# عالمگیریت اور اردو ناول

مقالہ برائے پی ایچ۔ڈی اردو

سیشن (۲۰۱۵ـ۲۰۲۰)

| نگران مقالہ | مقالہ نگار |
| --- | --- |
| ڈاکٹر محمد کامران | رفعت رفیق |
| (پروفیسر) | رولنمبر ۷۰-۱۵ |





## شعبہ اردو اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی لاہور

والدہ جی

(آسمان تیری لحد پہ شبنم افشانی کرے

سبزہ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے)

اور

# ابو جی کی نذر

(سدا سلامت رہیں)

جن کی دعائیں زندگی کے ہر امتحان میں میری کامیابی کی ضامن رہیں۔

# اظہارِ تشکر

تمام تر حمد و ثنا خدائے بزرگ و برتر کے لئے جو واحدہٗ لاشریک بھی ہے اور علیم و خبیر بھی۔ جس نے اپنے علم کے بحرِ بے کناں سے علم کی چند بوندیں انسان کو عطا کر کے اس میں مزید کی خواہش، جستجو اور لگن پیدا کر دی اور پھر پوری کائنات اس کے سامنے رکھ کر اسے دعوتِ فکر اور اذنِ تسخیر دیا۔

اور لاکھوں کروڑوں درود و سلام نبی آخر زمان کی ذاتِ پر نور پر کہ جو دنیا میں جہالت کے خاتمے کی نوید اور علم و آگہی کی روشنی کے داعی بن کر تشریف لائے۔ اور علم و عقل اور سوچ و فکر پر صدیوں سے لگے جہالت کے قفل توڑتے ہوئے انسان کو علم کے حصول کی راہ دکھلائی۔

ناسپاس گذاری ہوگی کہ میں اپنے نگران مقالہ ڈاکٹر محمد کامران کی شکریہ ادا نہ کروں کہ جنہوں نے اپنی رہنمائی سے تحقیق کے خارزار کو میرے لئے سہل بنا دیا۔ اس کے علاوہ ہمیں استاذالاساتذہ پروفیسر ایمریطس ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کی نہایت شکر گذار ہوں کہ ان کے انتہائی مصروف شیڈول میں سے جب بھی میں نے وقت مانگا انہوں نے وقت نکالا اور رہنمائی فرمائی اور اپنے انتہائی شفیق اور مہربان استاد ڈاکٹر ناصر عباس نئیر کی بطور خاص شکر گذار ہوں کہ جن کی شفقت اور رہنمائی نہ صرف اس مقالے کے دوران میرے لیے مشعل راہ رہی بلکہ ان کی خوبصورت شخصیت کے اوصاف سے خاکسار نے بہت کچھ سیکھا اور انشاءاللہ سیکھنے کا یہ عمل آئندہ بھی جاری رہے گا بلا شبہ ڈاکٹر ناصر عباس نئیر جیسے استاد صدیوں بعد جنم لیتے ہیں۔اپنے دیگر اساتذہ کرام ڈاکٹر زاہد منیر عامر، ڈاکٹر بصیرہ عنبرین اور ڈاکٹر ضیا الحسن صاحب کا شکریہ ادا کرنا بھی مجھ پہ واجب ہے۔ ڈاکٹر محمد ہارون عثمانی، چیف لائبریرین پنجاب یونیورسٹی کی بھی بے حد ممنون ہوں کہ ان کے ذاتی ذخیرہ کتب سے استفادے نے میرے کام کو سہل بنا دیا۔ اپنے والد گرامی پروفیسر (ر) محمد رفیق کا شکریہ ادا کرنا یقیناً میرے لیے ممکن ہی نہیں کہ جن کی حوصلہ افزائی اور ہر ملاقات و ٹیلی فونک گفتگو میں میرے مقالے کے حوالے سے استفسار اور حوصلہ افزائی نے مجھے تھکنے نہیں دیا۔ ان کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر محمد اسلم حیات (شریک حیات) کی انتہائی احسان مند ہوں کہ ان کے مثالی تعاون کے بغیر اس مقالے کی تکمیل ممکن ہی نہ ہوتی۔ اپنے بہن بھائیوں عفت آپا، شفیق بھائی اور عمران بھائی اور منی بہن راحت کی بھی شکر گذار ہوں کہ جن کی دعاؤں نے میرا حوصلہ بنائے رکھا۔ بچوں افرح فاطمہ، حسن عبد اللہ اور مسفرہ فاطمہ اور مستبشرہ فاطمہ کی بھی شکر گذار ہوں کہ جنہوں نے میرے اس پورے سفر کے دوران صبر کا مظاہرہ کیا اور اپنے حصے کا وقت کتابوں اور مقالے کو دیتے دیکھ کر بھی کوئی شکوہ نہیں کیا۔ شاہد صاحب کا بھی شکریہ ادا کرنا لازم ہے کہ جنہیں جب بھی کہا انہوں نے چند گھنٹوں کے نوٹس پر کتاب میری میز تک پہنچانے کا اہتمام کیا۔ ثقلین شوکت صاحب کے تعاون کے لئے ان کی بھی ممنونِ احسان ہوں۔ حیدر صاحب کا بھی شکریہ ادا کرنا لازم ہے کہ جنہوں نے کمپوزنگ کو میرے لیے درد سر نہیں بننے دیا۔ فاروق صاحب، روءف اسحاق، محمد نذیر اعوان، محمد عمران اور علی عمران مختار کا بھی خصوصی شکریہ۔ لیاقت علی اور زیشان جاوید کا بھی شکریہ۔

ڈاکٹر حمیرا بانو انچارج شعبہ خصوصی تعلیم کی بھی شکر گذار ہوں کہ ان کی شفقت اور حوصلہ افزائی میسر رہی۔ ڈاکٹر ثمینہ اور ڈاکٹر منور ملک اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ خصوصی تعلیم کی بھی احسان مند ہوں کہ انہوں نے میرے موضوع میں ذاتی دلچسپی ظاہر کرتے ہوئے ہمیشہ میری حوصلہ افزائی کی۔

اس کے علاوہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری، اورینٹل کالج لائبریری، لائبریری شعبہ معاشیات پنجاب یونیورسٹی، لائبریری شعبہ سیاسیات پنجاب یونیورسٹی، قائداعظم لائبریری اور پنجاب پبلک لائبریری کے عملے کی بھی شکر گذار ہوں۔

آخر میں درخواست ہے کہ اس مقالے کی تمام خامیوں اور کوتاہیوں کو میری کم علمی، ہیچ مدانی، سہل پسندی اور کوتاہ بینی پر محمول کیا جائے اور اس کی خوبیوں کو توفیق خداوندی کے بعد میرے معزز و محترم اساتذہ کرام کے علم و فضل کا کمال سمجھا جائے۔

رفعت رفیق

# مقدمہ

خدائے بزرگ وبرتر کالامتنہیٰ تشکر کہ اس کی بخشی توفیق کی بدولت اس قابل ہوئی کہ "عالمگیریت اور اردو ناول" جیسے وسیع موضوع پر تحقیق کے خار زار سے گذرتے ہوئے مقالے کی تکمیل کو ممکن بنا سکی۔

یہ موضوع اردو ادب میں کتنی اہمیت کا حامل ہے اس کا فیصلہ اردو ادب کے نقاد بخوبی کر سکتے ہیں۔ عالمگیریت کی اس تحریک کو سمجھنے کی ضرورت اس لئے بھی ہے کہ اس کا تعلق موجودہ دور میں زندگی کے سبھی شعبوں سے اور علوم کی بہت سی شاخوں سے ہے جن میں معاشیات، عمرانیات، سیاسیات، نفسیات اور ادب وغیرہ شامل ہیں۔ ایسی صورت میں عالمگیریت پر تحقیق کی اہمیت دوچند ہو جاتی ہے۔ پوری دنیا بالخصوص ترقی پذیر ممالک کو درپیش صورتحال کے پیش نظر عالمگیریت کی صورتحال سمجھنا اور زندگی سے اس کے تعلق کو جوڑتے ہوئے آنے والے حالات اور چیلنجوں کا ادراک کرنا بطور ترقی پذیر معاشرے کی ایک فرد میرے لیے از حد ضروری ہے۔ ناول چونکہ زندگی کا کلی طور پر احاطہ کرتا ہے اس لیے عالمگیریت کے اثرات کو مکمل طور پر دیکھنے اور سمجھنے کے لیے ناول کی صنف کا انتخاب کیا گیا۔

اس انتخاب کے بعد اگلا مرحلے میں اس موضوع کو چار ابواب میں تقسیم کیا۔ پہلے باب میں عالمگیریت کا معنی و مفہوم، مختلف لغات اور دائرۃ المعارف کی روشنی میں عالمگیریت کی تعریفات، اس کے قدیم و جدید تصورات اور مختلف پہلو مثلاً معاشی پہلو، تہذیبی و ثقافتی پہلو، سیاسی پہلو اور نفسیاتی پہلوؤں پر بحث کی گئی ہے۔

دوسرے باب میں اردو میں ناول کا آغاز و ارتقاء اور اردو ناول کے بنیاد گذاروں کے ہاں عالمگیریت کے اثرات کا جائزہ پیش کیا گیا اور عالمگیریت کے مختلف پہلوؤں کی روشنی میں اردو کے پہلے ناول مراۃ العروس سے ۱۹۴۷ء تقسیم ہند اور قیام پاکستان تک اردو ناول کے طویل دور کو زیر بحث لاتے ہوئے عالمگیریت کے اثرات کو دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

تیسرا باب قیام پاکستان سے ۱۹۸۰ء تک محیط ہے کہ جب عالمگیریت کی یہ جدید صورت واضح ہو کر سامنے آنے لگی تھی۔ اسی دور میں اردو ناول نگار کا شعور پختہ ہوا اور اس کا فن نکھرنے لگا۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور میں اردو کو ایسے ناول نگار میسر آگئے جنہوں نے اردو ناول کو بڑی بڑی زبانوں کے ناول کا ہم پلہ کر دیا۔ اس دور میں قرۃ العین حیدر، عبداللہ حسین، ممتاز مفتی، عزیز احمد، نثار عزیز بٹ جیسے ناول نگاروں نے خون جگر سے اس کی صنف کی آبیاری کی ہے اور اپنے شاہکار دنیا کے سامنے پیش کیے۔

مقالے کا چوتھا باب ۱۹۸۰ء سے تاحال کا احاطہ کرتا ہے۔ اس دور میں دنیا میں ہر سمت میں برق رفتار تبدیلیاں نظر آتی ہیں۔ اسی دور میں دنیا بائی پولر سے یونی پولر ہو گئی۔ امریکہ دنیا کی واحد سپر پاور بن کر اپنے مخصوص طرز حیات اور طرز فکر کی حکمرانی کے ایجنڈے پر عمل پیرا ہو گیا۔ اس دور میں

مواصلاتی ٹیکنالوجی میں بے مثل ترقی نے دنیا کو ایک عالمی گاؤں میں بدل کر عالمگیریت کے ایجنڈے کی حامل قوتوں کے لیے ان کے اہداف کے حصول میں آسانی پیدا کی تو دوسری طرف امیر اور غریب کے درمیان میں دولت کی خلیج نمایاں ہونے لگی۔ ایک طرف میکڈونلڈ، کے ایف سی جدید طرزِ زندگی کی علامت بنے تو دوسری طرف افریقہ، ایشیا میں لاکھوں انسان نانِ شبینہ کو ترسنے لگے۔

اس باب میں ان ناولوں کا تجزیہ پیش کیا گیا جو بیسویں صدی کی آخری دو دہائیوں اور اکیسویں صدی کی ابتدائی دو دہائیوں میں عالمگیریت کے اثرات کو واضح انداز میں پیش کرتے ہیں انہی دہائیوں میں اب عالمگیریت بھی اپنے جدید دور میں داخل ہو گئی ہے۔ ناولوں کے انتخاب میں ناول نگاروں کے نمائندہ ناولوں کو مدِ نظر رکھا گیا ہے۔ یعنی جو ناول عالمگیریت کے اثرات کے مطالعے میں معاون تھے ان پر بحث کی گئی ہے۔

محاکے میں تحقیق کا حاصل اور جوہر پیش کیا گیا ہے۔ عالمگیریت ایک تیزی مقبول ہونے والی اصطلاح ہے جس نے ہر شعبہ زندگی کو متاثر کیا۔ اس مقالے میں دنیا میں عالمگیریت کے زیر اثر نظر آنے والی تبدیلیوں اور سماج کے بدلتے ہوئے تناظر میں اردو ناول کی صورتحال کا جائزہ پیش کیا گیا اور عالمگیریت کے اثرات کا احاطہ کیا گیا۔

یہ موضوع نیا ہے اور اس پر تحقیقی کام نہیں ہوا۔ اس لیے اس ضرورت کو مد نظر رکھتے ہوئے مستند مواد کی جمع آوری کے بعد مربوط انداز میں کام کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں مختلف لغات، انسائیکلوپیڈیاز اور عالمگیریت پر کام کرنے والے مفکرین کی آرا کو مد نظر رکھتے ہوئے عالمگیریت کی ایک جامع تعریف وضع کرنے کی کاوش کی گئی ہے۔ اور عالمگیریت کے اردو ناول پر اثرات کا بطور خاص جائزہ لیا گیا ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ آنے والے محققین، ناقدین اور مؤرخین کے لیے عالمگیریت کے حوالے سے مواد جمع کیا گیا اور اس پر آئندہ تحقیق کے لیے ایک بنیاد فراہم کی گئی ہے۔

اس مقالے کے لیے دستاویزی تحقیق (Documentary Research) کا طریقہ استعمال کرتے ہوئے تشریحی انداز اختیار کیا گیا ہے۔ اور ناول کی صنف نے چونکہ ان اثرات کو زیادہ جذب کیا ہے اس لیے ناول کے حوالے سے عالمگیریت کے اثرات کو بیان کیا گیا ہے۔

اس موضوع پر تحقیق کرتے ہوئے مندرجہ ذیل مصادر و منابع سے استفادہ کیا گیا ہے۔

عالمگیریت کے بارے میں اردو اور انگریزی میں لکھی گئی کتب، مضامین اور مقالات

عالمگیریت کے اثرات کے حامل اردو ناول

انٹرنیٹ

انسائیکلوپیڈیاز

ادبی تواریخ

مختلف یونیورسٹیوں کے HEC سے منظور شدہ تحقیقی مجلے

مقالے میں جہاں جہاں ضروری تھا اردو ناول سے اقتباسات بطور مثال پیش کیے گئے ہیں۔ اردو ناول پر عالمگیریت کے اثرات کے حوالے سے پہلے کوئی کام نہیں ہوا۔ اس لیے موضوع کی جدت کے پیش نظر یہ کام آنکھوں سے تیل ٹپکانے کے مترادف تھا لیکن ناول ناول نگار کی پسندیدہ اصناف میں سے ہے اس لیے کام طویل ضرور تھا لیکن مقالہ نگار کہیں بھی غالب کے رقیب کی طرح بدمزہ نہیں ہوئی بلکہ ہر روز ایک نئی دلچسپی اور ایک نئے جذبے کی رہنمائی میں اس تحقیق کو بروقت مکمل کرنے کے قابل ہوئی۔ اس کے لیے خداوند تعالیٰ کی بے انتہا شکرگزار ہوں۔

# فہرست

# باب اول

# عالمگیریت: معنی و مفہوم

بِسۡمِ اللہ الرحمٰنِ الرّحِیۡم

عالمگیریت انگریزی لفظ(Globalization) گلوبلائزیشن کا اُردو روپ ہے. گلوبلائزیشن کا لفظ دراصل لفظ گلوب(Globe) سے اخذ کیا گیا ہے۔ جس کے مفاہیم میں گیند، کرہ، کرہ زمین، کروی جسم یا گول شے شامل ہیں۔ گلوب سے لفظ گلوبل بنا ہے جس کا مفہوم مختلف لغات میں اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

کتابستان نیو میلینیم ڈکشنری کے مطابق:

"Global:اسم صفت، دنیا بھر کا، عالمگیر worldwide" (۱)

پروفیسر کلیم الدین احمد کی مرتبہ لغت میں بھی اس لفظ کا مفہوم اس طرح بیان کیا گیا ہے:

"گلوبل، عالمگیر، مجموعی طور پر، عالمی، کروی۔"(۲)

اگر چہ گلوبل کا لفظ ۴۰۰ چار سو سال پرانا ہے لیکن Globalize،Globalizing اور Globalization جیسے الفاظ کا استعمال ۱۹۴۰ سے قبل نہیں ملتا۔(۳)

Webster وہ پہلی لغت ہے جس نے ۱۹۶۱ میں Globalize اور Globalization کی تعریف بیان کی۔

نیا تصور ہونے کی بنا پر Globalization کا لفظ بہت سی جدید لغات میں موجود نہیں ہے کیونکہ جدید دور میں یہ تصور سقوط ماسکو کے بعد متعارف ہوا تاہم گلوبلائزیشن کے ماہرین اس بات پر عمومی اتفاق رکھتے ہیں کہ اگرچہ یہ لفظ نیا ہے لیکن اس سے وابستہ تصور نیا نہیں ہے۔ گلوبلائزیشن کا مفہوم مختلف لغات میں کچھ اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

آکسفورڈ انگلش ڈکشنری کے مطابق گلوبلائزیشن سے مراد:

> "The process by which business or other organizations develop international influences or start operating on an international scale." (4)

یعنی عالمگیریت سے مراد

"وہ عمل جس کے ذریعے کاروبار یا دیگر ادارے بین الاقوامی اثر ورسوخ قائم کرتے ہیں یا اپنے کاروبار کو بین الاقوامی سطح پر شروع کرتے ہیں۔"

---

(1) Bashir,A.Qureshi,ed, *Kitabistan New Millennium Practical Dictionary*,(Lahore:kitabistan Publishing Company,2004) p357

(2) Kalim uddin Ahmad,ed, *Jami English Urdu Dictionary* ( New Dehli: National Council for promotion of urdu,1996) p 961

(3) Malcom Waters,*Globalization*,(NewYork:Routledge,2001) p 2

(4) Pearsall,Judy,ed,*Oxford Dictionary of English* 2nd (Oxford: Oxford University Press, 2006) p 736

New Collegiate ڈکشنری میں گلوبلائزیشن کی وضاحت یوں کی گئی ہے۔

Globalization: (n) the act of globalizing , the state of being globalize.

یعنی

"عالمگیر بنانے کا عمل، عالمگیریت کی حالت۔"

اس کے بعد گلوبلائز کی وضاحت کی گئی ہے

Globalize to make global :esp to make worldwide in scope or application. (1)

گلوبلائز یعنی عالمگیر بنانا: خصوصاً عالمگیر دائرہ کار یا اطلاق۔

## گلوبلائزیشن کے مترادفات

گلوبلائزیشن کے لیے کچھ دیگر الفاظ بھی رائج ہیں، جو گلوبلائزیشن کو کلی طور پر بیان کرنے کی بجائے بالعموم اس کے کسی نہ کسی پہلو کو بیان کرتے ہیں یا اس کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے Internationalization یعنی **بین الاقوامیت** کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ اس حوالے سے دیکھیں تو گلوبل یا عالمگیر سرحدوں کے آر پار تعلقات کو بیان کرتا ہے اور عالمگیریت سے مراد بین الاقوامی تبادلہ (اشیاء افراد اور سرمایہ) ہے۔

عالمگیریت کے ضمن میں ایک دوسری انگریزی اصطلاح (liberalization) لبرلائزیشن پیش کی جاتی ہے، جس سے ذہن ممالک کے مابین نقل و حمل پر حکومتی نافذ کردہ پابندیوں کو ہٹانے کی طرف منتقل ہوتا ہے تاکہ سرحدوں سے آزاد ایک عالمی معیشت کو وجود میں لانا ممکن ہو سکے۔ اس حوالے سے دیکھیں تو گلوبلائزیشن ایک عام لفظ بن چکا ہے اور اس قسم کی گلوبلائزیشن کی مثالیں ریگو لیٹری تجارتی پابندیوں کو اُٹھانا اور آزاد تجارت کو فروغ دنیا میں با آسانی مل جاتی ہیں۔

گلوبلائزیشن کے متوازی ایک تیسری اصطلاح (Universalization) یعنی آفاقیت کا استعمال کیا جاتا ہے۔

آفاقیت کی وضاحت کرتے ہوئے جان آرٹ شولتے لکھتے ہیں

Indeed when Oliver and Baldwin Davies coined the verb globalize in 1940s, they took it to make universalize and foresaw, a planetary synthesis of cultures in global humanism.(2)

---

(1) Webster ,New Collegiate Dictionary (London:Punams sons ,1949) p 485.

(2) Scholte, Jan Art, , *Globalization: A Critical Introduction* ,2nd ed, (New York:Palgrave Macmillan:2005) p 196

در حقیقت آلیوراور بالڈون ڈیویزنے چالیس کی دہائی میں جب **گلوبلائز** کی اصطلاح تراشی تو اس سے ان کا مفہوم آفاقیت تھا اور وہ اس کو کرہ ارض کی ثقافتوں کے مرکب اور عالمی انسانی برادری کے طور پر دیکھ رہے تھے۔

اس مفہوم میں گلوبل کا مطلب عالمگیر ہے اور گلوبلائزیشن سے مراد مختلف اشیاو تجربات کو کرہ ارض کے تمام کونوں پر موجود انسانوں تک پھیلانے کا عمل ہے۔

اس طرح کی گلوبلائزیشن کی مثالوں میں مخصوص کمپنیوں کی گاڑیوں مکڈونلڈ، کے ایف سی جیسے ریسٹورنٹس کا دنیا بھر میں پھیلاؤشامل ہے گلو بلا ئزیشن کے ناقدین کی طرف سے ایک اصطلاح modernization/ Americanization/ westernization/ پر استعمال کی جاتی ہے۔اس تصور کے تحت جدیدیت کے تمام اہم اداروں کا دنیا بھر میں پھیلاؤ ہے۔اور ایسا عموماً پہلے سے موجود مقامی اداروں کو تباہ کرتے ہوئے کیا جاتا ہے۔اس قسم کی گلوبلائزیشن کو عام طور پر استعماریت کے طور پر بیان کیا جاتا ہے ۔CNN،McDonaldsاورHollywood جیسے اداروں کی اجارہ داری اس قسم کی گلوبلائزیشن یا استعماریت کی مثالیں ہیں۔

ایک پانچویں اصطلاح اس حوالے سےDeterritorializationہے۔

یعنی ایسی جغرافیائی ساخت جو علاقائی دائروں سے ماوراہو۔اس حوالے سے ڈیوڈ ہیلڈ اور ٹونی مک گرو عالمگیریت کی تعریف اس طرح کرتے ہیں

> A process (or set of processes) which embodies a transformation in spatial relations and transaction.(1)

عالمگیریت سے مراد ایسا عمل ہے جو مقامی روابط اور مقامی کاروبار اور لین دین کو تبدیلی سے ہمکنار کرتا ہے۔عالمگیریت مقامیت کے برخلاف بین الاقوامیت پر یقین رکھتی ہے اور فروغ دیتی ہے۔بہرحال یہ تمام اصطلاحات عالمگیریت کے مختلف پہلوؤں کو بیان کرتیں ہیں لیکن عالم گیریت ان تمام پہلوؤں اور تصورات کو یکجا کر کے دیکھتی ہے۔

(1) Scholte, Jan Art, , *Globalization: A Critical Introduction* ,2nd ed, (New York:Palgrave Macmillan:2005) p 196

## عالمگیریت کی تعریفات

عالمگیریت ایک ہمہ گیر تحریک ہے جس نے بہت تیزی سے دنیا بھر میں سیاست، مذہب معیشت، معاشرت اور ادب و فکر کو متاثر کیا ہے۔ اس کی تعریف مختلف علوم کے ماہرین اپنے اپنے مخصوص تناظر میں کرتے ہیں۔ ماہرینِ معاشیات اس کو معیشت کا عالمی پھیلاؤ قرار دیتے ہوئے اس کے مختلف خد و خال بیان کرتے ہیں۔ ماہرین عمرانیات اسے ثقافت پر اثرات کے حوالے سے دیکھتے ہیں اور عالمگیریت کے زیر اثر آنے والی ثقافتی تبدیلیوں اور اثرات کو بیان کرتے ہیں۔ اسی طرح ماہرین سیاسیات قومی حکومتوں کے کردار میں تخفیف اور ایک عالمی حکومت کے قیام کے تناظر میں عالم گیریت کو بیان کرتے ہیں۔ غرضیکہ عالمگیریت ایک ایسی تحریک ہے جس نے بہت تیزی سے دنیا کو متاثر کیا ہے اور گذشتہ تین چار دہائیوں سے یہ اصطلاح علمی و ادبی حلقوں میں بہت زیادہ مروج و مقبول ہو چکی ہے۔ دنیا میں جب بھی کوئی نئی صورتِحال در پیش ہوتی ہے یا نئے علوم اور نئی ایجادات سامنے آتیں ہیں تو ان کے لیے خاص اصطلاحات وضع کی جاتی ہیں۔ ان اصطلاحات کی مقبولیت کا ایک خاص زمانہ ہوتا ہے اور یہ خاص مقاصد کے لیے وضع کی جاتی ہیں۔ ان مقاصد کے حصول کے لیے ان اصطلاحات کو تواتر کے ساتھ میڈیا کے ذریعے دہرایا جاتا ہے اور اتنا دہرایا جاتا ہے کہ زبان زدعام ہو جاتی ہیں۔ یہی حال عالمگیریت کی اصطلاح کا بھی ہے۔ یہ ایک نسبتاً جدید اصطلاح ہے۔ اس لیے صرف اکیسویں صدی میں چھپنے والی ڈکشنریوں اور انسائکلوپیڈیاز میں اس کا ذکر ہے۔ اکیسویں صدی سے پیشتر چھپنے والی لغات، دائرۃ المعارف میں یہ اصطلاح نہیں ملتی کیونکہ اپنے موجودہ معنی میں اکیسویں صدی سے پیشتر یہ اصطلاح رائج نہیں تھی بہر حال مختلف کتب لغات، دائرۃ المعارف اور ماہرین کے ہاں اس اصطلاح کی تعریفات کا جائزہ لینا ضروری ہے تا کہ اس کی جامع تعریف اخذ کی جاسکے جو اس کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہو۔

دی نیو انسائکلوپیڈیا برٹانیکا(TheNew Encyclopedia Britannica) میں عالمگیریت کی تعریف یوں کی گئی ہے:

> Globalization is a process by which the experience of everyday life, marked by the diffusion of commodities and ideas, is becoming standardized around the world. (1)

> عالمگیریت ایک ایسا عمل ہے جس کے ذریعے دنیا بھر میں روزمرہ زندگی کے تجربات، اشیائے صرف اور نظریات کے پھیلاؤ کے ذریعے ساری دنیا میں یکساں ہو رہے ہیں۔

لیکن اس سے مقامی روایات اور مخصوص جغرافیائی خصوصیات ختم ہو رہی ہیں اور دنیا کو ایک ایسی جگہ میں تبدیل کیا جارہا ہے جہاں یکساں ثقافت کو فروغ مل سکے۔

---

(1) Safra, Jacob ,ed, *The New Encyclopedia Britannica*, Vol 20,15ed. ( Chicago: The New Encyclopedia Britannica , Inc,2005) p 133

برٹانیکا کنسائز انسائکلوپیڈیا(Britannica Concise Encyclopedia) میں بھی اسی تعریف کو پیش کیا گیا ہے کہ

"Process by which the experience of everyday life, marked by diffusion of commodities and ideas, is becoming standardized around the world- Factors that has contributed to globalization include increasing but sophisticated communication and transportation technologies and services mass migration and movement of the people." (1)

عالمگیریت روزمرہ زندگی کے تجربات کو اشیائے صرف اور نظریات کے پھیلاؤ کے ذریعے یکساں کرنے کا عمل ہے۔البتہ اس کے عوامل میں مواصلاتی اور نقل وحمل سے وابستہ ٹیکنالوجی کی تیز رفتار ترقی، اور اس کے نتیجے میں اشیاوخدمات کی بڑے پیمانے پر منتقلی اور افراد کی نقل وحرکت شامل ہیں۔

اوکسفورڈ ڈکشنری کے مطابق عالمگیریت وہ عمل ہے جس کے ذریعے کوئی کاروبار یاادارے بین الاقوامی رسوخ قائم کرتا ہے یا عالمی پیمانے پر کام کرنا شروع کردیتے ہیں۔

The Oxford Companion to the Politics of World کے مطابق

Globalization can be conceived as a process (or set of processes) which embodies a transformation in the spatial organization of social relations and transaction, expressed in transcontinental or interregional flows and networks of activity, interaction and power. It is characterized by four types of changes. First, it involves a stretching of social, political and economic activities across frontier regions and continents. Second, it is marked by the intensification or the growing magnitude of interconnectedness and flows of trade investment, finance, migration and culture. Third it can be linked to a speeding up of a global interactions and process as the development of worldwide systems of transport and communication increase the velocity of the diffusion of ideas, goods, information, capital and people. And fourth, the growing extensity intensity and velocity of global interactions can be associated with their deepening impact such that the effects of distant events can be highly significant elsewhere and specific local developments can come to have considerable global consequences. .(2)

عالمگیریت کو ایک ایسے عمل کو طور پر لیا جا سکتا ہے جو سماجی معاملات اور تعلقات جن کا اظہار بین البراعظمی طور یا بین العلاقائی سرگرمیوں، طاقت یاباہمی روابط کے بہاؤ سے ہوتا ہے۔اس کی چار خصوصیات ہیں۔پہلی، اس میں سماجی، سیاسی، اور اقتصادی سرگرمیوں کا پھیلاؤ سرحدوں کے آرپار شامل ہے۔دوم اس کی علامت ثقافت، سرمائے، ہجرت، سرمایہ کاری کا بہاؤ اور باہمی روابط کی بڑھتی ہوئی شدت ہے۔سوم اس کا تعلق اقوام عالم کے درمیان روابط میں تیزی اور عمل سے جوڑا جا سکتا ہے۔کیونکہ دنیا بھر میں نقل وحمل اور

---

(1) Pappas, Theodore,ed, *Britannica Concise Encyclopedia* (London :Encyclopedia Britannica, Inc 2005) p 752

(2) Joe, Krieger, ed ,*The oxford companion to politics of the world* (New York :oxford university Press, 2001) p 324

ابلاغ کے نظام کی ترقی نے افراد، سرمائے، معلومات، اشیاء اور نظریات کے پھیلاؤ کی تیزی میں اضافہ کر دیا ہے۔ اور چہارم، گلوبل تعاملات کی رفتار اور پھیلاؤ میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ ان کے گہرے اثرات باہم منسلک ہو سکتے ہیں وہ اس طرح کہ کسی دور دراز جگہ ہونے والا کوئی وقوعہ بھی کسی اور جگہ پر بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہو سکتا ہے اور عین ممکن ہے مقامی سطح پر ہونے والی پیش رفتیں عالمی اثرات کی حامل ہوں۔

ڈکشنری آف پولیٹکل سائنس کے مطابق

Globalization or globalisation is the increasing interdependence, integration and interaction among people and corporations in disparate locations around the world. It is an umbrella term which refers to a complex of economics, trade, social, technological, cultural and political interrelationship. The term has been used as early as 1944, however Theodore levity is usually credited with its first use in an economics context.(1)

عالمگیریت دنیا کے مختلف علاقوں میں موجود افراد اور اداروں کے درمیان بڑھتے ہوئے انحصار، تعامل اور انضمام کا نام ہے۔ یہ مختلف تصورات پر محیط ایک ایسی چھتری نما اصطلاح ہے جس کے تلے معیشت، تجارت، سماجی، ثقافتی اور باہمی سیاسی تعلقات کے مجموعے آجاتے ہیں۔ یہ اصطلاح ۱۹۴۴ میں پہلی بار استعمال کی گئی تاہم تھوڈور لیوٹ کو فوقیت حاصل ہے کہ اس نے پہلی بار معاشی تناظر میں اس اصطلاح کو استعمال کیا۔

عالمگیریت سے مراد ایک ایسی عالمی معیشت کی تشکیل ہے جو تیزی سے باہم مربوط ہو رہی اور جو آزاد تجارت، سرمائے کے آزادنہ بہاؤ اور سستی غیر ملکی افرادی قوت کی منڈیوں کو بروئے کار لانے سے ممتاز ہوتی ہے۔

پینگوئن ڈکشنری آف اکنامکس نے گلوبلائزیشن کو اس طرح بیان کیا

> "The geographic dispersion of industrial and services activities
>
> and the cross border networking of companies ".(2)
>
> عالمگیریت سے مراد صنعتوں اور خدمات کے شعبوں کی سرگرمیوں کا ایسا جغرافیائی پھیلاؤ
>
> اور مختلف کمپنیوں کا مربوط سلسلہ ہے جو سرحدوں سے بالاتر ہو۔

جوزف سٹگلٹز اپنی کتاب Globalization and its Discontent میں لکھتا ہے۔

> The close integration of countries and people of the world,.. brought about by the enormous reduction of costs of transportation and communication and the breaking down of

(1) Arora,Peeyush, *Dictionary of Political Science* ,(New Delhi :SARUP and Sons, 2007) p 243

(2) Bannock,G,Baxter,R.E.ed,*The Penguin Dictionary of Economics*,(New York: Penguin books,1984) p 91

artificial barriers to the goods, services, capital, knowledge and people across borders.[1] .

پوری دنیا کے ممالک اور لوگوں کے مابین ایسی قریبی جڑھت۔۔۔جو نقل و حمل اور ابلاغ کے اخراجات میں بے حد کمی اور خدمات، سرمائے، علم اور لوگوں کے درمیان حائل مصنوعی رکاوٹوں کے خاتمہ کی وجہ سے عمل میں آئی ہے۔

ماہر عمرانیات میلکم واٹر(Malcalm Water)عالمگیریت کی تعریف اس طرح کرتے ہیں

" A social process in which the constraint of geography on economics, political, social and cultural arrangement recede and in which people become increasingly aware that they are receding" . [2]

ایسا سماجی عمل جس میں جغرافیے کی بندشیں معاشی، سیاسی، سماجی اور تہذیبی بندوبست کی بدولت کم ہو جاتے ہیں اور جس سے لوگ بخوبی آگاہی رکھتے ہیں کہ یہ بندھن ٹوٹ رہے ہیں۔

انتھونی گڈنز(Anthony Giddens)اپنی کتاب میں عالمگیریت کو وسیع تر تناظر میں بیان کرتے ہیں:

"Globalization, as 1 shall conceive of it in what follows, at any rate, is not only or even primarily, about economic interdependence, but about transformation of time and space".[3]

عالمگیریت کو جہاں تک میں سمجھا ہوں صرف اقتصادی انحصار باہمی ہی نہیں بلکہ زمان و مکان کی تبدیلی ماہیت کے متعلق ہے۔

واٹر میلکم عالمگیریت کے موضوع پر اپنی کتاب Globalization میں عالمگیریت کے تصور کو زیادہ واضح کرتے ہوئے کہتے ہیں:

Globalization …. can be defined as the intensification of worldwide social relation which link distant localities in such a way that local happening are shaped by events occurring many miles away and vice versa .[4]

عالمگیریت... کی تعریف عالمی سماجی تعلقات میں پیدا ہونے والی گرم جوشی سے کی جاسکتی ہے

(1) Stiglitz ,Joseph E, *Globalization and its Discontent*,(New York :Norton and company 2006) p 5

(2) Waters, Malcolm, *Globalization*,(New York: Routedge,2001) p 5

(3) Anthony Giddens, *The third way: the renewal of social democracy* (UK: Cambrigde Polity Press, 1998) p 30-31

(4) Waters, Malcolm, *Globalization* p 2

جس کی بدولت دور دراز کے سماج ایک دوسرے سے اس طرح مربوط ہو گئے ہیں کہ ہزار ہا میل دور رونما ہونے والے واقعات کا اثر دور دراز علاقوں پر بھی ہوتا ہے۔

رابرٹ سن(Robertson)اپنی کتابGlobalization: Social Theory and cultureمیں لکھتے ہیں۔

"The compression of the world and the intensification of consciousness of the world as a whole… both concrete global interdependence and consciousness of the global whole in the twentieth century " [(1)]

دنیا کا سمٹ جانا اور پوری دنیا کو بطور ایک اکائی سمجھنے کا عمل۔۔۔بیسیویں صدی میں یہ دونوں چیزیں یعنی انحصار باہمی اور دنیا بطور اکائی عالمی انحصار میں اضافے کا سبب بنیں گی۔

شیلا ایل کروچر عالمگیریت کو اسطرح بیان کرتی ہیں

"Globalization can be defined as a process by which people of the whole world are unified into a single society and function together. This process is a combination of economic, technological, socio-cultural and political forces."[(2)]

عالمگیریت کی تعریف یوں بیان کی جاسکتی ہے کہ یہ وہ عمل ہے جس میں ساری دنیا کے لوگ ایک معاشرت میں یکجا ہو کر عمل پذیر ہوں گے۔ یہ عمل معاشی، سیاسی، ثقافتی اور ٹیکنالوجیکل قوتوں مجموعہ ہے۔

شیلا عالمگیریت کو بہتر انداز میں بیان کرتی ہیں اور اس کے ظاہری اور عمومی پہلو کے ساتھ ساتھ اس سے جڑے ہوئے دیگر پہلوؤں اور جہات کو بھی زیر بحث لاتی ہیں۔

تھامس فرائیڈ مین The Lexus and Olive Tree میں لکھتے ہیں:

I defined globalization this way: It is the inexorable integration of markets, nation-state and technologies to a degree never witnessed before is a way that is enabling individuals corporations, and nation- states to reach around the world farther, faster, deeper and cheaper than ever before and in a way that is enabling the world to reach into individuals

(1) Robertson ,Ronald , *Globalization :social theory and culture*,(New York: Sage publication, 1992) p 8

(2) Croucher,Sheila L. *Globalization and belonging the politics of identity in a changing world* (Maryland: Roman and Littlefield, 2004 ) p 10

corporations and nation-states to reach, deeper than ever before. (1)

میں عالمگیریت کی تعریف یوں کرتا ہوں: یہ مارکیٹوں، قومی ریاستوں اور ٹیکنالوجیز کا ایسا انضمام ہے جو اس سے پہلے نہیں دیکھا گیا۔ اور یہ عمل انفرادی کارپوریشنز اور ریاستوں کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ دنیا بھر میں پہلے کے مقابلے میں تیزی سے اور کم اخراجات سے اور زیادہ دور تک پہنچ سکیں اور اسی طرح دنیا انفرادی کارپوریشنز اور ریاستوں تک پہلے کے مقابلے میں کم وقت اور اخراجات سے پہنچنے کے قابل بن جاتی ہے۔

فرائیڈمین مزید کہتے ہیں:

The driving idea behind globalization is free market capitalism-the more you let market forces rule and the more you open your economy, the more efficient and flourishing your economy will be. Globalization means the spread of free market Capitalism to virtually every country in the world. Globalization also has its set of economics rules -rules that resolve around opening, deregulating and privatizing your economy, (2)

عالمگیریت کے پیچھے آزاد منڈی پر مشتمل سرمایہ داری کا نظریہ کار فرما ہے۔ آپ اپنی معیشت کو جتنا کھلا چھوڑیں گے اور جتنا مارکیٹ کی قوتوں کو حکمرانی کرنے دیں گے، معیشت اتنی ہی زیادہ پھلے پھولے گی۔ عالمگیریت کا مطلب آزاد منڈی پر مشتمل سرمایہ داری کا عملی طور پر دنیا کے ہر ملک تک پھیلاؤ ہے۔ عالمگیریت کے اپنے معاشی اصول ہیں –وہ اصول جو معیشت کی آزادی، ڈی ریگولیشن اور نجکاری کے گرد گھوتے ہیں۔

سید مسعود جاوید بھی اسی رائے کا اظہار کرتے ہیں اور عالمگیریت کو ترقی پذیر ملکوں کے لیے ایک نوع کا نو آبادتی نظام قرار دیتے ہیں:

"In the developing countries, there is a fear that globalization will lead to a form of recolonization where their economies become dominated by Western MNCs serving western financial interests." (3)

(1) Freidman,Thomas L,*The Lexus and olive tree* ( New York: Farrar Straus Guiros, 1999) p 9

(2) Ibid

(3) Javed Masood, Syed, *International Political Economy and Globalization*,(Singapore: world scientific publishing, 2008) p 204

ترقی پذیر ممالک میں یہ خوف پایا جاتا ہے کہ عالمگیریت ایک قسم کی نو آبادیات کی طرف لے جائے گی جہاں ان کی معیشت پہ مغربی ملٹی نیشنل کمپنیوں کا غلبہ ہو گا جو مغرب کے معاشی مفادات کے لیے کام کریں گی۔

مندرجہ بالا تعریفیں عالمگیریت کے مختلف پہلوؤں اور خدوخال کو اجاگر کرتے ہوئے عالمگیریت کا ایک ایسا تصور ہمارے سامنے لاتی ہیں جو جغرافیائی حدبندیوں سے ماورا ہے۔ یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ یہ آزاد تجارت کی تحریک ہے جو مقامی حکومتوں کے کردار کو کم سے کم کرنے کا مطالبہ کرتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ ثقافتی تنوعات کا خاتمہ بذریعہ طاقتور ذرائع ابلاغ کرتے ہوئے ثقافتی یکسانیت کے فروغ کی خواہاں ہے لیکن یہ تمام امور بہت سی مزید پیچیدگیوں اور سوالات کو جنم دیتے ہیں

سوویت یونین کے خاتمے کے بعد سے ایک ہی نظام عالمی بننے کے لیے رہ گیا ہے وہ Capital Imperialist ہے۔ باقی ساری دنیا کی عافیت اسی میں ہے کہ اس کو قبول کر لے۔ یہ رجحانات ایک اور صورت کی طرف لیے جارہے ہیں۔ جہاں سب ایک جیسے کپڑے پہنیں گے (جینز) ایک جیسے کھانے کھائے جائیں گے (برگر) ایک جیسی فلمیں دیکھیں گے (والٹ ڈزنی، ہالی ووڈ) ایک جیسی موسیقی پر تھرکیں گے اور جھومیں گے (پاپ میوزک) اور ایک جیسی کتابیں پڑھنے لگیں گے اور وہ بھی ایک زبان میں۔ گلوبلائزیشن کا یہ ایجنڈا ظاہر ہے کہ امریکہ بہادر ہی طے کرے گا۔ اسی لیے بعض تجزیہ نگاروں نے گلوبلائزیشن کو فی الاصل امریکنائزیشن قرار دیا ہے۔

مختلف کتب، لغات، دائرۃ المعارف، علما و مفکرین اور ادباء کی بیان کردہ تعریفات کو دیکھا جائے تو ان سے عالمگیریت اس کے اسباب اور نتائج یا اس سے پیدا شدہ عالمی صورتحال کو سمجھنے میں آسانی ہو جاتی ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ عالم گیریت اس کرہ ارض کے مختلف کونوں میں آباد افراد، اقوام اور ملکوں کو قریب تر لانے اور ایک کر دینے کا عمل ہے۔ جس کی ابتدا آزاد منڈیوں کے نظام سے ہوئی۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ معاش آج کی دنیا کی سب سے بڑی حقیقت ہے زندگی کے باقی پہلو اس سے جڑے ہوئے ہیں لہٰذا بنیادی طور پر اس تحریک نے زندگی کے ہر شعبے خواہ وہ سیاست ہو یا معاشرت، مذہب و اخلاق ہو یا زبان و ادب کو اپنے حیطہ اثر میں لے کر زندگی کو بدل کے رکھ دیا۔ اس تحریک کے فروغ میں جو عناصر سب سے بڑھ کر معاون ثابت ہوئے ہیں وہ تیز رفتار ذرائع نقل و حمل اور اطلاعاتی ٹیکنالوجی میں برق رفتار ترقی ہے جس نے دنیا کے فاصلے مٹا دیے ہیں آن واحد میں انداز و نظریات، فیشن یہاں تک کہ اشیاء ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو جاتی ہیں۔ بنیادی طور پر عالمگیریت دنیا کو ایک اکائی کی صورت میں دیکھنے کی کاوش کا نام ہے Global Village اور اب Global Hut کے تصورات اسی کے پیدا کردہ ہیں۔

عالمگیریت کے پیش کردہ تصورات بہت خوش کن ہیں کہ پھیلی ہوئی اس وسیع و عریض دنیا کو ثقافتی وحدت کی لڑی میں پرو دیا جائے۔ جدید اور برق رفتار ٹیکنالوجی نے دنیا کے مابین فاصلوں کو سمیٹ دیا ہے۔ پوری دنیا ایک عالمی گاؤں کا منظر پیش کر رہی ہے دنیا کے مختلف رنگارنگ معاشروں سے مکالمہ آسان ہو گیا۔ صنعتی معاشی ترقی میں پوری نوع انسانی کی مشارکت کے امکانات وسیع ہو گئے ہیں جیسا کہ بعض مصنفین مثلاً Malcolm Walter کے مطابق عالمگیریت عدم مساوات کے خاتمے، انسانی حقوق کے تحفظ،

ماحولیاتی تحفظ، سائنسی علوم کے پھیلاؤ اور تانیثت کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کر رہی ہیں۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں:

"It also involves at least opportunities for expansions of collective responsibilities for the mitigation of inequality of human rights of environmental values and of feminism". (1)

یہ بات درست ہے کہ عالمگیریت کا عمل کئی طرح سے فائدہ مند بھی ہے اور دنیا بھر کے رہنے والوں پر اس کے مثبت اثرات مرتب ہوئے ہیں ترقی یافتہ ممالک اس عمل میں سرمایہ اکٹھا کر رہے ہیں جبکہ سرمایہ کاری کی وجہ سے ترقی پذیر ملکوں میں لوگوں کو روزگار اور بہتر زندگی کی سہولیات میسر آتی ہیں۔

لیکن صورتحال اتنی سادہ ہرگز نہیں ہے یہ حقیقت ہے عالمگیریت اپنے جلو میں جس تہذیب کو لیے سایہ فگن ہو رہی ہے وہ یورپی بلکہ اگر زیادہ مخصوص کیا جائے تو امریکی تہذیب ہے۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ ہر تہذیب اپنا مخصوص تصور حیات اور تصور حقیقت رکھتی ہے۔ مغربی فکر جن مختلف دھاروں سے گزر کر بیسویں صدی کی دیلیز پر پہنچی ہے وہاں اعلیٰ اور پامال کا فرق مٹ چکا تھا۔ لمحہ موجود ہی سب سے بڑی حقیقت اور انسان ہر شے کا پیمانہ ہے۔ کسی بڑی مابعد الطبیعاتی صداقت سے انکار اور انسان مرکزیت کے تصورات نے مغرب کو جس مادی دلدل میں جا دھکیلا، جدید معاشی اور عمرانی تصورات اسی کے زائیدہ و پروردہ ہیں۔ نطشے کا دیوانہ آدمی گلیوں میں وحشیانہ بھاگتا ہوا خدا کی موت کا اعلان کرتا ہے تو خدا کی موت کے بعد مغرب آزاد ہے۔ عیش امروز، دنیاوی اقتدار اور مادی فوائد ہی بڑے اہداف بن جاتے ہیں۔

اس تحریک کے باطن میں جھانکیں تو اس کے پس پردہ وہی ذہنیت کار فرما ہے جو استعماریت، سامراجیت اور نو آبادیت کے پیچھے تھی لیکن طریقہ کار بدل گیا ہے۔ یعنی جال نیا ہے لیکن شکاری پرانے ہیں۔ استعماری اور سامراجی نظام میں فوج کشی کی جاتی ہے۔ نو آبادیات میں طریقہ کار تبدیل کر کے وسائل پر قبضہ کیا جاتا ہے۔ اب فوج کشی کے بغیر وہی مقاصد حاصل کیے جا رہے ہیں اسی حوالے سے والٹر میکولم (Malcolm Walter) کہتے ہیں

"Globalization represents an expansion of capitalist production market based consumption and western culture."(2)

والٹر میکولم کی بیان کردہ یہ تعریف عالمگیریت کے اصل چہرے کو بے نقاب کرتی ہے۔ اور اس کے پیچھے پوشیدہ سرمایہ داری نظام اور مغربی ثقافت کو سامنے لاتی ہے۔ لہذا اس تحریک کا مقصد اپنی مصنوعات کے صرف کے لئے نئی منڈیوں کی تلاش، نئی ضرورتوں کا احساس

(1) Malcolm ,Walter, *Globalization* p 232.
(2) Ibid.

پیدا کرنا ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ ساری دنیا کو ایک ہی ثقافتی رنگ میں رنگ دیا جائے۔ خواہ اس کی قیمت میں غریب اقوام کے منہ سے آخری نوالہ چھین لیا جائے یا دنیا سے ثقافتی تنوع کا خاتمہ ہو۔ یک ثقافتی دنیا اس عالمگیریت کے فروغ، استحکام اور پھیلاؤ کے لئے ضروری ہے۔

# عالمگیریت :قدیم تصور

عالمگیریت کا عمل انسانی تاریخ جتنی عمر رکھتا ہے کیونکہ ہر فرد یہ چاہتا ہے کہ وہ اپنے افکار، خیالات اور نظریات کو نہ صرف دنیا کے سامنے پیش کرے بلکہ دنیا کو انھیں قبول کرنے پر آمادہ بھی کرے۔ مذہب و قومیت کی بنا پر لڑی جانے والی جنگیں اسی احساس تفاخر کا نتیجہ تھیں اور مختلف وقتوں میں قائم ہونے والی سلطنتیں بھی اسی ایجنڈے پر عمل پیرا تھیں اور اپنی حدود کو وسعت دینے کے پیچھے بھی یہی مقاصد کار فرما تھے۔ سمیری، مصری یونانی اور باقی سلطنتیں بھی یونہی اپنے رقبے میں اضافہ کرتیں۔ اور اس مقصد کے لئے جنگی رتھ اور جنگی گھوڑے استعمال کرتے تھے۔ ان سلطنتوں نے ارد گرد کے علاقوں سے تجارتی روابط بھی قائم کیے۔ جو عالم گریت کے اس عمل کا ایک اہم جزو ہیں۔

عالمگیریت کی اصطلاح اگرچہ جدید ہے لیکن اس سے وابستہ معانی اپنی جڑیں تاریخ میں گہری رکھتے ہیں کیونکہ انسان نے بھی اپنے تہذیبی سفر کے آغاز سے ہی اپنے تجارتی و سیاسی افق کو وسیع تر کرنے کی کوشش کی ہے۔ تاریخ میں نقل مکانی، تجارت اور فوجی قوت کے ذریعے سلطنت کو وسعت دینے کا عمل معلوم تاریخ کے آغاز سے ملتا ہے۔ اس سلسلے میں مختلف سلطنتیں جو تاریخ کے مختلف ادوار میں تاریخ انسانی کے افق پر نمودار ہوتی رہیں ان کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ ملک گیری اور سلطنتوں کی حدود کو پھیلانے کے پیچھے بھی وہی مقاصد تھے جو آج جدید دور میں عالم گیریت کے ہیں فرق صرف یہ ہے کہ طریقہ کا تبدیل کر لیا گیا ہے۔ تاریخ کے مختلف ادوار میں ظاہر ہونے والی یہ سلطنتیں یہی مقاصد لے کر اُٹھیں اور دنیا کے مختلف حصوں کو زیر نگین کرنے لیے جنگ و جدل کے راستے کو اپنایا۔ ان سلطنتوں میں اہم درج ذیل ہیں کہ جنہوں نے تاریخ عالم پر گہرے نقوش ثبت کیے۔

## سمیری سلطنت

چھ اور سات قبل مسیح میں وادی نیل اور ایشیا کے زرخیز علاقوں میں نیم مہذب گروہ آباد تھے۔ اسی زمانے میں دریائے جہلم و فرات مختلف دھانوں سے خلیج فارس میں جا گرتے ہیں تھے انہی دونوں دریاؤں کے بیچ موجود ملک میں اہل سمیر نے اپنے اولین شہر قائم کیے۔ اہل سمیر بھوری رنگت والے تھے جن کے چہروں پر ناک نمایاں تھی۔ وہ خاص زبان لکھتے تھے۔ ان کی زبان پڑھی جا چکی ہے۔ کانسی کا استعمال سمیریوں نے شروع کیا۔ اس کے علاوہ وہ سورج کی حدت میں اینٹیں پکاتے اور پھر ان سے بڑے بڑے میناروں والے مندر تعمیر کرتے۔ مٹی کی الواح پر عبارتیں تحریر کرتے۔ مویشی، بھیڑیں، بکریاں اور گدھے پالتے تھے۔ گھوڑے نہیں رکھتے تھے۔ وہ پیدل ہی لڑتے۔ بھالوں اور کھالوں کی ڈھالوں سے جنگ کرتے۔

> ''اہل سمیر کا ہر شہر عمومی طور پر خود مختار تھا۔۔۔ کبھی کبھار کوئی شہر دوسرے پر قبضہ کر لیتا اور ان کی عوام سے جبر اًخراج وصول کرتا تھا۔ نیپیئر کے کھاتوں میں ایک مسودے میں سلطنت کا لفظ لکھا ملا ہے۔ سمیری شہر۔''ارخ'' کی سلطنت اولین معلوم شدہ باشاہت ہے

اس کے دیوتا اور پروہت بادشاہ کا تسلط خلیج فارس سے بحیرہ احمر تک دراز تھا۔"[۱]

## مقدونیہ کا عروج

یونان پہاڑوں اور چھوٹی چھوٹی وادیوں کی سرزمین ہے۔ جن میں نہ تو بڑی بڑی ندیاں ہیں اور نہ ہی میدان۔ گنتی کے چند میدانی علاقے ہیں تو وہ بھی رقبے میں زیادہ وسیع نہیں۔ یونان کی تاریخ حقیقت میں چھوٹی چھوٹی خود مختار ریاستوں کی تاریخ ہے۔ یوں تو ہر ملک پر وہاں کے جغرافیائی حالات کا گہرا اثر ہوتا ہے لیکن یونان میں یہ اثر بہت زیادہ نمایاں تھا۔

یونان کی سرزمین زیادہ زرخیز نہیں اس لیے یہاں کے لوگ قسمت آزمائی کے لیے سمندروں کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ خاص کر جب افزائش آبادی نے وسائل میں تنگی پیدا کی تو سمندر پار کی زمینوں نے انھیں کھینچا اور دوسرے ملکی پیداوار کی کمی پورا کرنے کے لیے باہر سے غلہ منگانا بھی ناگریز ہو گیا۔[۲]

یونان کے اصل باشندے غیر آریائی نسل سے تعلق رکھتے تھے اور جو بحیرہ ایجین کے ساحلی علاقوں میں آباد تھے۔ یہ لوگ یونانی مہاجرین سے تمدنی اعتبار سے آگے تھے۔ یہ لوگ تجارت پیشہ تھے اور بہت سے ملکوں سے ان کے تجارتی روابط قائم تھے۔ وہ اطالیہ کی لگوری اور ہسپانیہ کی ای بیری قوم کی مانند یونان میں بھی آریہ نسل کے آنے والوں سے پہلے سے آباد تھے۔ اس کے تمدن کے آثار جزائر میلوس وامر گوسو کریت میں دریافت ہوئے۔ مای کینی اس عہد میں ساحل ایجین کے علاقوں میں سب سے دولتمند اور مضبوط شہر تھا کہ ہومر اسے "زرنگار" کا لقب دیتا ہے۔ ملک مصر میں جو شواہد ملے ہیں وہ اس عہد کا سراغ دیتے ہیں جس میں ایجینی کمہار برتن بنا بنا کر سمندر پار ملکوں میں بھیجنے لگے تھے۔ مصر کے قدیم شہر تھیبز میں سولہویں صدی قبل مسیح کی بنی ہوئی ایک تصویر نکلی ہے جس میں ایجینی وضع کے لوگ مای کینی ظروف ہاتھ میں لیئے دکھائے گئے ہیں ایک اور شہر گورب سے متعدد صراحیاں برآمد ہوئی ہیں جو ممالک ایجین سے بن کر یہاں درآمد آئی تھی اور یہ گورب پندرھویں صدی قبل مسیح میں بنا اور دو تین سو برس کے بعد برباد ہو گیا۔[۳]

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مختلف اقوام اور ممالک کے مابین تجارتی روابط دورِ قدیم سے ہی قائم ہو چکے تھے۔ یونانیوں کے دنیا فتح کرنے کا مقصد دیگر اقوام کے وسائل تک رسائی اور انھیں اپنے تصرف میں لانا تھا۔ نہ صرف یونانیوں بلکہ دنیا کی دیگر اقوام اور تاریخ کے مختلف ادوار میں نمودار ہونے والی سلطنتیں بھی دیگر اقوام پر حملہ آور ہوتی رہیں اور امن عالم کو خطرے سے دوچار کرتی رہیں۔ یہ جنگیں خواہ مذہبی مقاصد کے لئے لڑی گئیں یا نسلی تفاخر کے پیش نظر۔ حقیقت یہ ہے کہ ان جنگوں کے پس پشت مال و دولت سمیٹنے کا مقصد کار فرما تھا۔

۴۳۱ سے ۴۰۴ قبل مسیح کے عرصہ میں پیلوپونیشن کی جنگ نے یونان کو تاخت و راج کیا جبکہ یونان کے شمال میں ایک ریاست

(۱) محمد عاصم بٹ (مترجم) مختصر تاریخ عالم، (لاہور، تخلیقات، ۲۰۱۰) ص ۶۸

(۲) مولوی سید ہاشمی فرید آبادی (مترجم)، تاریخ یونان ترجمہ ہسٹری آف گریس پروفیسر بیوری (حیدر آباد دکن: دارالطبع سرکار عالیہ، ۱۹۱۹) ص ۵

(۳) ایضاً

مقدونیہ اسی دور میں طاقت ور اور تہذیبی مرکز کے طور پر نمایاں ہو رہی تھی۔ اہل مقدونیہ یونانیوں سے مماثل زبان بولتے تھے۔ ۳۹۵ قبل مسیح میں اس چھوٹے سے ملک میں ایک اعلیٰ جواہر اور ارادے والا بادشاہ فلپ برسر اقتدار میں آیا۔ سب سے پہلے اس نے اپنے ریاستی حدود کو پھیلانے اور فوج کی تشکیل نو کی جانب توجہ کی۔ اس نئی فوج کی ہمراہی میں فلپ نے اپنی ریاستی سرحدوں کو تھیسلی سے یونان تک پھیلایا۔ ۳۳۸ق م میں چیرونیا کی جنگ میں اس نے ایتھنز اوراس کے اتحادیوں پر یلغار کی اور تمام یونان اس کی قلمرو میں شامل ہو گیا اور تمام یونانی ریاستوں کی مجلس نے فلپ کو ایران کے خلاف گریگو مقدونیہ اتحاد کا سربراہ اعلیٰ منتخب کر لیا۔ ۳۳۶ق م میں اس کی ترقی یافتہ فوج ایشیا میں داخل ہو کر پہلے سے طے شدہ رستوں پر روانہ ہو گئی۔ لیکن فلپ کو قتل کر دیا گیا اور اس کے بعد اس کے بیٹے سکندر کی بیس سال کی عمر میں مقدونیہ کے نئے حکمران کے طور پر تاج پوشی کی گئی۔ ۳۳۴ق م میں اس نے خود کو مستحکم کر لیا اور یونان اور مقدونیہ پر اپنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے ایشیا میں داخل ہوا۔ گرانیکس کی جنگ میں ایرانی فوج کو شکست فاش دی جو حجم میں بہت بڑی تھی اور ایشیائے کوچک کے متعدد شہروں کو مطیع بنایا۔ وہ ساحل سمندر پر آگے بڑھتا گیا۔ آئسس کے مقام پر وہ ڈاریس سوم کی قیادت میں لڑنے والی جسیم فوج کے روبرو ہوا اور اسے فنا کر دیا۔

سائیڈن نے سکندر کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے مگر ٹائر نے شدت سے مخالفت کی، آخر کار اس عظیم شہر پر یلغار کی گئی اسے لوٹا اور تباہ کر دیا گیا۔ غزہ پر بھی دھاوا بولا گیا۔ ۳۳۲ق م کے اختتام تک فاتح فوجیں مصر میں داخل ہوئیں اور ایرانیوں سے عنانِ حکومت چھین لی۔ ۳۳۱ میں ایرانی فوج کو شکست دیکر وسطی ایشیا کی طرف پیش قدمی کی اور بحری راستے سے مغربی ترکستان کے پہاڑوں تک پہنچا۔ ہراتِ، کابل اور درہ خیبر کے رستے ہندوستان میں داخل ہوا۔ وادی سندھ میں اس کا مقابلہ مہاراجہ پورس سے ہوا۔ یہاں پہلی مرتبہ اس کی فوج کا سامنا ہاتھیوں سے ہوا لیکن وہ یہاں بھی کامران رہا۔ دریائے سندھ کے دھانے کی طرف سفر کرتے رہے۔ چلتے چلتے وہ بلوچستان میں داخل ہوا اس کے بعد وہ دوبارہ سوسا ۳۲۴ق م میں پہنچا اور استحکام سلطنت کی طرف متوجہ ہوا۔ لیکن ۳۲۳ق م میں اس کے انتقال کے بعد اس کی سلطنت کے حصے بخرے ہو گئے۔ اس کے ایک سپہ سالار میلوکس نے قدیم ایرانی سلطنت کو وادی سندھ سے ایفس تک بحال رکھا۔ دوسرے سپہ سالار بطلیموس نے مصر پر قبضہ کیا۔ اینٹی گونس مقدونیہ پر برسر اقتدار آیا جبکہ باقی سلطنت غیر مستحکم ہو گئی۔

یوں وہ سلطنت جس نے ایران، شام، مصر، بابل سوس اصطخر، مشرق اقصی، ہند کے ایک وسیع علاقے اور موجودہ افغانستان میں شامل قدیم شہروں کو تسخیر کر کے اپنی سلطنت کی حدیں دور دور تک پھیلا دیں اس کی موت کے ساتھ ہی منتشر ہو گئی۔

قدیم دور میں قدیم طرز کی عالم گریت کی ایک عمدہ مثال ہمیں اس سلطنت کی وسعت اور پھیلاؤ میں ملتی ہے۔ جس نے دیگر علاقوں اور ملکوں کے تجارتی روابط بھی قائم کیے اور ملکی ضروریات کے پیش نظر مختلف اقوام اور ممالک کو تسخیر بھی کیا۔ اور ان ملکوں کی دولت سے اپنے ملک کو مالا مال کیا۔ لیکن تب یہ مقاصد فوج کشی کے ذریعے حاصل کیے گئے کیوں کہ جدید پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا اور ملٹی نیشنل کمپنیوں کی عدم موجودگی میں فوج کشی معاشی مقاصد کے حصول کا ہی واحد ذریعہ تھا۔

## سلطنت روما کا عروج

دوسری صدی عیسوی میں سلطنت روما روئے زمین کی بہترین سلطنتوں میں ایک تھی۔اس سلطنت کی قلمرو میں دنیا کی مہذب اور متمدن قوم آباد تھی۔رومی افواج و قوانین اتنے موثر تھے کہ سلطنت کے تمام صوبے باہم مضبوط و مربوط تھے۔ان صوبوں کی رعایا امن پسند اور متمول تھی اور عیش و عشرت کی زندگی اسراف کی حد تک بڑھی ہوئی تھی۔رومی حکومت کی بنیاد آزادی کے اصولوں پر رکھی گئی تھی۔

رومی سینٹ یا مجلس ملکی کو تمام اعلیٰ اختیارات حاصل تھے اور یہی وہ مجلس تھی جو رومی شہنشاہوں کو اقتدار اعلیٰ پر فائز کرتی تھی۔ سلطنت کے اولین ۸۰ برس کے عرصے میں سلطنت کی باگ دوڑ قیصر نرما، قیصر ٹروجن، قیصر ہیڈرین اور دوانطونینس جیسے مدبر حکمرانوں کے ہاتھ رہی تھی۔مارکس انطونی کی وفات کے بعد ایسے حالات پیش آئے جو رومی سلطنت کے زوال کا باعث بنے۔[1]

سلطنت روما کے زیر حکومت صوبجات میں ہسپانیہ (Spain)، گال یا فرانس، برطانیہ، اٹلی، اطالیہ، ڈینیوب اور ایریا،لائیشیا، نار یکم اور پینونیا،ڈالمیشیا، میزیا اور ڈیشیا، تھریس، مقدونیا اور یونان (جسے اب بھی ترک رومیلیا کا نام دیتے ہیں) ایشیائے کوچک، شام فونیقیا اور فلسطین، مصر،افریقہ، بحرہ روم اور اس کے جزائر" غرض یہ کہ رومی سرحدیں مراکش اور سپین تک پھیل گئیں بعد ازاں رومیوں نے تمام شمال مغربی علاقوں پر اپنا اقتدار جمالیا"[2]

لیکن روما کے اس پھیلاؤ کے دوران مفتوحہ علاقوں مثال کے طور پر سسلی کو رومیوں کی ذاتی ملکیت قرار دے دیا گیا،روم کو امیر بنانے کے لیے اسکی زرخیز مٹی اور محنت کش طبقے کا استحصال کیا گیا درباری امراء اور عوام میں بااثر لوگوں نے اس دولت میں اپنا بڑا حصہ حاصل کیا۔۔۔سلطنت روم پر ولادت مسیح کے وقت قیصر آگسٹس حکمران تھا۔اسی قیصر کے عہد سے سلطنت روما کا آغاز ہوتا ہے۔ پہلی صدی عیسوی تک تقریباً ۱۲ قیصران روم نے حکومت کی۔"[3]

یہ قیصران ہر قسم کی اخلاقی اور مذہبی قیود سے ناآشنائے محض تھے اور عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتے تھے۔قیصران رومہ عام طور پر بت پرست، شگونوں کو ماننے والے، تنگ مزاج اور بے انتہا ظالم تھے۔یہاں تک کہ اپنی ماں کو بھی (نیرونے) قتل کروانے میں کوئی ہرج محسوس نہیں کرتے تھے۔انہیں رعایا کی بہتری سے کوئی سروکار نہیں تھا۔رومی قیصروں نے اپنی وسیع سلطنت میں اپنا اقتدار فوج کے ذریعے قائم کر رکھا تھا اور اس کے لیے انہوں نے بہت سی فوجی چھاؤنیاں قائم کیں اس کے لئے ہر صوبے کا ایک گورنر جنرل مقرر کرتے تھے جو خراج کی خطیر رقمیں عوام سے بالجبر وصول کر کے مرکزی حکومت کو بھیجتے تھے۔یاد رہے قیصران روم کے عہد

---

(۱) اخلاق احمد قادری(مترجم) تاریخ انحطاط وزوال روما (لاہور: بک فورٹ،۲۰۱۷) ص ۳۵

(۲) محمد عاصم بٹ، مختصر تاریخ عالم، ص ۱۴۶

(۳) اخلاق احمد قادری(مترجم) تاریخ قیصران روم(لاہور: بک فورٹ،۲۰۱۴) ص ۱۱-۱۲

ہی میں غلامی اور بردہ فروشی کو فروغ ملا تھا۔ اس کے ساتھ عوام پر بھی بھاری سے بھاری ٹیکس عائد کرتے تھے۔ [۱]

قیصر آگسٹس کے عہد میں دنیائے عرب کو بھی تسخیر کرنے کی کوشش کی گئی لیکن مہم ناکام ہو گئی۔ ۷۰ عیسوی میں ہیکل سلیمانی اور یروشلم کی تباہی کا واقعہ بھی قیصران رومہ کے عہد کا ایک واقعہ ہے۔ رومیوں نے یہودیوں کے متبرک معبد کو محض اس لئے پیوند خاک کر دیا تھا کہ یہودی قیصروں کی مورتیوں کو سجدہ نہیں کرتے تھے۔ پھر اس پر بس نہیں کیا گیا بلکہ ۱۳۲ صدی عیسوی میں یہودیوں کو ان کے وطن سے قیصر روم کے حکم پر ہمیشہ کے لیے نکال دیا گیا۔ [۲]

رومی قیصروں کے عہد میں امیر و غریب، آقا و غلام کی خلیج گہری ہو گئی۔ حکمران طبقے کے افراد دونوں ہاتھوں سے دولت لوٹتے اور پُر تعیش زندگی بسر کرتے۔ انسانوں کے درندوں سے یا دوسرے انسانوں سے جان کے مقابلے ان کی سب سے بڑی تفریح تھی۔ ایسے ہی اعمال کی بدولت مارکس انطونی کی وفات کے بعد اس عظیم الشان سلطنت کا سورج غروب ہو گیا۔

## مسلم عرب ریاست

عالمگیریت کا قدیم تصور تاریخ میں جہاں عظیم یونانی رومی اور ایرانی سلطنتوں اور ان کی توسیع کی صورت میں نظر آتا ہے۔ وہیں یہ عالمگیریت جزیرہ نما عرب میں قائم ہونے والی مسلمانوں کی اسلامی ریاست کی صورت میں بھی جھلک دکھاتا ہے جس نے نہایت قلیل وقت میں دنیا کے ایک بڑے وسیع رقبے کو اپنی حدود میں شامل کر کے جریدہ عالم پر اپنے دائمی نقوش ثبت کر دیے۔ اسلامی ریاست کی بنیاد نبی اکرمؐ کی مدینہ منورہ میں آمد سے رکھی گئی۔ جسکے قریباً آٹھ سال بعد آپؐ نے مکہ کو بغیر لڑے فتح کر لیا اور اپنی وفات تک بقیہ عرب تک مسلم ریاست کو وسیع کر دیا۔

نبی اکرمؐ کے بعد خلیفۃ الرسول حضرت ابو بکر صدیقؓ کے عہد میں بھی فتوحات کا سلسلہ جاری رہا۔ سب سے پہلے جزیرہ نما عرب حضرت خالد کی تلوار کے ذریعے حضرت ابو بکر کی زیر قیادت متحد ہوا۔ حضرت ابو بکر نے ملک شام کی فتح کے لیے جو اسلامی فوج بھیجی اس کی روانگی کے وقت جو ہدایات سپہ سالار کو دیں وہ اسلامی فوج کے لیے ہمیشہ کے لیے دستور العمل بن گئیں اور انہی سے مسلم فوج اور مسلم حکمران دوسروں سے ممیز ہوتے ہیں، حضرت ابو بکر صدیق نے فرمایا:

> ”تم کو دس نصیحتیں کرتا ہوں
>
> ۱۔ خیانت نہ کرنا، ۲۔ جھوٹ نہ بولنا، ۳۔ بد عہدی نہ کرنا، ۴۔ کسی عورت بچے اور بوڑھے کو قتل نہ کرنا، ۵۔ ثمر دار درخت کبھی نہ کاٹنا، ۶۔ کسی آباد جگہ کو ویران نہ کرنا، ۷۔ کھانے کی ضرورت کے سوا بکری، گائے اور اونٹ کبھی ذبح نہ کرنا، ۸۔ مال غنیمت میں خیانت نہ کرنا،

---

(۱) محمد عاصم بٹ، مختصر تاریخ عالم ص ۱۴۸

(۲) اخلاق احمد قادری، تاریخ قیصران روم، ص ۱۲

۹۔ بزدلی نہ دکھانا، ۱۰۔ جب کھانا تمھارے سامنے آئے تو اللہ کا نام لے کر کھانا۔"[۱]

یہ بات قابل ذکر ہے کہ مسلم فوج کے علاوہ اور کسی قوم نے اپنے مفتوح دشمنوں سے اس طرح کا حسن سلوک نہیں کیا۔ حضرت ابو بکرؓ کے عہد میں کئی فتوحات ہوئیں جن میں اجنادین اور یرموک کی فتح اہم ہے۔ جنگ یرموک دنیا کی فیصلہ کن جنگوں میں سے ایک ہے۔ یہ حضرت خالد بن ولید کی عظیم فتح تھی یہ جنگ حضرت ابو بکر کے عہد خلافت میں ہوئی۔ حضرت ابو بکرؓ کی وفات کے بعد حضرت عمر فاروق کا دور شروع ہوا۔ یہ دور اس لحاظ سے قابل ذکر ہے کہ اس میں بصرہ، دمشق اور بیت المقدس کی فتح عمل میں آئی۔ شام کے ساتھ ساتھ اسی دور میں سرزمین مصر اسلامی سلطنت کے زیر نگیں آ گیا، اس کے علاوہ ایرانیوں نے مغربی محاذ پر مسلمانوں کو مصروف پا کر پیش قدمی کی دو بڑے کے معرکے ہوئے۔ ایک جنگ قادسیہ دوسری جنگ نہاوند۔ قادسیہ میں ایرانی سپہ سالار رستم مارا گیا مسلمان ایرانیوں کے دار الحکومت مدائن جا پہنچے، اس کے قریباً چار سال بعد جنگ نہاوند پیش آئی۔ اس جنگ میں بھی فتح مسلمانوں کے حصے میں آئی اور مسلمان ایرانیوں کے تعاقب میں ہمدان جا پہنچے، آخری ساسانی بادشاہ یزدگرد فرار ہو گیا۔ پورے ایران پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا اور مسلمانوں کی سلطنت کی حدود سندھ تک آن پہنچی۔ حضرت عمرؓ نے عدل وانصاف اور حسن انتظام جس خوبی سے قائم کیا اس کی مثال نہیں ملتی۔ ان کا یہ قول اسلامی ریاست کو دیگر ریاستوں سے ممیز کرتا ہے۔

" اگر دریائے فرات کے کنارے کوئی کتا بھی بھوکا مر جائے تو میں جواب دہ ہوں گا۔" [۲]

حضرت عثمان تیسرے خلیفہ راشد تھے۔ ان کے دورِ حکومت میں بھی اسلامی فتوحات کا سیل رواں آگے بڑھتا گیا مشرق کی طرف سے ترکوں کی دخل اندازی کو روکنے کے لیے اسلامی لشکر آگے بڑھا اور بلخ پر قبضہ کر لیا۔ ہرات، کابل اور غزنی مسلمانوں کے زیر تسلط آ گئے۔ کرمان سیستان کے ساتھ ساتھ اسلامی فوج بحیرہ اسود تک ایشیائے کوچک پر چھا گئیں۔ افریقہ میں طرابلس اور برکہ فتح ہو گئے، حضرت عمر اور حضرت عثمان نے مفتوحہ علاقوں میں متعدد ترقیاتی کام کرائے۔ آب رسانی کا انتظام بہتر بنانے کے لیے نئی نہریں کھودی گئیں، پھل دار درخت لگائے گئے۔ تجارتی قافلوں کی حفاظت کے لیے جگہ جگہ پولیس چوکیاں قائم کی گئیں۔ تجارت کو فروغ حاصل ہوا تو ہر طرف خوشحالی اور فارغ البالی کے آثار نمایاں ہو گئے۔ فتوحات یہ سلسلہ حضرت امیر معاویہ کے دور میں اسی طرح جاری وساری رہا۔ "امیر معاویہ کے زمانے میں طور خم عبور کر کے درہ خیبر کے رستے ہندوستان پر یلغار کی گئی دوسرا حملہ بلوچستان کے شہر قیقان (قلات کے قریب) پر ہوا۔ قندھار فتح ہوا، ترکستان میں پیش قدمی ہوئی۔ شمالی افریقہ کے ممالک تیونس، الجیریا اور مراکش امیر معاویہؓ کے عہد میں فتح ہوئے اور امیر معاویہ کے عہد میں عقبہ بن نافع نے مغربی افریقہ کی آخری سرحد تک پہنچ کر بحر ظلمات (اٹلانٹک) میں گھوڑا ڈال دیا

(۱) جمیل یوسف، *مسلمانوں کی تاریخ ایک جائزہ* (اسلام آباد: کتاب گھر، ۲۰۰۵ء)ص ۳۹

(۲) حوالہ بالا، ص ۴۵

دشت تو دشت، صحرا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحر ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے

اموی خلیفہ عبدلملک بن مروان کے عہد تک ایران میں دفتری کام فارسی میں اور شام و مصر میں یونانی زبان میں ہوتا تھا۔عبدالملک نے حکم دیا کہ سب دفتری کام عربی زبان میں ہوگا۔[۱]

یہ عالمگیریت کا لسانی پہلو ہے کہ غالب اقوام اپنی زبان کو مفتوحہ علاقوں میں رائج کرنے کی کوشش کیا کرتی ہیں۔آج غالب مغربی اقوام کی زبان انگریزی ہے لہٰذا انگریزی زبان کو ذرائع ابلاغ کے ذریعے دنیا پر مسلط کرنے کی کاوشیں جاری ہیں۔کیونکہ زبان محض کچھ مخصوص علامات اور ان سے منسلک مفاہیم کا نام نہیں بلکہ یہ ثقافتی پیداوار ہونے کی بنا پر ثقافتی اقدار ورسومات اور اس ثقافت سے وابستہ تصورات کو بھی ساتھ لاتی ہے۔اور مقامی ثقافتوں کے وجود کو خطرے سے دوچار کرتی ہے۔

History of Arabs تاریخ عرب کے مصنف فلپ کے حتی کے مطابق ولید اور ہشام کے دور حکومت میں اسلامی سلطنت نے زیادہ سے زیادہ وسعت پائی جس کی حدود بحر اوقیانوس اور پائرینیز سے لے کر دریائے سندھ اور چین کی حدود تک پھیلی ہوئی تھیں۔ قدیم دور میں اتنی وسعت کی بہ مشکل ہی کوئی مثال ملتی ہے اور جدید دور میں صرف برطانوی اور روسی سلطنتیں اس کی ہم سری کرتی ہیں ۔اسی شان دار دور میں ہی ورائے جیحون کو مطیع کیا گیا۔شمالی افریقہ کی تسخیر نو اور صلح کاری ہوئی اور عربوں کے قبضے میں آنے والے سب سے بڑے یورپی ملک سپین کو حاصل کیا گیا۔[۲]

اس بے مثال دور میں ایک طرف قتیبہ بن مسلم نے بلخ، بخارا، سمرقند، خوارزم اور فرغانہ فتح کیے۔مشرق میں اسلامی سلطنت کی حدود چین کی سرحدوں تک بڑھادیں، مغرب کی جانب قسطنطینہ پر حملہ کیا۔طرسوس اور انطاکیہ فتح ہوئے۔میوروقہ سارڈینیا فتح ہو گئے۔اس کے ساتھ ساتھ محمد بن قاسم نے نیرون اور ملتان تک علاقہ فتح کرلیا، افریقہ میں عقبہ بن نافع نے مغربی افریقہ کی آخری سرحد تک پہنچ کر گھوڑا بحر ظلمات میں ڈال دیا۔

لیکن اس دور میں عوام کی فلاح و بہبود کو بھی فوقیت دی گئی۔جس طرح مسلمان حکمرانوں نے اپنی رعایا کا بلا تفریق مذہب خیال رکھا تاریخ انسانی ایسی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔اور ایسا صرف خلفائے راشدین کے دور سے مخصوص نہ تھا، بعد میں آنے والوں نے ان سنہری اصولوں کی پاسداری کی۔

> ”ولید نے بھیک مانگنے کی ممانعت کر دی۔تمام ضرورت مندوں کے لیے روزینے مقرر کیے۔
> یتیموں کی کفالت کا انتظام کیا۔ایسے آدمی مقرر کیے جن کا کام صرف یہ تھا کہ جہاں کسی

---

(۱) جمیل یوسف، *مسلمانوں کی تاریخ ایک جائزہ* ، ص ۳۹

(۲) یاسر جواد(مترجم)، *تاریخ عرب* (لاہور: الفیصل ناشران، ۲۰۱۵) ص ۱۸۳

اندھے یا اپاہج کو دیکھیں ان کی مدد کریں اور جہاں انہوں نے جانا ہو وہاں پہنچا دیں۔"[۱]
اور یہ طرز عمل کسی ایک مسلم حکمران تک محدود نہ تھا بعد کے مسلمان حکمرانوں نے فلاح و بہبود کے ان کاموں کو بغیر کسی مذہبی تفریق کے جاری رکھا۔

"حضرت عمر بن عبدلعزیز نے جاگیر داری ختم کرنے کے لیے جاگیریں بحق سرکار ضبط کر لیں۔ اپنے پاس لباس کا ایک جوڑا رہنے دیا جسے دھو دھو کر پہنتے تھے۔ عوام اتنے خوشحال ہو گئے کہ صدقہ اور زکوۃ لینے والا بھی کوئی نہ رہا۔ سب محتاجوں معذوروں کے وظیفے اور روزینے مقرر کر دیئے۔"[۲]

پیغمبر اسلام حضرت محمدؐ کے بعد سو برسوں میں عرب اس سلطنت کے مالک بن گئے جو رومی سلطنت کے دور عروج سے بھی زیادہ وسیع و عریض تھی۔ اندلس سے لے کر دریائے سندھ تک، چین اور بحیرہ خوارزم سے دریائے نیل تک اسلامی پرچم لہراتا تھا۔

اموی خلافت کے بعد عباسی خلافت ۷۴۹ء میں قائم ہوئی اور قریباً پانچ سو برس تک قائم رہی۔ پہلا عباسی خلیفہ ابو العباس عبداللہ بن محمد سفاح تھا، عباسی دور میں بغداد شہر کی بنیاد رکھی گئی۔ عباسی دور میں ہارون الرشید اور اس کا بیٹا مامون الرشید سب سے بڑے حکمران تھے۔ ہارون کے دور میں رومیوں سے جنگوں میں رومیوں کو شکست دی۔ مامون علم و فضل، تدبر و سیادت، عدل و انصاف، شجاعت و سخاوت میں باکمال اور بے مثل تھا، یونانی کتابوں کے ترجموں کا سلسلہ خلیفہ منصور کے عہد میں شروع ہوا، مامون کے عہد میں یہ کام کمال کو پہنچا۔ دارالترجمہ میں سنسکرت کی علمی کتابوں کے ترجمے بھی ہوئے۔ مسلمان سائنس طب، فلکیات اور ریاضیات میں دنیا کے امام بن گئے۔ عباسیوں کے دور میں سسلی سمیت کئی فتوحات ہوئیں لیکن اسی دور میں غزنوی، سلجوقی اور فاطمی خاندانوں نے اپنی اپنی حکومتیں قائم کر لیں۔ محمود غزنوی ۹۹۹ میں تخت نشین ہوا، اس نے ہندوستان پر پے در پے ۱۷ حملے کیے قنوج، کالنجر، گوالیار، متھرا، گجرات، سومنات، کاٹھیاوار اس کی زد میں آئے۔ اس کے عہد میں غزنی کا شمار دنیا کے بڑے شہروں ہوتا تھا، فردوسی، عنصری، البیرونی اسی کے دربار سے منسلک تھے۔ سارے ایران، جرجان، خوارزم، طبرستان، اصفہان اور ہمدان پر اس کا قبضہ تھا۔

ایران میں سلجوقی سلطنت شوکت و حشمت، جاہ و جلال اور وسعت میں بے مثال تھی۔ چھبیسویں عباسی خلیفہ قائم بامر اللہ کے زمانے میں یہ سلطنت قائم ہوئی اور چونتسویں خلیفہ ناصر الدین اللہ کے زمانے میں اس کا اقتدار ختم ہوا۔ اس کے مشہور سلطانوں میں طغرل، الپ ارسلان اور ملک شاہ شامل ہیں۔ آخری عباسی خلیفہ معتصم باللہ تاتاریوں کے ہاتھ قتل ہوا۔ چنگیز خان کے پوتے ہلاکو خان نے بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ بغداد میں تو عباسی خلافت ختم ہو گئی لیکن ظاہر بامر اللہ کا ایک بیٹا مصر پہنچ گیا۔ وہاں کے مملوک سلطان نے اس کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ مصر میں خلافت کا یہ سلسلہ مزید ڈھائی سو سال چلتا رہا۔

---

(۱) جمیل یوسف، *مسلمانوں کی تاریخ۔۔ایک جائزہ*، ص ۷۰

(۲) ایضاً، ص ۷۳

عباسیوں کے عہد میں مختلف علوم وفنون اپنے اپنے اوج کمال کو پہنچے تفسیر، حدیث، فقہ، تاریخ، جغرافیہ، طب، ادب اخلاق، ہر موضوع پر بہتر سے بہتر عالم اور بہتر سے بہتر کتابیں موجود تھیں۔ طب میں ابو بکر رازی اور بو علی سینا، فلسفے میں کندی اور فارابی، ریاضیات میں الخوارزمی (جس کا نام لاگر تھم کی شکل میں زندہ ہے لاگر تھم الخوارزمی کا ہی بگاڑ ہے) البیرونی، عمر خیام۔ تفسیر و تاریخ میں ابو جعفر، محمد بن جریر الطبری اور مسعودی۔ ادب و شعر میں جن لوگوں نے اختیار حاصل کیا ان کا کچھ شمار نہیں، سعدی، حافظ، خیام، فردوسی بے شمار بڑے بڑے نام اسی عہد سے متعلق ہیں۔ حدیث کی چھ مشہور کتابیں (صحاح ستہ اسی عہد میں مرتب ہوئیں) اسلامی فقہ کے چاروں بڑے امام بھی عباسیوں کے عہد میں گزرے ہیں۔ سوڈیڑھ سو برس ہی میں عربی زبان اتنی پھیل گئی کہ عرب سے باہر سمرقند، بخارا، مرو، غزنی، اصفہان، شیراز، رے اور ہمدان میں عربی کے ہزاروں عالم ملتے تھے۔ سامانیوں، غزنویوں اور سلجوقیوں کے زمانے میں فارسی شعر وادب نے بھی غیر معمولی ترقی کی۔ (۱)

یورپ کے مغربی پھاٹک، آئیبریائی جزیرہ نما میں مسلم فوجی مہم عربوں کی بڑی عسکری کارروائیوں میں آخری اور نہایت ڈرامائی تھی۔ اس نے مسلمانوں کی افریقی یورپی توسیع کے نقطۂ عروج کی نشاندہی کی بالکل اسی طرح جیسے ترکستان کی تسخیر ایشیائی مصری توسیع کا نقطہ عروج تھی۔

عالمگیریت کی اس قدیم شکل کا اطلاق لشکر کشی کے ذریعے ممکن ہوتا تھا۔ اس کے لئے بڑی بڑی فوجیں، آلات حرب ضروری تھے۔ پھر دور دراز کے ملکوں تک سالوں اور مہینوں سفر کر کے پہنچا جاتا تھا۔ جنگ کی صورت میں انسانی جانوں کا ضیاع معمول کی بات تھا۔ اس طرح کثیر وسائل خرچ کر کے اور افرادی قوت کا استعمال کر کے مقصد حاصل کیا جاتا تھا۔ سائنس کی ترقی کے ساتھ ساتھ نئی نئی ایجادات نے جہاں انسانی زندگی کو سہل بنایا وہیں عالمگیریت کی شکل بھی تبدیل ہوگئی۔ جدید ٹیکنالوجی نے فاصلوں کو سمیٹ دیا۔ سفر کو آسان اور وقت کی کفایت کو ممکن بنادیا۔ اب عالمگیریت کی نئی شکل سامنے آئی۔ بہت بڑی فوج اور دور دراز علاقوں کا سفر کرنے کی ضرورت نہ رہی۔ اس جدید عالمگیریت کے ہتھیار بھی تبدیل ہو گئے۔ طاقتور اور جدید ذرائع ابلاغ کے دوش پر سوار اس جدید عالمگیریت کو موثر اور منظم کرنے والوں کے لئے دنیا کے دور دراز علاقوں تک رسائی حاصل کرنا، افراد کی ذہن سازی کرنا اور اپنی مصنوعات کے طلب پیدا کرنا اور دیگر اقوام کے زیادہ سے زیادہ وسائل کو چھین لینا انتہائی قلیل وقت میں اور کم خرچ کے ساتھ ممکن ہو گیا۔ عالمگیریت کے اس جدید تصور کو سمجھنا از حد ضروری ہے کیونکہ اسے بجا طور پر تہذیبوں کے مابین کشمکش کا نام دیا گیا جس نے کمزور اقوام کے ثقافتی تشخص کو حقیقی خطرات سے دوچار کر دیا ہے۔ آزاد تجارت کے نام پر ترقی پذیر ممالک کے سرمائے کا رخ ترقی یافتہ ممالک کی جانب موڑ دیا گیا ہے۔ اس لئے عالمگیریت کی پیش کردہ صورتحال کو سمجھنا اشد ضروری ہے۔

(۱) جمیل یوسف، مسلمانوں کی تاریخ۔۔ایک جائزہ، ص ۹۲

# عالمگیریت کا جدید تصور

عالمگیریت کا تصور اگرچہ تاریخ میں قدیم دور سے ہی موجود ہے (جیسا کہ پہلے مختلف سلطنتوں کے حوالے سے بیان کیا جاچکا ہے) لیکن زمانہ قدیم میں وسائل کی محدودیت کی وجہ سے اقوام عالم کے درمیان تعلقات میں اتنی وسعت نہ تھی۔ لیکن موجودہ دور میں انٹرنیٹ، انفارمیشن ٹیکنالوجی، ذرائع نقل و حمل کی برق رفتاری نے انسان کو اس قابل بنا دیا ہے کہ وہ دنیا کے کسی بھی کونے میں رونما ہونے والے واقعے یا آنے والی تبدیلی کی معلومات پلک جھپکنے میں حاصل کر سکتا ہے۔ دنیا کے مختلف خطوں کے مابین فاصلے سمیٹ چکے ہیں اور مزید سمٹ رہے ہیں۔ کہا جاسکتا ہے عالمگیریت کا یہ تصور تو موجود تھا، لیکن اس کی نوعیت کسی قدر مختلف تھی،۔ اس تصور کو مہمیز بیسویں صدی میں ہونے والی ایجادات اور ترقیات کی بدولت ملی۔

اس جدید طرز کی عالمگیریت کے آغاز و ارتقاء کے حوالے سے محققین، معاشیات دانوں، سیاسی مفکرین کے ہاں مختلف نقطہ ہائے نظر میں ہیں

تھامس ایل فریڈمین Thomas L. Friedman اپنی کتاب (The world is Flat) میں عالمگیریت کے تین ادوار بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں

> The first era, which he names as globalization1.0 is all about "countries and muscles" and lasted from 1492. When Columbus set sail, opening trade between the old world and new world, until around 1800. (1) According the second great era, globalization 2.0 lasted roughly from 1800 to 2000, interrupted by the great depression and world wars 1 and 2 (2). here the main dynamism for pushing the global integration forward is considered multinational companies. Globalization 3.0 starts from2000.
> Globalization 2.0 is shrinking the world from a size small to a size tiny and flattening the playing field at the same time .And while the dynamic force in globalization 1.0 was countries globalizing and dynamic force in globalization 2.0 was companies globalizing, the dynamic force in globalization 3.0 is the force that gives it its unique character is the new found power for individuals to collaborate and compete globally[(1)]

تھامس فرائیڈمین عالمگیریت کے تین ادوار بیان کرتے ہیں پہلے دور کو عالمگیریت countries and muscles کا نام دیتے ہیں ۱۴۹۲ میں جب کولمبس بحری سفر پر روانہ ہوا تھا اور قدیم جدید دنیا کے درمیان تجارت کا آغاز ہوا۔ یہ دور اس وقت سے لے کر قریباً ۱۸۰۰ تک محیط ہے۔ دوسرے دور کو وہ عالمگیریت ۲ کا نام دیتے ہیں جو ۱۸۰۰ سے ۲۰۰۰ تک کا عرصہ ہے۔ یہ دور جنگ عظیم اول اور دوم اور ان کے نتیجے میں جنم لینے والے ڈپریشن سے متاثر ہوا۔ یہاں عالمی انضمام کو بڑھاوا دینے والی قوت محرکہ کثیر القومی کمپنیاں

(1) Friedman, Thomas L. *The world is Flat* (London: Pengiun Books. 2006) p 9

ہیں۔عالمگیریت ۳کا آغاز ۲۰۰۰ءسے ہوتا ہے۔

ان کے مطابق عالمگیریت ۳ میں دنیا مختصر سائز سے ننھے بونے سائز میں سکڑ رہی ہے۔ساتھ ہی ساتھ میدان عمل کو چپٹا کر رہی ہے۔عالمگیریت ۱ میں قوت محرکہ ملک تھے جو عالمگیریت کو روبہ عمل لا رہے تھے۔عالم گیریت ۲ میں یہی کردار کمپنیاں ادا کر رہی تھیں۔عالم گیریت ۳ کو جو قوت منفرد بنا رہی ہے۔افراد کی مل کر کام کرنے اور عالمی مسابقت کے لئے نو دریافت شدہ طاقت ہے۔۔۔

ریچل سنگھ ( Racheal Sing ) اپنی کتاب Globalization, law and the states میں جین برنارڈ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> There is much debate as to whether the globalization were currently witnessing is an unprecedented phenomenon. Some argue that the world witnessed a similar trend during the Renaissance; others associate it instead-----even cumulatively--- with the birth of capitalism in the nineteenth century ,still others make the same assertion about ancient times …..Nevertheless an examination of these alternative views shows us that although history provides example of earlier periods in which, for instance, trade opened up ,setting the foundations of what we know today , the current realities are of a particular intensity and nature while arguing that the world experienced wide range globalization in the nineteenth century.CA Bayly concedes that current globalization present three unique characteristics it is polycentric; the nation state has weekend while the markets have grown more powerful and the digital revolution has been such that the world's trans activity is now without parallel in its scale and dimension. (1)

جین برنارڈ ابی (Jean Bernard Auby) بھی عالمگیریت کے آغاز کے حوالے سے جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ دنیا نے عالمگیریت جیسا تجربہ نشاۃ ثانیہ کے دور میں بھی کیا تھا۔جبکہ کچھ دیگر کا خیال ہے کہ عالمگیریت کا آغاز انیسویں صدی میں سرمایہ داری کے جنم کے ساتھ ہوا۔کچھ لوگ عالمگیریت کی قدیم دور میں موجودگی کا دعویٰ کرتے ہیں۔

سب دلائل کا تجزیہ کرتے ہوئے برنارڈ کہتے ہیں کہ اگرچہ تاریخ کے ابتدائی ادوار میں ایسی مثالیں موجود ہیں۔مثال کے طور پر جب تجارت آزاد ہو گئی۔لیکن آج موجودہ حقائق ایک خاص شدت اور نوعیت کے حامل ہیں سی اے بائل یہ کہتے ہوئے کہ انیسویں صدی میں دنیا نے ایک Wide range عالمگیریت کا تجربہ کیا، کہتے ہیں کہ موجودہ عالمگیریت تین منفرد خصائص پیش کرتی ہے۔یہ

---

(1) Rachael Singh(trans),*Globalization, Law and the state*,(Oxford: Hart Publishing,2017) ,5

کثیر المرکز ہے، قومی ریاستیں کمزور ہوئی ہیں جبکہ مارکیٹیں زیادہ طاقتور ہو گئی ہیں اور ڈیجیٹل انقلاب اس درجے کا ہے کہ دنیا اس کی مثال پیش نہیں کر سکتی۔

کچھ محققین عالمگیریت کا آغاز پندرہویں صدی عیسوی میں تحریک احیائے علوم سے کرتے ہیں جب یورپ میں تجارت اور مواصلات کے میدان میں ترقی کا سلسلہ شروع ہوا، کیونکہ عالمگیریت کا بنیادی عنصر سامان تجارت، خدمات، سرمایہ افکار وخیالات کا تبادلہ ہے اور یورپ میں اپنی ترقی کے عمل کے آغاز ہی سے یہ عنصر موجود تھا۔ کولمبس کی امریکہ کی دریافت اور یورپی ممالک کی نو آبادیاتی پالیسی سے اس عمل کو مہمیز ملی اور عالمی سطح پر تجارت، ہجرت اور باہمی روابط میں وسعت آئی۔ اس دور میں مشرق سے مغرب کی طرف انسانوں اور جانوروں اور خوراک اور دیگر اشیا کے تبادلے ہوئے۔ ملٹی نیشنل کمپنیاں جو آج عالمگیریت میں کلیدی کردار ادا کر رہی ہیں ان کا آغاز سترہویں صدی عیسوی میں ہوا۔ ۱۶۰۰ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا قیام عمل میں آیا اس کے دو سال بعد یعنی ۱۶۰۲ میں ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی وجود میں آئی۔ لیکن رفتہ رفتہ برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی دنیا کی سب سے بڑی کمپنی بن گئی۔

ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی تو دو سو سال بعد زوال پذیر ہو گئی لیکن برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان کا رخ کر لیا، یہ دور عالمگیریت کے حوالے سے بہت اہم تھا، اٹھارہویں صدی میں آنے والے صنعتی انقلاب نے نہ صرف یورپ بلکہ پوری دنیا کو متاثر کیا، صنعتی انقلاب کی بدولت یورپ اپنی سست رفتار زراعتی اقتصادیات سے نکل کر عالمی منڈیوں اور سامراج کے دور میں داخل ہوا۔ ۱۸۱۵ میں واٹرلو (Water loo) کے مقام پر برطانیہ کے ہاتھوں نپولین کی شکست کے بعد برطانیہ ایک بہت بڑی عالمی طاقت بن گیا۔ اگلی صدی تمام دنیا پر برطانیہ کی بادشاہت کی صدی تھی، اس عرصے میں عالمگیریت کی شکل استعماری تھی۔ انیسویں صدی میں یورپی افراد کی بہت بڑی تعداد تقریباً ۷۰ ملین افراد یورپین نو آبادیات اور امریکہ کی طرف نقل مکانی کر گئے، جنگ عظیم اول و دوم اور اس کے نتیجے میں جنم لینے والے گریٹ ڈپریشن سے عالمگیریت کا پہلا دور اختتام پذیر ہو گیا کیونکہ ان جنگوں کی وجہ سے برطانیہ کے تمام ذخائر اور سرمایہ امریکہ کو منتقل ہو گیا۔ بیسویں صدی کے دوسرے عشرے میں روس میں اشتراکی انقلاب آیا تو تمام وسائل قومی تحویل میں لے لیے گئے۔ اس طرح اشتراکی سوویت یونین منظر عام پر آیا اور دنیا دو قطبین میں منقسم ہو گئی۔

لوئی ہیبرون (Lui Hebron) اپنی کتاب میں عالمگیریت کے آغاز و ارتقا کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"Globalization therefore is process that has ancient roots.

Globalization may appear new and threatening because of the uncertainty that accompanies many changes throughout the global system. But globalization is the further development of the processes initiated over many centuries, reflected in the trade expansion, exploration, conquest, migration, colonization, evangelization and so on that have taken place throughout the world history. The silk trade is an example of an early form of

> globalization because its impact was felt across continents and had a powerful economic effect…. The expansion of trade routes and the movement of people of Mongolia illustrate the transforming by products of globalization in European history------ the introduction of bubonic plague for example. Pandemics have accompanied the movement of people throughout the history. The effects of the plague were far reaching , transforming the economic ,cultural and sociological structures of medieval Europe. The age of discovery in fifteenth century was followed by the establishment of European empires across the world." (1)

عالمگیریت ایک ایسا عمل ہے جس کی جڑیں قدیم ہیں۔عالمگیریت بظاہر نئ محسوس ہوتی ہے اور عالمگیر نظام میں ہونے والی تبدیلیوں کے باعث خوفزدہ کرنے والی بھی، لیکن عالمگیریت کئ صدیاں پہلے شروع ہونے والے عوامل کی پیشرفت ہے۔ جو تجارتی پھیلاؤ، مہمات، فتوحات ہجرت، نو آبادیات، عیسائیت کی تبلیغ اور اسی طرح کے دوسرے عمل جو دنیا کی تاریخ میں رونما ہوتے ہیں۔

ریشم کی تجارت عالمگیریت کی ابتدائی صورت کی ایک مثال ہے کیونکہ اس کے اثرات بین البراعظمی طور پر محسوس کیے گئے اور اسکا ایک طاقتور معاشی اثر تھا۔

تجارتی راستوں کی وسعت اور منگولیا کے لوگوں کو نقل مکانی یورپی تاریخ میں عالمگیریت (ضمنی پیداوار کے طور پر) کی تصویر کشی کرتی ہیں۔اسی طرح مثال کے طور پر گلٹی دار طاعون کی موجودگی بھی عالمگیریت کی مثال ہے۔۔۔وبائیں پوری انسانی تاریخ میں لوگوں کی نقل مکانی کے ساتھ منتقل ہوتی رہی ہیں۔ طاعون کے اثرات دوررس تھے قرون وسطیٰ کے یورپ کے معاشی، ثقافتی اور سماجی اداروں کو تبدیل کرنے والے۔ پندرہویں صدی میں دریافتوں کے دور میں دنیا بھر میں یورپی سلطنتوں کا قیام ہوا۔عالمگیریت کی ضمنی پیداوار وبائی امراض تھے جس کا نتیجہ امریکہ، افریقہ اور ایشیا میں لاکھوں لوگوں کی موت کی صورت میں نکلا۔

Global pandemics throughout history are a fundamental manifestation of globalization. During the worldwide outbreak of the so called "Spanish flu", it was brought to the united states by soldiers returning from world war 1, resulting in the deaths of ten millions of people around the world, Evangelization too has been a crucial dimension of globalization as a seen in the expansion of ottoman empire into Europe, in Spain and central Europe during the twelfth and thirteen centuries. The current spread of Islam in Africa and Asia is but the latest version of globalization assisted by twenty first century transportation, travel and media networks.(2)

(1) Lui Hebron ,*Globalization* :*Debunking the Myth* (Noida:Dorlind Kindersley pvt ltd,2013) p2-3

(2 ) Ibid , p 3

لوئی ہیبرون عالمگیریت کی مثالیں تاریخ سے دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ پوری تاریخ میں عالمی وبائی امراض عالم گیریت کا بنیادی مظہر ہیں مثلاً سپینش فلو (Spanish Flu ) کے دنیا بھر میں پھیلاؤ کے دوران یہ جنگ عظیم اول سے لوٹتے فوجی تھے جو اسے ریاستِ متحدہ امریکہ لے کر آئے۔ جس کا نتیجہ دنیا بھر میں کروڑوں لوگوں کی اموات کی صورت میں نکلا۔ عیسائیت کی تبلیغ بھی عالمگیریت کا ایک لازمی پہلو رہی ہے۔ بارہویں اور تیرھویں صدی کے دوران یورپ، سپین اور وسطی یورپ میں عثمانیہ سلطنت کا پھیلاؤ ہوا۔ تاہم افریقہ اور ایشیا میں اسلام کا موجودہ پھیلاؤ عالمگیریت کا جدید انداز ہے جسے اکیسویں صدی میں نقل و حمل اور ذرائع ابلاغ سے معاونت ملی۔

The middle decades of nineteenth century looked upon a world that was experiencing rapid globalism in the form of speed: the development of steamship travel and the laying of the transatlantic telegraphic cables. over time there was decrease in cost and increase in speed of movement of goods and travels as well as communication making of more interconnection in communication, financial markets and economic systems among other across the globe.(1)

لوئی ہیبرون تاریخ سے مثالیں دینے کے بعد بتاتے ہیں کہ انیسویں صدی کے وسطی عشروں میں دنیا نے رفتار کی صورت میں تیز تر عالمگیریت کا تجربہ کیا۔ یعنی دخانی انجن والے بحری جہاز کی ایجاد اور بین البر اعظمی ٹیلگرافک تاروں کی تنصیب۔ وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ پیداواری لاگت میں کمی اور اشیا کے تبادلے کی رفتار اور سفر میں تیزی آئی۔ اس کے ساتھ ساتھ مواصلات جس نے ابلاغ معاشی منڈیوں اور دنیا بھر میں معاشی نظاموں کے مابین روابط کو بڑھایا۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد لیگ آف نیشنز( League of nations) کا قیام بین الاقوامی ادارے کے طور پر عمل میں آیا۔ لیگ آف نیشنز کے پس پردہ صیہونی دانشوروں کا عالمی حکومت کا تخیل کار فرما تھا لیکن امریکی سینٹ نے اسے مسترد کر دیا اور اس طرح یہ منصوبہ عملی شکل میں آنے سے پہلے ہی ناکام ہو گیا اگرچہ امریکہ لیگ آف نیشنز کا ممبر نہیں بنا لیکن اس ادارہ کا وجود بہر حال برائے نام باقی رہا۔(۲)

دوسری جنگ عظیم میں یورپیوں اور جاپانیوں نے جو اپنے وقت کی بڑی سرمایہ دارانہ قوتیں تھیں شکست کھائی اور لاکھوں جانیں ضائع ہوئیں۔ اس جنگ کے بعد امریکہ کو نہ صرف اپنی حیثیت کا احساس ہوا بلکہ وہ اپنے مفاد کے تحفظ کے لیے بھی پوری طرح تیار ہو چکا تھا۔ جنگ عظیم دوم سے پہلے یورپ کے پاس جو مقام صدارت تھا وہ امریکہ منتقل ہو گیا لیکن اس وقت اس کے حریف کے طور پر سوویت یونین بھی سپر پاور کی صورت میں موجود تھا۔ امریکہ جمہوریت، آزاد منڈی کی معیشت اور سرمایہ دارانہ نظام کا بڑا حامی تھا۔ دوسری طرف سوویت یونین نے مارکسی اشتراکی نظریات کو دنیا کے سامنے ورلڈ آرڈر کے طور پر پیش کیا۔

۱۹۴۴ میں بر ٹین ووڈ( Bretton Wood) میں ہونے والے معاہدے میں ایک نئے عالمی مالیاتی نظام کی بنیاد رکھی گئی اور اس

---

(2) Lui Hebron ,*Globalization* :*Debunking the Myth* ,p5

(۲) نذر الحفیظ ندوی، *مغربی میڈیا اور اس کے اثرات* (کراچی: مجلس نشریات اسلام، س-ن)، ص ۱۴۵

میں برطانوی پاؤنڈ کی جگہ امریکی ڈالر کو متعارف کرایا گیا۔ برٹین ووڈ کے مقام پر منصوبہ سازوں نے انٹر نیشنل مانیٹری فنڈ(IMF) اور(International Bank for Reconstruction and development (IBRO) قائم کیے جو آج ورلڈ بینک گروپ کا حصہ ہیں اور انہی کی سرپرستی میں عالمگیریت نے اقتصادی میدان میں کامیابی حاصل کی علاوہ ازیں بہت سے سیاسی واقعات نے بھی عالمگیریت کو اس کی موجودہ شکل میں لانے میں اہم کردار ادا کیا۔

روس میں اشتراکی انقلاب اور پہلی اور دوسری عظیم جنگوں کے نتیجے میں برطانیہ کا کنٹرول اپنے مقبوضات پر کمزور ہو گیا اور اقتدار کا مرکز برطانیہ کی بجائے امریکہ بن گیا اس طرح دنیا دو قطبین میں تقسیم ہو گئی۔۱۹۴۴- ۱۹۸۹ کے دوران امریکہ نے اشتراکی روس کو تباہ و برباد کرنے کے لیے ہر حربہ آزمایا۔ ہر اس مطلق العنان حکمران کی حمایت کی گئی جس نے روس کے مقابل امریکہ کا ساتھ دیا۔ روس کو آخری دھچکا افغانستان میں لگا جب روس نے افغانستان پر چڑھائی کر کے اپنی مشکلات میں اضافہ کر لیا۔ اس وقت امریکہ نے مسلح افغان گروپوں کی ہر طرح سے معاونت کرتے ہوئے روس کی بربادی کا سامان کیا اگرچہ افغان مجاہدین نے یہ کام نظریاتی پس منظر میں کیا لیکن اس کی بہت بڑی قیمت انہیں ادا کرنا پڑی۔ ۱۹۸۹ میں سرد جنگ کا خاتمہ ہو گیا، روسی صدر میخائل گورباچوف( Mikhail Gorbachev ) نے کمیونزم کے اقتصادی نظام میں تبدیلی اور تعمیر نو کا اعلان کیا جس کا مطلب سوویت یونین کا سیاسی و اقتصادی زوال تھا ستر سال سے زائد عرصے تک دنیا پر حکمرانی کرنے کے بعد کمیونزم کا سورج سویت یونین میں غروب ہو گیا اور دنیا کی دوسری بڑی طاقت جو سویت یونین کے نام سے جانی جاتی تھی بکھر گئی۔

۱۹۸۹ میں دیوار برلن کے انہدام اور مشرقی اور مغربی جرمنی کے انضمام کے بعد کمیونزم مشرقی یورپ سے بھی رخصت ہو گیا ۔ پھر وارسا پیکٹ کے ممالک کا نیٹو ممالک کے ساتھ انضمام ہوا۔ ان تمام غیر معمولی واقعات کے نتیجے میں وہ سب بلند آہنی دیواریں منہدم ہو گئیں جن کے سایہ میں چین، مشرقی یورپ اور روسی منڈیاں پناہ لیتی تھیں اور افکار و خیالات کا تبادلہ بہت آسان ہو گیا۔

روس کی شکست کے بعد اس کے زیر اثر ممالک پر بھی امریکی اجارہ داری کا آغاز ہوا۔ سویت یونین کی موجودگی میں وہ اتنی کھلی اور من مانی کارروائیاں نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ سیاسی، معاشی، عسکری ہر لحاظ سے سویت یونین کی صورت میں امریکہ کا حریف موجود تھا۔ معاشی لحاظ سے دنیا کے اہم ترین علاقے خلیج فارس میں اسے درپردہ ایران کی حمایت حاصل تھی عراق اس کا بہت بڑا حمایتی تھا۔ اسی طرح بحیرہ قزوین جو اقتصادی نقطہ نظر سے بہت اہمیت کا حاصل تھا مکمل طور پر اشتراکی اتحاد کے زیر اثر تھا، لیکن سویت یونین کے خاتمے کے بعد امریکہ واحد سپر پاور کی صورت میں ابھرا اور اسے تیزی سے اپنا اثر و رسوخ بڑھانے اور بین الاقوامی سطح پر اپنا دائرہ اثر وسیع کرنے کا تاریخی موقع ہاتھ آ گیا۔

چنانچہ اس نے سیاسی و اقتصادی مفادات کے حصول کے لیے اور بین الاقوامی سطح پر اپنا تسلط جمانے کے لیے نیو ورلڈ آرڈر کا اعلان کرتے ہوئے پوری دنیا میں جائز و ناجائز ہتھکنڈوں اور سیاسی، فوجی اقدامات کا سلسلہ وسیع کر دیا ۱۹۹۱ میں خلیجی جنگ کا آغاز ہوا جس کے بہانے امریکہ کو جدید عالمی نظام کی قیادت کا موقع از خود فراہم ہو گیا۔ اور عالمگیریت کے ایک نئے دور کا آغاز ہو۔

تھامس فرائیڈ نے اسے عالمگیریت کے دوسرے راؤنڈ کا نام دیا۔ وہ کہتے ہیں:

> “With the fall of Berlin Wall, it was replaced by another system: the new era of globalization. We are in all call it Globalization Round.”(1)

لیکن یہ عالمگیریت اس عالمگیریت سے مختلف تھی جو انیسویں صدی میں دنیا کو متاثر کر رہی تھی۔ یہ کس لحاظ سے مختلف تھی اس کے متعلق ڈینیل کوہن (Daniel Cohen) اپنی کتاب Globalization and Its Enemies میں لکھتے ہیں۔

> Although it may be tempting to draw a parallel between today's globalization and that of that nineteenth century, there is a fundamental difference that makes such a comparison rather perilous. Today's globalization is "immobile". Merchandise is traded among all parts of the world, but it is only through television, or during a few vacation weeks from rich countries that one encounters other societies. Yesterday's globalization was very different, at least in regard to European populating new lands. The effects of this globalization were not achieved through commodities or images but principally through people who physically---- not--- virtually left one world for another---(2)۔

ڈینیل کوہین کے مطابق آج کی عالمگیریت انیسویں صدی کی عالمگیریت سے بہت مختلف ہے وہ کہتے ہیں کہ فرق بہت بنیادی نوعیت کا ہے۔ جس کی وجہ سے یہ موازنہ ممکن نہیں۔ آج کی عالمگیریت غیر حرکی ہے۔ آج اگرچہ تجارت دنیا بھر میں کی جاتی ہے لیکن یہ صرف ٹی وی کے ذریعے یا پھر چھٹیوں کے ہفتوں کے دوران ہوتا ہے کہ ایک فرد دوسرے معاشروں کے افراد سے ملتا ہے۔ کل کی عالمگیریت بہت مختلف تھی کم از کم یورپین کے نئی زمینوں کی آباکاری والی عالمگیریت سے۔ اس طرح کی عالمگیریت کے اثرات محض تصاویر اور اشیا کے ذریعے حاصل نہیں کیے جاتے تھے بلکہ افراد کے ذریعے جو جسمانی طور پر ایک جگہ دوسری جگہ منتقل ہوتے تھے۔

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو عالمگیریت اپنی ابتدائی شکل میں تو بڑی بڑی قدیم ایمپائرز کی صورت میں نظر آتی ہے۔ وسائل اور منڈیوں پر تسلط یہی دو بنیادی اصول تھے جس کے لئے فوجی مہمات، عسکری فتوحات اور اپنی جغرافیائی حد بندیوں کو وسعت دی جاتی تھی۔ پس منظر میں یہی محرکات تھے۔ اس میں پھر تجارت، نقل مکانی یا فتوحات کی صورت میں دیگر معاشروں اور ثقافتوں کے ساتھ شناسائی کا عمل شروع ہو گیا۔ اس کی نسبتاً جدید شکل پندرھویں اور سولہویں صدی میں نظر آئی جب یورپی ممالک نے عہد دریافت میں

---

(1) Friedman ,Thomas,L. *The Oliver and Lexus Tree*, p 42

(2) Daniel Cohen, *Globalization and its enemies* (Massachusets: Institute of Technology, 2007) , p 27

نامعلوم دنیا بالخصوص کولمبس نے امریکہ کو دریافت کیا۔ اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے والٹر میکولم( Walter Malcolm )نے لکھا ہے

> Globalization caused an enormous increase in the power of the capitalist class because it opened up new markets for it. Indeed, the discovery of America and the opening of navigation routes to Asia established a world market for modern industry"(1).

یعنی عالمگیریت نے سرمایہ دار طبقے کی طاقت میں بے پناہ اضافہ کیا اور اس کے لیے آزاد تجارت یا آزاد منڈیوں کی راہ اپنائی اور امریکہ کی دریافت اور ایشیا کی طرف نئے بحری راستوں کی دیافت نے جدید انڈسٹری کے لیے عالمی منڈی کی بنیاد رکھی۔

صنعتی انقلاب سے پیداوار میں بے پناہ اضافہ ہوا لہذا نئی نئی منڈیوں کی تلاش اور نئے تجارتی رستے دریافت ہوئے۔ نہر سویز اور نہر پانامہ کے ذریعے سمندروں کو ملا کر بحری فاصلوں کو سمیٹا گیا اور دنیا بھر میں مصنوعات کی ترسیل کو ممکن بنایا گیا۔ اسی دور یعنی دور تجارت میں بڑی بڑی تجارتی کمپنیوں یعنی ملٹی نیشنل کمپنیوں کا ظہور ہوا۔ اس ضمن میں ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی اور پھر برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی عالمگیریت کے نقوش اول کی حیثیت رکھتے ہیں۔

"ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی کو ہالینڈ کے سٹیٹ جنرل نے اکیس برس کے لیے ایشیا میں سرگرمیوں کا پروانہ دیا۔ یہ دنیا کی پہلی تجارتی کمپنی تھی جس نے سٹاک جاری کیے اور حکومتی اختیارات کا استعمال کیا۔ جن میں جنگیں لڑنے، جنگی قیدی بنانے، تجارتی اور دفاعی معاہدے کرنے، سکے ڈھالنے اور نوآبادیات قائم کرنے جیسے اختیارات بھی شامل تھے۔"

یہی ملٹی نیشنل کمپنیاں اپنے آغاز سے ہی تجارت کے ساتھ ساتھ سیاست میں بھی دخیل رہی ہیں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی تو سال ہا سال تک برصغیر پر حکومت کرتی رہی ہیں۔ اس حوالے سے سید عظیم لکھتے ہیں: "آج سے ڈھائی صدی پہلے بھی کمپنیاں اسی طرح بادشاہوں کی اتھل پتھل سے مفادات حاصل کرتی رہی ہیں۔ جس طرح آج ملٹی نیشنل کمپنیاں حکومت کے آنے اور جانے سے اپنے مالی مفادات کو تحفظ دیتی رہی ہیں۔"(۲)

انیسویں صدی میں لبرلائیزیشن کو جدید عالمگیریت کا پہلا دور کہا جاتا ہے۔ جس میں بین الاقوامی تجارت اور سرمایہ کاری کا رجحان تیزی سے بڑھا پھر دوسری جنگ عظیم کے بعد بین الاقوامیت (Intenationalism) کی تحریک کے کے زیر اثر ٹیکنالوجی کی برق رفتاری اور تیزی کی بدولت دنیا بھر میں آمدورفت اور رابطے آسان ہو گئے۔ جس سے تجارت کا دائرہ وسیع تر ہو گیا۔ اس وقت آزاد تجارت کے کئی معاہدے ہوئے جنہوں نے عالم گیریت کو پروان چڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس میں مندرجہ ذیل ادارے اور معاہدے شامل تھے۔

GATT (General Agreement on Terrif and Trade)

---

(1) Walter Malcolm, *Globalization* ,p 8

(۲) سید عظیم، *ملٹی نیشنل کمپنیاں* (لاہور: دارالشعور: ۲۰۰۴) ص ۸۲

NAFTA (North America Free Trade Area)

WTO (World Trade Organization)

WB(World Bank)

IMF (International Monitoring Fund)

ان معاہدوں اور اداروں نے آزاد تجارت کو تحفظ فراہم کیا بلکہ نئی نئی منڈیوں تک رسائی کو ممکن بنایا۔

۱۹۸۰ کی دہائی میں رونالڈ ریگن اور برطانیہ کی خاتون وزیر اعظم مار گریٹ تھیچر نے آزاد منڈیوں کا نظام متعارف کروایا۔ جدید عالمگیریت کا نقطہ آغاز اسی کو سمجھنا چاہیے۔ طاقتور حکومتوں نے جدید میڈیا کے ذریعے اس نظریے کی ترویج و اشاعت دنیا بھر میں کی۔ عالمی تجارت کے اس مشترکہ منصوبہ کا مقصد بین الاقوامی تجارت پر اپنی اجارہ داری کی قائم کر کے عالمی منڈیوں پر قبضہ کرنا اور اپنی پیداوار کی تجارت کے ذریعے زر مبادلہ کے ذخائر میں اضافہ کرنا تھا لیکن امریکہ اپنے سرمایہ دارانہ نظام اور اپنی کرنسی کو استحکام دینے کے لیے اس نظام میں تبدیلیاں لاتا رہا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عالمگیریت کا عمل تیز رفتاری سے وقوع پذیر نہیں ہو سکا۔۔۔

اسّی کی دہائی کی تبدیلیوں کی بازگشت ۹۰ء کی دہائی میں بھی جاری رہی، اس دور کی نمایاں خصوصیت ایک دفعہ پھر امریکی ڈالر کی بالادستی کو چیلنج اور قومی بنیادوں پر سرمایہ دارانہ مخاصمت اور گلوبلائزیشن کی طرف بہت تھوڑی پیشرفت ہے۔ (۱)

بہت سے ممالک کے WTO کے ممبر بن جانے سے عالمگیریت کو سرعت سے پھیلنے کا موقع مل گیا۔ مختلف ممالک میں قائم سٹاک ایکسچینج نے بھی عالمگیریت کی ترقی میں اہم کردار ادا کیا کیونکہ ان اسٹاک مارکیٹوں کی وجہ سے جو شخص جہاں بھی اور جتنا بھی سرمایہ تجارت میں لگا رہا ہے اس کا سرمایہ عالمی سطح پر لگ رہا ہے اور عالمگیریت بھی یہی چاہتی ہے کہ سرمایہ کاری کسی ملک میں محدود ہونے کی بجائے عالمی سطح پر ہو تاکہ آزادانہ تجارت کو فروغ مل سکے۔

ان سیاسی اور اقتصادی حالات نے عالمگیریت کو نظریے سے بڑھ کر عملی شکل اور حقیقت کا روپ دیا۔

اس حوالے سے امریکہ کی یہ پالیسی رہی ہے کہ جس چیز کا نفاذ کا کرانا چاہتا ہے۔ سب سے پہلے ذرائع ابلاغ کے ذریعے اس کی تشہیر کی جاتی ہے۔ رائے عامہ ہموار کی جاتی ہے۔ اس کے خلاف رد عمل کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ پھر اس کی روشنی میں امریکہ کو اپنی پالیسیاں بنانے میں مدد ملتی ہے اور اس رد عمل کے لیے میڈیا کو وقف کر دیا جاتا ہے کہ وہ اس نظریے کے لیے رائے عامہ ہموار کرے اور ایسی خبریں رپورٹس اور یہاں تک کہ مطابقت میں ریسرچیز شائع کروائی جاتی ہیں تاکہ عوام اس نظریے کی تائید کرنے پر تیار ہو جائیں۔ عالم گیریت کے سلسلے میں بھی یہی پالیسی اختیار کی گئی۔ عالمگیریت کے نظریے کو عوام میں مقبول کرنے اور اس کے فوائد و ثمرات گنوانے کے لیے مضامین و مقالات لکھوائے گئے ۔ کتابیں تصنیف کروائی گئی اور کانفرنسیں منعقد کروائی گئی اس حوالے سے پہلی کتاب فرانسس فوکو یاما یا نے ۱۹۸۹ میں "The end of History" کے نام سے لکھی۔ اس کتاب میں گلوبلائزیشن کے نظریے کو پوری قوت کے ساتھ پیش کیا گیا۔ اس کتاب کے لکھنے کا اصل مقصد دراصل عوام و خواص کے حلقوں کے رد عمل کا جائزہ لینا تھا۔ کچھ افراد نے

(۱) سید عظیم، ملٹی نیشنل کمپنیاں، ص ۸۶

اس کتاب میں پیش کردہ نظریے کی موافقت کی اور کچھ نے مخالفت کی۔ ۱۹۹۲ میں فرانس فوکویامانے عالمگیریت کے موضوع پر دوسری کتاب *The End Of History and last man* لکھی۔ اس کتاب کا مقصد بھی عالمگیریت کو متعارف کروانااور رائے عامہ کو ہموار کرنا تھا۔

اس کتاب کے علاوہ ہارورڈیونیورسٹی کے پروفیسر اور یہودی مفکر سموئل ہنٹنگٹن(Samuel Huntington)کا ۱۹۹۰ میں موقر امریکی جریدےForeign Policy کے Summer Issue میں ایک مضمونThe Clash of Civilization شائع ہوا۔ اس مضمون کے شائع ہونے کے بعد علمی حلقوں میں ایک طویل بحث چھڑ گئی۔ بعد میں اس مضمون کی افادیت کے پیش نظر نئے اضافوں اور گفتگو کو مزید دلائل سے مزین کرکے اس شہرہ آفاق مضمون کو The Clash of Civilization and the remaking of world order" کے نام سے ۱۹۹۴ میں کتاب کی صورت میں شائع کروایا گیا،اس کتاب کو عالمی سطح پر اتنی ہی شہرت ملی جتنی فوکویاما کی دونوں کتب کو حاصل ہوئی تھی۔ایک طرف رائے عامہ کو ہموار کرنے کی غرض سے اس طرح کی کتب شائع ہو رہی تھیں دوسری طرف امریکی پالیسی ساز عالمگیریت کو حتمی شکل دے رہے تھے۔

اس تمام بحث سے اندازہ ہوتا ہے کہ عالمگیریت نے اچانک جنم نہیں لیا۔بلکہ اس کے پیچھے صدیوں کی تاریخ ہے۔صدیوں کے اس عمل میں اس کے طریقہ کار میں تبدیلی آچکی ہے۔یعنی جو کام عسکری قوت اور اسلحے سے لیا جاتا تھا۔اب وہی کام طاقتور میڈیا اور عالمی اداروں اور ان کے بنائے گئے قوانین کی مدد سے لیا جارہا ہے۔طریقہ کار اگرچہ تبدیل ہوا ہے لیکن پس پردہ مقاصد وہی ہیں دنیا بھر کے وسائل پر اپنا تصرف،ایک خاص طرز حیات،اقدار اور ایک عالمی نظام کا اطلاق۔۹/۱۱ میں امریکہ کے اہم ترین تجارتی مرکز ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور دفاعی ہیڈ کوارٹر پر دہشت گردوں کے حملے نے دنیا کو بہت تیزی سے تبدیل کر دیا۔اس واقعے کے بعد دنیا کے بیشتر ممالک دہشت گردی کے خلاف جنگ کے نام پر امریکہ کے ساتھ شامل ہو چکے ہیں۔

گلوبلائزیشن کے مترادف جو اصطلاحیں استعمال کی جارہی ہیں ان میں امریکنائیزیشن بھی شامل ہے۔یہ اصطلاح دراصل عالمگیریت کے ان پس پردہ مقاصد کی طرف اشارہ کرتی ہے جس کے تحت آج دنیا بھر میں جینز،میکڈونلڈ اور کوک کلچر فروغ پارہاہے۔قومی حکومتوں کا کردار کم کرکے عالمی مالیاتی اداروں کی پالیسیوں کے نفاذ کی راہ ہموار کی جارہی ہے۔آزاد معیشت اور آزاد تجارت کو فروغ دیا جارہا ہے۔

عالمگیریت کی یہ تحریک کثیر الجہت ہے۔اس کا تعلق بیک وقت معیشت،سیاست،ثقافت،زبان وادب سے بھی ہے اور ان سب کا بنیادی موضوع فرد ہے۔لہذا اس تحریک کا بالواسطہ تعلق فرد سے بھی ہے۔یعنی فرد کی اندرونی کیفیات،باطنی دنیا سے

ہے۔ دوسرے لفظوں میں عالم گیریت نے انسان کی نفسیات پر بھی اثرات مرتب کیے ہیں۔ اب عالمگیریت کے ان پہلوؤں کا الگ الگ تعارف و جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

# عالمگیریت: معاشی پہلو

عالمگیریت نے زندگی کے ہر شعبے کو نہ صرف متاثر کیا ہے بلکہ اس کی کایا کلپ کر دی ہے۔ اگرچہ عالمگیریت کا صل میدان اقتصاد ہے لیکن زندگی کے دیگر شعبوں مثلاً سیاست، ثقافت اور مذہب کو اس لیے زیر بحث لایا جاتا ہے تاکہ معاشی برتری کا مقصد حاصل کیا جا سکے۔ زمانہ قدیم سے ہی دولت کی ہوس اور مال و ثروت کی خواہش کے نتیجے میں طاقتور قومیں کمزور قوموں کا استحصال کرتی چلی آرہی ہیں۔ گویا عالمگیریت کا اصل محرک و میدان معاشی ہے۔ مختلف ماہرین معاشیات اور عالمی ادارے عالمگیریت کو معاشی حوالے سے بیان کرتے ہیں. اس ضمن میں انٹرنیشنل مانیٹرنگ فنڈ عالمگیریت کی تعریف ان الفاظ میں کرتا ہے۔

> "Economic globalization is a historical process, the result of human innovation and technological progress. It refers to the increasing integration of economies around the world, particularly through trade and financial flows. The term also refers to movement of the people (labor) and knowledge (technology) across international borders. There are also broader cultural, political and environmental dimensions of globalization."(1)

معاشی عالمگیریت تاریخی عمل ہے جو انسانی جدت اور تکنیکی ترقی کا نتیجہ ہے۔ اس سے مراد دنیا بھر میں معیشتوں کا بڑھتا ہوا انضمام و انحصار ہے خصوصاً تجارت اور سرمائے کے بہاؤ کے ذریعے۔ اس اصطلاح سے مراد افراد اور علم کا بین الاقوامی سرحدوں کے آر پار تبادلہ بھی ہے۔ عالمگیریت کی ثقافتی، ماحولیاتی اور سیاسی جہات بھی ہیں۔

معاشی عالمگیریت کی اہم خصوصیات میں معاشی حدبندیوں کو توڑنا، آزاد تجارت کا فروغ اور ملٹی نیشنل کارپوریشنوں اور بین الاقوامی مالیاتی اداروں کی بڑھتی ہوئی قوت ہے۔ جس سے تمام ممالک متاثر ہوئے ہیں لیکن یہ اثرات یکساں نہیں ہیں۔

عالمگیریت کے علمبرداروں کی طرف سے یہ دلائل دیے جاتے ہیں کہ آزاد تجارت، غیر ملکی سرمایہ کاری اور ملٹی نیشنل کمپنیوں کی وجہ سے تمام ممالک معاشی لحاظ سے خوشحال ہو جائیں گے۔ سب کو ترقی کے یکساں مواقع ملیں گے لیکن عملی طور پر آزاد تجارت اور غیر ملکی سرمایہ کاری کی صورت میں جو عالمگیریت نافذ ہوئی ہے اس نے عالمگیریت کے حمایتیوں کے دعوؤں کی قلعی کھول کر رکھ دی ہے۔

"In economic discourse globalization refers to the progressive networking of national market economies into a single, tightly interconnected global political economy (via advances in communication technology and falling transportation costs ) whose accumulation and

---

(1) Vandana Shajan ,*Globalization and Income inequality* (Hyderabad:Icfaci university press,2010) p 1

distribution of resources are increasingly governed by neoliberal principles-emphasizing the role of market while minimizing government involvement in economic matters.[1]

معاشی عالمگیریت کے حمایتی اکثر اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ "It lifts all boats" یعنی اس کے نتیجے میں ہر ایک آخر کار امیر تر ہو جاتا ہے۔ جبکہ عالمگیریت کے مخالفین کا کہنا ہے۔"It lifts all yatch" کہ اس سے صرف امیروں کو فائدہ پہنچتا ہے اور یہ بات درست ہے کہ معاشی عالمگیریت کا فائدہ امیر طبقات کو پہنچتا ہے اور وہ امیر تر ہو جاتے ہیں۔ اور غریب ممالک اس عالمگیریت کے نتیجے میں مزید غریب ہوتے ہیں، آج کی اس عالمگیر دنیا کی ساخت اور سیاست دونوں کا توازن امیر ممالک کے حق میں ہے۔

جی آر بکمین( G Reg Buckman ) کے مطابق: اگر اس عالمگیر ساخت اور سیاست کو اسی طرح رہنے دیا گیا تو آج کی عالم گیر سپر مارکیٹ اور عالمگیر بینک امیر کو امیر تر بنا دیں گے اور غریب خوفناک نتائج کے ساتھ پیچھے رہ جائیں گے۔[۲]

صنعتی انقلاب کے آغاز نے دنیا کے امیر ممالک اور غریب ممالک کے درمیان دولت کی اس کی خلیج کو گہرا کیا ہے۔ United Nation Development Progarm (UNDP) کے تخمینے کے مطابق دنیا کے امیر ترین اور غریب ترین ممالک میں Per Capita آمدنی کے لحاظ سے فرق ۱۸۲۰ میں ۱:۳، ۱۹۱۳ میں یہ فرق ۱:۱۱ اور ۱۹۵۰ میں یہ فرق ۱:۳۵، ۱۹۷۳ میں یہ فرق ۱:۴۴ اور ۱۹۹۲ میں فرق اس ادارے کی تخمینے کے مطابق ۱ :۷۲ تک پہنچ چکا ہے۔

ہارورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر ایمریطس ڈیوڈ لینڈس( David Landis ) کے مطابق دنیا کے امیر ترین ملک مثال کے طور پر سوئٹر زلینڈ اور غریب ترین ملک مثلاً موزمبیق میں فی کس آمدن کا فرق ۱:۴۰۰ ہے ۲۵۰ سال پہلے یہ فرق امیر اور غریب ترین ممالک کی فی کس آمدن کے درمیان ۱:۵ تھا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس وقت سب امیر تھے بلکہ تقریباً سبھی غریب تھے لیکن اس وقت سے لے کر اب تک صرف کچھ لوگ امیر ہوئے ہیں باقی سب غریب رہ گئے ہیں۔ دنیا میں دولت کی غیر منصفانہ تقسیم کے حوالے جائزہ لیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ غربت میں کمی کا دعویٰ کرنا کتنا سچ ہے۔

دنیا کی آدھی آبادی یعنی تین بلین افراد ڈھائی ڈالر سے کم پر گزارہ کرتے ہیں ۸۰ فیصد لوگ ۱۰ ڈالر سے کم پر گزارہ کرتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ چین کے علاوہ دنیا کے تمام ترقی پذیر ممالک میں گزشتہ دو عشروں میں غربت میں ضافہ ہوا ہے۔ ۶ء۵ بلین آبادی میں ۴۰ فیصد لوگ غربت کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں۔ ۱۹۸۱ میں یہ شرح ۳۶ فی صد تھی۔ دنیا کی آبادی کا چھٹا حصہ یعنی ۸۷۷ بلین افراد انتہائی غربت کی حالت میں ہے۔ یہ شرح ۱۹۸۱ میں ۳فی صد تھی، افریقہ میں ۱۹۸۱ میں یہ ۴۱۔۶ فی صد آبادی شدید غربت کا شکار تھی۔ ۲۰۰۱ میں یہ شرح 46.9 فی صد تک پہنچ گئی۔[۳]

دوسری جنگ عظیم کے بعد ایک بین الاقوامی اقتصادی نظام کی ضرورت محسوس ہوئی اور ورلڈ بینک International

(1) Lui Hebron ,*Globalization: Debunking the Myth*,p 20

(2) G Reg Buckman, *Globalization tame it or scrap it* (Dhaka: the university press 2004) p 08

(3) Joseph Stiglitz ,*Making Globalization Work* (New York :Norton and company,2006) p11

Bank for Reconstruction and development اور International monitory Fund(IMF) جیسے ادارے قائم کئے گئے اور (GAT) (General Agreement on Tariff and Trade جیسے معاہدے ہوئے جس پر ۱۹۴۷ میں سائن کیے گئے۔

ان اداروں اور معاہدوں کا بنیادی مقصد بین الممالک تجارتی رکاوٹوں کو دور کرنا تھا۔ ۱۹۹۴ میں World Trade Organization WTO) پر دستخط کیے گئے۔اس تنظیم کو سب سے زیادہ تنقید کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ یہ معاصر عالمگیریت کا سب سے اہم اظہار تھی اوراس فورم کو ترقی پذیر اور ترقی یافتہ ممالک کے مابین جاری تقسیم کی بنا پر ہدف تنقید بنایا جاتا ہے اور یہ فورم پہلے سے خوشحال ممالک کی حمایت میں جھکاؤ رکھتا ہے۔WTO,GAT کے نتیجے میں تجارت اور سرمائے کی ترسیل میں حائل پابندیوں میں خاطر خواہ کمی آئی ہے۔اور اس طرح کے اقدامات کیے گئے ہیں کہ جو ٹیرف میں کمی یا خاتمے، آزاد تجارتی زون کے قیام اور سرمائے کے کنٹرول میں کمی، مقامی کاروباروں کیلیے سبسڈی کے خاتمے، آمدورفت کے اخراجات میں کمی، جائیداد کے قانون میں ہم آہنگی اور patent کو بین الاقوامی طور پر تسلیم کرنے، ایک عالمی نظام کے قیام اور حقوق نقل واشاعت وغیرہ کے ضمن میں معاون ثابت ہوئے ہیں۔

عالمگیریت کے ناقدین کا کہنا ہے کہ WTO کے اصول جن مفروضات پر مبنی ہیں وہ غیر منصفانہ اور ترقی پذیر ممالک کے حوالے سے متصعبانہ ہیں۔ ان قوانین سے ایک ایسا ایجنڈا ظاہر ہوتا ہے جو کھلے عام غالب کارپوریشنز اور ملٹی نیشنل انٹرپرائیزز کے مفادات کو تحفظ اور بڑھاوا دیتا ہے۔جو پہلے ہی عالمی تجارت کو کنٹرول کررہی ہیں اس حوالے سے نوید احمد طاہر لکھتے ہیں۔

> Besides, many studies of globalization urge that the coperate profits today are based on exploitation of local work forces, rersources, environment, symbols and cultures. Though this kind of exploitation is not an entirely new phenomenon, it is now more widely prevalent ever before. (1)

عالمگیریت کے مطالعات سے ظاہر ہے کہ کارپوریشنز کا منافع مقامی ثقافت،ماحول،وسائل اور مقامی افرادی قوت کے استحصال پر مبنی ہے۔اگرچہ اس قسم کا استحصال کوئی نئی بات نہیں لیکن یہ پہلے سے مقابلے میں زیادہ نمایاں ہے۔بہر حال عالمگیریت کی وجہ سے دنیا کے مختلف ممالک کے درمیان اور ملک کے اندر مختلف طبقات کے درمیان آمدنی میں تفاوت بڑھا ہے۔

اس حوالے سے پیٹر لنڈرف اور ٹیفرے جی ولیم سن( Peter H Lindref and Teffrey G Williamsom) اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

(1) Tahir,Naveed Ahmad, *Globalization Economics, Social and Political Dimensions, Focus on South Asia*( Karachi : Area study center of Europe University of Karachi,2007) p v

The world economy has become more unequal over the last two centuries. Since with in country inequality exihibits no ubiquitous trend ,it follows that vitually all observed rise in world income inequality has been driven by widening gaps within nations .Meanwhile,the world economy has become more globally integrated over the past two centuries.If correlation meant causation ,these facts would imply that globalization has raised inequality between nations….[(1)]

عالمی معیشت گزشتہ دو صدیوں میں زیادہ غیر مساوی ہو چکی ہے۔چوں کہ ملک کے اندر عدم مساوات نے موجودگی کا کوئی نمایاں رجحان ظاہر نہیں کیا۔اور گزشتہ دو صدیوں میں عالمی معیشت زیادہ مربوط ہو گئی ہے۔ان عوامل کا نتیجہ اقوام کے مابین عدم مساوات میں اضافہ ہے۔

(1) Linderf Peter ,*Does Globalization Make the World More Unequal IN Globalization and Income Inequality* (Hyderabad:Icfaci University press,2010) p 28

## مختلف ممالک کی اقتصادی ترقی پر عالمگیریت کا اثر

عالمگیریت کے معاشی اثرات ترقی یافتہ، ترقی پذیر اور پسماندہ ممالک کے حوالے سے مختلف ہیں اور حیران کن بات یہ ہے کہ ۱۹۹۰ میں عالمگیر طور پر GDP کی شرح نمو پچھلی دہائی کے مقابلے میں سست رہی اور یہ وہ دہائی ہے جس میں عالمگیریت کو زیادہ فروغ حاصل ہوا۔

(1)
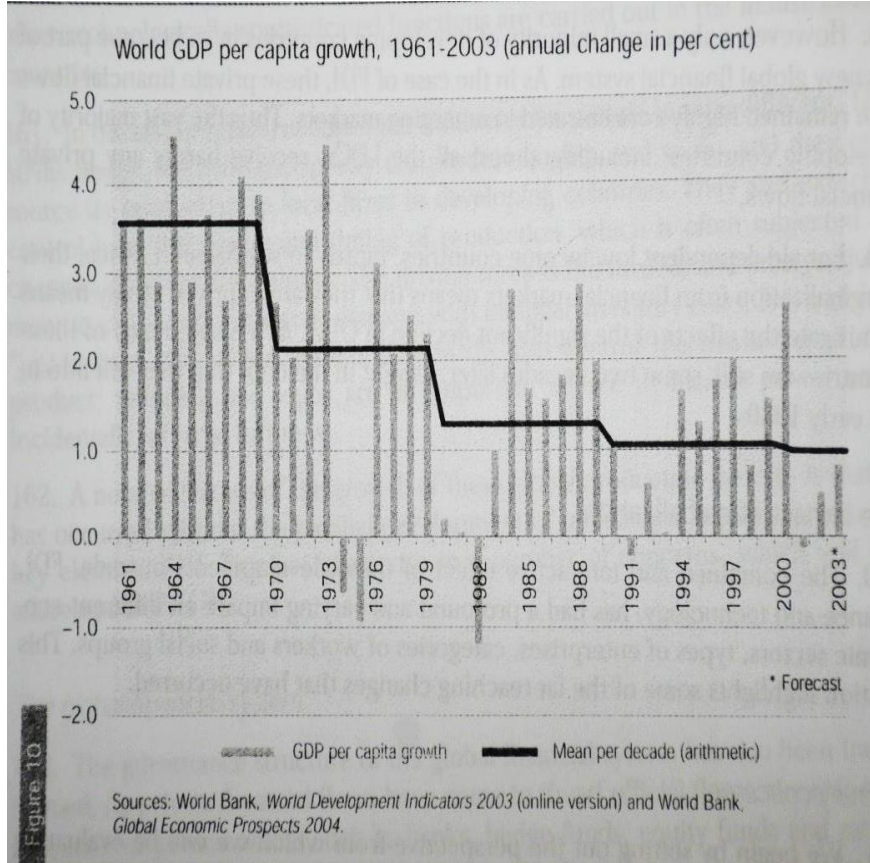
اس کے ساتھ ساتھ GDPS کی شرح نمو میں عدم یکسانیت صنعتی اور ترقی پذیر ممالک کے حوالے سے بھی سامنے آئی۔ فی کس آمدنی کے حوالے سے ۱۹۸۵ تک سے ۲۰۰۰ تک صرف ۱۶ ترقی پذیر ممالک میں شرح سالانہ ۳ فی صد سے زیادہ رہی۔ اس بات کی وضاحت اس ٹیبل سے بھی ہوتی ہے۔

(1) World Commission on the social Dimensions of Globalization , *A Fair Globalization* (New Dehli:Academic Foundation,2006) p 36

**Table 1. The economic performance of developing countries (grouped by growth performance) compared to industrial and transition countries**

| | | Industrial countries | Developing countries with growth rate per capita GDP of | | | | | | Transition[1] countries |
|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|
| | | | ← >3%[2] | → | 2%-3% | 1%-2% | 0%-1% | <0% | |
| Number of countries | | 22 | 16 | (14) | 12 | 20 | 14 | 23 | 17 |
| % share of world population (2001)[3] | | 13.8 | 44.7 | (7.1) | 5.6 | 10.3 | 7.5 | 4.8 | 5.3 |
| GDP growth (in %), 1985-2001 | | 2.5 | 7.3 | (6.2) | 4.2 | 3.4 | 2.3 | 1.8 | –1.1 |
| Population growth (in %), 1985-2001 | | 0.65 | 1.5 | (1.6) | 2.0 | 2.2 | 2.1 | 2.6 | –0.3 |
| % share in global trade (including transition countries) | 1991 | 53.9 | 18.5 | (10.3) | 3.2 | 6.6 | 3.1 | 4.7 | 10.0 |
| | 2001 | 48.4 | 26.6 | (11.3) | 2.9 | 6.7 | 3.0 | 3.6 | 8.9 |
| % share in global FDI (including transition countries) | 1991 | 54.4 | 24.6 | (13.7) | 2.2 | 10.2 | 3.0 | 2.9 | 2.7 |
| | 2001 | 52.9 | 22.2 | (2.7) | 2.0 | 5.8 | 6.9 | 4.3 | 5.8 |

[1] Growth rates for transition countries are calculated for the period 1991-2002. [2] The second column excludes China and India. [3] The 124 countries included in the sample accounted for 92 per cent of the estimated world population of 6,129 million in 2001.
Source. The basic data are taken from the World Bank, World Development Indicators (CD-ROM, 2003).

([1])

اس کے برعکس ۵۵ ترقی پذیر ممالک میں GDP کی شرح ۲ فیصد سے بھی کم رہی۔ جبکہ ۲۳ ممالک میں یہ گروتھ منفی رہی۔ اسی دوران امیر اور غریب ممالک کے درمیان شرح آمدنی کا فرق نمایاں حد تک بڑھا۔ اس کی تائید نیچے دیئے گئے گراف سے ہوتی ہے
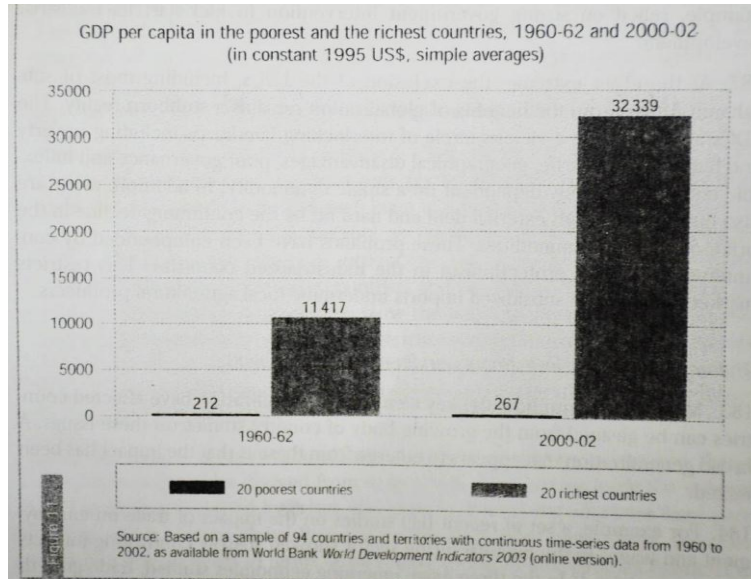
(۲)

## بے روزگاری میں اضافہ

عالمگیریت کے سماجی اثرات کا جائزہ لینے کے لیے معاشی کارکردگی کے علاوہ یہ جائزہ لینا بھی ضروری ہے کہ عالمگیریت کے گذشتہ دو دہائیوں میں روزگار، عدم مساوات اور غربت کے حوالے سے کیا اثرات سامنے آئے ہیں۔

---

([1]) World Commission on the social Dimensions of Globalization , *A Fair Globalization*، *p 36*

(2) Ibid, p 37

ILO کے تخمینے کے مطابق دنیا بھر میں ۲۰۰۳ تک گذشتہ ایک دہائی میں بے روز گاروں کی تعداد ۱۸۸ ملین تک بڑھ گئی۔ تاہم مختلف خطوں میں گذشتہ دو دہائیوں میں روز گار کی صورتحال مختلف رہی۔[۱]
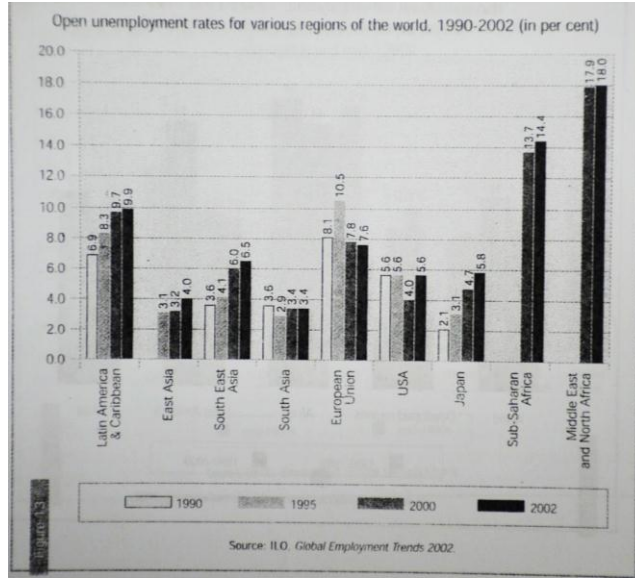
یہ بات قابل ذکر ہے کہ ترقی پذیر ممالک میں لاطینی امریکہ، کریبین اور جنوب مشرقی ایشیا کے ترقی پذیر ممالک میں بھی بے روز گاری میں اضافہ ہوا اور ۱۹۹۵ سے مشرقی ایشیا میں بھی بے روز گاری میں اضافہ ہوا۔ بے روز گاری میں اضافے کی ایک وجہ ۱۹۹۰ کے اواخر میں آنے والا معاشی بحران بھی تھا۔ مثال کے طور پر اس بحران کے بعد بحران سے متاثرہ بڑے ممالک میں بے روز گاری کی شرح میں کمی آئی۔ لیکن بہت سے ممالک میں یہ کمی بحران سے پہلے کی سطح تک نہیں آئی۔[۲]
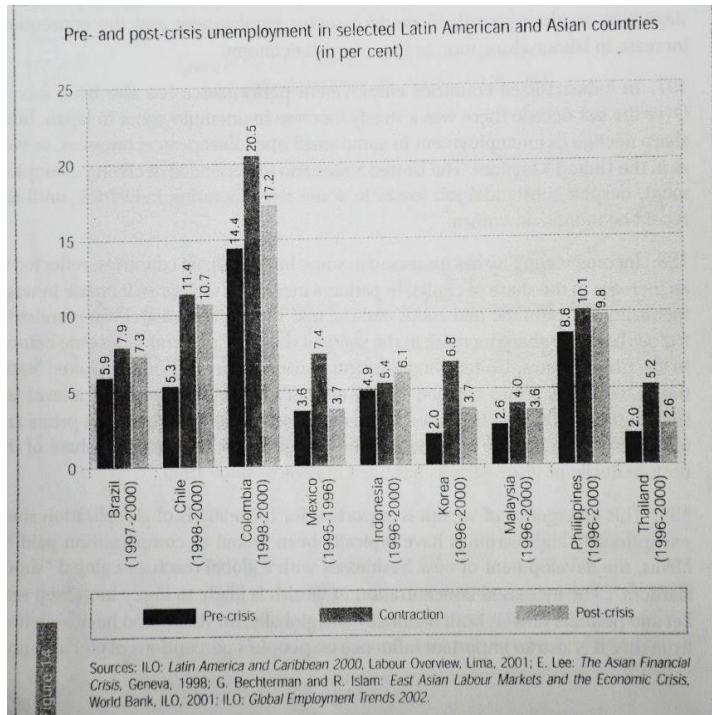
(1) World Commission on the social Dimensions of Globalization , *A Fair Globalization,p 41*

(2) Ibid

صنعتی ممالک میں بھی روز گار کی صورتحال ملی جلی رہی۔ پچھلی ایک دہائی میں جاپان میں بے روزگاری میں اضافہ ہوا۔ لیکن کچھ چھوٹی یورپین معیشتوں میں بے روزگاری میں نمایاں کمی آئی۔ اسی طرح برطانیہ اور امریکہ میں بھی بے روگاری میں کمی ہوئی۔

بے روزگاری میں یہ اضافہ نہ صرف ترقی پذیر بلکہ ترقی یافتہ ممالک میں بھی سامنے آیا ہے۔ ترقی یافتہ ممالک میں بے روزگاری بڑھنے کی بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ ممالک سستی لیبر کی تلاش میں ترقی پذیر ممالک کا رخ کرتے ہیں اور وہاں فیکٹری کارخانے قائم کرتے ہیں جس کی وجہ ان کی پیداواری لاگت میں نمایاں کمی آجاتی ہے تاہم اس کی وجہ سے ان کے اپنے ممالک میں بیروزگاری پیدا ہو جاتی ہے

## ترقی پذیر اور ترقی یافتہ ممالک کی تجارت پر اثر

عالمگیریت کی اس لہر نے دنیا بھر میں تجارت کو بھی متاثر کیا ہے اور تجارت پر یہ اثرات ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک پر مختلف اور متضاد ہیں۔ دنیا بھر میں تجارت میں گذشتہ دہائیوں میں تیزی سے پھیلاؤ آیا ہے۔ لیکن یہ تجارتی پھیلاؤ مختلف ممالک کے لحاظ سے یکساں طور پر نہیں آیا، اس تجارتی پھیلاؤ میں صنعتی ممالک اور ۱۲ ترقی پذیر ممالک کا حصہ lion's share ہے۔ جبکہ غریب ممالک کے نزدیک یہ عالمی تجارت امیر آدمی کا کھیل ہے۔ اس تجارتی پھیلاؤ کا توازن صنعتی اور امیر ممالک کی حمایت میں ہے۔ ایک طرف غریب ممالک کا تجارتی خسارہ بڑھ رہا ہے تو دوسری طرف ترقی یافتہ ممالک کے تجارتی سرپلس میں اضافہ ہو رہا ہے ایک اندازے کے مطابق چین کو نکال کر غریب ممالک کا ۱۹۹۰ میں اوسط تجارتی خسارہ ۱۹۷۰ کے مقابلے میں ۳ فیصد زیادہ تھا اور عالمی تجارت تیزی سے تین بڑے علاقائی تجارتی بلاکس، شمالی امریکہ، مشرقی ایشیا اور مغربی یورپ، میں مرتکز ہو رہی ہے۔

تجارت کے اس عدم توازن ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ غریب ممالک عام طور پر خام مواد کی تجارت پر انحصار کرتے ہیں عام طور پر کسی ایک خام چیز کی تجارت پر۔ اس خام مواد کی قیمت وقت کے ساتھ ساتھ گر جاتی ہے۔

عام طور پر تجاتی پھیلاؤ کے اہم اثرات سے ترقی پذیر ممالک محروم رہتے ہیں۔ تجارت میں اس اضافے کے فوائد و ثمرات زیادہ تر صنعتی اور ترقی یافتہ ممالک کو حاصل ہوئے ہیں، دوسرے لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ دنیا میں امیر اور غریب ممالک کے مابین بڑھتے ہوئے اس تفاوت کی ایک اہم وجہ آزاد عالمی تجارت ہے۔ صنعتی اور ترقی یافتہ ممالک نے تجارت کی آزادی کا اطلاق ان مصنوعات پر کیا ہے جن کو وہ برآمد کرتے ہیں لیکن اس دوران وہ اپنے ان شعبوں کو تحفظ دیتے رہے ہیں جس میں ترقی پذیر ممالک کی طرف سے ان کی معیشت کو مقابلے کا خطرہ تھا۔ مثلاً صنعتی اشیا یعنی آٹو موبائل سے لے کر تمام مشینری پر سے تجارتی پابندیاں ہٹالی گئیں یا کم کر دی گئیں جبکہ مغربی ممالک نے زرعی اشیا پر سبسڈی برقرار رکھی اور ایسی مصنوعات اور ٹیکسٹائل کے لیے اپنی مارکٹیں بند رکھیں جہاں سے ترقی پذیر ممالک کو فائدے کی توقع تھی۔ [1]

سب سہارن افریقہ جو کہ ورلڈ بینک کی رپورٹ کے مطابق دنیا کا غریب ترین خطہ ہے آزاد تجارت کی وجہ سے اس کی آمدنی میں ۲ فیصد کمی آئی۔

(1) Stiglitz ,Joseph E .*Globalization and its Discontent* , p 60

ترقی یافتہ ممالک ترقی پذیر ممالک کو صرف تیار شدہ مصنوعات فروخت کرتے ہیں۔ ان مصنوعات کی تیاری میں استعمال ہونے والے آلات کی فروخت نہیں کرتے۔ دوسری طرف ترقی پذیر ممالک کے پاس بر آمد کے لیے خام مال ہوتا ہے جس کی قیمت کم ہوتی ہے یوں تجارت کا توازن صنعتی اور امیر ممالک کے حق میں رہتا ہے۔ در آمدت خام مال پر مشتمل ہونے کی وجہ سے کم رقم حاصل ہوتی ہے جبکہ بر آمدت الیکٹرانک اور ٹیکنالوجی پر مشتمل ہوتی ہیں جس کے ضمن میں ان غریب ممالک کو بھاری قیمتیں ترقی یافتہ ممالک کو ادا کرتی ہیں۔ یوں تجارتی توازن صنعتی اور ترقی یافتہ ممالک کے حق میں رہتا ہے۔

## غیر ملکی سرمایہ کاری کا اثر

غیر ملکی سرمایہ کاری بھی ان ترقی پذیر ممالک کی معیشت کے حق میں سم قاتل ثابت ہوتی ہے۔ اس غیر ملکی سرمایہ کاری کی وجہ سے مقامی صنعت کار تباہ ہو جاتے ہیں اور چھوٹے بزنس مین اور مقامی صنعتیں کسی قسم کا تحفظ نہ ہونے کی وجہ سے ان ملٹی نیشنل کمپنیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ مثلاً کوکا کولا اور پیپسی کی آمد سے مقامی مصنوعات کی قدر اور مارکیٹ کم ہوئی۔ Walls اور یونی لیور آئس کریم کمپنیز سے مقامی آئس کریم بنانے والے کسی طور پر مقابلہ کرنے کی سکت نہیں رکھتے۔ اسی طرح کے ہزاروں خطرات مقامی صنعتوں کے لیے موجود ہیں۔

اس کے علاوہ عالمی مالیاتی اداروں کا بلند شرح سود پر فراہم کردہ قرض کی ادائیگی کی صورت میں بھی غریب ممالک کی آمدنی کا بڑا حصہ ان اداروں کی نذر ہو جاتا ہے۔ لہٰذا بین الاقوامی مالیاتی اداروں کے فراہم کردہ قرض ان ممالک کی غربت کے خاتمے میں کوئی کردار ادا نہیں کرتے۔ ترقی یافتہ ممالک اپنی زراعت کو تحفظ فراہم کرنے کے لیے اپنے کسانوں کو سبسڈی دیتے ہیں لیکن ترقی پذیر ممالک پر بین الاقوامی مالیاتی اداروں کی طرف سے سٹرکچرل ایڈ جسٹمنٹ پروگرام کے تحت شرائط عائد کی جاتی ہیں کہ زرعی شعبے کو سبسڈی ختم کر دی جائے یا انتہائی کم کر دی جائے۔ جس سے ترقی پذیر ممالک کا زراعت کا شعبہ بھی پسماندہ رہ جاتا ہے۔ بر آمدات کم ہو جاتی ہیں اور ان ترقی پزیر ممالک کی معیشت کا انحصار عام طور پر زرعی اجناس اور زراعت کے شعبے پر ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ شعبہ پسماندہ رہ جانے سے ان کی ترقی کا عمل بھی رک جاتا ہے۔

## بنیادی ضروریات زندگی کی حوالے سے عدم یکسانیت

غربت کے خاتمے میں ناکامی اور تقسیم دولت میں ناہمواری کے ساتھ ساتھ عالمگیریت ضروریات زندگی کی یکساں فراہمی میں بھی ناکام رہی ہے اور اس سلسلے میں پسماندہ، ترقی پذیر اور ترقی یافتہ ممالک کے حوالے سے صورتحال بہت بھیانک ہے۔

Hassan M.Kabir اپنی کتاب میں عالمگیریت کے اثرات کے حوالے سے لکھتے ہیں

> "Despite all the proposed benefits of world trade, the process of globalization has so far only reduced "Third World Countries" share in global GDP. Many of these nations are worse off than

ever before and have suffered massive build -up of foreign debt.[1]

عالمی تجارت کے تمام مجوزہ فوائد کے باوجود عالمگیریت کے عمل نے عالمی جی ڈی پی میں تیسری دنیا کے حصے کو کم کر دیا ہے۔ان اقوام کی حالت پہلے کی نسبت خراب ہوئی ہے۔اور ان پر غیر ملکی قرض میں بے پناہ اضافہ ہو گیا ہے۔

اسی طرح Greg buckmanاپنی کتاب Globalization:Tame it or scrap it میں لکھتے ہیں:

"Apart from inadequate access to wealth ,the world also suffers from inadequate access to other essential of life. Over 1 billion people do not have access to water and about 2 billion do not have adequate access to essential medicines. Also about 840 million people in the world are malnourished". [2]

دولت تک ناکافی رسائی کے علاوہ، دنیا کو دیگر ضروریات زندگی کی عدم دستیابی کے مسئلے کا بھی سامنا ہے۔ایک بلین سے زائد افراد کو پانی میسر نہیں اور تقریباً دو بلین افراد کو ضروری ادویات بھی میسر نہیں۔اور قریباً ۸۴۰ ملین افراد کو ناقص و ناکافی غذا دستیاب ہے۔ترقی پذیر اور پسماندہ ممالک میں اکثریت ان ممالک کی ہے جو افریقہ میں واقع ہیں مثلاً زمبابوے، لائبیریا، ایتھوپیا وغیرہ۔

گیلیپ ورلڈ کے مطابق ۲۰۱۳ میں خط غربت کے نیچے زندگی بسر کرنے والوں کی اکثریت سب سہارن افریقی ممالک میں تھی۔انتہائی غربت سے مراد ۲۵ء۱ڈالر یا اس سے کم یومیہ آمدنی ہے۔۲۰۱۰ میں ۴۱۴ ملین لوگ سب سہارن افریقہ میں انتہائی غربت میں زندگی بسر کر رہے تھے۔ورلڈ بینک کے مطابق وہ لوگ جو ۲۵ء۱ڈالر پر گزر کر رہے تھے۔۲۰۱۰ میں اس خطے میں ان کی آبادی کا تناسب ۵ء۴۸ تھا۔

اسی طرح سب سہارن افریقہ میں رہنے والوں میں سے ہر تین میں ایک فرد غذائیت کی کمی کا شکار تھا۔اقوام متحدہ کی Agriculture organizationکے تخمینے کے مطابق ۲۳۹ ملین لوگ اس خطے میں بھوک کا شکار تھے دنیا بھر میں یہ اس حوالے سے بلند ترین شرح ہے۔اس کے ساتھ ساتھ Millenium Project U.N کے مطابق افریقہ کی کل آبادی کا ۴۰ فیصد باقاعدہ بنیادوں پر متناسب خوراک کے حصول میں ناکام ہے۔اسی طرح سب سہارن افریقہ میں ۵۸۹ ملین لوگ بجلی کے بغیر زندگی بسر کر رہے ہیں۔لہٰذا ۸۰ لوگ کھانا پکانے کے لیے لکڑی، تار کول، گوبر وغیرہ پر انحصار کرتے ہیں۔

دنیا بھر میں صاف پانی سے محروم آبادی کا ۳۷ فیصد سب سہارن افریقہ میں رہتے ہیں اور ۲۰ فیصد سے بھی کم لوگوں کو تعلیم تک رسائی حاصل ہے۔سب سہارن افریقہ میں ہر سولہ میں سے ایک عورت بچے کے پیدائش کے دوران زندگی کی بازی ہار جاتی

(1) Hassan M.Kabir, *Globalization and sustainable development in the POIC countries in Globalization and Muslim world* (Dhaka : Bangladesh Institute of Islamic Thought (BIIT), 2003) p 25

(2) Gerg Buckman,*globalization Tame It OR SCRAP IT?* p 72-73

ہیں۔ طبی سہولیات کی عدم دستیابی کی اس کی بنیادی وجہ ہے۔ اسی طرح ہر سال ایک ملین سے زیادہ لوگ جن میں زیادہ تر بچے شامل ہیں ہر سال ملیریا کی وجہ سے موت کے منہ میں چلے جاتے ہیں۔[1]

بہر حال یہ صورتحال افریقہ سے ہٹ کر دنیا کے دیگر ترقی پذیر ممالک میں بھی زیادہ حوصلہ افزا نہیں ہے۔ ترقی پذیر ممالک جن میں زیادہ تر جنوبی ایشیا اور سب سہارن ممالک شامل ہیں غربت اور سہولیات کی عدم دستیابی کا شکار ہیں اس کے علاوہ بہت سے غریب ممالک میں معاشی عالمگیریت کے فوائد عوام تک یکساں نہیں پہنچ رہے۔ موجودہ دہائیوں میں مثال کے طور پر چین نے تاریخ میں برآمدات کے حوالے سے سب سے بڑے فوائد حاصل کیے ہیں لیکن اس کی ۸۰۰ ملین (کل آبادی ۲ء۱ بلین) کسان ہیں۔

میکسو میں ۵۰ فیصد آبادی غربت کا شکار ہے اس حقیقت کے باوجود کہ ۱۹۴۴ میں North America Free Trade Agreement پر دستخط کرنے کے بعد اس ملک کی برآمدات تین گنا ہو گئی ہیں اسی طرح افریقہ میں بھی آبادی کا ۵۶ فیصد حصہ وہ ہے جو ۱۹۶۰ دہائی میں ایک ڈالر یا اس سے کم پر گزر بسر کر رہا تھا۔ ۱۹۹۰ کے اواخر میں ۶۵ فیصد تک پہنچ گیا۔ ارجنٹینا میں بھی ۳۶ ملین کی کل آبادی کا نصف سے زائد غربت میں زندگی بسر کر رہا ہے۔

نائجیریا میں آبادی کا ۳/۲ حصہ ایک امریکی ڈالر سے بھی کم پر گزارہ کر رہا ہے اس حقیقت کے باوجود کہ ملک نے گذشتہ دو دہائیوں میں ۳۰۰ بلین ڈالر کا تیل برآمد کیا۔ اس طرح امیر ممالک میں بھی دولت کی تقسیم اکثر غیر یکساں ہے امریکہ میں امیر ترین ایک فیصد آبادی کے پاس پوری قوم کی ۳۰ فیصد دولت ہے۔ یہ ایسے حقائق ہیں جو کسی کے لیے بھی قابل فخر نہیں اور عالمگیریت کے حامیوں کا یہ دعویٰ کہ Its lifts all boats کو غلط ثابت کرتے ہیں ۱۹۶۶ میں Organization of Economics Corporation and Development نے یہ مقصد متعین کیا کہ ۲۰۱۵ تک وہ آبادی جو خط غربت سے نیچے زندگی بسر کر رہی ہے کو نصف تک لانا ہے۔ لیکن کسی کو بھی اس پر یقین نہیں تھا کہ یہ مقصد حاصل ہو گا۔ کچھ تاریخی طور پر غریب ممالک جن میں مشرقی ایشیا کے Tigers (مثلاً جنوبی کوریا، سنگاپور، ملائشیا اور تائیوان) کچھ تیل برآمد کرنے والے ممالک نے اگرچہ معاشی عالمگیریت سے اچھا فائدہ اٹھایا لیکن یہ استثنائی مثالیں ہیں۔ عمومی طور پر عالمگیریت کے فوائد امیر اور صنعتی ممالک کو حاصل ہوئے ہیں۔ ترقی پذیر اور غریب ممالک کی حالت میں سدھار نہیں آیا۔

## ملٹی نیشنل کمپنیاں:

غیر ملکی سرمایہ کاری یا براہ راست سرمایہ کاری کی اہم ترین شکل ملٹی نیشنل کمپنیاں ہیں۔ سید عظیم انسائیکلوپیڈیا امریکانا کے حوالے سے ملٹی نیشنل کمپنیوں کی تعریف یوں بیان کرتے ہیں۔

"ملٹی نیشنل کارپوریشن ایک بہت بڑی کمپنی ہوتی ہے جو کہ پلانٹ اور دوسری سرمایہ کاری ایک سے زیادہ ملکوں میں رکھتی ہے، اس کو انٹر نیشنل کارپوریشن یا ٹرانس نیشنل کارپوریشن بھی کہا جاتا ہے۔ ملٹی نیشنل کمپنیاں خاص طور پر ترقی پذیر ممالک میں منافع

(1) http ://broganprojectorg /10 quick -fact about poverty-in Africa, Retrieved at 4-4-2018 -

بخش منڈی کے عوض ٹیکنالوجی ،مالیاتی سرمایہ اور مارکیٹنگ کی مہارتیں مہیا کرتی ہیں مگر بڑے بڑے ترقی یافتہ ممالک بھی ملٹی نیشنل کمپنیوں کی سرمایہ کاری لیتے ہیں۔ غیر ملکی حکومتوں کے خلاف جو طاقت ملٹی نیشنل کمپنیاں استعمال کرتی ہیں وہ ہدف تنقید ہے مگر زیادہ تر ممالک نے ان کے لیے قواعد بنائے ہیں جس سے ان ملکوں کو منافع سے حصہ، نوکریاں اور منڈی میسر آتی ہے۔"[۱]

اس تعریف سے مندرجہ ذیل نکات واضح ہوتے ہیں

۱۔ یہ کمپنیاں دو سے زیادہ ملکوں میں کام کرتی ہیں ان کو ٹرانس نیشنل کمپنیاں بھی کہا جاتا ہے۔

۲۔ یہ اشیا کسی ایک ملک میں تیار کرتی ہیں اور باقی ممالک میں بھیجتی ہیں یا مختلف ممالک میں پلانٹس لگاتی ہیں۔

۳۔ یہ سستی محنت، سستا خام مال اور منڈی کی سہولت کے پیش نظر منافعوں کی تقلید میں ساری دنیا میں اپنا کاروبار پھیلا لیتی ہیں۔

۴۔ ان کے حوالے سے ایک رائے یہ ہے کہ ان کی آمد سے سرمایہ کاری، روزگار اور معاشی بہتری آتی ہے۔

۵۔ ان کے متعلق ایک خیال یہ بھی ہے کہ یہ مقامی معیشتوں کو مقابلے سے خارج کر دیتی ہیں اور کمزور معیشتوں کے حامل ممالک کے حکمرانوں کو بلیک میل کر کے ناجائز فائدہ لیتی ہیں۔

اس سرمایہ کاری کے آغاز کے حوالے سے world commision reports of social dimension of globalization میں درج ہے کہ ۱۹۷۳میں Bretton Words سسٹم کے خاتمے کے بعد تبدیلی کا آغاز ہوا اور زیادہ تر صنعتی ملکوں میں ۱۹۸۰ کے بعد یہ آغاز ہوا کہ جس کے نتیجے میں ان ممالک کے درمیان سرمائے کی ترسیل میں اضافہ ہوا۔ عالمی مالیاتی نظام بیک وقت تین بڑے انقلابات Innovation , internationalization اور deregulation سے گزرا۔ لیکن سرمائے کی ترسیل میں شدت ICT میں انقلاب کے بعد آیا۔ کیونکہ اس کے ذریعے سرمائے کی غیر ملکی مارکیٹوں کے متعلق معلومات کی رفتار میں تیزی اور بہتری آگئی۔ بہر حال بیسویں صدی کی ساتویں دہائی کے آغاز میں اچانک FDI میں اضافہ ہو گیا جو آٹھویں دہائی تک آسمان کو چھونے لگا۔ ترقی پذیر ملکوں میں اربوں کھربوں ڈالر کی سرمایہ کاری کی گئی، اب یہ غیر ملکی سرمایہ کاری یعنی FDI پہلے سے کئی گنا تیز ہو چکی ہے۔

ملٹی نیشنل کمپنیوں کی صورت میں ایک نئے سامراجی دور کا آغاز ہو چکا ہے۔ اب ایک نہیں کئی کئی ایسٹ انڈیا کمپنیوں کے ہاتھوں تجارت کی آزادی کا پروانہ ہماری معاشی غلامی اور موت کا پیغام ہے۔

اکثر دانشور یہ مغالطہ پھیلاتے ہیں کہ دنیا سے سامراج کی نو آبادیاں ختم ہو گئی ہیں لہٰذا سامراج بھی ختم ہو گیا لیکن در حقیقت ایسا نہیں ہے۔ دراصل انقلابات، عوامی بغاوتوں، انقلاب کی دھمکی، سوشلسٹ بلاک کی توسیع اور امریکہ کے نو آبادیاتی دنیا میں اثر و نفوذ نے دوسری جنگ عظیم کے بعد نو آبادیاتی نظام کو پر سمیٹنے پر مجبور کر دیا۔ لیکن سامراج کے وہ تمام خواص جو نو آبادیاتی دنیا میں تھے جدید نو آزاد دنیا میں بھی موجود رہے یعنی بڑی بڑی سرمایہ داریاں، اجارہ داریاں، بڑے میٹروپولیٹن سنٹرز کا خام مال اور مارکیٹ پر کنٹرول اور

(۱) سید عظیم، ملٹی نیشنل کمپنیاں، ص ۲۹

جو ان بڑے ممالک کے مفاد میں تھے صنعتی انقلاب کے دوران دولت کو ڈھکے چھپے انداز میں قدر زائد کے ذریعے مرتکز کیا گیا مگر اس سے پہلے کی تاریخ میں سرمایہ ننگی لوٹ مار کے ذریعے اکٹھا کیا گیا۔یہ سرمایہ امریکہ کی دریافت کے بعد وہاں کروڑوں غلاموں کو زندہ درگور کرکے حاصل کیا گیا، یہ سرمایہ میکسیکو کی آبادی کو ۲۵ ملین سے ایک صدی ۵.۱ ملین تک تہس نہس کرکے اکٹھا کیا گیا۔یہ سرمایہ بنگال کی ایک تہائی آبادی کو قحط میں ماردینے سے حاصل کیا گیا۔انڈیا برطانوی سلطنت سے قبل صنعتی اعتبار سے یورپ سے آگے تھا۔لیکن نوآبادیاتی دنیا کی دولت اٹھارویں صدی میں انگلینڈ کی دولت کا سبب بنی۔1 ۰ ۱۷ میں انگلینڈ کی برآمدات ۶ ملین پاؤنڈ تھیں جو کہ ۱۸۰۱ میں ۳۶ ملین پاؤنڈ ہو گئیں۔اس کے برعکس انگلینڈ کی درآمدات ۱۷۰۱ میں ۵ ملین پاؤنڈ تھیں جو کہ ۱۸۰۱ میں ۲۹ ملین پاؤنڈ ہو گئیں گویا بحیثیت مجموعی انگلینڈ نے پوری صدی میں برآمدات میں ایک مستقل اضافہ برقرار رکھا۔مگر اصل تبدیلی یہ آئی کہ انگلینڈ کی تجارت کا رخ یورپ سے بدل کر نوآبادیوں کی طرف ہو گیا۔مثلاً اٹھارویں صدی کے آخر تک انگلینڈ کی کاٹن ٹیکسٹائل انڈسٹری کا ۵/۱ حصہ یورپ کو جاتا تھا۔جبکہ ۵/۴ حصہ باقی دنیا یعنی نوآبادیوں کو جاتا تھا گویا جب یورپی تجارتی مخالفین نے انگلینڈ کو یورپ سے نکال باہر کیا تو اٹھارویں صدی کے آخر میں برطانیہ کی اپنی تیار کردہ مصنوعات یورپ کی نسبت نوآبادیوں کو ایکسپورٹ کرنے کا رجحان بڑھا۔[۱]

اٹھارویں صدی کی آخری دہائیوں میں معاشی بحران سامنے آیا۔اس بحران کے نتیجے میں آزاد منڈی اور Laissez Faire کا نظریہ معیشت پیدا ہوا۔آدم سمتھ آزاد تجارت کو صحیح معنوں میں نظریاتی قالب مہیا کرنے والا شخص ہے۔ڈبلیو ٹی او اور آزاد منڈی کی معیشت کے فلسفے کا چولی دامن کا ساتھ ہے اگر یوں کہا جائے کہ آزاد منڈی کی معیشت کا فلسفہ وہ بنیاد ہے جس پر ڈبلیو ٹی او کا عقوبت خانہ استوار ہے تو بے جا نا ہو گا۔

"آزاد منڈی کی معیشت کا فلسفہ تاریخ کا وہ کاٹھ کباڑ ہے جس پر کہ نئی ڈینٹنگ پینٹنگ بشکل سرمایہ دارانہ گلوبلائزیشن کرکے نئی تخلیق اور انسانی ارتقا کی نئی جست کے طور پر پیش کیا جارہا ہے یہ وہ باسی کھانا ہے جسے کہ سامراجی ڈبلیو ٹی او ریسٹورنٹ میں عالمی بہرے امریکی سامراج نے بڑے اہتمام سے نئے تڑکے لگا کر پیش کیا ہے مگر غریب اور کمزور ملک ایک دونوالے کھانا تو درکنار دیکھتے ہی قے کرنے پر مجبور ہیں۔چارو ناچار دنیا کے غریب ملکوں کے ساتھ ڈبلیو ٹی او کا زنا بالجبر جاری ہے اور یہ آزاد منڈی امیر ملکوں کو غریب ملکوں کے استحصال کی آزادی ہے۔گویا بھیڑیئے اور بھیڑ میں مقابلہ سے انجام کار تو ظاہر ہے بھیڑ کی موت ہی ہو گی۔۔۔[۲]

اس حوالے سے سید عظیم لکھتے ہیں

> بلا شبہ نیا عالمی سرمایہ نئی توانائی اور جدید ٹیکنالوجی کی ٹانگوں سے عالمی سرحدیں پھلانگنے پر تلا بیٹھا ہے۔۔۔تیسری دنیا جو کہ دنیا کی آبادی کا تین چوتھائی ہے دولت کا ایک چوتھائی بھی اسکو نصیب نہیں۔عالمی سرمایہ داری کے چہرے پر گلوبلائزیشن کا ماسک اور اس کے پیچھے استحصال

---

(۱) سید عظیم، تجارتی لوٹ مار کی تاریخ اور نام نہاد آزاد منڈی کی تجارت (لاہور: دارلشعور،۲۰۰۶) ص ۱۸۱

(۲) مقصود خالق (مترجم) *W.T.O* کیا ہے (لاہور: دارلشعور, ۲۰۰۶) ص ۷

> کے دانتوں کا ادراک بڑا ضروری ہے۔ دراصل عالمی معیشت کے اتحاد سے دنیا کی سٹیج پر نئے ایکٹرز کا اضافہ ہو گیا جو مرکزی کردار کے حامل ہیں یہ ایکٹرز (Actors) ملٹی نیشنل اور ٹرانس نیشنل کمپنیاں ہیں جو سرمایہ داری کے بطن میں بڑی دیر سے پل رہی تھیں۔۔۔ان کی طاقت کے سامنے دنیا کی بڑی بڑی حکومتیں لرزہ براندام ہیں۔ یہ نو آبادیوں کے بغیر ایک نیا نو آبادیاتی سامراجی نظام ہے۔[۱]

دنیا میں برپا ہونے والے بڑے بڑے انقلابات جن میں پہلا صنعتی انقلاب کوئلے کی وسیع پیداوار، بھاپ انجن کا استعمال اور ریلوے کے نظام کی ایجاد و تنصیب ہے جس نے برطانیہ کو پوری صدی کے سرمایہ دارانہ نظام کا لیڈر بنا دیا۔ اگلا صنعتی انقلاب توانائی کے ذرائع کے طور پر تیل اور بجلی کے استعمال کی صورت میں آیا۔ تیسرا صنعتی انقلاب الیکٹرونکس، ٹیلی کمیونیکیشن اور بائیو کیمسٹری سے متعلق ہے جو دوسری جنگ میں شروع ہوا اور ۶۰ کی دہائی میں بام عروج کو پہنچ گیا۔ ان تمام انقلابات نے بالعموم اور آخری انقلاب نے بالخصوص فاصلوں کو سمیٹتے ہوئے دنیا کو ایک گلوبل ولیج بنا دیا۔ ایک پراڈکٹ کو فی الفور پوری دنیا میں دیکھا جاتا ہے۔ لہٰذا پوری دنیا اس کا مطالبہ کرے گی تو ظاہر ہے پوری دنیا میں اسکی پیداوار یا ترسیل ضروری ہے۔ دوسری اہم بات آج کے صنعتی انقلاب نے سائنس اور ٹیکنالوجی کو یکجا کر کے انسانی وسائل کو طبعی وسائل پر فوقیت دے دی ہے۔ نئی ٹیکنالوجی نے جہاں پیداوار کی استطاعت بڑھا دی ہے وہاں اس کی کھپت کے لیے نئی اور بڑی منڈیوں کی ضرورت کو بھی جنم دیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک کمپنی کی پیداوار کو دوسری کمپنیوں کے ساتھ بھی جوڑ دیا ہے جو کہ دوسرے ملکوں میں تھیں یوں سرمایہ ملٹی نیشنل ہو گیا مثلاً آٹو موبائیل انڈسٹری میں کار ایک ہی جگہ پر تیار ہوتی تھیں۔ پھر فورڈ نے اسمبلی لائن متعارف کروائی تا کہ بڑے پیمانے پر پیداوار ہو سکے۔ تو تب بھی پیداروار کا عمل محدود رہا۔ آج آٹو موبائل انڈسٹری میں جتنی جدت اور ٹیکنالوجی شامل ہے اس سے مختلف جگہوں پر مختلف پرزے تیار ہوتے ہیں۔ منڈی کے قریب ہونے کی وجہ سے پیداواری لاگت کم ہو جاتی ہے مختلف ملکوں میں ٹیکس قوانین بھی مختلف ہیں اس کے علاوہ بڑی بات رسک کم ہو جاتا ہے۔ اگر کسی ایک ہی ملک میں ساری کار تیار ہو رہی ہوں تو وہاں ہڑتال کی صورت میں سارا کاروبار ٹھپ ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر کار مختلف جگہوں پر تیار ہو رہی ہو اور اگر تیاری کے ایک حصے میں شامل کسی ملک کی کمپنی ہڑتال کرتی ہے تو فوراً کسی اور جگہ سے بات کر کے رسک کو کم کیا جا سکتا ہے گویا لیبر کو تقسیم اور پابند اور سرمائے کو آزاد کر دیا گیا۔ ملٹی نیشنل کمپنیاں چھوٹے موٹے کاروبار اور مقامی صنعتوں کو ہڑپ کر جاتی ہیں۔ اگرچہ ان کمپنیوں کو اپنے ان آپریشنز کو آگے ٹھیکے پر بھی دینا پڑتا ہے اور خود وہ ایک enterprise web کا کردار ادا کرتی ہیں تاہم فیصلہ کن کردار اور کلیدی فیصلوں کا اختیار پھر بھی ان امیر ملٹی نیشنل کمپنیوں کے پاس ہی ہوتا ہے۔

بہر حال ملٹی نیشنل کمپنیوں کے بارے میں جتنے بھی دعوے کیے جائیں جتنی بھی تاویلیں دی

---

(۱) سید عظیم، ملٹی نیشنل کمپنیاں، ص ۱۵۶

جائیں ایک بات واضح ہے کہ ملٹی نیشنل کمپنیوں کے بننے کے پس پشت اجارہ داری کا عمل کار فرما ہے۔۔۔ ملٹی نیشنل کمپنیوں کا حجم اتنا بڑا ہوتا ہے کہ وہ مقامی سرمائے کو ہڑپ کر کے اپنی توند بڑی کر لیتی ہیں، اگر ان کے راستے میں کوئی ریاستی رکاوٹ بھی ہو تو وہ اسے سٹرکچرل ایڈ جسمنٹ پروگرام کی چھری سے کاٹ لیتے ہیں۔[۱]

ان کمپنیوں کے اثر رسوخ کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کو تحفظ فراہم کرنے کے لیےWTO جیسے ادارے قائم اور AOA,GATS جیسے معاہدے کیے گئے۔

WTO کے تحت کیے جانے والے معاہدہ WTO Agreement on Agricultural-Aoa کی سب سے بڑی ناانصافی ہے۔اس معاہدے کے تحت ترقی پذیر ممالک کی جگہ ترقی یافتہ ممالک کے ساتھ ایس ڈی ٹی کیا گیا۔ترقی پذیر ممالک نے یہ سوچ کر حمایت کی تھی کہ زرعی مراعات کے خاتمے سے انھیں فائدہ ہو گا تاہم معاہدے کے وعدوں کو پورا نہیں کیا گیا۔معاہدات کی شرائط کو چالاکی سے ترتیب دیا گیا تا کہ اس کے اصل اثرات کو پوشیدہ رکھا جاتا۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ او ای سی ڈی ممالک میں زرعی مراعات ڈمپینگ غیر قانونی ہونے کے بجائے قانونی حیثیت اختیار کر گئے۔امریکہ اور یورپین کیمونٹی کی زرعی مراعات اور ڈمپینگ (غیر ملکی منڈیوں پر قابو پانے کے لیے اپنی اشیا کو کم قیمت پر بیچنا) نے ترقی پذیر ممالک کی زراعت پر شدید منفی اثرات مرتب کیے۔مراعات کی وجہ سے عالمی منڈیوں میں زراعت کی اضافی مقدار موجود رہتی ہے جس کے باعث قیمتیں گر جاتی ہیں یہ کم قیمت برآمدات اے او اے، آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کی محصولات پر عائد کردہ پابندیوں کی وجہ سے ترقی پذیر ممالک کی منڈیوں کو تباہ کر دیتیں ہیں۔ترقی پذیر ممالک کے کسان ان قیمتوں کے مقابلہ میں کاروبار نہیں کر سکتے، جس کی وجہ سے مقامی پیداوار تباہ ہو جاتی ہے۔کبھی کبھار تو یہ کم قیمت خوراک مقامی پیداوار کو مکمل طور پر تباہ کر دیتی ہے[۲]

اس ضمن میں مزید مثالیں بھی پیش کی جا سکتیں ہیں جہاں بڑی بڑی کمپنیوں نے چھوٹے کاشتکار کی حق تلفی کر کے انھیں تباہ کر دیا۔ترقی پذیر ممالک کے چھوٹے کسان اس بے ایمانی کا خمیازہ اس طرح بھگت رہے ہیں کہ مینڈاناؤں فلپائن میں مکئی کے کاشتکار نیست و نابود ہو چکے ہیں۔

اور یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے کہ جب مقامی منڈیوں کی قیمتوں سے مقابلہ نہ کیا جا سکتا ہو تو کسان اپنی مکئی کو گلنے سڑنے کے لیے کھیتوں میں ہی چھوڑ دیں یہی منظر لاطینی امریکا، افریکا اور ایشیا کے ترقی پذیر ممالک میں دیکھا جا سکتا ہے۔

یہی صورتحال تھائی لینڈ میں Jasmine چاول کے کسانوں کی ہے جو دنیا کی چاول کی کل برآمد کا ۳۵٪ مہیا کرتا ہے۔وہاں اکثر کسان بدحالی کی زندگی بسر کر رہے ہیں زراعت کے کمرشل ہونے اور تجاتی آزادی نے ان کے حالات کو بدتر بنایا ہے۔

---

(۱) سید عظیم، *ملٹی نیشنل کمپنیاں*، ص ۱۶۱

(۲) فراز احمد (مترجم) *WTO ڈبلیو ٹی او پس پردہ حقائق* (لاہور: سانجھ پبلی کیشنز، ۲۰۰۶) ص ۲۷-۲۶

پام آئل کی قیمت ۱۹۹۷-۹۸ میں ۴ بھٹ (تھائی کرنسی) فی کلو تھی۔ ملائشیا نے یہاں بر آمد شروع کی تو اس کی قیمت ۷۵.۰ بھٹ فی کلو ہو گئی۔ چاول کی قیمت جو ۱۹۹۷ کے مالیاتی مسائل سے پہلے ۱۰۰۰۰ بھٹ فی ٹن تھی سال ۲۰۰۰ء میں بھٹ فی ٹن ہو گئی۔ تجارتی آزادی کی وجہ سے درآمد پر پابندی ختم ہو گئی اس معاہدے کے تحت تھائی لینڈ کو ۲۰۰۰ء تک ہر سال محصولات میں ۲ء۰٪ کمی کرنا ہو گی اور ۲۰۰۴ یک اپنی درآمدت کو بڑھا کر ۲۵۰,۰۰۰ ٹن تک لے جانا ہو گا۔ مراعات کی مدد سے تیار کردہ یورپین کمیونٹی کے خشک دودھ نے تھائی لینڈ میں دودھ کی قیمتوں کو سخت نقصان پہنچایا پچھلے پانچ سالوں میں کھاد اور زرعی ادویات کی قیمت میں ۴۰ فیصد اضافہ ہوا ہے۔ بہت سے کسانوں کے لیے دو وقت کی روٹی کمانا مشکل ہو گیا ہے۔

اس کے علاوہ سروسز کی تجارت کے متعلق کیا گیا معاہدہ گیٹس (GATS) کا بھی فائدہ ترقی یافتہ ممالک پہنچا اگرچہ اس کو ترقی پذیر ممالک کے لیے ایک اہم رعایت قرار دیا گیا۔ در حقیقت ترقی پذیر ممالک کو اس سے کچھ حاصل نہیں ہوا کیونکہ ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک کے درمیان برابری کا مقابلہ نہیں ہے ترقی پذیر ممالک پر بہت زور دیا جا رہا ہے کہ اپنے کمزور شعبہ جات میں تجارتی آزادی دیں ایسا ہوا تو مقامی سروسز کی صنعت تباہ ہو جائے گی۔

گیٹس صرف بڑے کاروبار کو مزید منڈیاں فراہم کرنے کے لیے مرتب کیا گیا ہے اس کی مدد سے معیشت کے ان حصوں کو بھی قابو کیا جا سکتا ہے جو پہلے حکومت کے پاس تھے اور حکومتیں انہیں بین الاقوامی معیار کے مطابق خوش اسلوبی سے چلا رہی تھیں۔

بڑی ملٹی نیشنل کمپنیوں کی مالیاتی طاقت، دنیا میں پھیلے ذرائع، نئی ٹیکنالوجی کا استعمال اور IL Infarstructure سے ترقی پذیر ممالک کی چھوٹی یا متوسط کمپنیوں کے لیے مقابلہ کرنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ جن ممالک میں تجارتی آزادی موجود ہے وہاں یہ مقابلہ یک طرفہ ہوتا جا رہا ہے۔[۱]

ڈبلیو ٹی او کے تجزیہ نگار اور انڈیا کے سابق سفیر بی ایل داس (BL.Das) کا کہنا ہے کہ:

> "اس حقیقت پر کوئی اختلاف نہیں ہے کہ ابھی تک تجارتی آزادی واضح طور پر یک طرفہ ہے اس سے صرف چند بڑے ترقی یافتہ ممالک کو فائدہ ہوا ہے کیونکہ سروسز کے شعبہ جات میں ان کی رسد کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا، مقداری تجزیہ تجارتی آزادی کے فوائد کو سمجھنے میں مدد دے گا۔ معیاری طور پر یہ کہنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہے کہ ترقی پذیر ممالک کو ابھی تک کوئی فائدہ نہیں حاصل ہوا کیونکہ ان کی رسد کمزور ہے۔"

ترقی پذیر ممالک کو ای ایس ایم (Emergency Safeguard Mechanism) کی ضرورت ہے جو انھیں تجارتی آزادی کے منفی اثرات سے محفوظ رکھ سکے۔ اس سلسلے میں قانون بھی موجود ہے۔ مگر ترقی یافتہ ممالک اس پر عمل درآمد نہیں چاہتے۔ دانشوارانہ

---

(۱) فراز احمد، *WTO پس پردہ حقائق*، ص ۳۰-۳۱

ملکیتی حقوق سے متعلقہ کرپس معاہدے نے بھی WTO کے منفی پہلو اجاگر کیے ہیں۔ کرپس نے یہ ثابت کیا ہے کہ یہ قانون یک طرفہ ہے اس کی وجہ سے صرف ٹیکنالوجی کی طاقت رکھنے والے صنعتی ممالک کو فائدہ ہوا ہے اور اس کی قیمت ترقی پذیر ممالک کو ادا کرنا پڑی ہے۔

ڈبلیو او ٹی او کے مصنفین نے اس حوالے سے ایک اور مثال پیش کی ہے ان کے مطابق مونسانٹو Monsanato جیسی ملٹی نیشنل کمپنیوں نے بائیو ٹیکنالوجی کی مدد سے بیجوں کی اقسام میں ہلکی پھلکی تبدیلی کر کے انھیں ۲۰ سال تک کے لیے پیٹنٹ کیا ہے۔ یہ بیج دنیا بھر کے کسانوں کو بیچے جائیں گے۔ اب ان کسانوں پر اپنے روایتی طریقے کے ذریعے پچھلی فصل سے حاصل کردہ بیجوں کی کاشت پر پابندی ہے جب یہ زرعی پیداوار کا صنعتی طریق کار پھیلے گا تو کسان زرعی صنعتی کمپنیوں کے زیادہ پیداوار دینے والے بیج خریدیں گے۔ اس وجہ سے ملٹی نیشنل کمپنیوں کی دنیا کے جنیاتی وسائل (Genetic Resources) پر اجارہ داری اور اختیارات میں اضافہ ہو گا۔ پھر وہ کسانوں سے اپنی مرضی کی قیمت وصول کر سکتیں ہیں۔

در حقیقت ڈبلیو ٹی او (WTO) ملٹی نیشنل کمپنیوں کی مفادات کے تحفظ کے لیے بنایا گیا ایک جال ہے۔ جس کا خاکہ سامراجی مفادات کے عین مطابق تیار کیا گیا ہے اور ترقی پذیر ممالک اس کا شکار ہیں۔ WTO میں وہ تمام معاہدات شامل ہیں جن کا فائدہ امیر ملکوں کی بڑی بڑی ملٹی نیشنل کمپنیوں کو ہے۔ یہ ملٹی نیشنل کمپنیاں بہت بڑا حجم اور بہت زیادہ سرمایہ رکھتی ہیں۔ کوئی مقامی کمپنی آزاد منڈی میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ بہت سی کمپنوں کی مالی قوت اکثر ممالک کی جی ڈی پی سے بھی زیادہ ہے۔ ۱۹۹۷ میں جنرل موٹرز کی امریکی ڈالر میں کل قیمت ناروے، پولینڈ، اسرائیل، سعودی عرب، شمالی افریقہ، فلپائن اور اسی طرح بہت سے دیگر ممالک کی ڈی جی پی سے بھی زیادہ تھی۔

ہر ملک کی مارکیٹ میں ملٹی نیشنل کمپنیوں کی اجاراہ داری کا جو منصوبہ عالمی سرمایہ داروں نے تیار کیا۔ اس کو عملی شکل دینے کے لیے اس بات پر زور دیا گیا کہ چھوٹے چھوٹے تجارتی دارے ختم ہو جائیں اور اس مقصد کے لیے عوام کے ذہنوں میں باقاعدہ تشہیری مہم سے یہ بات واضح کی گئی کہ بین الاقوامی کمپنیوں کی اشیا خریدنا ہی مہذب ہونے اور بہتر معیار زندگی کی علامت ہے۔ اور ان کمپنیوں سے خریداری کرنے میں سہولت ہے۔ اس رحجان کا آغاز امریکا سے ہوا۔ امریکا میں ذاتی دکانوں کا تناسب بہت کم ہے۔ لوگ مختلف کمپنیوں کی شاخوں سے خریداری کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں وال وارٹ سرفہرست ہے۔ اب ترقی پذیر ممالک میں بھی اسی رجحان کو فروغ دیا جا رہا ہے۔ یہ کمپنیاں اپنے سائز اور سٹرکچر کے اعتبار سے ایک مافیا کی شکل اختیار کر رہی ہیں۔ مافیا جس طرح اپنے کام کے حوالے سے بہت منظم اور سخت ترین ڈسپلن کا حامل ہوتا ہے، جہاں تک اخلاقیات اور انسانوں کے حوالے سے ان کے رویوں کا تعلق ہے تو ان کے سامنے اپنے مفادات اور مالی منفعت سے بڑھ کر کچھ نہیں اور اس مقصد کے حصول کے لیے خواہ انھیں پورے خطے، علاقے یا ملک کو نیست و نابود کرنے کے لیے جو کرنا پڑے وہ کر گزرتے ہیں۔ یہی صورتحال ان ملٹی نیشنل کمپنیوں کی ہے۔

یہ ملٹی نیشنل کمپنیاں حکومتوں کی معاشی اور سیاسی پالیسیوں پر بھی اثر انداز ہوتی ہیں یہ جس ملک میں سرمایہ کاری کرتی ہیں وہاں اپنے اثرورسوخ کی مدد سے اور حکومتی عہدے داروں اور کارندوں کو مختلف مراعات دیکر ملک کی معاشی پالیسیوں میں اپنے لیے کچھ خاص مراعات حاصل کر لیتی ہیں جو مقامی کمپنیوں کو حاصل نہیں ہوتیں۔ جس کے نتیجے میں مقامی دکاندار ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

## برانڈ کا تصور

اپنی پیداوار اور مصنوعات کے حوالے سے ان کمپنیوں نے برانڈ کا تصور متعارف کروایا۔ برانڈ کا یہ تصور دراصل عام آدمی کو نفسیاتی طور پر اپنے جال میں جکڑنے کا ایک بہت بڑا ذریعہ ہے۔ برانڈز ملٹی نیشنل کمپنیوں کی طاقت اوراجارہ داری کا اظہار ہے۔ برانڈ کا یہ تصور اپنے اندر یہ طاقت رکھتا ہے کہ وہ عام سی اشیا کو خواہش کی جانے والی اور چاہے جانے والی اشیا میں بدل دے۔ اور یہ برانڈ عوام الناس پر اس طرح چھاجاتے ہیں کہ انھیں اپنا غلام بنالیتے ہیں۔

نومی کلین اپنی کتاب No Logo میں لکھتا ہے

> "Quite simply every company with a powerful brand attempting to develop a relationship with consumers that resonates so completely with their sense of self that they will aspire, or at least, consent, to be serfs under these feudal brand lords"(1)

بہت آسانی سے ہر کمپنی اپنے صارفین کے ساتھ ایک ایسا تعلق بنانے کی کوشش کر رہی ہے کہ یہ تعلق ان کے وجود کے احساس کو ایک مزارع کی طرح برانڈوں کے جاگیرداروں کے تابع کر دیتا ہے۔

یہ کمپنیاں محض صارفین کو خریداری کا موقع فراہم نہیں کرتی بلکہ یہ ان کی زندگی کی ساخت کو اپنے مقصد کے تحت ڈھال لیتی ہیں۔ برانڈ کا مطلب ہی لائف سٹائل ہے یعنی برانڈ کے اندر زندگی گزارو۔ یہ کمپنیاں اپنے حجم اور طاقت کی وجہ سے ممالک کی معیشتوں اور عوام کے ذہنوں پر اپنی اجارہ داری قائم کر رہی ہیں۔ ترقی پذیر ممالک اپنی کمزوریوں کی وجہ سے ان کے سامراجی مفادات کے آگے مجبور ہیں۔ اور ان کمپنیوں کی سہولت کی خاطر اپنے مزدوروں کی تنخواہوں میں کمی کر رہے ہیں، معیار زندگی گر رہا ہے۔ ماحولیاتی آلودگی میں اضافہ، مقامی صنعتوں کی تباہی اور غربت میں بے تحاشہ اضافہ دیکھنے میں آرہا ہے لیکن ان مسائل کے باوجود کمپنیوں کے اپنے منافع میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ یہ ملٹی نیشنل کمپنیاں تمام دنیا کی دولت لوٹ لوٹ کر چند عالمی سرمایہ داروں کے پاس اکٹھی کر رہی ہیں۔

---

(1) Noami Klien, *No Logo* (New york : Martin Press ,2002) p 140

# عالمگیریت: ثقافتی پہلو

ثقافت کے لیے انگریزی میں کلچر (Culture) کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ کلچر میں تراش خراش کر کے درست کرنے کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ کلچر کا مفہوم ای بی ٹیلر (E. B. Taylor) نے انسائیکلوپیڈیا بریٹینیکا میں اس طرح بیان کیا ہے:

"Culture or Civilization, taken in its broad ethnographic sense, is that complex whole which includes knowledge, belief, art, morals, law, custom, and any other capabilities and habits acquired by man as a member of society."(1)

کلچر اس مجموعے یا ضابطے کا نام ہے جس میں علم، عقیدہ، آرٹ، اخلاقیات، قانون، رسوم و رواج اور دیگر تمام عادات شامل ہیں جو ایک فرد کو بطور سماج کا رکن ہونے کے حاصل ہیں۔

گویا ثقافت ایک ایسی جامع اصطلاح ہے جس میں طرزِ معاشرت اور طریقِ زندگی کے تمام نمونے لائے جاتے ہیں۔ یعنی ثقافت افکار اور نظریات میں ایسے سُلجھاؤ اور ترتیب کا نام ہے جو عملی زندگی کی بہترین بنیاد بن سکیں۔ اس میں انسانوں کے رہنے سہنے، ملنے جلنے اور کھانے پینے کے تمام طریقے آجاتے ہیں۔

معنوی اعتبار سے ثقافت اور تہذیب کو عموماً مترادف سمجھا جاتا ہے۔ اگرچہ بعض مفکرین نے ان دونوں الفاظ میں معمولی فرق کی نشاندہی کی ہے۔

فیضی اسی فرق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

(i) "Civilization, as it is said, is what we use culture, what we are, culture is the inward spirit. Civilization, an outward manifestation.

(ii) Culture is the intellectual side of civilization".(2)

اس فرق کی نشاندہی کے باوجود تہذیب و ثقافت کو مترادف استعمال کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ تہذیب و ثقافت انفرادی اور اجتماعی زندگی کی ایک ایسی بنیادی اکائی ہے جس کے بغیر معاشرے کا تصور ہی ممکن نہیں۔ اور ثقافت کسی معاشرے کے شعور اور روح کی ترجمانی کرتی ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ یہ کسی قوم کے انفرادی تشخص کو نمایاں کرنے والے عناصر کے حاصل جمع کا نام ہے۔ ثقافت کسی قوم کی منفرد تخلیقی صلاحیتوں اور منفرد خصائص کی نشو و نما کرتی ہے اور قوم کو اجتماعی نظام کے سانچے میں ڈھالتی ہے۔ جو قومیں اپنی ثقافت کے تحفظ میں ناکام ہوتی ہیں وہ انفرادی تشخص سے محروم ہو جاتی ہیں۔ اس لیے زندہ اقوام نہ صرف اپنے سماجی و سیاسی بلکہ اپنے تہذیبی و ثقافتی امور میں مداخلت کی بیخ کنی کرتی ہیں۔ لیکن موجودہ دور میں عالمگیریت نے جہاں زندگی کے دیگر شعبوں کی کایا کلپ کر دی ہے وہاں ثقافت بھی کوئی استثناء نہیں ہے۔ بلکہ یہ کہنا غلط نہیں ہو گا کہ عالمگیریت کا سب سے زیادہ اثر ثقافتی سطح پر ہوا ہے۔

---

(1) *Encyclopeadia Britannica*,(Chichago:The University of Chichago,1986)Vol 1, p 21

(2) Fyzee,Asaf A.*Islamic Culture* (Bombay:International Book House,1944) p 5

عالمگیریت کے عمل میں سب سے اہم ان مغربی اور امریکی ثقافتی اقدار و طرزِ زندگی کا پھیلاؤ ہے جو مخصوص ممالک اور اقوام کے سیاسی و معاشی مفادات کے پیش نظر ضروری ہیں۔ اس حوالے سے میلکم واٹرز لکھتے ہیں:

> "They emphasis subjectivity and cultures as central factors in the current acceleration of process."(1)

موجودہ عمل کی شدت میں مرکزی عنصر ان (عالمگیریت کے کارپردازوں) کا ثقافت اور معروضیت پر زور دینا ہے۔

مین فریڈ سٹیگر کہتے ہیں اس حوالے سے عالمگیریت کے علمبردار ایک ایسا کلچر فروغ دینا چاہتے ہیں جو سرحدوں سے ماوراہو۔

> "Cultural globalization refers to the intensification and expansion of cultural flows across the globe".(2)

مختلف معاشروں پر عالمگیریت کے ثقافتی اثرات نے بہت سے سوالات اور شکوک و شبہات کو جنم دیا ہے۔ حالانکہ یہ ثقافتی اثرات راک اینڈ رول اور کوکا کولا یا فٹ بال کی مقبولیت سے پھیلنے شروع ہوئے تاہم ثقافتی عالمگیریت کی تاریخ ان چیزوں سے کہیں زیادہ قدیم ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ثقافتی اقدار کی یہ ترسیل موجودہ دور میں پہلے سے کہیں زیادہ ہے۔ اور انٹرنیٹ اور موبائل ٹیلیفون جیسی سہولیات کی وجہ سے مختلف بیانیے زیادہ تیزی اور شدت سے دنیا بھر میں سیکنڈز میں پہنچ جاتے ہیں۔ آج ثقافتی اقدار مقامیت اور قومیت کی سرحدوں سے نکل چکی ہیں اور غالب عالمی موضوعات سے مل کر نئی معنویت حاصل کر رہی ہیں۔

عالم گیریت کے حوالے سے جو سوال سب سے اہم ہے وہ یہ ہے کہ کیا اس کی وجہ سے دنیا میں لوگ زیادہ یکساں ہو جائیں گے یا زیادہ مختلف -- اس حوالے سے معترضین کا کہنا ہے کہ ثقافتی عالم گیریت کا مقصد دنیا میں موجود مختلف ثقافتوں پر مشتمل قوس قزح کو تشکیل دینا نہیں جس میں سبھی ثقافتوں کے رنگ موجود ہوں بلکہ اس کی وجہ سے نیویارک، لندن، میلان اور ہالی وڈ میں موجود مغربی کلچرل انڈسٹری کے ذریعے یکساں مقبول عام ثقافت کا فروغ ہے۔ اور اس کا نتیجہ مقامی ثقافتوں کی معدومیت کی صورت میں نکلے گا۔ آسان لفظوں میں عالم گیریت کی اس لہر کے نتیجے میں دنیا بھر میں یکساں ثقافت یعنی یونی کلچر سوسائٹی کی بنیاد رکھی جا رہی ہے۔ اور اس کا مقصد دنیا بھر کے لوگوں کا طرز زندگی ایک جیسا کرنا ہے۔ اس کے پیچھے بھی ان کی بڑی بڑی ملٹی نیشنل کمپنیز کے معاشی و تجارتی مقاصد کار فرما ہیں۔ اس نظریے کے حامیوں کا خیال ہے کہ مغربی اطوار، رسوم اور طرز زندگی کمزور ثقافتوں کا محاصرہ کیے ہوئے ہیں۔ اسی لیے وہ عالم گیریت کو امریکنائزیشن سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ ثقافتی عالم گیریت ثقافتی سامراجیت کا دوسرا نام ہے اس سلسلے میں جارج رٹز (George Ritz) نے ایک اصطلاح Mcdonaldization of society (۳) وضع کی یہ اصطلاح خوراک کے سلسلے میں فاسٹ فوڈ ریستوران کی وسیع رینج کو بیان کرتی ہے جو امریکی معاشرے کے زیادہ سے زیادہ حصے پر غالب آ رہے ہیں اور اسی طرح باقی دنیا میں بھی خوراک کا یہ رجحان واضح نظر آ رہا ہے۔

---

(1) Walters,Malcom,*Globalization*,p 14
(2) Steger,Manfred B.*Globalization* (Oxford:Oxford University Press,2013) p 74
(3) George Ritzer,*The Mcdonaldization of Society*,(Los Angles :Sage , 2015) p 125

بظاہر تو یوں لگتا ہے، دلکش اشتہارات کے ذریعے یہ باور کرایا جاتا ہے کہ صارفین کی سہولت اور انتخاب اولین ترجیح ہے لیکن دراصل صارفین کے پاس انتخاب کے مواقع نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اور یہ فاسٹ فوڈ بظاہر خوش ذائقہ اور خوش نما ہوتی ہے لیکن ان میں کم غذائیت، چربیلے مادے کی کثرت بہت سے خطرات جن میں دل کے امراض، ذیابیطس، کینسر اور بچوں میں موٹاپے جیسے امراض کو جنم دے رہے ہیں۔ اور یہ ملٹی نیشنل کمپنیز وہ سپلائرز ہیں جو ساری دنیا پر اپنی مصنوعات تھوپنا چاہتے ہیں اور ساری دنیا ان کے لئے ایک منڈی کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور وہ جو کچھ چاہتے ہیں بیچتے ہیں۔ سرمایہ دارانہ دنیا میں ہر چیز قابل فروخت ہے۔ اپنی ان پراڈکٹس کو بیچنے کے لیے وہ لوگوں کی ذہن سازی کرتے ہیں۔ اپنی مصنوعات کی تشہیر اس انداز سے کرتے ہیں کہ ضرورتوں کا مصنوعی احساس پیدا کرتے ہیں۔ اور اس سب کے لیے ضروری تھا کہ سیاسی و ثقافتی حدبندیوں کو توڑا جائے یا کم از کم کیا جائے چاہے اس کا نتیجہ کچھ بھی ہو۔

لوئی ہیبرون (Lui Hebron) اپنی کتاب میں اے او سکاٹ جو نیویارک ٹائمز میں مووی کریٹک کے حوالے لکھتے ہیں:

> The multinational North becomes the supplier,pushing its product on the rest of the world.Or more benignly,inventing new ways to give people what they want.(1)

> ملٹی نیشنل شمال وہ پیدا کنندہ ہے جو اپنی مصنوعات باقی دنیا پر تھوپنا چاہتا ہے۔ یا نرمی سے کام لیتے ہوئے وہ طریقے ایجاد کرتا ہے کہ کیسے لوگوں کو وہ سب کچھ بیچے جو بیچنا چاہتا ہے۔

بالکل یہی بات کہ وہ میڈیا کے ذریعے اپنی مصنوعات کی طلب پیدا کرتا ہے اور اس سلسلے میں کسی اخلاقی اصول کی پاسداری اس کے لئے اہم نہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ کیسے اپنی مصنوعات کو فروخت کر کے ساری دنیا کے وسائل کو اپنے تصرف میں لایا جائے۔

اس حوالے سے لوئی ہیبرون مزید لکھتے ہیں:

> “The result unfortunately is a prescription for cultural genocide based on the power of globalization to eradicate cultural distinctiveness in vibrant Communities throughout the world.” (2)

> بدقسمتی سے عالمگیریت پر مبنی قوت ثقافتی قتل عام تجویز کرتی ہے تاکہ دنیا بھر کے زندہ معاشروں کے ثقافتی تنوع کا خاتمہ ہو۔

یہ حقیقت ہے کہ عالمگیریت کا یہ عمل تیزی سے جاری ہے۔ اور مقامی ثقافتوں کو نگلتا جا رہا ہے حالانکہ یہ بھی حقیقت ہے کہ عالمگیریت کی لہر کے نتیجے میں دنیا بھر میں جس ایک یکساں ثقافت یا یونی کلچر کی بنیاد رکھی جا رہی ہے اور دنیا بھر کے لوگوں کے طرز زندگی کو یکسانیت کے رنگ میں رنگنے کی کوشش کی جا رہی ہے وہ عملاً ممکن نہیں کیونکہ ہر علاقے کے جغرافیائی حالات، موسم، تہذیبی

---

(1) Lui Hebron ,*Globalization:debunking the myth* , p 100

(2) Ibid.

صورتحال اور سوچ کے زاویے یکساں نہیں ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ نظریہ ایک مثالی صورتحال کو پیش کرتا ہے جس کا مکمل طور پر حقیقی ظہور ممکن نہیں۔

عالمگیریت کا منشا اس پورے کرہ ارض پر ایک ہی ثقافت اور ایک ہی معاشرے کی تشکیل ہے لیکن یہ معاشرہ اور ثقافت سب ملکوں اور لوگوں کی شراکت و مشاورت سے تشکیل نہیں پائے گا، جیسا کہ اسے پانا چاہیے، بلکہ اس کا رجحان واضح طور پر بالا دست طبقے کی طرف ہے۔ اسی حوالے سے روبرٹسن( Robertson)اس ثقافتی یکسانیت کو مسترد کرتے ہوئے glocalization کی بات کرتا ہے:

> “A complex interaction of the global and local characterized by cultural borrowing.”[1]

عالمگیریت کا یہ عمل نیا نہیں۔ اس حوالے سے ۱۹۹۶ میں ہارورڈ کے سیاسی سائنسدان سیموئل ہنٹنگٹن( Samuel Huntington )نے بھی جو Clash of Civilization کا نظریہ پیش کیا وہ بھی دراصل مغرب اور باقی دنیا بالخصوص اسلام کی تہذیبی و ثقافتی اقدار کے درمیان کشمکش کا ہی نظریہ ہے جو آج ہمیں عالمگیریت کی صورت نظر آرہا ہے۔

> "He Says: What we westerners see as benign global integration such as the proliferation of worldwide media now. Nonwestern see as nefarious Western imperialism."[2]

گلوبلائزیشن کے اس معاشی انقلاب نے تین کلچر پیدا کیے ہیں۔ کارپریٹ کلچر، کمیونیکیشن کلچر اور ماس کلچر۔ کارپریٹ کلچر کے پیرو ملٹی نیشنل ہیں جو پاپولر کلچر کو رد کرتے ہوئے ایک مصنوعی Mass Culture پیدا کرتے ہیں۔ جیسے پاکستانی تھیٹر میں ہالی وڈ کے ساؤنڈ ٹریکس پر کھیلے جانے والے ڈرامے، جیسے پاپ میوزک جن کی پاکستان میں کوئی جڑیں نہیں لیکن جنہیں ملٹی نیشنل کمپنیاں نہایت فراخدلی سے سپانسر کرتی ہیں۔

اور یہ Mass Culture کیا ہے؟

مغربی لباس، مغربی خوراک، مغربی طرز زندگی اور مغربی ذوق کو ترقی اور روشن خیالی کی علامت قرار دینا اور تمام غیر مغربی اقدار و روایات کو فرسودہ اور پسماندہ سمجھنا۔ یہی تصور عالمگیریت کے زیر اثر میڈیا سے زور و شور دن رات عوام الناس کے کانوں اور آنکھوں کے ان کے دماغوں میں انڈیلا جارہا ہے۔ تاکہ وہ اپنی علاقائی شناخت، اپنی مقامی اقدار و روایات اپنی ثقافت کے حوالے سے احساس کمتری کا شکار ہو کر اس سے لاتعلقی اختیار کر لیں۔

اکثر ماہرین کے نزدیک عالمگیریت کے معاشی و سیاسی اثرات کے مقابلے میں ثقافتی اثرات بہت اہم ہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام تمام دنیا پر ایک ایسی ثقافت کے نفاذ کا متقاضی ہے جو کہ مغربی ثقافت ہو گی۔ میڈیا چونکہ ثقافتی عالمگیریت کا ایک اہم ذریعہ ہے اس لیے

---

(1) Steger B.Manfred ,*Globalization*, p 80

(2) Huntington,Samual phillip, *The Clash of Civilizations and Remaking of World Order* (London:Touchstone Books,1998) p 67

دنیا کی غالب اور بالادست طاقتوں نے اپنے مفادات کے تحفظ کے پیش نظر مخصوص عالمی ثقافت کے فروغ کے لیے میڈیا پر اجارہ داری اور کنٹرول کو اہم قرار دیا۔ انتھونی گڈنز نے اسے میڈیا کی استعماریت کا نام دیا۔

> "The paramount position of the industrialized countries, above all the United States in the production and diffusion has led many observers to speak of media imperialism. According to this view, a cultural Empire has been established… less developed countries are held to be more vulnerable because they lack resources with which to maintain their own Cultural Independence."(1)

پیداوار اور اس کی ترسیل میں صنعتی ممالک بالخصوص امریکا کی برترحیثیت کو ناقدین نے میڈیا کی سامراجیت کا نام دیا ہے۔ اس نقطہ نظر کے مطابق ایک نئی سلطنت قائم ہو چکی ہے۔ کم ترقی یافتہ ممالک کمزور حیثیت رکھتے ہیں کیونکہ ان کے پاس ان وسائل کی کمی ہے جن کے ذریعے وہ اپنی ثقافتی آزادی کا تحفظ کر سکیں۔

کیبل نیٹ ورک کی آمد سے قبل مختلف خطوں کے لوگ مغربی ثقافت اور صارفیت سے بے خبر تھے اور عالمی ثقافت ورحجانات کے بارے میں لاعلم تھے جس کی وجہ سے مقامی اور علاقائی ثقافتیں عالم گیریت کے اثرات سے محفوظ تھیں۔ جب سے غیر ملکی سرمایہ کاری کو پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا تک رسائی ملی تو ان خطوں اور دنیا بھر میں مغربی ثقافت پھیلنے لگی۔ ٹرانس نیشنل کمپنیوں نے الیکٹرانک میڈیا میں سرمایہ کاری کے سابقہ تجربات سے یہ نتیجہ نکالا کہ عوام کو اپنی اشیاء خریدنے کے لیے متحرک کرنے کے لیے پریس کو کنٹرول کرنا ضروری ہے۔ میڈیا کی سرمایہ کاری کا ان کا یہ فیصلہ بہت سود مند ثابت ہوا اور اس طرح مغربی خاص طور پر امریکن ثقافت کو عالمی سطح پر فروغ دینے اور اس کی نشرواشاعت میں کافی مدد ملی۔ نئے دور میں پریس اور میڈیا کا نیا کردار متعین ہو گیا ہے جو کہ محض ملکی اور مقامی خبروں اور مسائل و مشکلات کے بیان پر مشتمل نہیں ہو گا بلکہ اس میں ہالی وڈ کی خبریں، فوڈز اور میکڈونلڈ کے اشتہارات اور اسی طرح دیگر کارپوریشنز کی تشہیر ہو گی۔ پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا پر ان کارپوریشنز کی اجارہ داری قائم ہو گئی۔

## کلچر انڈسٹری کا فروغ

تجارت کے آزاد ہونے کی وجہ سے ثقافت کی صنعت بھی تیزی سے ترقی کر رہی ہے۔ ثقافتی اشیاء سے مراد وہ اشیاء ہیں جو اپنے ساتھ کچھ خاص تصورات و نظریات اور ایک خاص طرز زندگی کا تصور رکھتی ہیں۔ یونیسکو کے مطابق گذشتہ دو تین عشروں میں ثقافتی

---

(1) Giddens,Anthony ,*Socology* (Cambridge:polity press,2006) p 626

اشیاء مثلاً پرنٹ شدہ مواد، ریڈیو، دستکاری، فیشن، ٹی وی، سینما اور کھیلوں کے سامان وغیرہ کے عالمی پھیلاؤ میں قابل ذکر اضافہ ہوا ہے۔ ۱۹۷۰ سے ۸۰ء کے دوران ثقافتی درآمدات و برآمدات میں تقریباً چھ فیصد اضافہ ہوا ہے۔[۱]

ثقافتی انڈسٹری کو فروغ دینے میں ذرائع ابلاغ اور جدید ٹیکنالوجی نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ ٹیکنالوجی کی وجہ سے ٹی وی سیٹ کی تعداد میں بہت اضافہ ہو گیا ہے۔ یہ اضافہ ۱۹۶۵ء میں فی ہزار باشندے ۵۷ تھا۔ ۱۹۸۰ء میں ۱۱۳ ہوا۔ ۱۹۹۵ میں ۲۲۹ اور ۲۰۰۰ میں ۲۴۳ ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی چینلوں کی تعداد میں بہت اضافہ ہو گیا۔ انٹرنیٹ استعمال کرنے والوں کی تعداد تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ یہ تعداد ۱۹۹۴ میں ۳۰ ملین تھی جو ۲۰۰۲ میں بڑھ کر ۵۰۸٫۷۷ ملین ہو گئی۔ انٹرنیٹ استعمال کرنے والوں کی تعداد میں یہ اضافہ غیر معمولی تھا۔ انٹرنیٹ نے ۵ ملین کی تعداد تک جاتے ہوئے صرف چار سال لیے ہیں۔ اگر ان چار سالوں کا مقابلہ ریڈیو کے ۳۸ سالوں اور ٹی وی کے ۱۴ سالوں سے کیا جائے تو یہ اضافہ غیر معمولی ہے۔[۲]

اس حوالے سے (Hasmondalgh) ہیسمنڈ اپنی کتاب میں لکھتے ہیں

ثقافت کی صنعت کاری تباہ کن ہے۔ ثقافتی صنعت گھٹیا اور نقلی چیز کو ظاہری طور پر خوبصورت بنا کر عوام الناس کی بڑی تعداد کے سامنے پیش کر رہی ہے اور یہ سب یک طرفہ ذرائع ابلاغ کے ذریعے ہو رہا ہے۔

وہ مزید کہتا ہے کہ افراد کے انتخاب کرنے اور لطف اندوز ہونے کی صلاحیت اس صنعت کے گرد گھوم رہی ہے۔ آغاز میں ان افراد کا رویہ ان مصنوعات کے حوالے سے تشکیک کا ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ بعد میں ان کا رویہ اس قیدی جیسا ہوتا ہے جو اپنے پنجرے سے صرف اس لیے محبت کرتا ہے کہ اس کے پاس محبت کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں ہوتا۔[۳]

کلچر انڈسٹری کا مطلب ذاتی اہلیت کا گم ہونا، طلب کا انحطاط پذیر ہونا، دیگر ممکنات کو تصور کرنے کی نا اہلیت میں اضافہ، رائے، ذائقے اور رویئے کی یکسانیت ہے جو مارکس کے اس نظریئے کی تصدیق کرتی ہے کہ جو لوگ مادی ذرائع کو کنٹرول کرتے ہیں وہی پیداوار کے نظریاتی ذرائع کو بھی کنٹرول کرتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں کسی دور میں غالب آنے والے تصورات ہمیشہ حکمران طبقے کے خیالات ہی ہوتے ہیں باقی عوام الناس تو آنکھیں بند کر کے ان کے پیچھے چلتے ہیں۔

تفریحی اور معلوماتی صنعت خاص مقاصد کے پیش نظر کچھ خاص رویے اور عادات ساتھ لے کر آتی ہے اور قارئین پر ایک خاص جذباتی اثر اور رد عمل طاری ہو کر رہتا ہے جو کہ صنعت کاروں کا مطمع نظر ہوتا ہے۔ یہ لوگ ایک خاص دانش اور جھوٹے شعور و آگہی کو فروغ دیتے ہیں جسے جھوٹا بھی نہیں کہا جا سکتا۔

---

(1) David Held,*A Globalizing World?Culture,Economics and Politics* (New York:Routledge,2000) p 49

(2) Chamsyel Ojeili and Patrick Hayden ,*Critical Theories of Globalization* (Basingstock:Palgrave Macmillon,2007) p136

(3) David,Hasmondalgh ,*The Culture Industries* (London:Sage Publications,2002) p 102-106

دنیا بھر میں چند ایک نیوز ایجنسیاں ہیں جو دنیا بھر کی خبروں کا تقریباً ۸۰ فیصد تیار کرتی ہیں۔ اور کچھ بڑی بڑی ملٹی نیشنل کمپنیاں ہیں مثلاً اے او ایل، ٹائم وارنر، ڈزنی، اے بی سی نیوز کارپوریشن، بی بی سی نیوز عالمی سطح پر معلومات اور تفریح کے بڑے حصے کو کنٹرول کرتی ہیں۔ اور ان سے بہت سی آمدنی حاصل کرتی ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ یہ فرمیں جو اخبارات، میگزین کتابیں شائع کرواتی اور متحرک فلمیں تیار کرتی ہیں ان کی تعداد کم ہوتی جارہی ہیں۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ یہ آپس میں اتحاد کر لیتی ہیں۔ اس لیے مواصلاتی محاذ کی طاقت سے مراد ثقافتی اشیاء کی پیداوار اور تقسیم پر ان کا بے پناہ غلبہ ہے۔

دوسرے لفظوں میں اس اتحاد سے میڈیا کو مرکزیت عطا کر کے معاشرے پر غلبہ پانے کی صلاحیت حاصل کی جارہی ہے۔ یہ صورتحال جمہوریت کے لیے خطرہ ہے۔ کارپوریشنوں کی سوچ محض کاروباری مفاد تک محدود ہوتی ہے اور کاروباری مفادات کے پیش نظر ان اشتہارات کو ترتیب دیا جاتا ہے۔ مثلاً بچوں کے لیے جو اشتہارات بنائے جاتے ہیں ان کا مقصد انہیں مستقبل کا ذمہ دار شہری بنانا نہیں ہوتا بلکہ میڈیا ان کو صرف فاسٹ فوڈ، کپڑوں اور کھلونوں کے صارف کے طور پر ہدف پر رکھتا ہے۔ بہت سے تجزیہ نگاروں کے مطابق اجارہ داری کے اثرات ایسے پروپیگنڈہ کی صورت میں نظر آتے ہیں جس میں سچائی، جمہوریت، آزادی، مساوات جیسی اقدار کی نفی ہوتی ہے حالانکہ یہی اقدار عالمگیریت کا بنیادی نعرہ ہیں۔ اس حوالے سے نوم چومسکی کا کہنا ہے:

> "In cultures where the levers of power are in the hands of a state bureaucracy, the monopolistic control over the media often supplemented by official censorship means it clear that the media serve the ends of a dominant elite".(1)
>
> ان ممالک میں جہاں طاقت و قوت کے مراکز حکومت کی نوکر شاہی کے ہاتھوں میں ہیں اوراجارہ دارانہ کنٹرول سرکاری نوکر شاہی کے پاس ہو میڈیا پر سینسر شپ سے اکثر و بیشتر واضح ہو جاتا ہے کہ میڈیا حاکم اشرافیہ کے مفادات کا تحفظ کرتا ہے۔

نوم چومسکی میڈیا پر اثر انداز ہونے والے عناصر کی نشاندہی کرتے ہیں جو لوگوں کی قوت مشاہدہ پر اثر انداز ہوتے ہیں، رائے سازی کرتے ہیں اور بالادست طبقے کے مفادات کے تحفظ کے لیے یہ سارے اقدامات کرتے ہیں۔ ان میں پہلا عنصر میڈیا مالکان، دوسرا عنصر اشتہارات جو میڈیا کے لیے فنڈز جمع کرنے کا ذریعہ ہیں۔ یہ اشتہارات دینے والے خبروں اور دیگر پروگراموں میں مواد کے حوالے سے دباؤ ڈالتے ہیں۔ تیسرا عنصر میڈیا کا حکومت، کاروبار اور ماہرین پر اعتماد ہے۔ اس سلسلے میں میڈیا کا رویہ محتاط ہونا چاہیے۔ چوتھا عنصر بااثر طبقے کی طرف سے کی جانے والی تنقید ہے،

---

(1) Noam Chomskay, and Herman Edward, *Manufacturing Consent, The Political Economy of the Mass Media* (New York: Pantheon Books, 2002) p 1

مختصر یہ کہ ثقافتی صنعت جمہوریت، اظہار رائے کی آزادی، اور صداقت کو تباہ و برباد کر رہی ہے، تعداد میں کم لیکن با اثر کارپوریشنز ہمیں فراہم کی جانے والی معلومات کا بڑا حصہ کنٹرول کرتی ہیں اور وہی معلومات عوام تک پہنچائی جاتی ہیں جو مخصوص بالادست طبقے کے مفادات کے لیے فائدہ مند ہوں۔

ثقافتی انڈسٹری دراصل ثقافتی استعماریت کا ایک ذریعہ ہیں۔

ثقافتی استعماریت کی وضاحت نیو فونٹانا ڈکشنری( New Fontana Dictionary ) میں اس طرح کی گئی ہے۔

> The use of political and economic power to exalt and spread the values and habits of a foreign culture at the expense of a native culture.(1)
>
> یعنی غیر ملکی ثقافتی اقدار اور عادات کو مقامی ثقافت کی قیمت پر پھیلانا اور اس کی مدح سرائی کرنا ثقافتی استعماریت ہے۔

ثقافی استعماریت کو بیان کرنے کے لیے کچھ دیگر اصطلاحات Wextoxification, Disneyfication, اور Cocacolonization بھی استعمال کی جارہی ہیں۔ ان اصطلاحات سے واضح ہوتا ہے کہ ثقافتی طور پر مغرب کی اجارہ داری، زیادہ مخصوص کیا جائے تو اسے امریکی اجارہ داری بھی کہا جاسکتا ہے۔ دنیا کے باقی خطے محض صارف کی حیثیت رکھتے ہیں۔

عالم گیریت کی اس دنیا کو ناقدین McWorld کا نام بھی دیتے ہیں، یعنی ہر طرف ایک ہی سوشل آرڈر۔ اس میک ورلڈ کے نتیجے میں سماجی تنظیموں کا مقصد محض نفع کمانا ہی ہوگا۔ فرد کی تمام حیثیات ختم ہو کر صرف صارف کی حیثیت باقی رہ جائے گی اور اجتماعی مفاد، معاشرے کی بھلائی اور جمہوریت کا فروغ جیسی اقدار ختم ہو جائیں گی۔

ثقافت کو کنٹرول کرنے والا یہ طبقہ اکیسویں صدی کی اہم ترین معاشی قوتیں ہیں۔ اس کی مثال ہم اشتہارات کی دنیا میں دیکھ سکتے ہیں جو کہ ۱۹۵۰ء کے دور سے تمام دنیا میں تیزی سے پھیلے ہیں۔ ۱۹۵۰ میں ۴۵ ملین اشتہارات پر خرچ ہوئے تھے ۱۹۹۸ تک یہ عدد ۴۱۳ بلین ڈالر تک پہنچ گیا۔ لوگ ہر روز بڑی رقم اشتہارات پر خرچ کرتے ہیں۔ اوسطاً ۲۵۴ امریکی اشتہار ہر روز تیار ہوتے ہیں۔ اس سیکٹر پر امریکہ کا غلبہ ہے اور امریکی کمپنیاں ۲۰ سرفہرست عالمی کمپنیوں میں سے ہیں۔(۲)

اشتہارات کی یہ وسعت ایک مصنوعی McWorld کے غلبہ کی علامت ہیں۔ اشتہارات اور مارکیٹنگ کے نت نئے طریقوں سے لوگوں میں ضروریات اور خواہشات پیدا کی جاتی ہیں پھر ان خواہشات کی تکمیل کو مخصوص اشیاء سے جوڑا جاتا ہے۔ عالمی سطح پر ایک

---

(1) Alan Bullock, Stephen Trombleyand Alf Lawrie, *The New Fontana Dictionary of Modern Thought* (London:Harpar Collins,1999) p 419

(2) Chamsyel Ojeili and Patrick Hayden,*Critical Theories of Globalization* ,p141.

صارف کلچر تشکیل دیا جارہا ہے، جہاں لوگوں کے تمام خواب نائیک، کوک، میکڈونلڈ، کے ایف سی، سٹار وارز، بے واچ اور پاپ میوزک کے گرد گھومتے ہیں۔ سامعین میں ایسی اقدار، ضروریات اور خواہشات انڈیلی جارہی ہیں جو کہ منڈی کے پھیلاؤ کے لیے ضروری ہیں۔ گلوبلائزیشن کے فوائد کے دعوؤں کی بھی ٹیلیویژن اور فلموں میں تشہیر کی جاتی ہے۔ شاپنگ مال کے موضوعات نئ گلوبل مارکیٹ کی شان و شوکت کو بڑھتے ہوئے صارفین کے انتخاب اور فرد کی خواہشات کی تکمیل کے تناظر میں بیان کرتے ہیں۔ شہزادی ڈیانا کی کہانی، اور اس طرح کی کہانیاں زیادہ حقیقی اور خبر کے قابل بن گئی ہیں اور غربت کے خلاف مزاحمت، عدم مساوات، لوگوں کا بے گھر ہونا اور ماحول کی خرابی کی عکاسی کم ہو رہی ہے۔[۱]

ثقافتی صنعت جن اشیا کو پیدا کر رہی ہے ان کی بڑی منڈی بھی تیسری دنیا کے ممالک ہیں۔ جہاں سب سے بڑا مسئلہ غربت ہے۔ وہاں بھی ان اشیا کی مصنوعی طلب پیدا کر کے ان کے تن خستہ سے رہی سہی خون کی بوندیں نچوڑ کر اس عالمگیر تہذیب کے رخساروں کے لئے غازہ فراہم کرنے کا سامان کیا جارہا ہے اس حوالے سے Critical Theories of Globalization کے مصنفین کا کہنا ہے

ثقافتی اشیاء کا بہاؤ بہت غیر مساوی ہے۔ اور یہ واضح طور پر ثقافتی اجارہ داری کی نشاندہی کرتا ہے۔ ایک رپورٹ کے مطابق ثقافتی اشیا کی برآمدات کا ۵ / ۴ حصہ صرف ۱۲ ممالک کے کھاتے میں جاتا ہے۔[۲]

مجموعی طور پر چار بڑے ممالک امریکہ، برطانیہ، جرمنی اور فرانس ثقافتی تجارت پر غالب ہیں، چین ان چاروں کا نیا حصہ دار بن رہا ہے۔

الیکٹرانک میڈیا پر بھی مغرب واضح طور پر غالب نظر آتا ہے۔ فلم سازی میں امریکہ کی پیداوار کا ۸۶ فیصد حصہ تمام دنیا میں پھیلے ہوئے امریکی سامعین سے حاصل ہوتا ہے۔ MTv ملینز کی تعداد میں گھروں میں داخل ہو گیا، برنگز مین میوزک گروپ، ای ایم آئی، دی وارنر میوزک گروپ، سونی اور یونیورسل میوزک گروپ تمام دنیا کی خریداری کا ۸۰ فیصد کنٹرول کرتے ہیں۔[۳]

---

(۱) سید عظیم، ڈبلیو ٹی او اور گلوبلائزیشن، ص ۳۷۹

(2) Chamsyel Ojeili and Patrick Hayden ,*Critical Theories of Globalization*, p 98

(3) Ibid

## صارف کلچر کا فروغ

ثقافتی صنعت اور میڈیا پر امریکی اور مغربی اجارہ داری کے ذریعے مغربی تہذیب و ثقافت، اقدار و روایات کو فروغ دیا جارہا ہے۔ دنیا کا ثقافتی تنوع ختم ہو رہا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ اس ثقافتی یلغار کے نتیجے میں دنیا پر مسلط کی جانے والی یہ مغربی اقدار اور روایات صحت مند ہر گز نہیں ہیں بلکہ ایک کنزیومر کلچر عوام الناس کے ذہنوں میں ٹھونسا جارہا ہے۔

خالد رحمٰن اپنے مضمون The Role of MNCs and TNCs and their Socio-Economic Impact on Host Societies میں لکھتے ہیں کہ

> "The type of development, being promoted is based on mere material gains. Luxuries and comforts are being turned into needs and necessities. Thus happiness and satisfaction are being associated with luxuries and their acquisition. Thanks to MNCs, "the consumption culture" has over taken almost the whole world. The presentation and cosmetic measures matters the most. Whether a product is really needed or not, how is it being presented determines its sale.The models change very fast and the older ones lose its relevance in a short span of time… This resulted in an overwhelming impact on societies." (1)

اس کے بعد وہ سماج پر اس صارف کلچر کے جن اثرات کو پیش کرتے ہیں وہ بہت ہولناک ہیں۔ جس میں احساس محرومی، جرائم میں اضافہ، صحت کو لاحق سنگین مسائل شامل ہیں۔

ملٹی نیشنل کمپنیاں اور دیگر غیر ملکی ایجنسیاں اشتہارات کے ذریعے نہ صرف نئی نئی اشیاء کو متعارف کرواتی ہیں بلکہ وہ دعویٰ بھی کرتی ہیں کہ اگر ان کو نہ خریدا گیا تو ہم کسی اہم چیز کا نقصان کر لیں گے۔ اس کے علاوہ انعامی سکیموں کا جال بھی بچھایا جاتا ہے۔ عالمگیریت کے تحت آزاد منڈی کا فلسفہ افراد کو اپنی مرضی سے خریدنے کی اجازت دیتا ہے تو دوسری طرف اربوں ڈالر پانی کی طرح بہا کر ذہن سازی کی جاتی ہے اور عوام کے ذہنوں کو اپنی مصنوعات خریدنے پر آمادہ کرنے کے لیے مختلف حربے استعمال کیے جاتے ہیں۔

اشتہارات کی پوری صنعت ایک دھوکہ ہے۔ پراڈکٹس جو نہیں ہوتیں وہ زبردستی بنا کر پیش کی جاتی ہیں۔ باقاعدہ پراڈکٹ کو اس کے میرٹ کی بجائے اسٹیٹس سمبل اور سیکس کے ساتھ جوڑ کر پیش کیا جاتا ہے اور ایڈورٹائزنگ سے چیزوں کو ان کے میرٹ پر فروخت کرنے کا طریقہ کب کا دفن ہو چکا ہے۔ ایڈوٹائزنگ کا اصل ہدف انسانوں میں ایک بے اطمینانی پیدا کرنا ہے جس کا حل پھر وہ

---

(1) Khalid Rehman,*The Role of MNCs and TNCs and Theit Socio-Economic Impact on Socities included in Globalization:Economic ,Social and political Dimensions* (Karachi:University of Karachi,2007) p39

پراڈکٹ ہوتی ہے۔ مثلاً ایک کچن صاف کرنے کی پراڈکٹ کو اس طرح فروخت کیا جائے کہ ایک بہت ہی صاف ستھرا گھر دکھا کر کسی شخص کی صاف گھر کی محرومی کو اجاگر کیا جائے۔ پھر اس پراڈکٹ کو ایک صاف گھر کے ساتھ جوڑ دیا جائے۔ اگر یہ حملہ گارگر نہ ہو تو اگلے مرحلے میں ثابت کیا جائے گا کہ اس کے کچن میں بڑے جراثیم ہیں۔ اسی طرح بڑی بڑی گاڑیاں لوگ اس لیے نہیں خریدتے کہ ان کو ضرورت ہوتی ہے بلکہ اس لیے خریدتے ہیں کہ ان کو خریدنے والا انسان بڑا انسان ہوتا ہے۔ حالانکہ اگر میرٹ پر دیکھا جائے تو نہ لوگوں کو ان گاڑیوں کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ ماحول اس کی اجازت دیتا ہے۔ اسی طرح کریڈٹ کارڈ کی خریداری لوگوں کے نزدیک سپیشل ہونا ہے۔[1]

برانڈ کا تصور ایک اہم تصور ہے جس نے لوگوں کے انداز کو تبدیل کر دیا ہے۔ اکثر اوقات صارفین کو یہ علم نہیں ہوتا کہ وہ خریدنا کیا چاہتے ہیں اور یہ خریداری کس مقصد کے تحت ہے۔ تمام معاشرے برانڈ پر انحصار کر رہے ہیں۔

پچھلے پندرہ سالوں میں برانڈ کا کردار تبدیل ہو گیا ہے۔ اب برانڈ کسی پراڈکٹ کے معیار کی ضمانت کی بجائے خود ایک پراڈکٹ بن گیا ہے۔ اصل پراڈکٹ محض ایک ذریعہ بن جاتی ہے، اس صارفیت کی وجہ سے انسان کی ضروریات کی تکمیل نہیں ہوتی بلکہ ضروریات مزید بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ ایک لامختتم سلسلہء ضروریات جو دراصل ضروریات نہیں بلکہ اشتہارات کی وجہ سے پیدا کردہ خواہشات ہیں۔ ذرائع ابلاغ اور انٹرنیٹ کی وجہ سے ہر طرف تیز رفتاری ہے۔ ہر کوئی مادی اشیاء کے حصول کی دوڑ میں شامل ہے لیکن ہر فرد وہ سب کچھ حاصل نہیں کر سکتا جو وہ چاہتا ہے یا جس کی خواہش اس میں پیدا کی جاتی ہے۔ محض برانڈ اور مادی اشیاء پر انحصار کر کے زندگی کو حقیقی معنی نہیں دیے جاسکتے۔ موجودہ دور میں صارفین ہمیشہ اپنی ادھوری خواہشات کے جال میں الجھے رہتے ہیں۔ اسی وجہ سے عدم اطمینان اور بے سکونی بڑھ رہی ہے۔ باہمی احترام اور خوبصورت اقدار و روایات اب ماضی کا قصہ بن چکی ہیں۔

سید عظیم اپنی کتاب ڈبلیو ٹی او اور گلوبلائزیشن میں لکھتے ہیں:

> "انسانی ضرورتیں کچھ اور ہوں اور مارکیٹنگ سر میں ہتھوڑے برسا کر اور چیزوں کی طرف راغب کر رہی ہو تو انسان کی شخصیت جس انتشار کا شکار ہوتی ہے وہ اسے بے ارادہ اور بے مقصد بنا دیتی ہے۔ اور اصل بات کہ اس کو بے عقل بنا دیتی ہے۔ وہ اپنے وسائل اور مسائل کی عقلی توجیہ سے قاصر درست سوچ کے رستے سے ہٹا دیا جاتا ہے۔ اور وہ اپنی غربت سے بھری دنیا سے دور ایک اشتہار کی دنیا میں رہنا شروع کر دیتا ہے۔ جہاں اس کو اس کی نئی اور نا ختم ہونے والی ضرورتوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ یعنی وہ اپنے حقیقی ارد گرد کے کلچر سے دور ایک کنزیومر کلچر میں چلا جاتا ہے جس کا اُس سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ انسان چلتا پھرتا

(۱) سید عظیم،ڈبلیوٹی او اور گلوبلائزیشن، ص ۳۸۹-۳۹۰

روبوٹ بن گیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ صبح کوئی ان کا بٹن دباتا ہے وہ رات گئے تک چیزیں پیدا
کرتے رہتے ہیں کیونکہ میڈیا ان کو ہر دو سیکنڈ بعد دکھاتا ہے کہ اس چیز کے آنے سے خاندان
یا شخص خوش ہوتا ہے۔ اگر انسان چند گھنٹے ٹی وی دیکھے تو اسے درجن اشیاء کی ضرورت کا
احساس بیدار ہو جاتا ہے۔[1]

اس صارفی کلچر کا نتیجہ خود غرضی اور مادیت پرستی کی صورت میں نکلتا ہے۔ جس کی وجہ سے بہت سے سماجی مسائل پیدا ہو رہے ہیں، جیسے جرائم، منشیات اور خاندان کا ٹوٹنا بکھرنا وغیرہ۔ مادی چیزوں کی خواہش انسان کو جرائم کے ارتکاب تک لے جاتی ہے اور رفتہ رفتہ پورا معاشرہ اس بیماری کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہ بیماری عالم گیریت کے نام پر پھیلائی جا رہی ہے۔

زیادہ سے زیادہ خواہشات کی تکمیل کے لیے زیادہ دولت اکٹھی کرنے کی ہوس کو جنم لیتی ہے۔ دولت کے حصول کی اس دوڑ میں والدین بچوں کو ڈے کیئر سنٹرز میں چھوڑ کر خود دن رات کام کرنے اور دولت اکٹھی کرنے میں مصروف ہیں۔ والدین میں سے دونوں کا ملازمت کرنا بچوں کی تربیت میں خلا کا باعث بنتا ہے۔ بچے توجہ سے محروم ہو کر دماغی بے ترتیبی کا شکار ہو جاتے ہیں۔

> "Departmental stores and shopping malls/ plazas are cropping up everywhere—further adding to the consumption culture and the habit of living beyond means. Eating and food habits are also changing. Fast food which is considered junk food in the developed world is becoming increasingly popular. Eating out, late night parties, alcohol, cigarettes, refrigerators load with processed and international branded munchies or instant meals is the life style of those regarded as most successful".[2]

ڈیپارٹمنٹل سٹورز، شاپنگ مالز اور پلازے ہر طرف نظر آ رہے ہیں۔ صارفی کلچر اور چادر سے بڑھ کر پاؤں پھیلانے کی عادت کے ساتھ ساتھ کھانے پینے کی عادات تبدیل ہو رہی ہیں۔ ترقی یافتہ ممالک میں فاسٹ فوڈ جسے بے کار اور ردی خوراک سمجھا جاتا ہے اب تیزی سے مقبول خوراک بنتی جا رہی ہے۔ باہر کھانا کھانا یعنی ہوٹل میں کھانا، رات دیر تک تقریبات کا انعقاد، نشہ آور مشروبات کا استعمال سگریٹ اور بین الاقوامی برانڈ کے تیار شدہ کھانوں سے بھرے فریج ان لوگوں کے طرز زندگی کی علامت سمجھے جا رہے ہیں جو ترقی یافتہ اور کامیاب لوگ ہیں۔

ایک اور اہم پہلو جس کی طرف خالد رحمٰن اشارہ کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ اشتہارات میں جن لوگوں کو پیش کیا جاتا ہے وہ نوجوان نسل کے لیے ایک رول ماڈل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس سارے عمل میں اخلاقی پہلو کی کوئی جگہ نہیں۔ یہ لوگ زیادہ تر فلم اور فیشن

---

(۱) سید عظیم، ڈبلیو ٹی او اور گلوبلائزیشن، ص ۳۸۹

(2) Khalid Rehman, *Globalization: Economic, Social and Political Dimension*, p 39

انڈسٹری سے تعلق رکھتے ہیں لہٰذا ان کی نقالی کرنا اور ان اشیاء کو خریدنا نوجوانوں کی بڑی خواہش بن جاتی ہیں۔ اسکے علاوہ MNCs مقابلہ حسن، میوزک کنسرٹ، اسٹیج ڈراموں، فیشن شوز جیسے تقریبات کا انعقاد کرکے لوگوں کو ان پراڈکٹس کی خریداری پر آمادہ کرتی ہیں۔

عالمگیریت کے ثقافتی اثرات خوراک، لباس، تہذیب، طرز زندگی، تفریح کے ذرائع، سیاسی نظام، مذہب وغیرہ پر نمایاں طور پر مرتب ہو رہے ہیں۔ ان میں سے چند اہم اثرات کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

## خوراک

عالمگیریت کے اثرات کے تحت دنیا بھر میں کھانے پینے کی عادات بھی تبدیل ہو گئی ہیں اور فاسٹ فوڈ کا رجحان تیزی سے مقبول ہوا ہے۔ نوجوانوں کی مرغوب ترین غذا برگر کے بارے میں لوگ کم ہی جانتے ہوں گے کہ یہ جرمنی کی مقامی خوراک ہے۔ اسی طرح پیزا، اسپیگٹیز، میکرونی اور پاستا کا تعلق اٹلی سے ہے۔ شاشلک، منچورین اور سوپ کا تعلق چین سے ہے۔ کوکا کولا، پیپسی امریکی پیداوار ہیں۔ لیکن یہ تمام اشیائے خورونوش اب پوری دنیا میں یکساں طور پر استعمال کی جارہی ہیں۔ میکڈانلڈ، کے ایف سی، سب وے، چائنیز، اطالوی، میکسیکن ریستورانوں کی شاخیں دنیا بھر میں پھیلی ہوئی ہیں۔ رشین سلاد بھی دنیا بھر میں ذوق وشوق سے کھایا جاتا ہے۔

عالمگیر کھپت کو مدنظر رکھتے ہوئے بین الاقوامی کمپنیوں نے پسماندہ ممالک کے کاشتکاروں کو نئی فصلیں کاشت کرنے کی ترغیب دی ہے جو پہلے ان ممالک میں کاشت نہیں کی جاتی تھیں۔ مثال کے طور پر وسطی افریقہ کے ملک برکینا فاسو میں مٹر کی کاشت شروع کی گئی ہے تاکہ پیرس کے ریستورانوں میں مٹر کی بڑھتی ہوئی مانگ کو پورا کرنے کے لیے برازیل پر انحصار کم کیا جاسکے۔ یہ برکینا فاسو کے لیے ایک غیر روایتی فصل ہے جو عالمگیریت کے رجحان کے تحت وہاں کاشت کی جارہی ہے۔ غیر روایتی فصلوں کے ورود سے روایتی فصلوں کی کاشت متاثر ہوئی ہے اور روایتی نظام زراعت بھی تبدیل ہو گیا ہے۔ افریقی کیلا، چلی کا انگور، کیلی فورنیا کے سنگترے دنیا بھر میں دستیاب ہیں۔ اسی طرح دیگر ممالک میں پائے جانے والے پھل مثلاً جاپانی پھل (کی)، سٹرابری، چیری، پائن ایپل وغیرہ بھی اب ہمارے روزمرہ کا حصہ ہیں۔ اسی طرح پیکٹوں میں بند خوراک کا رجحان فروغ پارہا ہے۔ اس عمل کو ہمارے شاعروں نے بھی اپنی شاعری کا حصہ بنایا ہے، جیسے منصور آفاق لکھتے ہیں:

فش اینڈ چپس سے اکتا گیا ہوں اب منصور
بس ایک ذائقے کا وصل چھوڑنا ہے مجھے[1]

عالمگیریت نے دنیا بھر میں نظام خوراک کو تبدیل کر کے رکھ دیا ہے، مختلف علاقوں کی یہ خوراک ساری دنیا میں یکسانیت سے فروغ پارہی ہے۔

(۱) منصور آفاق، نیند کی نوٹ بک (لاہور: اساطیر، ۲۰۰۴) ص ۱۱۴۴

## لباس

عالمگیریت کی اس لہر نے دنیا بھر کے مختلف معاشروں میں لباس کے ضمن میں بنیادی تبدیلیاں پیدا کی ہیں۔ ہمارے روایتی معاشرے میں برطانوی سامراجیت کے زیر اثر کلونیل پیریڈ میں پہلے پہل پتلون کا چلن صرف انگریزوں کے حامی اور مراعات یافتہ طبقے میں ہوا اور عمومی طور پر اس کو برا سمجھا گیا لیکن آہستہ آہستہ یہ لباس عوام میں بھی مقبول ہو گیا۔ آج کی نوجوان نسل اس لباس کو مکمل طور پر اپنا چکی ہے اور نہ صرف مقامی لباس کو چھوڑ چکی ہے۔ بلکہ قومی لباس کا استعمال بھی بعض مخصوص مواقع مثلاً جمعہ وعیدین کے تک محدود ہو رہا ہے۔

امریکی معاشرت کے اثرات کے تحت یہاں جینز، ٹراؤزر، ٹی شرٹ اور برموداشارٹس کا رواج ہو گیا ہے۔ اس سلسلے میں بین الاقوامی برانڈز مارکس اینڈ سپنسر (Marks & Spenser)، ایڈی ڈاس (Adidas)، نائک (Nike)، لیوائز (Levis)، ارمانی (Armani)، رالف لارین(Ralph Lauren)، آکسفورڈ(Oxford)، بونینزا (Bonanza)، رے بین (Ray Ban) وغیرہ کے کپڑے، جوتے، عینکیں، پرس، ہینڈبیگ اور دیگر ملبوسات نے تیزی سے مقبولیت حاصل کی ہے۔

آج دنیا بھر میں ایگزیکٹوز کا ڈریس کوڈ یکساں ہے، پینٹ کوٹ اور رنگین ٹائی۔ ڈاکٹر جمیل جالبی اسی حوالے سے لکھتے ہیں کہ "ہمارے پاس خیال کا کوئی زندہ نظام باقی نہیں رہا اور اب ہم صرف مغربی بن جانے کی خواہش کے سہارے آنکھیں میچے دوڑے چلے جا رہے ہیں۔ اس دوڑ میں نہ منزل کا تعین ہے اور نہ کسی سمت کا۔"[۱]

## تفریح کے ذرائع

تفریح کے ضمن میں ہالی وڈ کی فلمیں دنیا بھر میں دیکھی اور پسند کی جا رہی ہیں، ان کا چربہ کیا جا رہا ہے۔ یہ فلمیں دنیا بھر کے سینماؤں میں نمائش کے لیے پیش کی جاتی ہے۔ ان کے موضوعات، تکنیک اور انداز کی نقل دنیا بھر میں کی جاتی ہے۔ دنیا بھر میں نظریات، فیشن، سٹائل اور طرزِ زندگی کی نشر و اشاعت میں ان فلموں کا اہم کردار ہے۔ فیچر فلموں کی بجائے اب اینی میٹڈ یا کارٹون فلموں کی تیاری کی جاتی ہے بلکہ تھری ڈی فلمیں بھی تیار کی جا رہی ہیں۔

ہالی وڈ کے بعد ہندوستان نے بھی فلم کے شعبے میں بے پناہ ترقی کی ہے جہاں سال میں ایک ہزار سے زیادہ فلمیں تیار کی جاتی ہیں۔ اسی طرح موسیقی کے سلسلے میں بھی نمایاں تبدیلی ہوئی ہے۔

پاپ میوزک دنیا بھر میں مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔ ہمارے معاشرے میں جہاں کلاسیکی موسیقی کی طویل روایت موجود ہے پاپ میوزک نے وہاں بھی اپنے قدم گاڑ لیے ہیں۔ اس کے علاوہ افریقہ سے امریکہ پہنچنے والے جاز JAZZ اور ریپ RAP نے خاصی مقبولیت حاصل کر لی ہے۔

---

(۱) جمیل جالبی، *پاکستانی کلچر* (کراچی: مشتاق بک ڈپو، ۱۹۶۴) ص ۱۷۷

# عالمگیریت: سیاسی پہلو

عالمگیریت کی عمومی تصویر اس کے معاشی اور ٹیکنالوجیکل پہلو کے حوالے سے اذہان میں موجود ہے۔ لیکن عالم گیریت کے سیاسی اثرات اور سیاسی جہت بھی اپنی جگہ پر بہت اہمیت کی حامل ہے۔ یہ ایک معاشی عمل ہونے کے ساتھ ساتھ سیاسی عمل بھی ہے جس کے پیچھے خاص فکر، نظریات، ریاستی ادارے، اور ملٹی نیشنل کمپنیاں ہیں۔ اس حوالے سے عظمیٰ شجاعت اپنے مضمون میں لکھتی ہیں:

> "Its political dimensions are reflected in the challenge that globalization poses to the traditional concept of sovereignty." (1)
>
> یعنی عالمگیریت کی سیاسی جہت کا اظہار اقوام اور ممالک کی خود مختاریت کو درپیش چیلنج کے ذریعے ہوتا ہے۔

تاریخ کو سمجھنے کے لیے مختلف تنقیدی نظریات مثلاً Realism اور Liberalism جیسی اصطلاحات مستعمل رہی ہیں۔ لیکن معاصر عالمی سیاسی صورتحال کے تناظر میں عالمگیریت کی اصطلاح استعمال کی جارہی ہے۔

سرد جنگ کے خاتمے کے بعد امریکہ دنیا کی واحد سپر پاور کے طور پر ابھرا اور اپنے عسکری، معاشی اور ثقافتی سرمائے کے ساتھ دنیا کے کسی بھی حصے میں فیصلہ کن کردار ادا کرنے کی صلاحیت حاصل کرلی ہے۔ 2012ء میں اس کی عسکری قوت دنیا کے کسی بھی ملک کی فوج سے زیادہ تھی۔ اس کا عسکری بجٹ دنیا کے دیگر تمام ممالک کے عسکری اخراجات سے زیادہ تھا۔ دنیا کی آبادی کے کل 4.27 فیصد پر مشتمل اس ملک کی دولت دنیا کی کل دولت کے پانچویں حصے پر مشتمل تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ٹیکنالوجی کے میدان میں امریکہ کو سبقت حاصل ہے۔ یہ ملک دنیا بھر میں مواصلات کا مرکز ہے اور طاقتور ذرائع ابلاغ کے ذریعے امریکی ثقافتی اقدار کی تشہیر دنیا بھر میں کی جاتی ہے۔

ایک سابقہ فرانسیسی وزیر خارجہ ہوبرٹ ویڈرین (Hubart Vedrine) کے مطابق:

> "The united states is not simply a superpower, it is a hyper power".(2)

عسکری، معاشی اور ثقافتی قوت کا یہ سنگم امریکہ کو ایک ایسی غیر معمولی صلاحیت دیتا ہے کہ وہ دنیا کے مستقبل کی صورت گری اپنی مرضی کے مطابق کرسکے۔

موجودہ عالمی سیاست میں مختلف ملکوں کی درجہ بندی کی جائے تو ایک اہرام کی صورت بنتی ہے۔ جس کی بلندی پر امریکہ اکیلا موجود ہے۔ اس کے نچلے درجے پر چین، جاپان، انڈیا، روس، برطانیہ، جرمنی، فرانس اور برازیل ہیں اور اسی طرح اس کے نیچے کئی

---

(1) Uzma Shujat, Globalization*: A political social and economics dilemma for India in Globalization economic, social and political dimensions* (Karachi: Area study centre, 2007) ,p 224

(2) Keylely, Charles wand and Blanton Shannon L, *world politics* (Australia Wads work: 2012) ,p 107

درجات ہیں۔ یہاں تک دنیا کے چھوٹے ترین ملک بھی اس بین الاقوامی اہرام میں اپنا ایک مقام رکھتے ہیں لیکن اقوام عالم کے مابین صرف امریکہ ہی ہے جو عالمی قوت اور عالمی رہنما کی حیثیت رکھتا ہے۔[1]

عالمگیریت بطور ایک جاری عمل کئی جہات کا حامل ہے اور زندگی کے مختلف شعبوں پر اپنے اثرات نقش مرتب کر رہا ہے۔ انہی شعبوں میں سے ایک اہم ترین شعبہ سیاست بھی ہے۔ لہٰذا عالمگیریت کے سیاسی پہلو پر غور کیا جائے تو کچھ سوالات ذہن میں جنم لیتے ہیں مثلاً:

کیا دنیا جب ایک واحد مقام بن جائے گی تو یہ پہلے سے بہتر اور مختلف بھی ہو گی؟

کیا عالمگیریت لوگوں کی شناخت میں تبدیلی کا باعث بنے گی؟

کیا عالمگیریت قوم پرستی کے رجحان میں کمی کا باعث بنے گی؟

کیا عالمگیریت انسانوں اور ماحول کے مابین تعلق میں تبدیلی کا باعث بنے گی؟

کیا عالمگیریت انداز حکومت اور اس کی ساخت میں تبدیلی کا باعث ہو گی؟

عالمگیریت نے مختلف ممالک کے مابین سرحدوں پر کیا اثر ڈالا؟

عالمگیریت کے زیر اثر ممالک کی اہمیت کے حوالے سے کیا تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں؟

ایسے سوالات کے جواب میں عالمگیریت پر لکھنے والے اس کا تعلق سول سوسائٹی کے قیام، سرمایہ داری نظام کا آغاز، مابعد جدیدیت کی آمد، کیمونزم کے اختتام یہاں تک کہ تاریخ کے اختتام سے جوڑتے ہیں۔ ان سوالات سے قبل ایک بڑا سوال یہ بھی ہے کہ عالمگیریت کے آغاز سے قبل عالمی سیاسی نظام کن خطوط پر مرتب کیا گیا تھا یا کونسا نظام رائج تھا۔ اس حوالے سے جان آرٹ (Jan Art Scholtay) لکھتے ہیں۔

> Before the onset of intensified globalization, several decades ago, world politics was organized on the basis of Westphalia system.... Westphalia system was a sate system. The Westphalia system was a framework of governance. That is, it provided a general way to for mutate, implement, monitor and enforce social rules. At the core of this mode of governance, stood the principles of statehood and sovereignty. Statehood meant that the world was divided into territorial parcels, each of which was ruled by a separate governance. This modern state was centralized formally organized public authority apparatus that enjoyed a legal (and mostly effective) monopoly over the means of armed evidence in the area of its jurisdiction. The Westphalia state was more over sovereign, that it exercised

(1) Keylely, Charles wand and Blanton Shannon L, *worldd politics* ,p 100-101

comprehensive, supreme, unqualified and exclusive control over its designated territorial domain.[1]

Jan Art مندرجہ بالا اقتباس میں ایک ریاست کے اختیارات کی وضاحت جن الفاظ میں کرتے ہیں ان میں Supreme, Comprehensive unqualified اور Exclusively جیسے اسمائے صفت شامل ہیں۔ پھر آگے چل کہ ان میں سے ہر اسم صفت کی وضاحت بھی کرتے ہیں۔

Comprehensive کا مطلب ان کے نزدیک یہ ہے کہ ایک خود مختار ملک کے سبھی معاملات اس کے اختیار دائرہ کار میں شامل ہیں۔

Unqualified کا مطلب وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ ایک ملک کے اپنی سرزمین پر مکمل اقتدار کے حق کو مقدس تصور کیا گیا ہے۔

Exclusive Rule: اس سے مراد یہ ہے کہ مقتدر ریاستیں اپنے داخلی معاملات میں کسی کے اختیار یا مداخلت کو گوارا نہیں کرتیں اور ریاستوں کے مشترک اقتدار کا تصور موجود نہیں۔

عالمگیریت سے قبل ریاست کا ماڈل یہ تھا جو تاریخ کے ایک خاص لمحے اور خاص حالات میں نمایاں ہوا۔ تاہم Jan Art Schalte کے مطابق یہ خود مختار ریاستی نظام کوئی ایسا فطری اصول یا نظام نہیں تھا جو وقت کے تصور سے ماوراہو۔ سترہویں صدی سے قبل کی سیاست اس ریاستی نظام کے بغیر تھی اور پھر عالمگیریت کی بنیاد پر یہ نظام اب ماضی کا قصہ بن چکا ہے۔ لیکن ریاست آج بھی موجود ہے اور بعض حوالوں سے پہلے سے زیادہ مضبوط، فعال اور سماجی زندگی میں داخل ہو چکی ہے لیکن Westphalia کا خود مختاری کا اصول موجودہ دور میں اپنی اصل روح کے مطابق قابل عمل نہیں رہا۔ اگرچہ سیاسی لسانیات میں یہ اصول آج بھی ان لوگوں کے لیے بہت اہم ہے جو عالمگیریت کے باوجود قومی خود مختاری میں اس کمی کو معکوس کرنا چاہتے ہیں۔

ریاست کی خود مختاری کی بنیاد علاقائی جغرافیے پر ہوتی ہے اور ایک ریاست کے اختیارات کے مکمل اطلاق کے لیے خاص علاقائی دائرے لازمی ہیں۔ ریاست کے دائرہ اختیار کی واضح طور پر بارڈر کے ذریعے حد بندی کی گئی ہو جس کی نگرانی ممکن ہو۔

لیکن عالمگیریت کی وجہ سے سماجی تعلقات جغرافیائی حد بندیوں سے آزاد ہو چکے ہیں۔ اگرچہ عالمگیریت نے ریاست کی خود مختاری کو متاثر کیا ہے لیکن اس نے ریاست کے کردار کو ختم نہیں کیا۔ لیکن موثر خود مختاری اس دور میں ممکن نہیں۔ بہت سے عوامل ہیں جنھوں نے اس دور میں ریاست کی خود مختاری پر کاری ضرب لگائی ہے۔ اور ایک ریاست عالمگیریت کے اس دور میں ان تمام عوامل جن میں عالمی کمپنیوں کا اثر ورسوخ، مصنوعی سیاروں کے ذریعے معلومات کی ترسیل، ماحولیاتی مسائل، عالمی سٹاک اور بانڈز کی تجارت کو کنٹرول نہیں کر سکتی۔ کمپیوٹر ڈیٹا کی ترسیل اور ٹیلیفون کالز کو سرحدی چوکیوں پر روکا نہیں جا سکتا۔ عالمی ذرائع ابلاغ کی بدولت زبان اور

---

(1) Scholtay,Jan Art, *The Globalization of world politics* (Oxford University Press, 2001) ,p 20

تعلیم کے حوالے سے بھی حکومت کے اختیارات میں کمی واقع ہو گئی ہے۔دیگر ممالک میں رقوم کی منتقلی اور رقوم کے برقیاتی تبادلے نے ریاست کی خود مختاری کی ایک بڑی علامت قومی کرنسی کے حوالے سے بھی ریاست کے اختیارات کو کمزور کیا ہے۔کسی ریاست پر اثر انداز ہونے والے عوامل کو جان آرٹ شولتے نے اس شکل میں ظاہر کیا ہے۔[1]
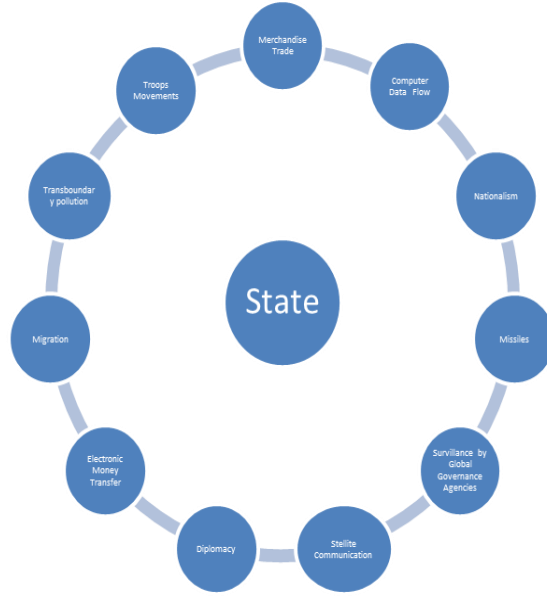
اگرچہ عالمگیریت نے ریاست کی خود مختاری کو متاثر کیا ہے تاہم اس نے ریاست کے کردار کو ختم نہیں کیا بلکہ چند ایک مثالوں مثلاً صومالیہ اور افغانستان کے اندرونی خلفشار سے قطع نظر اس نے ریاست کو مضبوط کیا ہے۔یہاں تک کہ کمیونزم کے زوال کے بعد کمیونسٹ ریاست کی سرحدوں میں محض کچھ تبدیلیاں ہوئی ہیں۔بلکہ عالمگیریت کے زیر اثر مختلف ممالک کے سرگرمیوں کے دائرے اور نگرانی کی صلاحیتوں میں اضافہ ہوا ہے۔عالمگیریت ریاست کو تحلیل نہیں کر رہی لیکن ایسا بھی نہیں کہ اس نے ریاست پر اثرات مرتب ہی نہ کیے ہوں۔یہ اثرات ان صورتوں میں نمایاں ہوتے ہیں

اول: آج کل ریاستیں اپنی حدود سے باہر بھی قومی مفاد میں اپنا دائرہ اثر رکھتی ہیں۔مثال کے طور پر 1980ء کی دہائی میں ایران نے دنیا بھر میں اسلام ازم کی تحریکوں کو بھرپور تائید و نصرت فراہم کی۔

دوم: عالمگیریت ریاستوں کو بڑے پیمانے پر کثیر الجہاتی مشاورت میں حصہ لینے پر مائل و مجبور کرتی ہے۔مثال کے طور پر بڑی ریاستیں ۱۹۷۰ء کی دہائی سے آپس میں مل کر مشترک دلچسپی کے موضوعات پر مشاورت کر رہی ہیں۔خیالات کے تبادلے کے لیے جی ۷ یا جی ۸ جیسے فورم خیالات کے تبادلے اور معلومات کے تبادلے کے لیے تشکیل دیئے گئے ہیں۔

سوم: سیاسی لحاظ سے عالم گیریت کا مفید پہلو یہ ہے کہ اس نے بین الممالک جنگ کے خطرات کو ختم کر دیا ہے۔بلکہ جنگ کی صورت بھی تبدیل ہو گئی ہے۔

---

(1) Scholtay ,Jan Art, *The Globalization of World Politics* , p 20

ریاست کا وہ ماڈل جو عالم گیریت سے قبل موجود تھا اب متروک ہو چکا ہے تو اب نظام حکومت کس انداز میں مرتب کیا گیا ہے۔ اب ریاست کے دائرہ کار، اس کی سرگرمیوں اور صلاحیتوں میں تبدیلی آچکی ہے۔ اب انتظام حکومت میں ریاست، ذیلی ریاستیں، بالائے ریاست ادارے اور مارکیٹ پر مبنی عالمی انتظامیہ اور عالمی سوسائٹی حصہ لیتے ہیں اور اصول و ضوابط اور انضباطی سرگرمیوں میں بالائے ریاست ادارے مارکیٹ کی ایجنسیاں اور سول سوسائٹی کی تنظیمیں شامل ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر عالمگیریت کے اس دور میں مختلف ممالک کی ذیلی حکومتیں پالیسی معاملات پر گفت و شنید کرتی ہیں اور معاملات طے کرتی ہیں۔ اس کی مثال چین اور کینیڈا کے مختلف صوبے آپس میں تعاون کے معاہدے اور گفت و شنید اور سفارتی معاملات طے کرتے ہیں۔ اسی طرح یورپ کے سترہ ممالک کی قریباً پچاس ذیلی ریاستیں مختلف تنظیموں مثلاً Regional Organization the Europeans, European, Regions کے ذریعے باقاعدہ رابطہ رکھتے ہیں۔ اقوام متحدہ نے اپنے ادارے Bank for International Statements کے ذریعے اپنے کاموں کا دائرہ دنیا بھر میں پھیلا دیا ہے۔ اقوام متحدہ کے یہ اقدامات بالائے ریاست اداروں کے مابین تعاون اور سرگرمیوں کی ایک اہم مثال ہیں۔

معاصر حکومتی ماڈل نامکمل رہے گا اگر اس میں صرف حکومتی ایجنسیوں، ذیلی حکومتی اداروں اور بالائے ریاست اداروں کو شامل کیا جائے۔ مارکیٹ کی قوتیں اور ادارے بھی اس حکومتی ماڈل میں وہاں اہم کردار ادا کرتے ہیں جہاں حکومتی ادارے خلا چھوڑ جاتے ہیں۔ قوانین کی تشکیل و اطلاق میں پرائیویٹ سیکٹر اداروں نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ حصص کی لین دین اور تجارت کے حوالے سے قوانین اور ضابطہ اخلاق کی تشکیل میں صنعتی اداروں جیسا کہ

International Federation of stock exchanges (Founded in 1961)
International securities market Association (Founded in 1969)

نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ اسی طرح کمرشل بینک جیسا کہ

International Monitoring Fund (IMF)

نے ترقی پذیر مقروض ممالک کو مالیاتی بحران سے نکالنے میں قابل قدر کام کیا ہے۔ ان اداروں کے ساتھ عالمی سول سوسائٹی کا کردار بھی اہم ہے۔ رضاکار تنظیموں میں شہری موثر اور متحرک کردار ادا کرتے ہیں۔

لہٰذا اس سیاسی نظام میں ریاستی معاملات میں تنہا ریاست کا کردار نہیں ہے اس کے علاوہ دیگر ادارے بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں جن کا اوپر تذکرہ ہو چکا ہے۔

مضبوط اور فعال حکومت اپنی معاشی، سیاسی، ثقافتی اور سماجی پالیسیاں بنانے میں آزاد ہوتی ہے اور اپنے داخلی معاملات میں بیرونی عناصر کی مداخلت کو نہ صرف ناپسند کرتی ہیں بلکہ ان کی بیخ کنی بھی کرتی ہیں۔ لیکن عصر حاضر میں حکومت کا یہ ماڈل فرسودہ قرار پایا ہے۔ سوویت یونین کے زوال کے بعد امریکہ نے نیو ورلڈ آرڈر(New World Order) متعارف کرایا۔ جس کی بنیاد آزاد تجارت، جمہوریت، بنیادی حقوق، امن اور نسلی تعصب کے خاتمے پر رکھی گئی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس ورلڈ آرڈر کی پس پشت ملٹی نیشنل کمپنیاں، بڑے بڑے مواصلاتی ادارے اور ان کا تیار کردہ انقلاب اور عالمی مالیاتی ادارے ہیں جنہوں نے دنیا کے تمام سیاسی

نظاموں کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔ مقصد وہی معاشی ہے۔ اور اس کے اہداف میں دنیا بھر کی منڈیوں تک بلا روک ٹوک رسائی، اپنی مصنوعات کی کھپت اور زیادہ سے زیادہ منافع کا حصول ہے۔ کمزور ملکوں کی محدود وسائل کی حامل صنعتیں ان بڑی بڑی کمپنیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ آزاد تجارت اور اس کے تحفظ کے لیے بنائے قوانین وہ کڑوا گھونٹ ہیں جنہیں پینے پر ان ممالک کو مجبور کر دیا گیا ہے۔ آزاد تجارت ان ممالک کی خود مختاری کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے۔ اسی لیے عالم گیریت کو جدید نو آبادیاتی نظام کا نام دیا جاتا ہے۔ ترقی پذیر اور ترقی یافتہ ممالک میں عوام کی زندگیوں کے فیصلے اب قومی حکومتوں کے ہاتھ میں نہیں ہیں۔ عوامی مفادات کے لیے منصوبہ سازی اور ملکی پالیسیوں کا انتخاب اب عالمی سرمایہ کار کرتے ہیں۔

کامرس اور مالیات کے شعبوں کی تشکیل ملٹی نیشنل کمپنیاں کرتی ہیں اور بڑے بڑے عالمی ادارے مثلاً EU, WTO, GAT وغیرہ انہی کمپنیوں کے مفادات کو تحفظ دینے کے لیے قانون سازی کرتے ہیں۔ گویا یہ ملٹی نیشنل کمپنیاں اب اصل حکمران ہیں اور دنیا بھر میں انہی کی حاکمیت ہے اور اس حاکمیت کو World Bank، IMF اور WTO کی معاونت حاصل ہے۔ جون گرے اس حوالے سے اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

> Transnational Organizations by this philosophy have sought to impose free markets economic life of sorties throughout the world. They have implemented programmed of policies whose ultimate objective is to incorporate the worlds diverse economics into a singal global marked.(1)

غیر جانب داری سے جائزہ لیا جائے تو یہ واضح ہوتا ہے کہ (WTO) ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن کے جو بھی قوانین بنائے جارہے ہیں وہ ترقی پذیر ممالک کے لئے ضرر رساں اور جمہوری روح سے عاری ہیں۔ وہاں ہونے والے فیصلے اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر کیے جاتے ہیں کہ دنیا میں ایک ایسے ایجنڈے کو جاری و ساری کیا جائے کہ جس کے بعد غریب ممالک کا اپنے وسائل اور منڈیوں پر اختیار نہ رہے گویا معیشت پر اختیار نہ رہے۔ معیشت اپنا مرتکز اظہار سیاست میں کرتی ہے اور سیاسی عمل ہی خود مختاری، حاکمیت کے اختیار اور معاشی پالیسیوں اور دیگر ملکی پالیسیوں کا انتخاب کرتا ہے لہٰذا ایک کمزور سیاسی نظام اور ایک کمزور حکومت محدود اختیارات کے ساتھ ہی ان ملٹی نیشنل کمپنیوں اور ان کے مفادات کو تحفظ دینے والے اداروں کے لیے قابل قبول ہوتی ہے۔

کسی ملک کی پالیسیوں کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنے اور حکومتوں کو بے دخل کرنے کے لیے آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک جیسے موثر ہتھیار موجود ہیں۔ ترقی پذیر ممالک اپنی معیشت کو تحفظ دینے کے لیے عالمی اداروں سے قرض لیتے ہیں۔ یہ قرض غیر مشروط نہیں ہوتے۔ ان قرضوں کو ری شیڈول کروانے کی ضرورت بھی پیش آتی ہے۔ قرضوں کی ادئیگی کے طریقہ کار کے ساتھ ان عالمی اداروں کی شرائط بھی ان ترقی پذیر ممالک کو کڑوے نوالے کی طرح نگلنی پڑتی ہیں۔ یہ شرائط مقروض ممالک کو آزاد تجارت، نج کاری،

---

(1) John Gray, *False Dawn*, (London: Granta,2009) ,p 2

معاشی پابندیوں کو ہٹانے یا ختم کرنے سے ہوتی ہوئی معاشی اور سماجی سرگرمیوں میں ریاست کی عدم مداخلت کی طرف لے جاتی ہے۔

آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کے پاس مقامی حکومتوں پر اپنی پالیسیاں مسلط کرنے کے بہت سے حربے ہیں۔ ترقی پذیر ممالک اگرچہ آزاد ہیں لیکن ان کے سارے اختیارات ان عالمی طاقتوں اور ان کے معاون اداروں کی مرضی کے تابع ہیں۔ اگر کوئی ملک ان کے خلاف چلے تو اس کا انجام افغانستان، عراق، شام جیسا ہوتا ہے اور جو حکمران ان کی رائے پر نہ چلے اس کا انجام لیبیا کے حکمران معمر قذافی، مصری حکمران محمد مرسی جیسا ہوتا ہے۔ خود پاکستان کی تاریخ میں اس کی کئی مثالیں موجود ہیں۔ ان مقروض ممالک کا بجٹ اکثر ان اداروں کے نمائندے آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کی ہدایات کی روشنی میں بناتے ہیں اور اکثر ان اداروں کے نمائندے براہ راست وزارت عظمی پر بھی فائز ہو جاتے ہیں۔ اس کی مثال بھی پاکستان میں ماضی قریب میں موجود ہے۔ آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کے نمائندے ایئر کنڈیشنڈ کمروں میں بیٹھ کر ان غریب ممالک کی عوام کی قسمت کا فیصلہ کرتے ہیں۔

ڈینی روڈرک (Dani Rodrick) لکھتے ہیں۔

Globalization has made it exceedingly difficult for governments to provide social insurance..... international economic integration is taking place against the background of recending governments and diminished social obligations. (1)

عالمگیریت نے حکومتوں کے لئے معاشرتی تحفظ کی فراہمی کو بہت مشکل بنا دیا ہے۔۔۔ عالمی معاشی انضمام حکومتوں کے کردار کو ختم کرنے اور سماجی فرائض کو کم کرتے ہوئے وقوع پذیر ہو رہا ہے۔

اسی طرح اگر کوئی حکمران ان اداروں کی پالیسیوں سے اتفاق نہ کرے تو اس حکمران کی جگہ دوسرا حکمران لانے اور ایک حکومت کا تختہ گرانے میں انہیں چنداں دیر نہیں لگتی۔

اس کی مثال پاکستان میں حکومتوں کی تبدیلی ہے اس بار بار کی تبدیلی کے پیچھے بھی انہی عالمی طاقتوں کا ہاتھ ہے۔ اس سلسلے میں انہیں جمہوریت یا آمریت سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جو بھی حکومت ان اداروں کی پالیسیوں پر بلا چوں چرا عمل کرتی رہے گی اور خاص طور پر امریکی استعمار کی فرمانبردار رہے گی وہ حکومت جاری رہے گی۔ ورنہ انجام ضیاء الحق کی طرح المناک موت ہو گا۔ جبکہ سعودی بادشاہت اس اطاعت کی ایک بڑی مثال ہے۔

واور فوسٹر (Vivore forrester) اپنی کتاب Horreur Economy جس کا انگریزی ترجمہ The Economic Horror کے نام سے کیا گیا ہے میں لکھتے ہیں:

> Nothing could demonstrate the power and hegemony of private economy...... Nothing but for the blackmail is exert from them on the policies of developed countries so as they make them

---

(1) Dani Roderick, *Has Globalization Gone Too Far*? (Washington: Institute for international economics 1997) p 4

fall into line, lower taxes, reduce public expenditure and social welfare systems regulate deregulation and free companies to lay off unimpeded abolish the minimum wages make work more flexible and so....[1].

کسی بھی چیز سے نجی معیشت کی طاقت اور غلبے کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ ہاں مگر ان کی بلیک میلنگ جو وہ ترقی یافتہ ممالک سے بھی کرتی ہیں اور ان کو ایک قطار میں کھڑا کر دیتی ہے کہ وہ ٹیکس کم کر دیں۔ عوام پر اخراجات گھٹائیں، سوشل ویلفیئر اخراجات کم کر دیں۔ ڈی ریگولیشن پالیسی کو زیادہ مربوط و منظم کریں۔ کمپنیوں کو ملازمین نکالنے میں آزاد کر دیں۔ کم سے کم اجرتوں کا خاتمہ کر دیں اور کام کو زیادہ لچکدار بنائیں وغیرہ وغیرہ۔

اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ترقی پذیر ممالک پر یہ پالیسیاں کس طرح مسلط کی جاتی ہیں اور ان کی صورتحال کو بد سے بد ترین کر دیتی ہیں یعنی اگر عالمی منڈی یہ محسوس کرتی ہے کہ کوئی نئی صحت کی پالیسی اور عوام کی تعلیم کی اصلاح مہنگی ہوئی تو وہ اپنا ردعمل زیادہ شرح سود کی صورت میں دے سکتی ہے یا پھر کرنسی کو تباہ کر سکتی ہے۔ اس طرح (گلوبل مارکیٹ) عالمی منڈی، عالمگیریت کے تحت نہ صرف سماجی اخراجات کو کاٹتی ہے وہیں یہ ریاست کی حاکمیت کو چیلنج کرتی ہے۔ سرمائے کی متحرک فطرت سے حکومتوں کو ہدایات دیتی ہے کہ وہ کیا کر سکتی ہیں اور کیا نہیں اور ٹیکس لگانا جو کہ نہ صرف کسی بھی قومی ریاست کا صوابدیدی اختیار ہے، بنیادی حق ہے اور وہ طریقہ ہے جس سے سماجی اور معاشی عدم مساوات کو ختم کیا جاسکتا ہے اسے کارپوریٹ دباؤنے ختم کر کے رکھ دیا ہے۔[۲]

## جمہوریت اور جمہوری نظام

عالمگیریت کا ایک اہم سیاسی ایجنڈا جمہوریت کا فروغ ہے۔ عالمگیریت کے علم بردار جمہوریت اور بنیادی انسانی حقوق کے نام پر عالمگیریت کو مسلط کر رہے ہیں۔ سوویت یونین کے زوال اور سرد جنگ کے خاتمے کے بعد کہا گیا ہے کہ یہ دور سرمایہ دارانہ جمہوریت کا دور ہے۔ مغربی طرز کی اس جمہوریت کو سیاسی نظام کے ماڈل کے طور پر پیش کیا جارہا ہے۔ اس سلسلے میں فرانسس فوکویاما لبرل ڈیمو کریسی (Liberal Democracy) کو انسانی کاوشوں کا نقطہ عروج قرار دیتے ہوئے تاریخ کے خاتمے کے اعلان کرتے ہیں۔

The liberal democracy may constitute the end point of mankind's ideological evolution and final form of human government. That is, while earlier forms of government were characterized by grave defects and irrationalities that led to their eventual collapse, liberal democracy was arguably free from such fundamental internal contradictions.[3]

---

(1) Viviane Forrester, *The Economic Horror* (Oxford: Blackwell 1999) ,p 95

(2) Noreena Hertz, *The Silent Take Over* (New york: the free press 2001) , p 52

(3) Franics Fukuyama, *The End of History and The Last Man* (New York: Avon Books inc،1998) p136

یہ آزاد جمہوریت انسانی حکومت کی آخری شکل اور انسانیت کے نظریاتی ارتقا کا نقطہ ثابت ہو سکتی ہے۔ حکومت کی پہلی شکلوں میں موجود سنگین نقائص اور غیر منطقیت کی وجہ سے ان کا انجام تباہی ہوا۔ لیکن آزاد خیال جمہوریت ایسے بنیادی داخلی نقائص سے پاک ہے۔

جمہوریت کے یہ دعوید اراپنے رویوں میں غیر جمہوری ہیں۔ امریکہ نے سرد جنگ کے دوران تمام آمر حکومتوں کی پشت پناہی کی۔ دنیا میں جمہوری حکومتوں کا تختہ الٹنے اور جمہوری حکمرانوں کو قتل کروانے میں امریکہ کا ہاتھ رہا ہے۔ امریکہ اور اس کے اتحادی جمہوریت اور بنیادی انسانی حقوق کا نعرہ لگاتے ہیں لیکن عراق اور افغانستان میں لاکھوں بے گناہ انسانوں کو ان کے حقوق کے ساتھ دفن کر دیا گیا۔ دہشت گردی کے خلاف نام نہاد جنگ کے ضمن میں افغانستان پر معاشی پابندیاں لگائی جاتی ہیں۔ عراق پر بھی معاشی پابندیاں لگائی گئیں جس کے نتیجے میں سینکڑوں معصوم بچے اور پر امن شہری بھوک کے ہاتھوں اور زندگی بچانے والی ادویات کی عدم دستیابی کی وجہ سے لقمہ اجل بن گئے لیکن جمہوریت کے علمبر داروں کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔ خود سرمایہ دار ممالک میں بھی کوئی ایسی جمہوریت نہیں ہے جسے نمائندہ جمہوریت کہا جاسکے۔ خود امریکہ میں خفیہ تنظیمیں امریکہ میں حکومتی امور میں نہ صرف دخل اندازی کرتی ہیں بلکہ اپنی مرضی کے افراد کو حکومت کا حصہ بنانے کے لیے منصوبہ بندی کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ ملٹی نیشنل کمپنیاں بھی سیاسی پارٹیوں کو فنڈز (Funds) دے کر اپنے مفادات حاصل کرتی ہیں۔ اس طرح جمہوریت کے نام پر عوام سے کھیلا جاتا ہے۔ میڈیا کے ذریعے ان کی ذہن سازی کی جاتی ہے۔ جمہوریت کا مطلب اب کسی ملک کے شہریوں کی اپنی مرضی نہیں بلکہ اس کا مطلب اب صرف یہ ہو گیا ہے کہ غالب اور بالادست قوتوں کی ترجیہات اور ان کی مرضی کے سامنے سرنگوں کر دیا جائے۔ یہ ایک چیز پورے جمہوری عمل کو شرمناک بنا دیتی ہے۔

# عالمگیریت: لسانی پہلو

زبان افرادِ معاشرہ کے درمیان محض رابطے کا ذریعہ ہی نہیں بلکہ کسی قوم کی تہذیب و ثقافت کی محافظ اورافراد معاشرہ کے درمیان اتفاق و اتحاد کا ایک اہم وسیلہ بھی ہے۔ زبان اور ثقافت کا باہمی تعلق دوطرفہ ہے کسی قوم کی ثقافت کی تشکیل کے مراحل اس کی زبان کی ترقی کے مدارج سے متعین کیے جاسکتے ہیں۔ زبان کے ذریعے ہی کسی قوم کی تہذیب وثقافت کا اظہار ہوتا ہے اور زبان ہی وہ ذریعہ ہے جس کے ذریعے کسی قوم کے تشخص اور انفرادیت کا اظہار ممکن ہے۔ زبان کے ذریعے کسی قوم کی ثقافت سے منسلک فنون لطیفہ کی تمام صورتوں کی decoding ممکن ہے۔ زبان سوچنے کے عمل کا نام ہے۔ زبان کے اندر ہی یہ صلاحیت ہے کہ ثقافت کی ترقی کے مدارج کو ادبی تخلیقات کی صورت میں الفاظ کے ذریعے بیان کرتی ہے اور زبان کے اندر ہی یہ صلاحیت بھی ہے کہ اس معاشرے کی روحانی زندگی کی مکمل تصویر کشی کر سکے۔ قومی ثقافت کے نمایاں ترین اور منفرد ترین مظاہر میں ایک اہم مظہر زبان بھی ہے۔ کیونکہ زبان نہ صرف ثقافت کو محفوظ کرتی ہے بلکہ اس کی نمائندگی بھی کرتی ہے۔ بلکہ کہا جاسکتا ہے کہ زبان کسی کلچر (ثقافت) کا حقیقی آئینہ ہوتی ہے۔ زبان اور ثقافت کسی قوم اور سماج کو منظم کرتے ہیں۔ افراد معاشرہ کو متحد کر کے رفتہ رفتہ قومی تشخیص کی تشکیل کرتے ہیں۔

زبان کسی قوم کی روح، ثقافتی اقدار، منفرد خصائص کی ترجمان ہوتی ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ زبان ایک جامد عمل نہیں ہے یہ ہر لحظہ تبدیل ہوتی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ یہ تبدیلی زبان کو تقویت دے اوراس کے ذخیرہ الفاظ میں اضافہ کر کے اس کی وسعت کا باعث بنے۔ لیکن کسی قوم میں اجنبی یا غیر ملکی زبان کا رائج ہو جانا اور فروغ پانا اس قوم کے تشخص کے خاتمے کا باعث ہو گا۔

عصر حاضر میں اس کی سب سے بڑی مثال انگریزی زبان ہے۔ انگریزی زبان کے متعلق کہا جاتا تھا:

English - a language - the language on which sun never sets.

یا پھر یہ بھی کہا گیا۔

The sun never sets upon the British Empire.

انگریزی زبان کی حامل اس برطانوی سلطنت کی حدود تو وقت کے ساتھ ساتھ سمٹ گئیں لیکن انگریزی زبان آج بھی پوری دنیا پر حکومت کر رہی ہے۔

عالمگیریت نے جہاں دنیا بھر کے معاشی اور سیاسی نظاموں پر اثرات مرتب کیے ہیں اور تہذیبی و ثقافتی اقدار کو تبدیل کر کے رکھ دیا ہے وہیں زبان بھی اس کے دائرہ اثر سے باہر نہیں ہیں۔ جیسا کہ پہلے کہا گیا کہ زبان سماجی پیداوار ہے اور کلچر کا جزولانیفک۔ تو ان سماجی و ثقافتی تبدیلیوں کے اثرات زبان پر بھی نمایاں نظر آتے ہیں۔

اس حوالے سے ڈاکٹر ناصر عباس نیر Alternatives to Economics Globalization جو کہ ۲۰۰۲ میں شائع ہوئی

کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> اس کتاب کے سرورق پر ذیلی عنوان کے طور پر درج ہے کہ ایک بہتر دنیا ممکن ہے۔ یہ بہتر دنیا کیا ہے؟ اسے کتاب کے مصنفین نے عالمگیریت کی آٹھ بنیادی خصوصیات کے ذکر میں سمو دیا ہے۔ ایک خصوصیت زبان اور کلچر کے حسن میں بھی ہے۔ اسے عالمگیریت کا ثقافتی ایجنڈا کہا جا سکتا ہے۔ عالمگیریت عالمی ثقافتی اور معاشی یک جنسیت (Global Cultural and Economic homogenization) کا نفاذ چاہتی ہے۔ اسے مزید طنز یعنی آئرنی کہا جائے یا المیہ کہ عالمگیریت کے ماہرین یہ سمجھتے ہیں کہ دنیا بھر میں ثقافتی و لسانی تکثریت اور معاشی تنوع کے خاتمے سے ایک بہتر دنیا تخلیق کی جا سکتی ہے۔۔۔ اس عالمی معاشرے میں اردو ہی نہیں وہ سب زبانیں بقا کے مسئلے سے دوچار ہیں جو عالمگیریت کے اہم اداروں جیسے میڈیا و معیشت میں اجارہ دارانہ جگہ حاصل نہیں کر پا رہی ہیں۔ حقیقت میں ان زبانوں کا مسئلہ بقا سے زیادہ خودکشی اور قتل ہے وہ یا تو کسمپرسی کی وجہ سے خودکشی پر مجبور ہیں یا عالمی اداروں کے ہاتھوں قتل ہو رہی ہیں۔[۱]

ڈاکٹر ناصر عباس کی رائے کی تائید زبانوں کے بارے میں معلومات جمع کرنے والے ادارے Ethnologic کی رپورٹ سے بھی ہوتی ہے۔ جس کے مطابق اس وقت دنیا کی چھ ارب اسی کروڑ کی آبادی میں 104 سے معلوم زندہ زبانیں موجود ہیں۔ ان ہزار زبانوں میں سے نصف سے زیادہ زبانوں کے سر پر موت کھڑی ہے۔ اندازاً ہر دو ہفتے کے بعد ایک زبان کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور اس طرح اس صدی کے اختتام تک تین سے چھ سو زبانیں باقی رہ جائیں گی۔

ڈاکٹر ناصر عباس نیر مزید لکھتے ہیں کہ زبانوں کی خودکشی یا قتل کی وجہ عالمگیریت کی ترقی کا وہ ایجنڈا ہے جس کے تحت ایک علاقے کی آبادی کو بے دخل کر دیا جاتا ہے اور وہ آبادی نئی ثقافت اور زبان کے علاقے میں خود کو ضم کرنے پر مجبور ہوتی ہے۔

ان زبانوں کے قتل یا خودکشی کے بعد اس عالمی معاشرے کی زبان انگریزی کو قرار دیا جا رہا ہے۔ دوسری طرف ایک بڑی حقیقت یہ ہے جسے سکتاب کینکس قاتل زبان کہتے ہیں۔ یہ کس مفہوم میں قاتل ہے اس کا اندازہ ہم اس بات سے لگا سکتے ہیں۔ کہ اب انگریزی محض عالمی لنگوا فرینکا نہیں ہے یعنی مختلف خطوں کے درمیان رابطے کا ذریعہ ہونے کے ساتھ ساتھ یہ لنگوا بیکا (یعنی جنگ کی زبان) لنگوا اکیڈیمیا، لنگوا کلچر لس، لنگوا اکونومیا بھی ہے گویا اس عالمی معاشرے کی روزمرہ گفتگو، جنگ، تعلیم و تحقیق و تدریس ثقافت اور معیشت کی زبان بھی انگریزی ہے۔[۲]

---

(۱) نئیر، ڈاکٹر ناصر عباس، *عالم گیریت اور اردو اور دیگر مضامین* (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۵) ص ۱۴

(۲) ایضاً، ص ۱۵

عالمگیریت کے زیر اثر انگریزی زبان کے پھیلاؤ اور فروغ کے اثرات کے حوالے Manfred B. Steger بھی لکھتے ہیں۔

> At the same time, however the number of spoken languages in the world has dropped about 14,500 in 1500 to less than 6500 in 2012. Given the current rate of decline, some linguists predict that 50-90 percent of the currently existing languages will have disappeared by the end of the 21th century. But the world's languages are not the only entities threatened with extinction the spread of consumerist values and materialist life style has endangered the ecological health of our planet.(1)

مندرجہ بالا اقتباس اس بات کی تائید کرتا ہے کہ AD ۱۵۰۰ میں دنیا میں ۱۴۵۰۰ موجود تھیں ۲۰۱۲ میں یہ تعداد ۶۵۰۰ تک رہ گئی۔ زبانوں کی اس کم ہوتی تعداد کو دیکھتے ہوئے کچھ ماہرین لسانیات پیش گوئی کررہے ہیں دنیا بھر میں اس وقت بولی جانے والی زبانوں میں سے اس صدی کے اختتام تک ۵۰ سے ۹۰ فیصد زبانیں ختم ہو جائیں گی اور اس بات کی تائید بھی اس اقتباس سے ہوتی ہے کہ عالمگیریت کی صارفی اقدار اور مادی طرز زندگی کے پھیلاؤ کی وجہ سے نہ صرف زبانوں کا وجود خطرے میں ہے بلکہ اس سیارے کی ماحولیاتی زندگی بھی خطرے سے دوچار ہے۔

یہ ایک نقطہ نظر ہے اس کے برعکس عالمگیریت کے حامی ایک مختلف موقف پیش کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ آج کے دور میں تیز ترین ذرائع مواصلات اور ذرائع نقل و حمل کی بدولت دنیا معاشی اور ثقافتی طور پر زیادہ قریب آ گئی ہے اور ان تیز تر ذرائع مواصلات و آمدورفت کی بدولت سرحدوں کے آرپار اقوام کے مابین ثقافتی اثرات زیادہ تیزی سے ایک دوسرے پر مرتب ہو رہے ہیں اسی وجہ سے کچھ ماہرین کا دعویٰ ہے کہ ثقافتی تنوع کی قیمت پر دنیا کو یک جنسیت کی راہ پر گامزن کیا جارہا ہے۔

لیکن عالمگیریت اور زبان کا یہ پھیلاؤ انسانی تاریخ میں کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ طویل فاصلوں کی تجارت قدیم دور سے ہی رائج رہی ہے اور اس تجارت سے صرف اشیاء ہی کا تبادلہ نہیں ہوتا تھا بلکہ اشیاء کے ساتھ ساتھ انسانوں اور خیالات اور اس طرح ثقافت کا بھی تبادلہ ہوتا تھا۔ اقوام ایک دوسرے کے رسوم ورواج اور زبانوں سے متعارف ہوتیں۔ یہ عمل زبانوں کے پھیلاؤ کا باعث بھی بنتا اور بعض اوقات مقامی (Vernacular) زبان کو لنگوفرینکا (بین الاقوامی) زبان میں تبدیل کر دیتا جیسا کہ تاریخ میں اکادمی (Akkadian) آرامی (Aramic) Greek(یونانی) لاطینی(Latin)، عربی(Arabic) ملایا(malay) سواحلی وغیرہ۔

جدید دور میں انگریزی نمایاں اور عالمی زبان کے طور پر سامنے آئی اور کئی مروج زبانوں کے خاتمے کی وجہ سے اسے Killer language (قاتل زبان) کہا جارہا ہے۔ لیکن انگریزی نے بطور لنگوافرینکا، مختلف معاشروں کو ملانے میں پل کا کام دیا ہے اور اس طرح

(1) Steger,Manfred B.*Globalization:A very Short Introduction* (Oxford:Oxford University Press,2013) p 86

دنیا کو ایک گاؤں میں تبدیل کر دیا ہے اور موجودہ دور میں مختلف لسانی گروہوں سے تعلق رکھنے والے افراد اور معاشروں کی سماجی تصویر سے روشناسی بھی انگریزی کے بدولت ہی ممکن ہے۔ انگریزی نے ہمیں اس قابل بنایا ہے کہ اس کی بدولت ہم اپنے عہد کی دنیا کی حقیقتوں سے واقف ہو سکتے ہیں۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ انگریزی نے طاقتور اقوام کے سامراجی مقاصد کی تکمیل میں ایک اہم آلے کا کردار ادا کیا ہے۔ طاقتور اور کمزور اقوام کے مابین تعلقات میں اعلیٰ و ادنی کا فرق انگریزی کی بدولت بھی پیدا ہوا ہے۔ انگریزی زبان کا پھیلاؤ اور دنیا بھر میں اس کا برتر مقام نو آبادیات کی پیداوار ہیں۔ انگریزی زبان کا یہ غلبہ لسانی سامراجیت کی ایک مثال ہے۔ اس کے ذریعے انگریزی بولنے والی اقوام اپنا کلچر غریب اقوام پر مسلط کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر ناصر عباس نیئر اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

> ایک زبان دوسری کو بے دخل کر سکتی: ایک زبان دوسری کو شرف و اقتدار سے محروم کر سکتی: ایک زبان دوسری کے سارے متنی سرمائے کو بڑی حد تک اپنی دسترس میں لا سکتی اور نئی طبقاتی اور ثقافتی شناختوں کو وجود میں لا سکتی ہے۔ اسی علم کو یورپ میں جدیدیت (ماڈرنٹی) اور جدید کاری (ماڈرنائزیشن) کے لئے استعمال کیا گیا اور اسی علم کو ایشیا و افریقہ میں یورپی استعماری تخیل نے کلچرل پالیٹکس کے لئے برتا۔[۱]

انگریزی زبان کا یہ پھیلاؤ کوئی نیا مظہر نہیں۔ اس سے پہلے زبان کے غلبے کے حوالے سے انسانی تاریخ میں کئی مثالیں موجود ہیں۔ مثلاً انسانی تاریخ کا وہ دور جب واحد پرتگالی زبان بطور تجارت اور سفارت کاری کی زبان کے پندرھویں سے اٹھارویں صدی کے مابین افریقہ کے مغربی سواحل سے جاپان تک غالب رہی۔

یہ بات سچ ہے کہ انگریزی زبان کا پھیلاؤ اقتصادی عالمگیریت کا مرہون منت ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس زبان کے بین الاقوامی بن جانے کے عمل کی جڑیں نو آبادیاتی دور میں گڑی ہیں۔ دنیا بھر میں بولی جانے والی اور اشاراتی زبانوں کی ترقی کے امکانات زیاہ روشن نہیں ہیں۔

آج کے دور میں انگریزی، فرانسیسی، ہسپانوی اور پرتگالی زبان کی قوت امریکہ، ایشیا، افریقہ، آسٹریلیا اور پیسفک میں 1492 کی مغربی توسیع اور اس کے بعد نو آبادیات کے براہ راست اثرات کا نتیجہ ہے۔ ان زبانوں کے ساتھ سیاسی و معاشی رسوخ اور عسکری قوت شامل ہوتی ہے۔

زبانوں کی ترقی اور درجہ بندی میں تبلیغ دین کا مقصد بھی شامل ہوتا ہے۔ عیسائیت کے ساتھ بہت سی یورپی زبانیں دنیا بھر میں پھیل گئیں۔ اسی طرح اسلامی فتوحات کے ساتھ عربی زبان کا پھیلاؤ لازماً شامل ہوتا تھا۔ موجودہ دور میں انگریزی طاقت کی زبان کے

(۱) ناصر عباس نیئر، ڈاکٹر، زبان: نو آبادیاتی سیاق اور لسانی استعماریت، مشمولہ *تحقیقات اردو جرنل* (راولپنڈی: ادارہ تحقیقات اردو، ۲۰۱۵) ص ۳۳

طور پر سامنے آئی۔

انگریزی زبان اور اس کی مادر ریاست کے حوالے سے یہ تاثر میڈیا کے ذریعے مسلسل راسخ کیا گیا اور کیا جا رہا ہے کہ انگریزی کا پھیلاؤ ناگزیر اور قدرتی عمل ہے۔ انگریزی زبان اور اس کی تدریس کا یہ پھیلاؤ اور غلبہ دنیا بھر میں ہے۔

انگریزی زبان کا تسلط قائم کرنے والے عناصر میں ایک اہم برطانوی عنصر نو آبادیات سے آزاد ہونے والے ممالک میں وہ احساس کمتری ہے جو ان ممالک کی عوام کے ذہنوں میں دور غلامی میں پروان چڑھایا گیا اور جو ان حکمرانوں سے وابستہ ہر چیز کو ایک بلند تر مقام عطا کرتا ہے۔ انگریزی زبان اور انگریزی خواں طبقات کو درجہ بندی میں بلند مقام اسی ذہنی کمتری کی علامت ہے۔ ان ممالک میں انگریزی آج بھی غیر ملکی زبانوں میں پہلی ترجیح ہے اور اکثر ان ممالک میں ثانوی درجے کی تعلیم کا لازمی حصہ ہے۔ ان ممالک میں اعلیٰ ملازمت کا حصول بہتر معیار زندگی، انگریزی میں خاطر خواہ مہارت و قابلیت کے بغیر ممکن نہیں۔ حالانکہ انگریزی زبان کی لازمی تدریسی طلباء میں کئی مسائل کا باعث ہے۔ عالمگیریت کے تناظر میں دیکھا جائے تو غالب (عالمگیر) زبان کے ذریعے تدریس کے کئی سماجی، نفسیاتی، معاشرتی اور معاشی نقصانات ہیں جن کا بر وقت ادراک کرنا ضروری ہے۔

اس کا نتیجہ بے روزگاری میں اضافہ، جرائم میں اضافہ، نشے کا استعمال، خودکشی اور اسی طرح کی خوفناک صورتوں میں نکل سکتا ہے۔

انگریزی زبان کو فروغ دینے میں جن عوامل نے اہم کردار ادا کیا ہے ان میں عالگیریت کے اہم ادارے ورلڈ بینک کی پالیسیاں بھی شامل ہیں جو مقامی زبانوں کی قیمت پر بین الاقوامی زبان یعنی انگریزی کی ترویج واشاعت اور غلبے کے لیے فنڈز فراہم کرتے ہیں جن کا نتیجہ معاشی اور ثقافتی عالمگیریت کے ساتھ لسانی و تعلیمی عالمگیریت کے اثرات تیسری دنیا کے ممالک میں واضح نظر آتے ہیں کہ جہاں اعلیٰ تعلیم میں انگریزی کا بطور واحد ذریعہ تعلیم ہونا (صرف ۲ء۶۳ فیصد آبادی کے لیے) کا نتیجہ طبقہ اعلیٰ کا باقی آبادی سے ثقافتی بیگانگی کی صورت میں نکلتا ہے۔

موجودہ عالمی تناظر میں انگریزی زبان کی اہمیت کئی حوالوں سے ہوتی ہے جن میں سے چند اہم درج ذیل ہیں

اس حوالے سے انگریزی زبان کی برتری مندرجہ ذیل ٹیبل Table سے واضح ہے

No of non native learners of major languages world wide

1.English 750 <1000, perhaps > 1000

2.French 82.5

3.Chinese 30(with other estimates hardly above 3)

4. German 16

5. Spanish 14

6. Italian 3-14

7. Japanese 3

2- زبان کو بولنے والے مقامی افراد کی تعداد

بین الاقوامیت یا عالمگیر ہونے کا جائزہ لینے میں ایک اہم عنصر اس زبان کو بطور مادری زبان بولنے والوں کی تعداد ہے۔اس کے ساتھ وہ لوگ بھی کامل کیے جاتے ہیں جو اس زبان کو بطور دوسری زبان سیکنڈ لینگوئج اختیار کرتے ہیں۔ Number of Native and Native plus second- language speakers of major languages world wide (in millions ranking order according to native plus second language speaker).

| **Rank** | **Language** | **No of Speakers** | |
|---|---|---|---|
| 1 | Chinese | 873 | 1051 |
| 2 | Hindi + urdu | 425 | 588 |
| 3 | English | 309 | 508 |
| 4 | Spanish | 322 | 382 |
| 5 | Russian | 145 | 255 |
| 6 | Arabic | 206 | 246 |
| 7 | Bengali | 171 | 211 |
| 8 | Portgeuese | 177 | 192 |
| 9 | Indonesian | 23 | 163 |
| 10 | Japanese | 122 | 123 |
| 11 | German | 95 | 123 |
| 12 | French | 65 | 45 |
| 13 | Italian | 62 | 62 |

[1] اسی طرح کسی زبان کے مرتبے کے تعین میں زبان کا معاشی استحکام اہم ہوتا ہے اس کا تعین عموماً اس زبان کو بطور مادری زبان بولنے والوں کے GDP سے ہو سکتا ہے اسی حوالے سے بھی دیکھیں تو انگریزی زبان درجہ اول پر فائز نظر آئی ہے۔

| **Language** | **Rank** | **GDP(Billions)** |
|---|---|---|
| English | 1 | 12.717 |
| Japanese | 2 | 45.98 |
| German | 3 | 34.50 |
| Spanish | 4 | 3204 |
| Chinese | 5 | 2400 |
| French | 6 | 2215 |
| Italian | 7 | 120 |
| Arabic | 8 | 984 |
| Portuguese | 9 | 872 |
| Russian | 10 | 584 |
| Hindi + Urdu | 11 | 215 |
| Bengali | 12 | 113 |
| Indonesian | 13 | 38 |

---

Nikolas Coupland, *Language,The handbook of language and globalization*, p110

اس میں سیکنڈ لینگویج سپیکرز کو شامل نہیں کیا گیا ورنہ اس طرح اعداد و شمار کی درستی کا حصول مشکل ہوتا۔

کسی زبان کے مقام و مرتبے کے تعین میں یہ بھی اہم عنصر ہے کہ وہ زبان کتنے ممالک کی سرکاری زبان ہونے کا شرف رکھتی ہے- اس حوالے سے بھی دیکھا جائے تو انگریزی اول نمبر پر متمکن نظر آتی ہے۔اس حوالے سے یہ ٹیبل دیکھئے:

| Language | Countries | Continents |
|---|---|---|
| English | 50 | 6 |
| French | 29 | 5 |
| Arabic | 22 | 2 |
| Spanish | 21 | 2 |
| Portuguese | 8 | 3 |
| German | 7 | 1 |
| Chines/ Italian | 3 | 1 |
| Bengali | 2 | 1 |
| Hindi+Urdu | 2 | 1 |
| Russian | 2 | 2 |
| Indonesian/Japanese | 1 | 1 |

(۱)

موجودہ سالوں میں دنیا بھر میں پھیلی ملٹی نیشنل کمپنیاں انگریزی کو اپنی سرکاری زبان یا پھر معاون سرکاری زبان کے طور پر اختیار کیے ہوئے ہیں۔اس کا مطلب یہ نہیں کہ دوسری زبانیں بین الاقوامی طور پر استعمال نہیں کی جارہی ہیں۔ تاہم اس سے انگریزی زبان کی فوقیت اور اہمیت ضرور واضح ہوتی ہے۔انگریزی زبان کی اہمیت مندرجہ ذیل پہلوؤں سے بھی واضح ہوتی ہے

## سائنس Science:

سائنس وہ میدان ہے۔ جہاں انگریزی زبان نمایاں بلکہ غالب زبان کے طور پر سامنے آتی ہے۔ دنیا بھر کی سائنسی publications میں کسی زبان کا حصہ وہ اہم اشاریہ ہے جس سے زبان کی اہمیت اور اس کے مقام کے تعین میں مدد ملتی ہے۔

تذکرہ بالا تمام اہم عناصر اگرچہ انگریزی زبان کی اہمیت پر دال ہیں لیکن زبان اور ثقافت کے تعلق کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

عالمگیریت کے مختلف اداروں کے علاوہ انٹرنیٹ، ٹیلی ویژن، فلموں نے انگریزی زبان کو پھیلانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

پاکستان کی صورتحال دیکھیں تو یہاں انگریزی علمیت اور اسٹیٹس کا مظہر سمجھی جاری ہے۔طبقہ اعلیٰ سے ادنی تک سب لوگ ہی اس کے دلدادہ ہیں۔روزمرہ کاروبار اور پیشوں کو اس بدیشی زبان کا لبادہ اور پڑھانے کی کوشش کی جارہی ہے۔بازار میں اب حجام، نائی کپڑے کا بازار جیسے اسما نظر نہیں آتے۔ بلکہ ہیئر ڈریسر، باربر، ٹیلرز، کلاتھ مرچنٹس جیسے بورڈ آویزاں نظر آتے ہیں۔ تعلیم کے لحاظ سے دیکھیں تو پرائیویٹ تعلیمی ادارے جہاں میڈیم انگلش ہو معیاری اداروں کا درجہ رکھتے ہیں ریڈیو اور ٹی وی چینلز پر اناونسرز اردو اور

(1) Nikolas Coupland, *Language, The handbook of language and globalization* , p112

انگریزی کی ملغوبہ پیش کرتے ہیں اور اردو کو بھی انگریزی لب ولہجے میں ادا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ تاکہ ماڈرن کہلا سکیں اور اس میں چند الفاظ اردو کے شامل کرکے باقی انگریزی کا تڑکا لگا کر پیش کیا جاتا ہے عالمگیریت کے لسانی پہلو کے تحت ہماری معاشرتی اقدار بھی متاثر ہو رہی ہیں۔ انگریزی نے ہماری قومی زبان اُردو پر بھی اثرات مرتب کیے ہیں اور اس میں بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ آج کی اردو دو دہائی قبل کی اردو سے مختلف ہو چکی ہے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ ہمارے ہاں درآمد ہو کر آنے والی اشیا کا استعمال بھی بڑھ گیا ہے۔ ہم زندگی کے ہر شعبے میں ان کا استعمال کر رہے ہیں تو یقیناً ان کے بیان اور تفہیم کے لیے اردو زبان کو ڈھالتے ہیں جس کی وجہ سے اشیا اور ان کے متعلقات کا اردو زبان میں درآنا یقینی ہے یہی انداز اردو زبان کو کئی طرح سے متاثر کر رہے ہیں۔ مثال کے طور موبائل فون کے بڑھتے استعمال نے اردو زبان پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ نئی نسل میں موبائل فون کا سب سے زیادہ استعمال ایس ایم ایس کی صورت میں ہو رہا ہے یہ شارٹ چیٹنگ سروس ایک زبان رومن اردو میں ہوتی ہے اس سے اردو کا لہجہ اور ہیئتی نظام متاثر ہو رہا ہے۔

دنیا کی تمام زبانیں دوسری زبانوں سے اخذ و قبول کرکے اپنے دامن کو وسعت بخشتی ہیں۔ لیکن موجودہ دور میں عالمگیریت کے زیر اثر یہ تبدیلی زبانوں کے وجود کے لیے خطرے کی علامت کے طور پر سامنے آرہی ہے اور یہ اس صورت میں ہوتا ہے جب زبانوں کے مابین برابری کا تعلق نہ ہو بلکہ کسی ایک زبان کو مرکزیت حاصل ہو اور دیگر زبانوں کو حاشیے پر دھکیلا جارہا ہو۔ موجودہ دور میں دانستہ طور پر امریکی اقدار، امریکی نظام ہائے سیاست، معیشت اور معاشرت کو دنیا بھر میں تمام معاشروں پر مسلط کرنے کے لیے انگریزی زبان کا سہارا لیا گیا ہے۔

دنیا بھر میں ایک زبان رائج کرنے کے حوالے سے ایک کوشش اسپرانتو کی تخلیق کے ذریعے کی گئی۔ لیکن یہ تجربہ زیادہ کامیاب نہیں رہا۔ انگریزی زبان کو نوآبادیاتی دور میں فروغ ملا۔ یہ زبان استعماری مقاصد کے حصول میں مدومعاون رہی ہے۔ موجودہ دور میں بھی اسکا کردار تبدیل نہیں ہوا آج بھی یہ بڑی بڑی معاشی طاقتوں کے سامراجی مقاصد کی تکمیل میں ایک بڑی قوت کی حیثیت رکھتی ہے۔

تاہم عالمگیریت کے حامیوں کا کہنا ہے کہ انگریزی زبان کا پھیلاؤ کسی طور پر ایک زبان کی سامراجیت یا لسانی سامراجیت نہیں ہے۔ کیونکہ یہ انگریزی برطانوی یا امریکی نہیں ہے۔ بلکہ ہر علاقے اور ملک میں اس کو ڈھال کر ایک نئی زبان کی صورت دی جارہی ہے اور اسکو Localize کیا جارہا ہے۔

اگرچہ عالمگیریت کے حامیوں کی جانب سے اس بات کی تردید کی جارہی ہے کہ انگریزی زبان دوسری زبانوں کو حاشیے پر دھکیل قاتل زبان کا کردار ادا کر رہی ہے لیکن بغور دیکھا جائے تو یہ صورتحال آج پاکستان کے الیکٹرانک میڈیا میں نظر آرہی ہے کہ جہاں میزبان خواتین و حضرات فقرے میں چند الفاظ اردو کے شامل کرکے انگریزی کے کثیر الفاظ استعمال کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ صورتحال خود ان زبانوں کے لیے قطعاً سودمند نہیں۔ ایک طرف تو یہ صورتحال احساس کمتری کی علامت نظر آتی ہے دوسری طرف زبان کا حشر نشر کرتے ہوئے اسے تباہی کی طرف لے جارہی ہے۔

# عالمگیریت: نفسیاتی اثرات

یوں تو عالم گیریت کئی صدیوں سے انسانی تاریخ میں اپنا وجود رکھتی ہے کیونکہ نقل مکانی، تجارت اور خیالات و معلومات کے تبادلے کے نتیجے میں مختلف تہذیبیں ایک دوسرے کا اثر قبول کرتی رہی ہیں۔ تاہم گذشتہ کچھ دہائیوں میں ذرائع ابلاغ و مواصلات کی ترقی اور دنیا بھر میں مختلف معیشتوں کے مابین ایک دوسرے دوسرے پر بڑھتے ہوئے انحصار نے اس عمل کی تیزی اور شدت میں حیرت انگیز حد تک اضافہ کر دیا ہے۔ نتیجتاً عالمگیریت کی اصطلاح غالباً معاصر دنیا میں سب سے زیادہ مستعمل اور مروج اصطلاح بن چکی ہے۔ موجودہ دور میں عالمگیریت زندگی کے بہت سے پہلوؤں کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور اس موضوع پر لکھی جانے والی کتب عموماً اس کے معاشی، سیاسی، تہذیبی و ثقافتی اور ماحولیاتی اثرات سے بحث کرتی ہیں۔ عالمگیریت کے اس عمل نے فرد کے ذہن اور اس کی نفسیات پر کیا اثرات مرتب کیے ہیں اس حوالے سے براہ راست مباحث ان کتب میں شامل نہیں۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ اثرات بالواسطہ ہیں بلاواسطہ نہیں۔ عالمگیریت کے فرد پر نفسیاتی اثرات کو درج ذیل چار حوالوں سے دیکھا جاسکتا ہے:

1- ذات اور شناخت کے حوالے سے — Self and identity

2- معیارِ زندگی کے حوالے سے — Quality of life

3- ذہنی صحت کے حوالے سے — Mental Health

4- متفرق اثرات — Miscellaneous

## ذات اور شناخت کا مسئلہ

عالمگیریت کے حوالے سے فرد کی نفسیات پر مرتب ہونے والے اثرات میں سرفہرست شناخت میں تبدیلی ہے۔ مثلاً اب دنیا بھر میں اکثر لوگ اب دو ثقافتی (Bicultural) شناخت رکھتے ہیں۔ ایک شناخت ان کے جغرافیائی منطقے کے مخصوص حالات کے تحت جنم لینے والی ثقافتی شناخت ہے اور دوسری عالمگیریت کے زیر اثر جنم لینے والی عالمی ثقافت کے تحت پروان چڑھنے والی شناخت ہے۔ اس دو ثقافتی دنیا میں غالب مغربی ثقافت سے تعلق رکھنے والے افراد کو نکال کر دنیا کے دیگر علاقوں سے تعلق رکھنے والے افراد اپنی شناخت کے حوالے سے تذبذب، کشمکش اور الجھن کا شکار ہیں اور اس سلسلے میں کئی رویے سامنے آتے ہیں۔ عالمگیریت کے ثقافتی اثرات کے تحت دنیا بھر میں مختلف معاشروں میں ثقافتی اقدار بدل رہی ہیں۔ یہ تبدیلی سبھی لوگوں کے لیے قابل قبول نہیں۔ ہر معاشرے میں ایسے لوگ موجود ہوں گے جو ان حالات میں نہ تو اب مقامی ثقافت کو اعتماد کے ساتھ اپنا سکتے ہیں اور نہ ہی اس عالمگیر ثقافت میں خود کو مطمئن محسوس کرتے ہیں۔ ایسی صورت میں وہ ہم خیال افراد کے ساتھ مل کر مخصوص ثقافتی اقدار کو اپنا لیتے ہیں اور ان کو کسی تبدیلی کے بغیر اصل حالت میں رکھنے کے خواہاں ہیں۔

## دوہری ثقافتی شناخت

عالمگیریت کے حوالے سے لکھنے والے مصنفین کی رائے ہے کہ موجودہ دور میں بچے اور نوجوان اس عالمگیریت کے شعور کے ساتھ پروان چڑھ رہے ہیں۔ مثلاً گڈنز Giddiness کے مطابق:

Children and adolescents have phenomenal worlds for the most part truly global.(1)

بچے اور نوجوان جس دنیا کا تصور رکھتے ہیں وہ عالمگیر دنیا ہے آج کا نوجوان سینکڑوں میل دور رونما ہونے والے حالات و واقعات، فیشنز رجحانات سے اسی طرح واقف ہے جیسے وہ اپنے قرب وجوار کے حالات وواقعات یا شاید اس سے بھی بڑھ کر۔

عالمگیریت کے حوالے سے لکھنے والے ایک اور اہم مصنف روبرٹسن (Roberston) اس حوالے سے کہتے ہیں:

Children today gradually develop the intensification of consciousness of the world as whole.(2)

رولاں ربرٹس بھی دنیا کو بطور ایک اکائی دیکھنے کی بات کرتے ہیں لیکن وہ مخصوص جغرافیائی حالات اور ثقافتی اقدار کو مکمل طور پر نظر انداز کر رہے ہیں۔

اسی طرح ٹاملیسن Tomlison بھی دنیا کو واحد ثقافتی افق قرار دیتے ہیں۔

World as a whole increasingly exists as a cultural horizon within which we frame our existence.(3)

یہ دانشور جس عالمی شعور کی بات کر رہے ہیں اسے ہم بآسانی دو ثقافتی شناخت کا نام دے سکتے ہیں۔ اگرچہ دو ثقافتی شناخت کی بات تارکین وطن اور اقلیتی نسلی گروہوں کے ضمن میں کی جاتی ہے۔ لیکن اس تصور کا اطلاق عالمگیریت پر بھی کیا جا سکتا ہے۔ سادہ الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ آج کا نوجوان اپنی مقامی ثقافتی شناخت کے ساتھ ساتھ ایک عالمگیر ثقافتی تشخص بھی رکھتا ہے ان کی یہ عالمی ثقافتی شناخت جدید ابلاغی ٹیکنالوجی کے ذریعے دنیا کے دور دراز علاقوں میں بسنے والے افراد کے ساتھ رابطہ قائم کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔

اس عالمگیر ثقافتی تشخص کے ساتھ وہ اپنی مقامی ثقافت بھی رکھتے ہیں وہ ثقافت جو وہ روزمرہ زندگی میں اختیار کرتے ہیں اور جس کے ذریعے وہ اپنے خاندان اور دوست احباب کے ساتھ ربط وضبط رکھتے ہیں۔

---

(1) Giddens, Anthony, *Modernity and Self-Iidentity: self and society in the late modern age* (Cambridge: polity press, 1991) p187

(2) Robertson, Roland, *Globalization: Social theory and global culture* ,p 8

(3) Tomlison, J.B, *Globalizationa and culture* (Chicago: University of Chicago Press, 1990) p 30

اس کی مثال ہمیں ہندوستان میں نظر آتی ہے کہ جہاں یہ دو ثقافتی مظہر نظر آتا ہے۔ ہندوستان جس کی معیشت کا ایک حصہ (سیکٹر) جدید ٹیکنالوجی سے متعلق ہے اور جس کی قیادت اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان کر رہے ہیں۔ یہ نوجوان عالمی ثقافت و معیشت کا مکمل رکن ہوتے ہوئے بھی ہندوستانی، سماجی روایات کے مطابق اپنے والدین کی طے کردہ (ارینج) شادیاں کر رہے ہیں۔ اسی طرح بڑھاپے میں وہ اپنے والدین کی دیکھ بھال بھی اپنی روایات کے مطابق کر رہے ہیں۔ دو ثقافتی تشخص مطلب یہ ہے کہ مقامی ثقافتی تشخص کے ساتھ عالمی ثقافتی تشخص کا بیک وقت حصہ ہونا۔ لیکن یہ بات بھی شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ یہ دو دھارے الگ الگ نہیں بہہ رہے۔ عالمگیریت کی مخصوص اقدار مثلاً آزاد منڈی کی معیشت، جمہوری اداروں کا قیام، عالمی ذرائع ابلاغ اور اس کے علاوہ نجی زندگی میں شادیوں میں تاخیر اور بچوں کی پیدائش میں التوا جیسے اثرات مقامی ثقافتی انداز میں تبدیلی کا باعث بن رہے ہیں اور اس طرح دو ثقافتی تشخص کی بجائے ایک (Hybrid) یعنی دوغلا کلچر اور دوغلی شناخت کی صورت سامنے آتی ہے۔

تارکین وطن کی صورت میں یہ معاملہ اور بھی پیچیدہ ہو جاتا ہے کہ ان کی اپنی مقامی ثقافت جو وہ ساتھ لے کر جاتے ہیں اور اس نئے مقام کی اپنی ثقافت بھی ہوتی ہے اور پھر ان دو ثقافتوں کے ساتھ عالمی ثقافت۔ ان تمام ثقافتوں سے انضمام سے کثیر الثقافتی شناخت یا پیچیدہ دوغلی شناخت صورت پذیر ہوتی ہے۔

## شناختی الجھاؤ

عالمگیریت کے زیر اثر مقامی ثقافتوں میں ہونے والی تبدیلیوں کو عام طور پر قبول عام کا درجہ مل جاتا ہے اور اس طرح اپنی مقامی ثقافت کے اندر رہتے ہوئے عالمی ثقافت کو عموماً لوگ اپنا لیتے ہیں لیکن استثنائی صورت میں کچھ افراد کے لیے اپنی ثقافتی اقدار میں رونما ہونے والی تیز رفتار تبدیلیوں کو قبول کرنا اور ان کے مطابق خود کو ڈھالنا ایک مشکل عمل ہے۔ عالمی ثقافت کے تصورات، اقدار و اطوار، مقامی ثقافتی اقدار اور تہذیبی روایات پر ان کے اعتماد کو متزلزل کر دیتے ہیں لیکن اس عالمی ثقافت کو اختیار کرنا ان کے لیے دشوار ہوتا ہے۔ اس طرح دو ثقافتی تشخص کو اپنانے کی بجائے وہ خود کو ان ہر دو ثقافتوں سے باہر محسوس کرتے ہیں۔

اس کے لیے تھامسن (Thomson) نے Delocalization کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ [۱]

اور ٹاملیسن (Tomlison) نے اس کے لیے Deteritorialization کی اصلاح استعمال کر کے وضاحت کی ہے۔ [۲]

جبکہ گڈنز اس کے لیے زیادہ واضح اصطلاح displacement استعمال کرتا ہے جس سے یہ مفہوم زیادہ سے زیادہ واضح ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ٹاملیسن (Tomlison) نے Delocalization کی جو اصطلاح استعمال کی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ جو نوجوان اس عالمگیریت کے شعور اس کے نتیجے میں عالمی شناخت کے ساتھ پروان چڑتے ہیں وہ اس خاص جگہ جہاں سے وہ تعلق رکھتے ہیں خاص یگانگت نہیں رکھتے۔ اس طرح آج کل کے بچے جہاں پرورش پاتے ہیں وہ جگہ ان کے لئے ماضی کے لوگوں کے مقابلے کے بہت کم

(1) Thompson, J.B, *The Media and Modernity*, (Cambridge: polity press, 1995) p 25

(2) Tomlison J.B, *Globalization and culture* , p 41

اہمیت رکھتی ہے اور اس تبدیلی کے پیچھے بھی ٹیلی ویژن اور انٹرنیٹ جیسی ایجادات ہیں ٹاملیسن( Tomlison)کے مطابق زیادہ تر نوجوانوں کے لیے delocalization(غیر مقامیت)کا یہ احساس کسی نقصان یا محرومی کے احساس کے بغیر زندگی بسر کرنے کا ایک عام قرینہ ہو سکتا ہے۔ لیکن کچھ لوگوں کے لیے یہ عالمگیر تناظر ایک مشکل صورتحال ہو گی کیونکہ یہ عالمی ثقافت ان کی مقامی ثقافتی روایات کی نفی کرتی ہے اور یہ صورتحال ان کے لئے ذہنی الجھائو اور پیچیدگی کا باعث بن سکتی ہے۔

دو ثقافتی شناخت کی صورت میں فرد کے ذہن پر مختلف اثرات مرتب ہو سکتے ہیں اس حوالے سے مختلف رد عمل ہو سکتے ہیں:

یعنی ایک ایسی صورت حال جس میں ایک فرد اپنی اصل ثقافت سے عدم دلچسپی رکھتا ہو لیکن نئے کلچر کو مسترد کرتا ہو یا یہ نیا کلچر اسے مسترد کرتا ہو۔ عالمگیریت کی صورت میں اس کا اطلاق اس شخص پر کیا جاسکتا ہے جو عالمگیریت کے زیر اثر مقامی ثقافت پر اپنا اعتماد کھو چکا ہو لیکن خود کو عالمی ثقافتی اقدار کے مطابق ڈھالنے میں ناکام ہو۔ اور اس طرح شناختی الجھاؤ یا الجھن کا شکار ہو۔

اسی طرح Culture Shedding کی اصطلاح ہے اس کا مفہوم یہ ہو سکتا ہے کہ عالمی ثقافت مقامی ثقافتی انداز میں تبدیلی کا باعث بن رہی ہے۔ مثلاً اکثر مشرقی معاشروں میں پدر سری خاندانی نظام رائج ہے لیکن اب تعلیم کے عام ہونے سے اور خواتین کے حقوق کی تنظیموں کے پیدا کردہ شعور کے باعث خاندان میں مرد کے حتمی اختیارات میں کمی ان معاشروں کے نوجوانوں میں Culture Shedding کا باعث ہوتی ہے۔

اسی طرح Acculturative Stress: یہ اصطلاح اصل مقامی ثقافت اور نئی عالمی ثقافت کے مابین کشمکش کو بیان کرنے کے لیے استعمال کی جاتی ہے اور یہ اس صورت میں ہوتا ہے جب مقامی ثقافتی اقدار وروایات کے عالمی ثقافتی اقدار سے مطابقت نہ رکھتی ہو۔ تو اس کا نتیجہ بھی شناخت کی الجھن کی صورت میں برآمد ہو گا۔

Cultural Distance: مقامی ثقافتی اقدار اور عالمی ثقافتی روایات میں عدم یکسانیت اور بعد کو بیان کرنے کے لیے یہ اصلاح وضع کی گئی ہے اور یہ ثقافتی اقدار کی عام یکسانیت جتنی زیادہ ہوتی ہے وہ لوگ زیادہ شناختی الجھاؤ کا شکار ہوں گے۔

اس شناختی الجھاؤ یا شناخت کی الجھن کا نتیجہ مختلف نفسیاتی عوارض مثلاً Depression(ذہنی دباؤ) فرسٹریشن، خودکشی اور نشہ آور ادویات کے استعمال کی صورت میں نکل سکتا ہے۔ تحقیق سے یہ بات بھی ثابت ہو گئی ہے کہ جن ممالک میں عالمگیر ثقافت کو اختیار کے عمل میں تیزی دکھائی گئی وہاں خودکشی کی شرح اور نشہ آور مواد کے استعمال میں اضافہ دیکھنے میں آیا۔

ان عالمگیر ثقافتی اقدار کے رد عمل میں کچھ مختلف رویے اور بھی ملتے ہیں۔ بہر حال ان کی بنیاد میں ان عالمی ثقافتی اقدار کو رد کرنے کا رجحان اور جذبہ ہی ہے۔

## خود اختیاری ثقافتیں

عالمگیریت کی بنیاد آزاد منڈی کی معیشت اور جمہوریت پر ہے۔ اس کے علاوہ اس کی بنیادوں میں انتخاب کی آزادی، فرد کے

حقوق، اور اختلافات کو برداشت کرنا بھی شامل ہے۔ اس عالمی ثقافت میں ان خصوصیات کی گہری چھاپ ہے۔ کیونکہ یہ خصوصیات ان ممالک کی انفرادی پہچان بھی ہیں جو عالمگیریت کی اس تحریک کے رواں رواں ہیں۔ یہ خصوصیات اس لیے بھی عالمگیریت کی امتیازی خصوصیات ہیں کیونکہ یہ عالمی ثقافت دنیا بھر کے انسانوں کو یک رنگی ثقافت میں رنگنے کے لیے سرحدوں اور ثقافتی تنوع سے تجاوز کرتی ہے۔ اختلافات کو برداشت کرنے بلکہ قبول کرنے پر زور دیتی ہے۔ عالمی ثقافت کی یہ خصوصیات ضروری ہیں۔ ذرائع ابلاغ کی ترقی نے اس عالمی ثقافت کو دنیا بھر کے لیے قابل قبول بلکہ پرکشش بنادیا ہے۔ سوائے ان ممالک کے جہاں اس عالمی ثقافت کو اختیار نہ کرنے کی شعوری کوشش کی جاتی ہے مثلاً سعودی عرب، شمالی کوریا اور کیوبا وغیرہ اور اس حوالے سے سب سے زیادہ تنقید جو اس عالمگیر ثقافت پر کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ عالمگیریت دنیا بھر میں ایسی واحد ثقافت کو پروان چڑھانا چاہتی ہے جہاں تمام بچے Big Mac کھانا پسند کرتے ہوں، چھٹیاں Disney World میں گزاریں اور نیلی جینز اور نائیک (Nike) ان کے پسندیدہ ملبوسات ہو تاہم عملاً ایسا ممکن نہیں ہے صرف اس لیے نہیں کہ لوگ دو ثقافتی طرز زندگی جاری رکھیں گے بلکہ اس لیے بھی ثقافتی تنوع موجود رہے گا کہ لوگ اپنے لیے کلچر کا انتخاب خود کریں گے۔ ایسا کلچر جو اس عالمی ثقافت کے مقابلے میں ان کی زندگی کو ایک خاص ساخت دیتا ہو۔ زیادہ با معنی بناتا ہو۔ زیادہ تر نوجوان اس عالمگیر ثقافت کو فوراً بغیر ہچکچاہٹ کے قبول کر لیتے ہیں۔ لیکن ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو خود کو قصداً منفرد رکھنا چاہتے ہیں۔

عموماً مختلف ثقافت کو اختیار کرنے والے مذہبی بنیاد رکھتے ہیں۔ یہ عالمگیر ثقافت اپنی اصل میں لادین (سیکولر) ہے۔ اور زیادہ تر مذہبی مسائل صارفیت، تفریح اور فرد کی آزادی کے پیش نظر نظر انداز کر دیے جاتے ہیں۔ اس عالمگیر ثقافت میں مذہبی مسائل صرف رواداری اور اختلافات کو برداشت کرنے کی حد تک موجود ہیں لیکن کچھ لوگوں کے لیے محض اتنا کافی نہیں۔ اس لیے وہ اپنی زندگیوں کو خاص سانچے میں ڈالنے کے لیے مذہبی نظام کی طرف رجوع کر لیتے ہیں اور ان دنیاوی اقدار کو رد کر دیتے ہیں۔

مذہبی بنیاد پر ثقافت کے انتخاب کی مثال ہمیں Debra Kaufman کی کتاب Rachel's Daughters[1], nearly Jewish orthodox women سے ملتی ہے۔ اس کتاب میں ان عورتوں کے حالات بیان کیے گئے ہیں جو امریکہ میں لادین یہودی گھرانوں میں پروان چڑھیں لیکن بلوغت کی عمر کو پہنچ کر وہ اس نتیجے پر پہنچیں کہ وہ لادین اقدار جن پر ان کی پرورش ہوئی ان کی زندگیوں میں کوئی معانی پیدا نہیں کرتیں۔ تشنگی کے اس احساس نے انہیں کٹر یہودیت کی طرف مائل کر دیا۔ یہودیت کے سخت جنسی اصولوں اور پابندیوں کے باوجود انہوں نے اسے قبول کیا کیونکہ یہ ان کی زندگیوں کو ایک خاص سانچے میں ڈھالتی ہیں اور اس کو با معنی بناتی ہیں۔

کٹر یہودی گروہ اگرچہ ایک مختصر گروہ ہے۔ لیکن مغرب میں اور مغرب سے باہر بھی بنیاد پرست مذہبی دھارے موجود ہیں۔

(1) Debra Renee Kaufman, *Rachel's Daughters, newly orthodox Jewish women* (New Jersey: Rutgers University Press 1993), p 87

یہ مذہبی گروہ اور مذہبی تحریکیں زیادہ تر بیسیوں صدی کے اواخر میں عالمگیریت کے رد عمل کے طور پر سامنے آئیں۔

یہ مذہبی گروہ عام طور پر معاشرے میں اقلیت کی صورت میں ہوتے ہیں اور ان افراد پر مشتمل ہوتے ہیں۔ جو تبدیلی کو ابدی سچائی کی تلاش میں رد کرتے ہیں۔ یہ بنیاد پرست تحریکیں اور گروہ اگرچہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں لیکن ان کے درمیان مشترک امور میں سخت ضابطہ اخلاق، شاندار مقدس ماضی پر یقین اور تنظیمی درجہ بندی شامل ہیں۔ اس کے علاوہ یہ گروہ مرد کی عورت پر برتری کے تصورات بھی رکھتے ہیں۔ ان بنیاد پرست مذہبی گروہوں کی یہ اقدار عالمی ثقافتی اقدار کے براہِ راست برعکس ہوتی ہے۔ یہ مذہبی گروہ یہ یقین رکھتے ہیں کہ سچائی صرف وہی ہے جو ان کی سچائی ہے۔ اور دیگر تمام لوگ جو اس سچائی کو قبول کرنے سے انکار کرتے ہیں وہ اپنی جسم وروح، دین ودنیا کو خطرے میں ڈال رہے ہیں۔

مذہبی بنیادوں پر ثقافتی تشخص کی ایک مثال ہمیں افغانستان میں بھی نظر آئی ہے۔ جو ایک خاص ظاہری وضع قطع کے ساتھ ایک خاص انداز فکر اور زاویہ نگاہ رکھتے ہیں اور اس کی سچائی کو حتمی اور آخری مانتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ خود اختیار ثقافت غیر مذہبی بنیادوں پر بھی ہو سکتی ہے۔ اس کی مثال 80 اور 90 کی دہائی میں Heavy Metal Music گروہ کی صورت میں نظر آتی ہے اور اس گروہ کے ممبران خود کو باقی معاشرے سے الگ تھلگ رکھتے اور مخصوص لباس جس میں سیاہ کنسرٹ کی قمیضیں جس پر Heavy Metal کا لوگو چسپاں ہوتا پہنتے تھے۔

اس کے علاوہ موجودہ دور میں عالمگیریت کے رد عمل کے طور پر دنیا کے مختلف علاقوں میں نسلی، مذہبی اور قومی شناختیں زیادہ نمایاں ہو کر سامنے آئیں۔ مثال کے طور پر ساموئز Samoons نے حال ہی میں اپنے بالغ مردوں کے جسم کے درمیانی حصے سے گھٹنوں تک جومیٹری کی اشکال کے Tatoos کے ذریعے سجانے کی روایت کا احیا کیا ہے۔ اس سے پہلے یہ روایت اس علاقے میں جنسی کشش کے حوالے سے اہم سمجھی جاتی تھی۔ اس بات کی علامت تھی کہ مرد اب بالغ ہے۔ لیکن اب انہوں نے عالمی ثقافت میں اپنی ثقافت کے مکمل انجذاب کے رد عمل کے طور پر اس روایت کا دوبارہ احیا کیا ہے۔

بہر حال یہ نفسیاتی رد عمل اور نفسیاتی اثرات عالمگیریت کی وجہ سے سامنے آئے ہیں۔ ثقافتی تشخص سے ہٹ کر بھی عالمگیریت نے اپنے اثرات فرد کی نفسیات پر مرتب ہوئے ہیں۔

## طرز زندگی میں تبدیلی کے اثرات

عالمگیریت کی ایک اہم خصوصیت موثر ذرائع ابلاغ کی بنیاد پر قائم ہونے والا معاشرہ ہے۔ ایک ایسی دنیا جہاں ایک فرد ایک خاص جغرافیائی مقام پر رہتے ہوئے کمپیوٹر پر بیک وقت کئی کام سرانجام دیتا ہے۔ موثر ذرائع ابلاغ انٹرنیٹ، ٹیلی ویژن وغیرہ کی بدولت ایک ہی وقت میں مقامی اور عالمی خبریں اور معلومات فرد تک بغیر کسی تاخیر کے پہنچ جاتی ہیں۔ یہ ایک طرف تو مثبت عمل ہے کہ وہ نہ صرف اپنے گردوپیش بلکہ عالمی منظرنامے سے آگاہ ہے لیکن دوسری طرف اس کا منفی پہلو یہ ہے کہ اس سے فرد پر ذہنی دباؤ بڑھ جاتا

ہے اور اس طرح Gergen[1] کا Absent person تصور سامنے آتا ہے۔ یعنی ایسا شخص جو سائبر نیٹ ورکنگ میں اتنا مشغول ہو جائے کہ اپنے گردوپیش کی دنیا ماحول اور افراد سے یگانگت مکمل طور پر یا جزوی طور پر ختم ہو جائے۔ دوسرے لفظوں میں اس سے مراد یہ ہے کہ ایک فرد جسمانی طور پر تو ایک جگہ موجود ہو لیکن ذہنی طور پر ایک مختلف دنیا میں مصروف ہو۔

## ذہنی صحت

عالمگیریت اپنی نہاد میں معاشی مضمرات کی حامل ہے لیکن اس کے اثرات مختلف ممالک کے مابین اور خود ایک ملک کے اندر مختلف طبقات پر یکساں نہیں ہیں۔ دولت کی غیر مساوی تقسیم نے ایک ملک کے اندر دولت کی بنیاد پر طبقاتی تقسیم کو گہرا کیا ہے۔ معاشی صورتحال کا ذہنی صحت کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ عالمگیریت کے مثبت اثرات کے تحت جہاں لوگوں کی آمدنی میں اضافہ ہوا ہے اور مالی آسودگی اور بہتر علاج معالجے کی سہولیات میسر آنے پر ان کی ذہنی وجسمانی صحت میں بہتری آئی لیکن جہاں غربت و بے روزگاری میں اضافہ ہوا وہاں ذہنی صحت پر منفی اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ انہی حالات کے تحت کچھ ممالک میں خودکشی کی شرح میں اضافہ ہوا ہے۔ Walker کے مطابق:

"عالمگیریت کے اثرات ڈپریشن میں اضافے کی صورت میں نظر آتے ہیں جہاں ترقی کے Post Fordit ماڈل کو اختیار کیا گیا جو فرد (مزدور) کو مدد وحمایت کے روایتی ذرائع مثلاً لیبر یونین سے الگ تھلگ کر دیتا ہے۔"[۲]

جبکہ چھوٹے کارخانوں اور دکانوں میں طویل اوقات تک کام کرنے والے کارکنوں اور مزدوروں کو ذہنی دباؤ کا سامنا کرتے ہیں جنہیں انتہائی کٹھن حالات میں طویل اوقات تک کام کرنا پڑتا ہے۔

عالمگیریت خواہ تجارتی آزادی کا نام ہو یا مغربی اقدار و جمہوریت کا اس کے اثرات ذہنی و نفسیاتی اعتبار سے بہت سے لوگوں کے لیے منفی ہیں۔ جن میں کچھ کا تذکرہ کیا جا چکا جبکہ مزید یہ ہیں۔

## جارحیت اور اشتعال انگیزی میں اضافہ

عالمگیریت کی اقدار خواہ کتنی ہی مثبت کیوں نہ ہو لیکن یہ حقیقت بھی اپنی جگہ اہم ہے کہ اس تحریک کے اہم آلات میں ذرائع، انٹرنیٹ، ٹیلی ویژن وغیرہ نے معلومات اور تفریح کی رسائی قریباً ہر فرد کے لیے آسان بنادی ہے۔ اس کے متوازی اگر انسانی رویوں کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات بھی نظر آتی ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تحمل اور برداشت کا عنصر کم ہو رہا ہے۔ جارحیت اشتعال انگیزی اور تشدد پسندی میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ماہرین نفسیات کی اس ضمن میں کی گئی تحقیقات سے یہ بات سامنے آتی ہے۔ ان منفی رویوں کے پیچھے کارفرما عوامل میں ایک اہم عنصر میڈیا اور اس کا کردار بھی ہے، جو کہ عالمگیریت کی ترویج و اشاعت کا ایک اہم ذریعہ ہے۔

---

(1) Gergen,K.J.*The challenge of Absent Person*(New York:Cambridge University Press,2002) p 35

(2) Walker,C,*Depression and Globalization:the politics of mental health in twenty first century*(New York:Springer,2008) p 76

باب دوم

# عالم گیریت اور اردو ناول کا آغاز وارتقاء

## (آغاز تا ۱۹۴۷)

زبان و ادب انسانی تاریخ کے ہم عصر اور ہم زاد ہیں۔ زبان انسانی اظہار کا پہلا با قاعدہ اور معیاری ذریعہ ہے۔ موجودہ دور میں زبان کو کلچر کا حصہ سمجھا جاتا ہے۔ علم و ادب نے بھی انسانی تاریخ کے ساتھ قدم بہ قدم ترقی کے زینے طے کیے ہیں اور یہ اس بات کے گواہ ہیں کہ انسان مادی ترقی کے ساتھ ساتھ جمالیاتی سطح پر بھی ترقی کا خواہاں رہا ہے۔ بلکہ جدید مادی ترقی تو گذشتہ پانچ چھ صدیوں میں برق رفتاری سے رونما ہوئی ہے مگر فنون لطیفہ تو ابتدائی انسانی تہذیبوں میں بھی انسان کی ذہنی و روحانی تسکین کے ذریعے کے طور پر موجود تھے۔

دنیا بھر کی تہذیبوں میں جہاں دیگر فنون لطیفہ انسانی ارتقاء کے ہم قدم رہے ہیں وہیں ادب بھی انسانی ترقی و ارتقا کا چشم دید گواہ ہے۔ معلوم ذرائع کے مطابق ادب کی ابتدا منظوم تھی لیکن ادب میں ارتقا کے ساتھ یہ کئی شاخوں یا اصناف میں منقسم ہو گیا۔ اور نظم و نثر میں اظہار کے کئی پیرائے وجود میں آئے۔ نثری اصناف میں ناول کی صنف نہایت اہم اور وقیع ہے اور اپنے اندر بے پناہ تنوع اور وسعت رکھتی ہے۔ اسی لیے ناول کو ہمیشہ پختہ کار ذہن کی تخلیقی سرگرمی اور پختہ ذہن کے حامل قارئین کی پسند قرار دیا جاتا ہے۔

انسان نے اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لیے جس صنف یا پیرایہ بیان کو اختیار کیا یا جو بھی انداز اختیار کیا اس کی بنیاد کوئی قصہ یا کہانی تھا۔ کہانی ازل سے انسان کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔ خود انسان کی تخلیق بھی ایک بہت بڑی کہانی ہے۔ یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ کہانی انسانی سرشت کا حصہ ہے۔ انسانی سماج بے شمار کہانیوں کا مرقع اور مجموعہ ہے۔ ہر لمحہ ایک نئی کہانی جنم لیتی ہے پروان چڑھتی ہے اور پھر اختتام کی جانب بڑھتی ہے۔ خود انسانی زندگی بھی ایک کہانی ہے۔

انسانی تہذیب کے مختلف ادوار میں یہ کہانی انسانی زندگی میں رنگ بھرتی چلی آ رہی ہے کہیں نانی دادی کی گود میں کہانی سنی جاتی ہے تو کہیں قدیم بازاروں میں قصہ گو بڑے بڑے مجمعوں پر سحر طاری کرتے۔ یہی کہانی جب ادب کی بنیاد بنی تو نئی ادبی اصناف کو جنم دینے کا باعث بنی۔ ادب میں کہانی کی جہاں دیگر بہت سی اصناف ہیں وہیں پر ناول بھی اس کہانی کی بنیاد پر وجود میں آیا۔

ناول کی بنیاد قصہ اور کہانی ہے یہ اپنی وسعت اور تنوع کی وجہ سے انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کو اپنے اندر سمو لینے کی صلاحیت رکھتا ہے فلسفیانہ مباحث سے لے کر انسانی نفسیات کی باریکیوں تک، تاریخ انسانی کا ہر ممکنہ منظر نامہ ناول ہی میں پیش کیا جاتا رہا ہے۔ ناول کے اسلوب نے کئی رنگ بدلے ہیں اور اپنی فکری و فنی رنگا رنگی کی وجہ سے دیگر افسانوی اصناف سے ممتاز ٹھہرا ہے۔

ناول کے آغاز کے حوالے سے ماہرین کی مختلف آرا ہیں۔ ناول کی تحقیق و تنقید کے مطابق ناول کا آغاز مغرب سے ہوا۔ ناول کے آغاز کو عمومی طور پر مغرب میں تہذیبی تبدیلیوں سے جوڑا جاتا ہے۔ ناول کو یورپ میں صنعتی دور کی پیداوار سمجھا جاتا ہے۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ ناول دراصل انسانی سماج اور تہذیب میں اقدار کی تبدیلی کے ساتھ رونما ہوا ہے۔[۱]

---

(۱) شاہد نواز، *پاکستانی اردو ناول میں عصری تاریخ (۱۹۴۷ تا ۲۰۰۷)*، (سرگودھا: شعبہ اردو یونیورسٹی آف سرگودھا، ۲۰۱۸) ص ۱۶

ڈاکٹر محمد عارف کے مطابق:

> ”تہذیبی تبدیلی کا آغاز چونکہ واضح اور فیصلہ کن انداز میں مغرب میں ہوا تھا وہیں جاگیردارانہ تہذیب کو پچھاڑ، تاجرانہ اور سرمایہ دارانہ انقلابات نے فتح پائی تھی۔ سو مغرب ہی نئی صنف ادب ناول کی جنم بھومی ٹھہرا۔“ (۱)

اس سلسلے میں میلان کنڈیرا لکھتے ہیں:

"ناول یورپ کی تخلیق ہے، اس کے مکشوفات، اگرچہ مختلف زبانوں میں ہوئے، ملکیت بہرحال سارے یورپ کی ہیں یہ ”دریافتوں کا سلسلہ“ (sequence) ہی ہے (نہ کہ جو کچھ لکھا گیا اس کا حاصل جمع) جو یورپی ناول کی تاریخ مدون کرتا ہے۔۔۔" (۲)

بہرحال اس صنف کو ڈی۔ ایچ لارنس نے گلیلیو کی دوربین سے بڑی ایجاد قرار دیا ہے۔ ممتاز احمد اسے ایک سمندر قرار دیتے ہیں جس کا کنارا ناپید اور جس کی تہہ میں ان گنت دنیائیں آباد ہیں۔ معروف ناول نگار فلابیر نے اس کے لیے 'نشاط مسلسل' کا استعارہ بجا طور پر استعمال کیا ہے۔

ناول کی ابتدائی شکلیں یورپ میں چودھویں صدی عیسوی میں موجود تھیں۔ مگر ناول کا باقاعدہ آغاز یورپ میں سترھویں صدی میں ہوا۔ یہ دور یورپ میں کئی حوالوں سے یادگار ہے۔ اس دور میں یورپ میں صنعتی انقلاب کا آغاز ہو چکا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ مذہبی نقطہ نظر کہ یہ دنیا شیطان کا گھر ہے، آہستہ آہستہ معدوم ہو گیا تھا اور اب افراد میں شیطان کی سوچ سے بھی زیادہ پر تعیش زندگی کے حصول کی خواہش کا پودا جڑ پکڑ چکا تھا۔

اس دنیا کو سمجھا جانے لگا اور اس میں دل لگانے والوں کی کثرت ہو گئی۔ اسی دور میں ناول کا باقاعدہ آغاز ہوتا نظر آتا ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر محمد عارف لکھتے ہیں:

> ”بہرحال استثنائی مثالوں سے قطع نظر ناول کی روایت اٹھارویں صدی کے یورپ ہی میں قائم ہوئی جب تاجرانہ انقلاب، عقل و دانش اور عزم و ہمت کی بنیاد پر حقیقی معنوں میں برپا ہوا۔ بعد ازاں صنعتی انقلاب نے انفرادی اور سماجی زندگی کو بے انتہا گہرائی اور گیرائی بخشی تو ناول ہی اس کی ترجمانی کے لیے ناگزیر صنف ادب ثابت ہوا۔“ (۳)

اردو میں ناول کا آغاز انیسویں صدی میں ہوا۔ اردو بولنے والے سماج کے ہاں ایسا کوئی صنعتی انقلاب برپا نہیں ہوا لیکن ۱۸۵۷ میں جنگ آزادی کی ناکامی ضرور وہ نقطہ ثابت ہوئی جس نے سوچ کے زاویے یکسر بدل کے رکھ دیئے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی علامتی حکومت باقاعدہ طور پر اپنے منطقی انجام کو پہنچی۔ اس ناکامی نے جہاں ہندوستان میں حکمران طبقے کو بدل ڈالا وہیں پر محکومین کو بھی کئی

---

(۱) محمد عارف، پروفیسر ڈاکٹر، *اردو ناول اور آزادی کے تصورات*، (لاہور: پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی ۲۰۰۶) ص ۲۵

(۲) میلان کنڈیرا، *ناول کا فن (مکالمے اور دیگر نگارشات)* محمد عمیر میمن (مترجم) (کراچی: شہرزاد، ۲۰۱۳) ص ۲۵

(۳) محمد عارف، پروفیسر ڈاکٹر، *اردو ناول اور آزادی کے تصورات*، ص ۳۰

حوالوں سے نئے امتحان میں ڈال دیا۔ ہندوؤں کے لیے یہ تبدیلی محض حکمرانوں کی تبدیلی تھی پہلے مسلمان حکمران تھے اب انگریز حکمران بن گئے بلکہ بعض حوالوں سے یہ تبدیلی ان کے لیے خوش آئند ثابت ہوئی کیونکہ انگریزوں نے مسلم دشمنی میں ہندوؤں کو بعض خصوصی مراعات سے نوازا۔

اصل کڑا وقت مسلمانوں کے لیے تھا۔ ان سے حکمرانی چھینی گئی۔ ان کے طبقہ امرا سے جاگیروں اور جائیدادوں کی ضبطی ہوئی۔ جنگ آزادی میں ہندوؤں اور مسلمان دونوں شامل تھے لیکن انگریزوں کی مخاصمت اور انتقام کا نشانہ مسلمان بنے۔ ہندوؤں نے فوراً مفاہمتی پالیسی اپنالی۔ مسلمانوں کو یہ بات دیر سے سمجھ میں آئی وہ بھی سب کو نہیں۔ اس ضمن میں سر سید احمد خاں اور ان کے رفقا کا کردار اہم ہے۔

بہر حال اس ناکامی نے ہندوستانی معاشرے کو خوابوں سے نکال کر حقیقت کی دنیا میں لا کھڑا کیا۔ اگرچہ حقیقت پسندی کا یہ رویہ رفتہ رفتہ نمو پذیر ہوا کیونکہ ہندوستانی معاشرے کا عمومی مزاج غزل اور داستان جیسی اصناف سے مناسبت رکھتا تھا۔ لیکن بدلتے ہوئے سیاسی و سماجی حالات کا اثر لوگوں کے مزاج پر پڑا۔ ان حالات سے قطع نظر غیر ملکی آقا اپنے ساتھ اپنی ثقافت، زبان اور اپنی اقدار وروایات بھی لے کر آئے تھے اور برصغیر کے لوگوں کے ذہن اس نئی تہذیب سے بھی متاثر ہوئے۔

انگریزی زبان میں ناول کا نقطہ آغاز پامیلا ناول مصنفہ سموئیل رچرڈسن کو مانا جاتا ہے جو اٹھارھویں صدی عیسوی میں لکھا گیا اور ۱۷۸۰ سے ۱۸۴۱ تک شائع ہوتا رہا۔

یہ وہ دور تھا جب اردو بولنے والے معاشرے میں داستانیں لکھی جارہی تھیں۔ پامیلا کی اشاعت کے بعد انگریزی میں ناول نگاری کو اتنا فروغ ملا کہ صدی ختم ہوتے ہوئے ناولوں کی ایک اچھی تعداد لکھی جاچکی تھی اور جین آسٹن، ڈکنسن اور تھیکرے جیسے مصنفین نے فن ناول نگاری کو نئی بلندیوں سے روشناس کروایا۔ اس دور میں ہندوستان کی سیاسی صورتحال نہایت ابتر تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان میں سیاسی اقتدار کے حصول کے لیے سازشوں کے جال بچھانے میں مصروف تھی۔ دیسی ریاستیں رفتہ رفتہ ختم ہورہی تھیں۔ کمپنی کا مقصد اب محض تجارت ہی نہیں تھا بلکہ وہ پورے ہندوستان پر حکومت کرنے کے منصوبے کی تکمیل میں مصروف تھی۔

اردو میں ناول کے آغاز کے حوالے سے رشید احمد گوریجہ لکھتے ہیں:

> ”۱۸۵۷ کی جنگ آزادی کے فوراً بعد ہندوستان کی پوری فضا میں انقلاب برپا ہوا تعلیمی نظریات میں بھی تبدیلی آئی اور ادبی لحاظ سے بھی کئی تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔ سر سید احمد خان نے افادی ادب کی داغ بیل ڈالی۔ ڈپٹی نذیر احمد ان سے بری طرح متاثر تھے اس لیے انہوں نے سر سید کے اصلاحی پروگرام کی تکمیل کے لیے قصہ کہانی کو وسیلہ بنایا۔“ (۱)

(۱) رشید احمد گوریجہ، ڈاکٹر، *اردو میں تاریخی ناول*، (لاہور: ابلاغ، ۱۹۹۶)، ص ۳۱۹

نذیر احمد سے پہلے بھی کچھ نام ملتے ہیں جنہوں نے شعوری کوشش سے قصے کو مافوق الفطرت واقعات، غیر انسانی کرداروں اور سحر نگاری وغیرہ سے دامن بچاتے ہوئے تحریر کیا۔ ان میں خصوصیت سے شیخ غوث محمد قریشی بنارسی کا فسانہ غوث ہے جو ۱۸۴۶ میں مطبع آفتاب قدرت لوہامنڈی آگرہ سے چھپا۔ اسی قصے کو ۱۲۸۷ ہجری میں امیر الدین معنی دہلوی نے **مقتول جفا** کے نام سے اپنی زبان میں دوبارہ تحریر کیا اور نول کشور پریس لکھنؤ سے چھپوایا۔ اس کا پلاٹ ایک بادشاہ کے دو وزیروں کی باہمی رقابت سے تیار ہوتا ہے اور مافوق الفطرت واقعات، غیر انسانی کردار، عجائب نگاری اور سحر سے یکسر پاک ہے۔ سہیل بخاری اردو ناول نگاری میں اسے اردو ناول کا پیش رو قرار دیتے ہیں۔ (۱)

اسی طرح خط تقدیر از مولوی کریم ۱۸۶۲ میں پہلی دفعہ شائع ہوئی اور اسی سال مدارس پنجاب کے نصاب میں شامل کرلی گئی۔ دوسری بار ۱۸۶۴ اور تیسری بار ۱۸۶۵ میں شائع ہوئی۔ کریم الدین کی خط تقدیر ۱۸۶۲، نذیر احمد کی مراۃ العروس ۱۸۶۹ سے سات سال قبل شائع ہوئی تھی۔

اردو میں نذیر احمد نے ناول نگاری کی ابتدا کی، وہ پہلے ناول نگار ہیں جنہوں نے ایک مخصوص معاشرے کی سیاسی، معاشرتی اور اخلاقی زندگی کی تصویر کشی کی اور اردو ناول کو پہلی بار صحت مند اور مستحکم روایات عطا کیں۔ (۲)

نذیر احمد کے علاوہ اس دور کے دیگر لکھنے والوں میں رشیدۃ النسا، نواب سید محمد آزاد، نواب افضل الدین احمد، رتن ناتھ سرشار، امداد امام اثر، سجاد حسین، عبدالحلیم شرر، موہن لال، ریاض خیر آبادی اور راشد الخیری وغیرہ شامل ہیں۔

یہاں تک اردو ناول کو پریم چند کی صورت میں ایک بڑا ناول نگار میسر آگیا۔ بیسویں صدی کے آغاز سے انہوں نے ناول نگاری کا آغاز کیا، انہوں نے افسانے بھی لکھے اور بطور رومانوی تخلیق کار اپنے فنی سفر کا آغاز کیا۔ دنیا کا انمول ترین رتن ان کا ابتدائی حوالہ بنا۔ اسرار معبد ان کا پہلا ناول تھا جو آواز خلق میں ۱۹۰۳ سے ۱۹۰۵ تک چھپتا رہا۔ اس کے بعد ہم خرما و ہم ثواب (۱۹۰۶)، کشنا (۱۹۰۷)، جلوہ ایثار (۱۹۱۲)، بازار حسن (۱۹۱۸)، گوشہ عافیت (۱۹۲۹)، چوگان ہنی (۱۹۲۷)، نرملا (۱۹۲۹)، پردہ مجاز (۱۹۳۱)، غبن، میدانِ عمل (۱۹۳۲)، بیوہ، گئودان (۱۹۳۶)، آسمان کی پری، وفا کی دیوی (۱۹۴۰)، دوزخ، عشق کا روگ، چھٹکارا، اسرار محبت، منگل سوتر، روٹھی رانی کے علاوہ ہندی میں بھی ناول لکھے۔ انہوں نے اردو میں ناولوں کے علاوہ افسانے اور ڈرامے بھی لکھے۔ افسانہ نگاری میں ان کا نام بہت ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔

پریم چند کی ناول نگاری ایک عہد کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہندوستان کی سیاسی، سماجی اور معاشی زندگی ان کے ناولوں میں منعکس ہوتی رہی ہے۔ ہندوستان کے اس عہد کو جس میں پریم چند لکھتے رہے ہیں۔ سمجھنے کے لیے پریم چند کے ناولوں کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ (۳)

---

(۱) ڈاکٹر سہیل بخاری، *اردو ناول نگاری*، ص ۶۹

(۲) ڈاکٹر یوسف سرمست، *بیسویں صدی میں اردو ناول*، (حیدرآباد: نیشنل بک، ۱۹۷۳ء) ص ۱۲

(۳) ایضاً، ص ۱۰

عالمگیریت کے قدیم وجدید تصورات کے سلسلے میں یہ بیان کیا جاچکا ہے کہ اس کا تصور قدیم ہے اگر چہ اسے یہ نام بعد میں دیا گیاہے اور اس کا طریقہ کار بھی گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتا رہاہے۔ تاہم مختلف ادوار میں مقصد میں یکسانیت موجود رہی ہے اور عالمگیریت کا مقصد بھی ہر جائز وناجائز طریقے سے سرمایہ اکٹھا کرنا، وسائل پر قابض ہونا ہے بعینہ یہی مقصد قدیم دور میں بڑی بڑی سلطنتوں کا رہاہے جو مختلف علاقوں کو فتح کرکے اپنی قلمرو میں شامل کرکے ان علاقوں کے وسائل سے استفادہ کرتیں۔ قطع نظر ان علاقوں کے باشندے کی صورتحال کے ان کا استحصال کرکے فنڈز/وسائل کو بے دردی سے نوچا کھسوٹا جاتا۔ یہی مقصد لے کر ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان کارخ کیا اور برطانوی راج کے دور میں مقامی لوگوں کا استحصال کرکے وسائل کارخ سلطنت برطانیہ کی طرف موڑا گیا۔ یہاں تک کہ بنگال جو برصغیر کا سب سے زیادہ خوشحال صوبہ تھا اس کی لاکھوں پر مشتمل آبادی قحط کا شکار ہوکر موت کے منہ میں چلی گئی۔ بہرحال یہ استحصال ایک ہی سماج میں موجود طبقات کے درمیان بھی نظر آتا ہے۔ انسان کی تہذیبی تاریخ کی ابتدا میں ملکیت کا تصور موجود نہ تھا۔ انسان غاروں میں رہتا تھا اور سب کچھ مشترک تھا خاندان قبیلے قوم یا ملک کا تصور بہت بعد میں پیدا ہوا۔ ذرائع قدرت وفطرت پر قبضہ ہی نجی ملکیتوں کی بنیاد بنا اور یہی قبضہ گیری طاقت واختیار اور دولت واحترام کا سرچشمہ قرار پائی۔ ابتدائی انسانی معاشرہ مختلف طبقات میں تقسیم ہوا اور طبقاتی کشمکش اور استحصال کی صورتیں پیدا ہوئیں۔ یہیں سے دشمن، غیر اور اعلیٰ ادنیٰ وکمتر جیسے تصورات بھی پیدا ہوئے۔ غلاموں، لونڈیوں کی خرید وفروخت کا آغاز ہوا۔ استحصال کی روایت ایک خاندان کے دوسرے خاندان، ایک قبیلے کے دوسرے قبیلے اور ایک ملک کے دوسرے ملک کے وسائل پر قابض ہونے کے لیے حملے کے طریقہ کار میں ڈھلی۔ اس کے ساتھ جائیداد کے تحفظ، خاندان کی بقا اور ریاستی کنٹرول کو برقرار رکھنے کے لیے اخلاقی واقداری ضابطے تشکیل دِیے گئے۔ خیر وشر کا تصور بھی اسی لیے دیا گیا۔ خاندان کے بزرگ، قبیلے کے سربراہ اور ملک کے حکمران کو اتھارٹی مانا گیا۔ دوسروں کی مادی و غیرمادی ملکیت، ذہنی وروحانی، فنی وفکری ملکیت کا احترام لازم قرار پایا۔ جائیداد، خاندان، طبقات اور ریاست کے ادارہ وجود میں آئے اور آئین وقوانین کے تحفظ کے لیے فوج، پولیس اور عدالتی نظام وجود میں آیا۔

قوم پرستی، حب الوطنی، شہادت اور بہادری جیسے تصورات نے حملوں، قبضوں، فتوحات اور دوسرے لفظوں میں استحصال کو تقدس عطا کردیا۔ انسانی تہذیب کے ہر دور میں انسان نے اپنے تجربات سے استفادہ کرتے ہوئے جہاں مختلف ایجادات کے ذریعے بنی نوع انسان کی خدمت کی وہیں اپنی آسائش اور اپنی ملکیت میں اضافے کے لیے مختلف حیلے بہانے بھی تراش لیے۔ ایک پورا سیاسی، سماجی، معاشرتی اور مذہبی نظام وجود میں آیا۔ قبائلی دور سے جاگیرداری دور تک اور جاگیرداری دور سے سرمایہ دارانہ دور تک سامراجی استحصال کے لیے مقدس قومی اور مذہبی جواز تراشے گئے۔ کبھی رنگ ونسل کو بنیاد بناکر ظلم وستم، لشکرکشی، اور استحصال کی راہ اپنائی گئی تو کبھی مذہب وفرقہ کو آڑ بناکر دوسروں کے وسائل کو لوٹا گیا۔ یہیں سے انسانی تاریخ میں نوآبادیات کا دور نظر آتا ہے۔ تہذیبی تاریخ کے تینوں بڑے ادوار غلامی کے دور میں، جاگیرداری اور سرمایہ داری دور میں نوآبادیات کی شکلیں بدلتی رہیں۔ آج کے دور کو عالمگیریت کے دور کا نام دیا گیا۔ سائنس کی ترقی، صنعت وحرفت، جمہوری نظام، نئے پیداواری رشتوں، رسل رسائل کے ذرائع، آلات پیداوار اور سیاسی سماجی نظاموں کی جدید ترین صورتوں نے دنیا میں بدل کر رکھ دیا ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر محمد عظیم اللہ لکھتے ہیں

"برصغیر میں مغلوں کے زوال اور انگریزوں کی آمد نے بہت دور رس نتائج پیدا کیے اور زندگی کے تمام شعبوں پر اثرات مرتب کیے۔ انگریز اپنے ساتھ اپنا تمدن اپنی اقدار اپنا مذہب اور اپنا ادب اور اصناف ادب کو لائے۔" [۱]

عالمگیریت اپنی اصل میں سرمایہ دارانہ ہے جس کا مقصد قسم قسم کی اشیا کو پیدا کر کے دنیا کے مختلف حصوں میں اس کے صارف پیدا کرنا، مصنوعی ضرورتوں کا احساس پیدا کرنا اور ذہن سازی کرنا ہے۔ ترقی پذیر اور غریب ممالک کے وسائل کو تصرف میں لا کر دنیا کے چند بڑے بڑے سرمایہ داروں کی تجوریوں کو بھرنا ہے۔

جاگیر دارانہ نظام بھی استحصال اور وسائل پر غاصبانہ قبضے کی حد تک سرمایہ دارانہ نظام سے مماثلت رکھتا ہے اور ارتکاز دولت بھی دونوں میں مشترک ہے۔ ارتکاز دولت اور پھر اس سے جنم لینے والی برائیوں مثلاً معاشی ناہمواری، طبقاتی تقسیم، امرا کے غیر پیداواری مشاغل، خط غربت سے نیچے سسکتی ہوئی زندگی کو اردو کے مختلف ناول نگاروں نے اپنا موضوع بنایا ہے۔ اس سلسلے میں اردو ناول کی روایت پر نظر ڈالیں تو پریم چند وہ پہلے ناول نگار نظر آتے ہیں جنہوں نے اس طبقاتی کشمکش اور استحصال کو شعوری طور پر اپنے ناول کا موضوع بنایا ہے۔ لیکن عالمگیریت کے اولین مظاہر ڈپٹی نذیر احمد کے ناول میں بھی ملتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کا ناول **ابن الوقت** خصوصیت سے قابل ذکر ہے۔ اس سلسلے میں ان ناول نگاروں کے ہاں عالمگیریت کے اثرات کا جائزہ ان کے نمائندہ ناولوں کے ذریعے پیش خدمت ہے۔

---

(۱) محمد عظیم اللہ، ڈاکٹر، *اردو ناول پر انگریزی کے اثرات* (لاہور: دارالشعور، ۲۰۱۵) ص ۸۷

# ابن الوقت

اردو ناول نگاری کا آغاز ڈپٹی نذیر احمد کے اصلاحی قصوں سے ہوتا ہے۔ نذیر احمد کے فن کے متعلق ناقدین کی متضاد آرا کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ نذیر احمد نے اردو میں قصہ نگاری کی قدیم روایات سے انحراف کرتے ہوئے اپنے عہد کے مطالبات کے پیش نظر کہانی کو غیر فطری اور غیر حقیقی عناصر کی گرفت سے نکال کر عصری حالات کی عکاسی کا قرینہ سکھایا اور اسے حقیقی زندگی کے قریب تر کیا۔

"نذیر احمد نے ناول نگاری کا آغاز عصری حالات اور تقاضوں سے مجبور ہو کر ہی سہی، کیا لیکن انہوں نے کچھ انگریزی قصوں کو ضرور پڑھا ہو گا۔ اس کی روشنی میں انہوں نے اردو نثری قصوں کا جائزہ لیا ہو گا اور ان کے اندر یہ خیال پیدا ہوا ہو گا کہ اردو میں کچھ ایسے قصے لکھے جائیں جن کا تعلق زندگی کے ٹھوس حقائق اور معاشرتی مسائل سے ہو، جن میں غیر فطری ماحول نہ ہو، ارضیت ہو اور جس کے کردار انسانی معاشرے کی نمائندگی کرتے ہوں۔" (۱)

ڈپٹی نذیر احمد نے کل سات ناول لکھے ہیں۔ مراۃ العروس (۱۸۶۹) بناۃ النعش (۱۸۶۷) توبتہ النصوح (۱۸۷۴) فسانہ مبتلا (۱۸۸۵)، ابن الوقت (۱۸۸۸)، ایامیٰ (۱۸۹۱) اور رویائے صادقہ (۱۸۹۲)۔

یعنی کہا جا سکتا ہے کہ اردو میں ناول نگاری کا آغاز عالمگیریت کے زیر اثر ہوا۔ انگریزی ادب سے واقفیت نے اور قربت نے اس پودے کی آبیاری میں زبردست حصہ لیا۔

**ابن الوقت** ڈپٹی نذیر احمد کے دیگر ناولوں کے مقابلے میں فنی و فکری اعتبار سے بہتر ناول ہے۔ یہ ناول بھی ڈپٹی نذیر احمد ایک خاص مقصد کو ذہن میں مد نظر رکھتے ہوئے لکھا۔ بنیادی طور پر یہ ایک کرداری ناول ہے۔ کلیدی کردار ابن الوقت کا ہے۔

ابن الوقت ایک اچھے گھرانے کا تعلیم یافتہ نوجوان تھا جو ذہنی طور پر انگریزوں سے متاثر تھا۔ ۱۸۵۷ کا ہنگامہ اس کی آنکھوں کے سامنے رونما ہوا۔ اس وقت وہ قلعہ کا ملازم تھا۔ غدر کے ہنگامے میں ابن الوقت نے ایک انگریز اعلیٰ عہدیدار کو پناہ دی۔ غدر کا ہنگامہ فرو ہوا تو صلے میں ابن الوقت کو ایک جاگیر بطور انعام اور ڈپٹی کلکٹری کا عہدہ ملا۔ مسٹر نوبل کے کہنے پر ابن الوقت اپنی قوم کی اصلاح کا بیڑا اٹھاتا ہے اور اس کے لیے وہ نوبل کے کہنے پر انگریزی وضع اختیار کر لیتا ہے۔ شہر سے باہر ایک بنگلہ کرائے پر لے لیتا ہے اور اسے جدید طرز کے فرنیچر اور جدید سامان آرائش سے آراستہ کرواتا ہے۔ لباس بھی مغربی طرز کا پہننے لگتا ہے۔ گھر میں کتے پالے جاتے ہیں اور حکمران طبقے میں اثر و رسوخ حاصل کرنے کے لیے گھر میں ڈنر اور پارٹیاں روز کا معمول بن چکی ہیں۔ انگریزی کھانے پکتے ہیں غرضیکہ اپنے تئیں وہ خود کو مہذب سوسائٹی کا فرد بننے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتا۔۔ صورتحال مسٹر نوبل کے قیام تک درست رہتی۔ خرابی طبع

(۱) *محمد عظیم اللہ، ڈاکٹر، اردو ناول پر انگریزی ناول کے اثرات، ص ۸۷*

کی بنا پر جب مسٹر نوبل ہندوستان چھوڑ کر جاتے ہیں تو ان کی جگہ مسٹر شارپ آجاتے ہیں مسٹر شارپ ابن الوقت کے انگریزی وضع اختیار کرنے کو پسندیدہ نظروں سے دیکھتے ہیں۔ وہ اس بات کے حق میں تھے کہ ہندوستانی انگریزی وضع اختیار نہ کریں۔ شارپ ابن الوقت سے ذاتی مخاصمت کی بنا پر جلن محسوس کرتا تھا اور اس نے ابن الوقت کو مسٹر نوبل کے انگلستان جانے کے بعد کافی تنگ کیا۔ اس دوران ابن الوقت کے بہنوئی حجۃ الاسلام بھی ابن الوقت کے طور طریقوں کی بنا پر اسے تنقید کا نشانہ بناتے ہیں اور اس کے ساتھ بحث و تمحیص بھی کرتے رہتے ہیں۔ ابن الوقت انگریزی معاشرت اختیار کرکے اپنے لوگوں میں پہلے مطعون تھا۔ اب انگریز بھی اسے ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اوپر سے انگریزی معاشرت کو نباہتے نباہتے وہ قرضوں کے انبار تلے دب چکا ہے۔ آخر ایک دن تنگ آکر وہ اپنی ساس سے ہندوستانی لباس میں ملنے چلا جاتا ہے۔

ابن الوقت نذیر احمد کی ایک ایسی تصنیف ہے جو ناول کی ہیئت کے زیادہ قریب نظر آتی ہے۔ یہ نذیر احمد کی زندگی کے تجربات واحساسات، سیاسی و سماجی بصیرت اور تہذیبی شعور اور مقصد حیات کی آئینہ دار ہے۔ یہ ناول نذیر احمد نے ۱۸۸۸ میں مکمل کیا۔ جنگ آزادی ناکام ہو چکی تھی۔ انگریزی حکومت ایک ناقابل تردید حقیقت بن چکی تھی۔ (نئی حکومت) سلطنت برطانیہ کی سرحدیں دور دور تک پھیل چکی تھیں اور کہا جاتا تھا کہ اس سلطنت میں کبھی سورج غروب نہیں ہوتا۔ صنعتی انقلاب کے نتیجے میں پیداوار کی کثرت نے یورپیز کو مجبور کیا کہ وہ نئی نئی منڈیاں تلاش کریں۔ عالمگیریت کی اس لہر نے برصغیر کو معاشی طور پر مفلوج کر کے رکھ دیا۔ انگریز حکومت نے اگرچہ یہاں دنیا کا سب سے بڑا نہری نظام دیا، ریلوے کا نظام متعارف کروایا لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ موجود ہے کہ یہ سب ترقیاتی کام مقامی باشندوں کی فلاح و بہبود کو مد نظر رکھ کر نہیں کیے گئے تھے۔ اگرچہ جزوی طور پر اس کا فائدہ مقامی لوگوں کو ہوا لیکن اصل مقصد خام مال اور تیار شدہ مصنوعات کی ترسیل میں سہولت پیدا کرنا تھا۔ اسی طرح نہری نظام کا مقصد زیادہ سے زیادہ پیدوار حاصل کرکے اپنی فوج کے لیے خوراک کی ضروریات پورا کرنا تھا۔ وہ مقامی لوگوں کی فلاح و بہبود یا برصغیر کی ترقی کے لیے کس حد تک مخلص تھے اس کا اندازہ اس تقریر سے ہوتا ہے جو مسٹر نوبل نے ابن الوقت کو اس وقت کی مہذب سوسائٹی میں متعارف کروانے کے لیے کی۔

انگریزوں نے مغلوں کے غیر موروثی جاگیرداری نظام کی جگہ موروثی جاگیرداری نظام متعارف کروایا۔ وجہ نوآبادیاتی مقاصد کا حصول تھا۔ مسلم طبقہ اشرافیہ کو ختم کرکے جاگیریں اپنے بہی خواہوں میں تقسیم کرنے کا مقصد اپنے لیے حمایت اور بوقت ضرورت سپاہ کی فراہمی تھا۔ اس کے ساتھ محاصل کو پیداوار کے ساتھ مشروط کرنے کی بجائے سختی کے ساتھ محاصل کی وصولی نے جہاں ایک طرف کاشتکاروں اور زمینداروں کی زندگی کو مشکل تر بنا دیا وہیں برصغیر کی کاٹیج انڈسٹری (گھریلو صنعتوں) اور اہل حرفہ کے حالات بھی تباہی کی داستان سنانے لگے۔ ان حالات کو ناول نگار نے ابن الوقت کی زبان سے یوں بیان کیا ہے:

"اہل حرفہ کی کیفیت کسانوں سے کہیں بدتر ہے۔ یہ سچ ہے کہ گورنمنٹ ان کے حال سے کم تر تعرض کرتی ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ نہیں کرتی مگر یورپ کی کلوں نے ان کو مار پٹڑا کر دیا۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے بہت سے عمدہ اور یافت کے پیشے معدوم ہو گئے اور ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اب کہاں ہیں وہ ڈھاکے کی ململ، بنارس کے مشروع، اورنگ آباد کے کمخواب، بیدر کے برتن، کالپی کے کاغذ، کشمیر کی شالیں، لاہور کے ریشمی ڈورے، اہل یورپ کیا اس پر بند ہیں کہ جس چیز کی مانگ ہندوستان سے ہوئی بنائی بھیج دی؟ نہیں وہ لوگ رات دن اس ٹوہ میں لگے ہیں کہ ہندوستان میں کیا کیا چیز پیدا ہوتی ہے۔ اور وہ انسان کے کس مصرف کی ہے اور اس ملک کے لوگوں کو کیا درکار ہے؟ نتیجہ یہ کہ ہندوستان سے ہر طرح کی پیداوار ولایت ڈھلی چلی جاتی ہے۔ کچھ تو یورپ کھپی اور کچھ ہندوستانیوں کے مصرف کی بن کر اُلٹی آگئی۔" (۱)

اردو میں ناول کا آغاز اگرچہ نوآبادیاتی مقاصد کے لیے نوآبادیاتی سرپرستی میں ہوا لیکن ابن الوقت تک آتے آتے مصنف سیاسی وسماجی شعور (جرأت بیداری) کی اس حد تک ترقی کر چکا ہے کہ جہاں ایک طرف اسے اپنے لوگوں کی جہالت، کاہلی بھی نظر آرہی ہے اور دوسری طرف وہ ان کی معاشی بربادی وتباہی کی ذمہ دار حکومت وقت کی پالیساں ہونے کا بھی شعور رکھتا ہے اور وہ جانتا ہے کہ

"انگریزی عملداری سے پہلے ہم میں اکثر لوگ خوش حال تھے بھی۔" (۲)

ابن الوقت نے جس اقتصادی صورتحال کی طرف اشارہ کیا ہے اس کی تصدیق تاریخ کی کتب سے بھی ہوتی ہے۔ علامہ عبداللہ یوسف علی اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

"سیاسی انقلاب کے بعد اقتصادی انقلابات نہایت ہی ہولناک واقع ہوئے۔ بنگال جو سلطنت مغلیہ کا سب سے زرخیز اور خوشحال صوبہ تھا اور جسے سلطنت ہند کی پیداوار کا ذخیرہ کہا جاتا تھا اس کا اب یہ حال ہو گیا کہ چند ہی دنوں میں غیر آباد ہو کر رہ گیا... جدید نظام مالگزاری جس کی رو سے نہایت سخت لگان عائد کیا گیا اور اس پر عمل بھی نہایت سختی سے ہونے لگا تھا جو اکثر زمینداروں کی تباہی کا باعث ہوا۔ ۱۷۷۰ کے قحط کا اثر ملک پر کئی سالوں تک باقی رہا۔" (۳)

عالمگیریت کی یہ صورت جسے نوآبادیات کہا جاتا ہے اس کا سامنا اس وقت بہت سے ممالک کو تھا۔ اس کا مقصد صرف اور صرف دولت اور وسائل کو سمیٹنا تھا۔ ایسی بہت سی مثالیں موجود ہیں کہ کیسے اس بدقسمت ملک کے وسائل کو لوٹا گیا یہاں تک کہ ہولناک قحط پڑا اور لوگ اپنے بچے تک فروخت کرنے پر مجبور ہو گئے۔

---

(۱) نذیر احمد، ڈپٹی، *ابن الوقت*، (لاہور: مجلس ترقی ادب، ۲۰۱۴ء) ص ۱۳۸

(۲) ایضاً، ص ۱۶۱

(۳) یوسف علی، علامہ، *انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ*، (لاہور، دوست ایسوسی ایشن، ۲۰۰۳ء) ص ۶۷

عالمگیریت کے اثرات ابن الوقت میں ایک طرف معاشی ہیں تو دوسری طرف اس کے ثقافتی اثرات بھی وقت کے ساتھ ساتھ ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ اور مصنف ایک ایسے سماج کی تصویر کشی کرتا ہے جہاں دو تہذیبوں کا ٹکراؤ ہمیں نظر آتا ہے۔ اس حوالے سے عظیم الشان صدیقی لکھتے ہیں:

"اپنے پہلے ناولوں میں انہوں نے قدیم تہذیب و معاشرت اور اس کے پروردہ افراد کو ہی طنز کا نشانہ بنایا تھا اور وہ زمانہ ہی ایسا تھا کہ نذیر احمد جدید تہذیب و معاشرت یا حکام وقت پر نکتہ چینی کی جرات نہیں کرسکتے تھے لیکن اس ناول میں وہ نہایت جرات اور بے باکی سے کام لے کر جدید تہذیب اور طرز معاشرت اور اس کے اندھے مقلدین کو طنز کا نشانہ بناتے ہیں۔ اس کی نفسیات کا تجزیہ کرتے ہیں۔ اس کے محرکات اور نتائج سے بحث کرتے ہیں اور اس عمل میں وہ کسی کے ساتھ رعایت نہیں برتتے۔" (۱)

نذیر احمد اگرچہ سرسید تحریک کے سرگرم رکن تھے۔ ادب میں مقصدیت کا نقطہ نظر غالباً اسی تحریک کا دین ہے جو نذیر احمد کے ہاں غالب نظر آتا ہے۔ تاہم مغربی تہذیب و معاشرت کے حوالے سے نذیر احمد سرسید سے متفق نہ تھے۔

اس غیر ملکی تسلط کے دور میں ہر چیز بازار جنس بن گئی اعلیٰ اخلاقی اقدار بھوک کی نظر ہو گئیں۔ یہاں ایک مثال علامہ عبداللہ یوسف علی نے درج کیا ہے کہ

"انگلستان کا ایک وکیل ولیم ہکی William Hickey ۱۷۸۲ اور ۱۸۰۸ کے درمیان میں تین بار ہندوستان آیا اور آخری مرتبہ تقریباً ڈیڑھ لاکھ کی رقوم خطیر اپنے ساتھ لے گیا اس نے ۱۷۸۹ کے قحط کا حال اپنی کتاب میں لکھا ہے اس زمانے میں کلکتہ کے شہر میں بے کس اور لاچار لوگوں کا ایک دریا امڈا چلا آرہا تھا۔ نعشیں اور سسکتے ہوئے لوگ جابجا بر سر راہ پڑے ملتے تھے۔ متواتر کئی دن تک روزانہ پچاس کی اوسط میں لوگ مرتے رہے۔ اور یہ استحصال کسی ایک طبقے تک محدود نہ تھا۔ غیر ملکی آقا ان کے اعلیٰ عہدیدار سے حکومتی مشینری کے نچلے طبقے تک سبھی اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھو رہے تھے کیونکہ غیر ملکی آقا خود اس اصول پر کاربند تھے کہ جہاں تک ہو سکے اور جتنی جلدی ہو سکے ملک سے روپیہ اکٹھا کر کے وطن کی راہ لو۔ اعلیٰ حکام اپنے ماتحتوں سے کہیں زیادہ حریص تھے۔ اس لیے اپنی حرص پوری کرنے کے

(۱) عظیم الشان صدیقی، نذیر احمد کی ناول نگاری، مشمولہ ڈپٹی نذیر احمد دہلوی سوانح و تصنانیف کا تنقیدی و تحقیقی جائزہ مرتبہ محمد اکرام چغتائی (لاہور: پاکستان رائٹرز کواپریٹو سوسائٹی، ۲۰۱۳ء) ص ۲۲۵

لیے انہیں ان ذرائع سے بھی دریغ نہ ہوتا جن سے ان کے ماتحت ظلم و جبر سے روپیہ وصول کر سکتے۔" (۱)

ابن الوقت میں انہوں نے بتایا کہ ابن الوقت مسٹر نوبل کے کہنے پر قوم کی اصلاح کا بیڑا اٹھاتے ہیں تو انہی کے قائل کرنے پر انگریزی طرز زندگی کو اختیار کر لیتے ہیں لیکن چونکہ مسلم معاشرہ اس وقت بہت زیادہ قدامت پرست تھا اس لیے ابن الوقت کے اس عمل کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا یہاں تک نوبل کے ہاں کھانا کھانے کی وجہ سے ابن الوقت کو کرسٹان کہا جاتا ہے یعنی دائرہ اسلام سے خارج ہونے کا فتویٰ دیا جاتا ہے۔ یہاں ناول نگار انگریزی طرز معاشرت کے مختلف مظاہر کو بیان کرتا ہے۔

"نوبل صاحب کے پاس سے اٹھا تو جان نثار ابن الوقت کو سیدھا اس کے بنگلے پر لے گیا اور جاتے کے ساتھ حجامت کروا اصطباغ دے یعنی نہلا دھلا، موسم اور وقت اور موقع کے مطابق انگریزی سوٹ پہنا۔ نکتہ، دپچی پوری یعنی بریسز، ٹائی، کالر سب کس کسا کر اس کو اچھا خاص عین معین یورپین جینٹل مین بنا دیا۔" (۲)

لیکن ابن الوقت کا یہ طرز عمل نوبل کی حد تک تو پسندیدہ تھا لیکن نوبل کے جاتے ہی مسٹر شارپ ابن الوقت کے اس طرز زندگی کو انگریز حاکم کے ساتھ برابری سمجھتے ہوئے اس سے برگشتہ ہو جاتا ہے اور حجۃ الاسلام کے ساتھ گفتگو میں واشگاف لفظوں میں ناپسندیدگی کا اظہار کرتا ہے۔ اس طرح ناول نگار اس طرز عمل سے یہ ثابت کرتا ہے کہ جو لوگ انگریزوں کی اندھی تقلید میں مغربی معاشرت کو قبول کرتے ہیں وہ جسمانی آسائش اور ذہنی سکون سے محروم ہو جاتے ہیں۔ بہر حال عالمگیریت کے یہ مظاہر اس ناول میں شروع سے آخر تک نظر آتے ہیں۔ عالمگیریت کے کے لسانی اثرات بھی اس ناول میں جابجا نظر آتے ہیں اور انگریزی الفاظ جو اردو عبارت میں ملتے ہیں

ھو کمز دیر who comes there۔ فرنڈز، ھُرا (۳)

ٹیبل کلاتھ (دستر خوان) (۴)

فنگر گلاس (ہاتھ دھونے کا پیالہ) (۵)

انٹروڈیوس (تقریب) (۱)

---

(۱) عبداللہ یوسف علی، علامہ، *انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ*، ص ۶۸

(۲) نذیر احمد، ڈپٹی، ابن الوقت، ص ۱۰۹

(۳) ایضاً، ص ۳۵

(۴) ایضاً، ص ۵۵

(۵) ایضاً، ص ۵۶

رفارمر (مصلح)[۲]، سٹیمر[۳] الیکٹریسی[۴] وغیرہ

اس کے علاوہ بھی کئی انگریزی الفاظ ملتے ہیں لیکن اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اس میں ناول نگار اس نقطہ نظر کا حامی نظر آتا ہے کہ ترقی کے لیے انگریزی زبان سیکھنا ضروری ہے گویا ترقی اور انگریزی زبان آپس میں لازم و ملزوم ہیں۔ اس سلسلے میں مسٹر نوبل کا طویل مکالمہ موجود ہے۔

"اور از بس کہ تمام علوم جدیدہ جن پر ملکی ترقی کا انحصار ہے انگریزی میں ہیں سب سے پہلے زبان انگریزی کو رواج دینا ہوگا۔ بعض لوگوں نے یہ بھی خیال کیا ہے کہ علوم جدیدہ کی کتابیں اردو میں ترجمہ کرائی جائیں مگر میں اس رائے سے متفق نہیں ہوں۔ اول تو زبان اردو میں اتنی وسعت نہیں کہ علوم جدیدہ کی تمام مصطلحات کا اردو ترجمہ ہو سکے، ناچار اکثر مصطلحات انگریزی کو اختیار کرنا پڑے گا اور ان کے تلفظ میں ضرور غلطیاں ہوں گی۔"[۵]

اسی طرح انگریزی سیکھنے کے حق میں دلائل دیتے ہوئے کہتا ہے کہ اس نے مختلف علوم کی کتابیں دیکھیں تو ترجمے اس طرح کے ہیں کہ آدھی لائن اردو میں آدھی انگریزی میں لیکن اگلے ہی بات میں وہ اصل مدعا بیان کر دیتا ہے کہ اس کے علاوہ انگریزی زبان کے رواج سے ایک غرض تو علوم جدیدہ کا پھیلانا ہے اور دوسری غرض بھی ہے یعنی عموماً انگریزی خیالات کا پھیلانا۔[۶]

مسٹر نوبل نو آبادیاتی فکر کو فروغ دینے میں بہت دانشمندی سے کام لیتا ہے اور ابن الوقت کے انگریزوں کی طرف جھکاؤ دیکھتے ہوئے اسے اپنے مقصد کی خاطر استعمال کرتا ہے اور مسٹر نوبل انگریزی زبان کو عام کر کے انگریزی خیالات کی اشاعت سے اپنی حکومت کا استحکام چاہتا ہے اور اس کے لیے وہ چاہتا ہے کہ

"جہاں تک ممکن ہو ہندوستانیوں کو انگریزی بنایا جائے خوراک میں، پوشاک میں، زبان میں، عادات میں، طرز تمدن میں، خیالات میں۔"[۷]

---

(۱) نذیر احمد، ڈپٹی، ابن الوقت، ص ۸۲

(۲) ایضاً، ص ۸۳

(۳) ایضاً، ص ۸۶

(۴) ایضاً، ص ۸۸

(۵) ایضاً، ص ۸۹

(۶) ایضاً، ص ۹۰

(۷) ایضاً، ص ۹۰

بظاہر تو مسٹر نوبل ہندوستانیوں کی ترقی کا خواہاں ہے لیکن در حقیقت غدر کے بعد وہ چاہتا ہے کہ ہندوستانیوں کو ان کی تہذیب و ثقافت زبان اور مذہب سے الگ کر کے ان کے دلوں پر اپنی زبان، اپنی تہذیب و ثقافت کی برتری کا سکہ بٹھایا جائے تاکہ پھر کبھی وہ ان کے مقابل نہ آسکیں۔

نوبل کے مقابلے میں شارپ زیادہ واضح طور پر اور کھل کر نو آبادیاتی فکر کا اظہار کرتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ انگریزی زبان سیکھ کر اور انگریزی لباس پہن کر مقامی لوگ حاکموں کی برابری کا خواب دیکھ رہے ہیں جو اس کے احساس برتری کے لیے کسی طور پر قابل قبول نہیں۔ اس کے علاوہ نو آبادیات جسے ہم عالمگیریت کی ایک شکل کے طور پر دیکھتے ہیں کی نفسیات کا اظہار مختلف طریقوں سے ہو رہا ہے۔

مقامی لوگوں کو کاہل سست کہا جاتا ہے مثلاً ابن الوقت ایک جگہ کہتا ہے:

"ہندوستانیوں کا لباس ان کی کاہلی اور آسائش طلبی کی دلیل ہے۔" (۱)

مسٹر نوبل کہتا ہے:

"خدا نے جیسی ان کی طبیعتیں بودی اور محکوم بنائی ہیں ویسے ہی یہ لوگ سدا سے بودے اور محکوم رہتے چلے آئے ہیں۔" (۲)

خود ابن الوقت جب مسٹر نوبل کے ہاں کھانا کھانے جاتا ہے تو چھری کانٹے کے استعمال میں ناواقفیت کی بنا پر اس کا مضحکہ اڑایا جاتا ہے۔

اس طرح اردو ناول نے اپنے ابتدائی دور میں ہی حاکم انگریز قوم کے عزائم اور ان کی ذہنیت کا پردہ بہت خوبصورتی سے چاک کرتے ہوئے مقامی لوگوں کو احساس دلایا کہ محض حاکموں کی مشابہت اختیار کر کے وہ اپنی کھویا ہوا وقار دوبارہ حاصل نہیں کر سکتے۔ بلکہ ان کی عزت اپنی روایات اور اقدار کے ساتھ جڑے رہنے میں ہے۔ دوسری طرف ہندوستانیوں کو تہذیب سکھانے کی خود اختیار کردہ ذمہ داری کی حامل قوم کی سوچ کی جھلکیاں بھی دکھاتے ہیں کہ ان کا مقصد محض حکومت کرنا ہے اور ان کی اس حکومت نے ہندوستان کو کس حال تک پہنچا دیا ہے اور ہندوستان کی اس حالت کے ذمہ داروں کا وہ بخوبی شعور رکھتے ہیں۔

---

(۱) نذیر احمد، ڈپٹی ابن الوقت، ص ۴۷

(۲) ایضاً، ص ۵۴

# فسانہ آزاد

پنڈت رتن ناتھ سرشار کا شمار انیسویں صدی میں اردو ناول کے بنیاد گذاروں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے کئی ناول لکھے ہیں لیکن ان کی شہرت و مقبولیت کا انحصار **فسانہ آزاد**، **سیر کہسار** اور **جام سرشار** پر ہے۔

پنڈت رتن ناتھ سرشار نے عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے علاوہ ۱۸۵۶ میں انتزاع سلطنت لکھنؤ کے بعد مغربی تعلیمی اداروں کا قیام عمل میں آیا چنانچہ سرشار نے کینگ کالج میں داخلہ لیا لیکن اپنی لاابالی طبیعت کی وجہ سے ڈگری تو نہ لے سکے تاہم کالج سے وہ انگریزی کی اچھی خاصی استعداد پیدا کر کے نکلے اور اپنی محنت اور مطالعہ سے اس میں مزید اضافہ کیا۔ اس طرح اردو، فارسی اور انگریزی زبانوں پر انھیں عبور حاصل تھا۔ اردو کے علاوہ انگریزی کے افسانوی ادب کا مطالعہ بھی کیا تھا اور ساتھ ہی مغرب کے جدید علوم و افکار سے بھی بے بہرہ نہ تھے۔ اتنا ہی نہیں انھیں انگریزی سے اردو ترجمے پر بھی عبور حاصل تھا۔ انھوں نے Don Quixote کا ترجمہ **خدائی فوج دار** کے نام سے کیا۔

سرشار کا ناول فسانہ آزاد پہلے منشی نول کشور کے **اودھ اخبار** میں بالاقساط شائع ہوا اور بعد ازاں یہ کتابی شکل میں چھپا۔ سرشار کوئی باقاعدہ ناول یا منظم قصہ نہیں لکھنا چاہتے تھے بلکہ لکھنؤ کے باشندوں کی روزمرہ زندگی کی جھلک دکھانا چاہتے تھے۔

فسانہ آزاد کا موضوع اس کے ہیرو یعنی آزاد کی مہمات ہیں۔ آزاد ایک ایسا انسان ہے جو ذہین بانکا اور خوبرو نوجوان ہے۔ ہر فن میں طاق ہے۔ آزاد کی فطرت میں جہاں گردی اور آوارگی ہے۔ لکھنؤ اور اس کے گردونواح کی سیر میں وہ لکھنؤ کے مہذب گھرانے کی دوشیزہ حسن آرا کو دیکھ کر اس کے عشق میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ وہ حسن آرا کو شادی کا پیغام دیتا ہے تو حسن آرا کہتی ہے کہ وہ پہلے دنیا میں کچھ شہرت اور ناموری حاصل کر لے اور شادی کے لیے حسن آرا آزاد کے سامنے یہ شرط رکھتی ہے کہ آزاد روس کے خلاف مسلمانوں کی طرف سے جنگ بلقان میں حصہ لے۔ آزاد شرط مان کر اپنے رفیق خوجی کے ساتھ جنگ میں شریک ہو کر شجاعت اور جرات کے ایسے کارنامے سرانجام دیتا ہے کہ یورپ کی شہزادیاں بھی اس پر جان دینے لگتی ہیں۔ آزاد جواباً عشق کا اظہار کرتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ حسن آرا کو بھی یاد رکھتا ہے۔ آخر کار وہ جنگ سے کامران لوٹ آتا ہے اور حسن آرا سے اس کی شادی ہو جاتی ہے۔ لکھنؤ کی ایک دوشیزہ ثریا بھی اس کے عشق میں گرفتار ہو جاتی ہے لیکن آزاد اس کی طرف مائل نہیں ہوتا۔ مایوس ہو کر وہ ایک نواب سے شادی کر لیتی ہے۔ بظاہر یہ ایک عشق کا قصہ ہے لیکن اس ناول میں پیش کیا گیا عشق کا تصور روایتی نہیں۔ آزاد بیک وقت کئی عورتوں کا عاشق ہے اس میں محنت کش طبقے کی عورت اللہ رکھی سے لے کر طبقہ اشرافیہ کی سپہ آرا اور حسن آرا شامل ہیں ناول میں ایک اہم کردار افیون کے عادی خوجی کا ہے جو موقع پرستی اور مفاد پرستی کا نمونہ ہے۔ یہ دونوں کردار دراصل اخلاقی تنزلی اور تہذیبی زوال کو پیش کرتے ہیں۔ فسانہ آزاد کے حوالے سے ڈاکٹر احزاز نقوی کی رائے ہے:

"فسانہ آزاد کی پوری فضا دھو کہ بازی اور فریب میں مبتلا نظر آتی ہے۔ افراد ایک دوسرے کو ہر وقت فریب دینے کے لیے تیار معلوم ہوتے ہیں۔ دوست اور دشمن کی پہچان ممکن نہیں۔" (۱)

سرشار نے ۱۸۷۸ تا ۱۸۸۵ کے دورانیے میں یہ ناول اودھ اخبار میں لکھا جو بعد ازاں چار جلدوں میں شائع ہوا۔ بہر حال یہ وہ دور تھا جب ہندوستان مکمل طور پر انگریزوں کے قبضے میں آ چکا تھا۔ مفتوح قوم کی اقدار، تہذیب، لباس، مذہب، اور طرز زندگی احساس کمتری تلے دب چکی تھی اور فاتح یعنی انگریز قوم کی زبان، لباس، تہذیب، اقدار، طرز معاشرت اور طرز حکومت سمیت ہر وہ چیز جس کا انگریز قوم سے دور کا بھی تعلق تھا مثبت خصوصیات کا استعارہ بن چکی تھی۔ مفتوح قوم خود اپنی تہذیب و معاشرت، اقدار و رویوں اور طرز زندگی کو ازراہ تمسخر دیکھ کر اس کی کمتری کو قبول کر چکے تھے جیسا کہ سرشار اس ناول کے کبیری کردار آزاد کو مغربی لباس میں دکھاتے ہیں اور اس کا حلیہ یوں بیان کرتے ہیں۔

"ایک صاحب وضع دنیا سے نرالے، پتلون خاکی، جاکٹ کالی، کوٹ پیلا، ویس کوٹ ڈھیلا، گھنی داڑھی خرگوش کی جھاڑی، ہاف بوٹ پہنے کھٹ پٹ کرتے ڈبل چال چلے جاتے ہیں۔" (۲)

عالمگیریت کے اثرات اس ناول میں کئی حوالوں سے نظر آتے ہیں اس میں نمبر ایک پر تو مغربی تہذیب کا اثر لباس کی صورت میں نظر آتا ہے۔ یہ محض لباس نہیں ہے اس کے ساتھ وہ خاص ذہنیت بھی وابستہ ہے جس کے تحت یہ لباس برتری جب کہ مقامی لباس کمتری کی علامت کے طور پر سامنے آتا ہے اور اس مقامی لباس کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ خود سرشار نے آزاد کے مقابلے میں مقامی وضع قطع رکھنے والے چھمی جان کا مذاق اڑایا ہے اور مقامی لباس کو زنانہ پن کی علامت اور آزاد کے لباس کو مردانگی کے لباس کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ زنانہ پن کے ساتھ کمزوری، بزدلی جیسے اوصاف منسلک کیا جاتا ہے جبکہ مردانہ پن کے ساتھ جرات بہادری اور دیگر اعلیٰ اوصاف کو منسلک کیا جاتا ہے۔ تو سرشار کے ہاں عالمگیریت کے مظاہر کے ساتھ اس کے پس پشت کار فرما سوچ کا اظہار بھی ملتا ہے اور ناول کا ہیرو محض انگریزوں کے لباس سے متاثر ہو کر صرف ظاہری وضع قطع میں ان کی تقلید نہیں کرتا بلکہ وہ ان کی اقدار اور رسوم و رواج سے بھی متاثر ہے اور انگریزی رسوم اسے مقامی رسومات کے مقابلے میں زیادہ فطری اور منطقی معلوم ہوتے ہیں اور وہ ان دو کے درمیان موازنہ کر کے یورپی رسوم کی تائید اور ہندوستانی رسوم کی مذمت کرتا نظر آتا ہے۔

"واہ رے انگریز واللہ ان کے یہاں کتنی عمدہ رسم ہے کہ جب تک نوکر چاکر نہ ہوں تب تک شادی نہیں کرتے۔ وہ شادی کر بھی لیں چاہیں مگر ان کو لڑکی کون دے اور اگر کوئی بے

---

(۱) احزاز نقوی، ڈاکٹر، پنڈت ناتھ سرشار بحیثیت ناول نگار، (لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۲۰۰۶ء)، ص ۵۲

(۲) رتن ناتھ سرشار، فسانہ آزاد، جلد اول، (لکھنو: نول کشور مطبع، ۱۹۴۹ء)، ص ۱

وقوف لڑکی دینے پر آمادہ بھی ہو جائے تو لڑکی بھلا کب منظور کرے۔ خلاصہ یہ کہ جب تک
ان کو بخوبی معلوم نہیں ہو لیتا کہ ہم اپنے بال بچوں کی اچھی طرح سے پرورش کر سکیں گے
تب تک ممکن نہیں کہ بیاہ ہو۔" (۱)

اور پھر اس کے بعد وہ ہندوستان میں ہونے والی شادی کو غم اور مصیبت قرار دیتے ہیں۔ یہ وہ ذہنیت ہے جسے عالمگیریت کے علمبر دار پروان چڑھانا چاہتے ہیں۔

فنی اعتبار سے یہ ناول داستان اور ناول کے درمیان کی کڑی ہے اس میں داستان کی طرح بعض ماورائی واقعات بھی ملتے ہیں َناول میں باقاعدہ کوئی مربوط پلاٹ نہیں ۔ حسنِ ترتیب اور منصوبہ بندی کا فقدان ہے۔ سرشار ہندوستانی رسوم و خیالات کی وضاحت کرتے ہیں۔ اس حوالے سے ڈاکٹر ریاض ہمدانی لکھتے ہیں:

"ناول میں داستان کی طرح کے بعض ماورائی قصے بھی ملتے ہیں کسی واقعے کو بیان کرنے اور
کردار کو پیش کرنے کے لیے ناول نگار کی طرف سے کوئی منصوبہ بندی نہیں کی گئی۔ رسوم ہند
اور عوام میں موجود دقیانوسی خیالات کو بھی وضاحت سے بیان کرنے کی کوشش ملتی ہے۔
لکھنؤ والوں کی آوارہ منشی پر طنز بھی ہے۔ زندگی کے عام پہلوؤں میں سے مزاحیہ رنگ تلاش
کرنا دراصل ناول نگار کی حس مزاح کو نمایاں کرتا ہے۔" (۲)

لیکن اس طنز و مزاح کے پردے میں دراصل وہی سوچ کارفرما ہے جو آج عالمگیریت کے حامیوں کی ہے اس وقت نو آبادکاروں کی تھی یعنی سرشار کی تحریر میں انگریز سامراج کی طرف جھکاؤ نظر آتا ہے۔ اس حوالے سے احزاز نقوی لکھتے ہیں:

"جب ان کا کام اس طنز و ظرافت سے بھی نہیں چلتا تو وہ مصلح، ناقد اور ناصح بن جاتے ہیں اور
جگہ جگہ انگریزی تمدن کی حمایت کرتے ہیں اور برطانوی تہذیب کی مصوری بھی کرتے
ہیں۔" (۳)

سرشار نے جس عہد میں یہ ناول لکھا ہندوستان میں تہذیبی آویزش عروج پر تھی۔ اس کے علاوہ سیاسی و معاشی طور پر بھی ہندوستان عدم استحکام کا شکار تھا۔ مختلف طبقات اپنے اپنے مفادات کے لیے مختلف انداز فکر کو اپنا رہے تھے۔ ایک طرف قدامت پرست تھے جو اپنی روایات اپنی اقدار اور اپنی تہذیب و معاشرت کو مغربی اقدار و روایات اور انگریز حکمرانوں کی صورت میں آنے

---

(۱) رتن ناتھ سرشار، *فسانہ آزاد*، ص ۴۰۶

(۲) ریاض ہمدانی، ڈاکٹر، *اردو ناول کا نو آبادیاتی مطالعہ*، ص ۱۸۲

(۳) احزاز نقوی، ڈاکٹر، *پنڈت ناتھ سرشار بحثیت ناول نگار* ص ۵۲

والے عالمگیریت کے سیلاب سے بچانے کے لیے کوشاں تھے اور ہر تبدیلی بشمول انگریزی تعلیم اور نئی نئی ایجادات کو مشکوک نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ دوسری طرف جدت پسند تھے جو مغربی سوچ، مغربی تعلیم اور مغربی انداز زیست کی تقلید کو کلید کامرانی جانتے ہوئے اپنی اقدار اور روایات سے پیچھا چھڑانے میں کوشاں تھے۔

سرشار فکری طور پر کانگریسی تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ سرسید تحریک سے بھی متاثر تھے۔ ان کی سوچ یہ تھی کہ انگریز کی سامراجی سوچ کی پوری طرح پیروی کی جائے اور کسی طرح بھی انگریز حکمرانوں کو ناراض نہیں کرنا چاہیے۔ سامراجیوں کو بھی ایسے معاونین اور جدت پسند لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے جو مقامی لوگوں کو نئی تہذیب کی روشنی میں اپنے مسائل کا حل تلاش کرنے کی راہ دکھائیں۔ اس حوالے سے احزاز نقوی لکھتے ہیں:

" ایسی بحرانی فضا میں سرسید اور سرشار اصلاح معاشرہ کے لیے اٹھے تو انگریزی تہذیب اختیار کرنے کی پرزور حمایت کی اور اس کے علاوہ کوئی دوسرا حل ان کی سمجھ سے بالاتر تھا۔"[1]

سرشار لکھنؤ کی زوال پذیر تہذیب کو اپنا موضوع بناتے ہیں جس کے حواس افیم کے زیر اثر مختل ہو چکے تھے۔ افیم اس سماج کی خانگی زندگی کا لازما بن چکی تھی مردوں کے ساتھ ساتھ عورتیں بھی افیم کی مدہوشی میں گم تھیں۔ یہ مدہوشی انھیں حال کے غموں سے کچھ دیر کو سہی بیگانہ کر دیتی تھی۔ لیکن یہی افیم انھیں منفعل کر دیتی ہے اور وہ حکومت کو ہاتھ سے نکلتا دیکھ کر بھی مزاحمت نہیں کرتے بلکہ اپنی تباہی و بربادی کو نوشتہ تقدیر جان کر قبول کر لیتے ہیں۔

فسانہ آزاد میں سرشار بزبان آزاد مقامی حکمرانوں، طبقہ اشرافیہ اور نوابین کو طنز کا نشانہ بناتے ہیں کہ ہر وقت اپنی عیاشیوں میں مشغول رہتے تھے۔ ریاست، فوج اور فلاحی کاموں کی ذمہ داری انگریزوں کے سر پر تھی۔ سرشار لکھنؤ کی تباہی کا ذکر کرتے ہیں لیکن اس کے لیے وہ مقامی لوگوں اور حکمرانوں کو مورد الزام ٹھہراتے ہیں۔ وہ یہاں برطانوی راج اور نئے حکمرانوں کا ذکر نہیں کرتے۔ وہ عالمگیریت جس نے نوآبادیاتی صورت میں وہاں قدم جمائے اور جن کے کہنے پر فوج ختم کر دی گئی ان کا ذکر نہیں کرتے۔ حالانکہ اس سامراج نے لکھنوی معاشرت میں اضطراب پیدا کر دیا۔ ہر طبقہ زوال پذیر تھا۔ ہندوستانی نواب حکمران، پرانے بیوروکریٹس اور عوام بھی انحطاط کا شکار تھے۔ وجہ وہ استحصال تھا جو نئے حکمرانوں کی طرف سے کیا جا رہا تھا۔ بلکہ حکمرانوں کی تبدیلی سے اس استحصال میں اضافہ ہی ہوا تھا۔ اس حوالے سے ڈاکٹر ریاض ہمدانی لکھتے ہیں:

> ”انگریز نچلے طبقے کی محنت کو برطانیہ منتقل کر رہے تھے۔ اس سے پہلے ہندوستانی سرمائے کی گردش ہندوستان تک محدود تھی جو کسی نہ کسی طرح عوام تک پہنچتی تھی۔ ہندوستان کے

---

(۱) احزاز نقوی، ڈاکٹر، پنڈت ناتھ سرشار بحیثیت ناول نگار، ص ۲۱۲

سابقہ حکمرانوں کے مقابلے میں انگریز زیادہ ظالم تھا۔ انہوں نے عام ہندوستانی کی لہو پسینے کی کمائی کو برطانیہ منتقل کیا۔" (۱)

اگرچہ ان نئے حکمرانوں کے توسط سے برصغیر بعض نئی ایجادات مثلاً ریل، تار، ریڈیو وغیرہ سے بھی متعارف ہوا لیکن ان تمام ایجادات کو برصغیر میں لانے کے پیچھے استحصالی مقاصد کار فرما تھے اور ان کا مقصد اس استحصالی نظام کی جڑوں کو مضبوط کرنا تھا لیکن فسانہ آزاد کا ایک کردار رفیق ان ایجادات کے حوالے سے کہتا ہے:

"واہ رے انگریزو! اللہ جانتا ہے کہ یہ بھی بلا تشبیہ خدائی کرتے ہیں۔" (۲)

ان سائنسی ایجادات کے ذریعے انگریز حکمران اپنا ایک بلند تر تصور مقامی لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں ان کی ثقافت ان کی اقدار کے حوالے سے مقامی لوگوں کے ذہنوں میں احساس کمتری پیدا کرتے ہیں تا کہ اول تو وہ ان کے مقابل آنے کا کبھی نہ سوچ سکیں۔ دوم سرمایہ دارانہ مقصد کے تحت اپنی مصنوعات اپنی اقدار یہاں تک تصورات کو بیچ کر منافع کمائیں خواہ مقامی لوگوں کو اس کی ضرورت ہو یا نہ ہو۔

آزاد ناول میں کئی جگہ بزرگوں کو پرانے فیشن کا ہونے کا طعنہ دیتے ہیں۔ آزاد کے مطابق ہندوستان کے زیادہ تر بزرگ جاہل ہیں اور نہ صرف جاہل ہیں بلکہ اپنی جہالت پر ہٹ دھرمی کا رویہ بھی رکھتے ہیں کیونکہ یہ بزرگ انگریزی تہذیب کو من وعن قبول نہیں کرتے۔ ایک بزرگ اپنی گفتگو میں بو علی سینا کا حوالہ دیتے ہیں لیکن آزاد اس کے مقابل نیوٹن، ہرس اور دیگر مغربی فلسفیوں کا حوالہ دیتے ہیں اور مغربی برتری کا نقش آزاد کے ذہن پر اس قدر سوار ہے کہ انہیں نیوٹن کے مقابل مسلم علما ہیچ نظر آتے ہیں۔

"اجی آپ ان کے کلام کو نمک لگا کر چاٹیے۔ یہاں ان کے قائل ہی نہیں، نیوٹن اور ہرس اور پروفیسر لاکیر اور گیو کی تصانیف لطیف کو دیکھیے تو آنکھیں کھل جائیں۔ قبلہ جھنڈے گڑے ہوئے تھے۔ شیخ بے چارے کس میں تھے۔ ان کو مانتا کون ہے معدودے چند دقیانوسی خیالات کے آدمی اور جن بزرگوں کے ہم پیرو ہیں ان کے کلام کی امریکہ اور یورپ کے کل علماء و حکما پیروی کرتے ہیں شیخ تھے کس میں۔ آپ شیخ الرئیس کو لیے پھرتے ہیں۔" (۳)

بہر حال یہ ناول جو خود عالمگیریت کی پیداوار ہے اپنی ابتدا سے عالمگیریت کے مختلف مظاہر اور عالمگیریت کے پس پردہ کار فرما سوچ کی عکاسی کرتا ہے۔ فسانہ آزاد میں جیسا کہ ہم نے دیکھا کہ انگریزی لباس، مغربی رسوم و رواج اور اسی طرح عالمگیریت کے حامیوں

---

(۱) ریاض ہمدانی، ڈاکٹر، *اردو ناول کا نو آبادیاتی مطالعہ*، ص ۱۸۷

(۲) رتن ناتھ سرشار، *فسانہ آزاد*، ص ۴۴۸

(۳) ایضاً، ص ۴۱۰

کی سوچ نظر آتی ہے آزاد نہ صرف مغربی لباس پہنتا ہے بلکہ مقامی لباس اور مقامی رسوم و رواج کو بنظر حقارت دیکھتا ہے یہاں تک کہ مسلم علما اور فلاسفر اسے نیوٹن ہرس جیسے مغربی علما سائنسدانوں کے سامنے بونے نظر آتے ہیں۔ وہ لکھنؤ کے نوابوں کی عیاشی پر تنقید کرتے ہیں لیکن انہیں انگریز حکمرانوں کا استحصال نظر نہیں آتا۔ انہیں ریل، تار، ریڈیو جیسی سہولیات اور ایجادات نظر آتی ہیں لیکن ان کے ساتھ منسلک سامراجی مقاصد سے وہ چشم پوشی کرتے ہیں۔ یہی رویہ عالمگیریت کے حامی آج تیسری دنیا کے ممالک میں پیدا کرنا چاہتے ہیں تاکہ ان کی مصنوعات کو بلا حیل و حجت قبول کر لیا جائے ان کی اقدار کو بلند تر اور اعلیٰ تصور کرتے ہوئے اپنا لیا جائے اور اس کے سامنے کسی قسم کی کوئی رکاوٹ خواہ وہ ثقافتی ہو یا مذہبی، آڑے نہ آئے اور پوری دنیا میں ایک ثقافت کو فروغ دے کر اور ایک زبان کی اشاعت کے ذریعے زیادہ سے زیادہ منافع کمایا جا سکے۔

# سیر کہسار

پنڈت رتن ناتھ سرشار کی تصانیف میں فسانہ آزاد کے بعد دوسری اہم تصنیف **سیر کہسار** ہے۔ اس ناول کا کبیری کردار محمد عسکری ہے جو فسانہ آزاد کے آزاد کی مانند دل پھینک ہے۔ اس ناول کا پلاٹ یوں ہے کہ لکھنو کا ایک نواب محمد عسکری مہذب بننے کا خواہشمند ہے۔ وہ اپنی دولت کو استعمال میں لاکر عزت اور شہرت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس کے گرد خوشامدی رفقا کا ایک گروہ ہے جو اس کی ہر بات پر واہ واہ کرتے ہیں اور مشورے دیتے ہیں۔ محمد عسکری ایک سال گرمیوں میں انگریزوں کی تقلید میں پہاڑی علاقے کو جانا چاہتے ہیں۔ وہ نینی تال جیسے صحت افزا مقام کے بارے میں معلومات اکٹھی کرتے ہیں لیکن راستے کی کٹھنائیوں کا سن کر کبھی ارادہ باندھتے ہیں کبھی توڑ دیتے ہیں۔ ناول کا ایک کردار چھٹن محمد عسکری کو پہاڑ لے جانے کے لیے یہ دلیل دیتا ہے کہ نینی تال کو صاحب لوگ گرمی بھر اور برسات بھر جا کر رہتے ہیں۔ نواب لیفٹیننٹ گورنر بہادر چار پانچ مہینے وہاں جا کر رہتے ہیں اگر خطرے کا مقام ہوتا تو ایسے جلیل القدر لوگ وہاں جا کر کیوں رہتے؟

ناول میں محمد عسکری ایک انگریز کے ساتھ نینی تال جانے کی منصوبہ بندی کرتے ہیں لیکن بعد میں اسے بتائے بغیر پروگرام ملتوی کر دیتے ہیں صرف اس لیے کہ اس کی سالی کے لڑکے کی مونچھوں کا کونڈا ہونے والا تھا لیکن اس تقریب میں اُن کی نظر ایک چوڑی والی قمرن پر پڑی تو وہ اس پر ہزار جان سے عاشق ہو گئے۔ قمرن چونکہ ایک شادی شدہ عورت تھی اس لیے پہلے تو اسے الگ چھپا کر رکھتے ہیں۔ پھر اگلے سال گرمیوں میں اسے نینی تال لے جاتے ہیں۔ نواب عسکری کے ایک رقیب بشیر الدولہ قمرن منہارن کے شوہر کی مدعیت میں نواب عسکری کے خلاف پولیس اسٹیشن میں رپٹ درج کرا دیتا ہے۔ نواب عسکری کو اپنے ہم زلف کے خط سے نینی تال میں اس رپٹ کی بابت اطلاع ملتی ہے۔ بعد ازاں وہ اپنے عزیزوں اور دوستوں کے مشوروں کے مطابق واپس لوٹ آتے ہیں۔ قمرن کو شوہر سے طلاق دلوا کر خود اس سے نکاح کر لیتے ہیں۔ لیکن قمرن منہارن کی دادی نے اپنی پوتیوں کی پرورش وپرداخت اس اصول پر کی ہے کہ عورت اپنا جسم بیچ کر بھی زندگی کی آسائشیں حاصل کر سکے تو اس میں عار محسوس نہ کرے۔ اس لیے دادی نازو اور قمرن دونوں بہنوں کو چوڑیوں کے علاوہ اپنی خوبصورتی بیچنے کے لیے بھی تیار کرتی ہے۔ قمرن کی انہی اداؤں کی وجہ سے نواب عسکری اپنی حسین اور پارسا بیوی کو دھوکہ دے کر نئے عشق سے لطف اندوز ہونے لگے لیکن قمرن کی سرشت میں وفا نہیں وہ نواب عسکری کے ساتھ نکاح کے باوجود فضلہ نامی برف فروش سے محبت کرتی ہے اور اس کے ساتھ بھاگ جاتی ہے اور نواب عسکری سے بیس ہزار کے زیور بھی لوٹ کر لے جاتی ہے جب تک زیور کام دیتے ہیں فضلہ قمرن کو ساتھ رکھتا ہے بعد میں اسے چھوڑ دیتا ہے۔ قمرن جسم فروشی کے دھندے پہ لگ جاتی ہے۔ اسے کئی بیماریاں لگ جاتی ہیں لیکن نواب عسکری قمرن کی تلاش میں رہتے ہیں آخر کار اسے تلاش کر کے اپنے محل میں لے آتے ہیں اسے معاف کر دیتے ہیں اس کا علاج کرواتے ہیں لیکن قمرن چند یوم کے بعد مر جاتی ہے۔ یہ ناول دو جلدوں پر محیط ہے۔ پلاٹ اکہرا اور سادہ ہے۔

اس ناول میں بھی سرشار نے لکھنؤ کے زوال پذیر معاشرے کی عکاسی کی ہے اور ہندوستانی معاشرے کے منفی پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ لکھنؤ کے نوابین کے مشاغل یعنی بٹیر بازی اور کبوتر بازی کے ضمن میں بتایا ہے اور فسانہ آزاد کی طرح اس ناول میں بھی مصنف کے نزدیک مقامی لوگ اور سابقہ حکمران گھٹیا جاہل اور بد تہذیب ہیں۔ ناول میں انگریز کردار مثلاً مسٹر فریزر، میجر بارلو اور حسین و جمیل انگریز لیڈیاں معزز حکام کی صورت میں وقتاً فوقتاً ظاہر ہوتے ہیں جنہیں مصنف مہذب اور اعلیٰ اوصاف کا حامل بتاتا ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ وہ مغربی تہذیب کے دیگر مظاہر مثلاً مغربی لباس، کھانے پینے کے مغربی طور طریقے مثلاً میز پر چھری کانٹوں کے ساتھ کھانا، پہاڑی مقام پر گرمیاں بسر کرنا اور پالتو جانور رکھنا کو تہذیب یافتہ زندگی کے اعلیٰ نمونے کے طور پر پیش کرتا ہے۔ انگریزوں کی اندھی تقلید اس کے لیے قابل فخر ہے۔ محض یہ تقلید ہی نہیں بلکہ وہ نوابی زندگی اور نوابی کلچر کی خامیوں کو اجاگر کرتے ہوئے اس کی مذمت بھی کرتا ہے۔ مصنف کا مقصد اپنے معاشرے اور افرادِ معاشرے کی اصلاح ہے لیکن اصلاح کا واحد ذریعہ اسے انگریزوں کی پیروی کی صورت میں نظر آتا ہے۔ محمد عسکری بھی آزاد کی طرح انگریزی تہذیب اور مقامی تہذیب کے تقابل کی کوئی نہ کوئی صورت تلاش کرلیتا ہے۔ عسکری کی طرح اس کی بیوی بھی انگریز پر فریفتہ ہے اور برطانوی تہذیب سے متاثر عسکری کے ساتھ گفتگو میں کہتی ہے۔

> "ہندوستان میں یہ بڑا فخر سمجھا جاتا ہے کہ گھر میں بہت کم بیٹھتے ہیں فلاں شخص دن رات عورتوں میں گھسا رہتا ہے۔ زنان منتری ہے غرض کہ پہر دوپہر بھی گھر میں بیٹھا تو لوگ نام رکھنے لگے اور یوروپین کو دیکھیے کہ ہوا کھائیں گے تو بیوی ساتھ، گرجا جائیں گے تو بیوی کے ساتھ، ناچیں گائیں گے تو لیڈی کے ساتھ، میلے ٹھیلے جائیں گے لیڈیاں ساتھ، دعوت میں جائیں تو لیڈیاں ساتھ، جنازے کے ساتھ تک لیڈیاں ہوتی ہیں۔" (۱)

اس ناول میں مصنف ہندوستانی تہذیب اور انگریزی تہذیب کا تقابل غیر جانبداری سے نہیں کرتا بلکہ اس کا واضح جھکاؤ انگریزی تہذیب کی طرف ہے۔ انگریزوں کا طرز زندگی اسے مہذب جبکہ مقامی اقدار و رسوم اسے مبنی بر جہالت دکھائی دیتے ہیں۔ اور وہ چن چن کر ایسے پہلوؤں کو اجاگر کرتا ہے جس سے مقامی تہذیب اور مقامی حکمران بدنما اور برے دکھائی دیتے ہیں۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ ۱۸۵۷ کے بعد برطانوی حکومت کو برصغیر میں مکمل اختیار حکمرانی حاصل ہو چکا تھا۔ سرشار نے جس دور میں یہ ناول لکھے اس وقت ہندوؤں اور مسلمانوں میں ایسے طبقات پیدا ہو چکے تھے تو حکومت وقت کے ساتھ مفاہمت کو ہی اپنے لیے اور اپنے مفادات کے لیے بہتر راستہ تصور کرتے تھے۔ چنانچہ اس ناول میں نہ صرف عالمگیریت کے مختلف مظاہر جابجا نظر آتے ہیں بلکہ عالمگیریت کے ساتھ وابستہ سوچ اور انداز فکر کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں۔

---

(۱) سرشار، رتن ناتھ، *سیر کہسار* (لکھنؤ: نول کشور مطبع، ۱۹۳۴) ص ا

مثلاً مسٹر فریزر عسکری کی کوتاہی کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے:

"میں نے اردو میں اعلیٰ درجہ کا امتحان دیا لفظ پنک چوالیٹی کا کوئی ترجمہ ہی نہیں کر سکتا۔ پابندی اوقات اس کا ترجمہ ہے مگر ایک لفظ میں اس کا ترجمہ محال ہے کیونکہ ہندوستان میں اس کے معنی کوئی جانتا ہی نہیں۔"

فریزر کے جواب میں میجر بارلو کہتا ہے:

"آپ نے بڑی غلطی کی کہ ہندوستانی کی بات کا اعتبار کیا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ہندوستانی عموماً بے ایمان ہوتے ہیں مگر یہ ضرور کہوں گا کہ ہندوستانی وعدے کو پورا کرنا فرض نہیں سمجھتے۔"[۱]

یہاں مصنف نے اس سوچ کی عکاسی کی ہے جو نو آبادیاتی کلامیے کا حصہ تھی اور جو آج عالمگیریت کے پس پشت بھی کار فرما ہے یعنی تیسری دنیا کے باشندے ہر اعتبار سے ان سے کمتر ہیں۔ ان کی تہذیب کمتر ان کی زبان کمتر اور خود ان کا کردار بھی کمتر ہے اور یہاں مصنف بھی اسی ایجنڈے کو آگے بڑھاتا ہوا نظر آتا ہے وجہ مصنف کی عصری مجبوریاں اور ذاتی کمزوریاں ہیں۔

مصنف اس اخلاقی تنزل کی بات کرتا ہے جس کا شکار اس وقت کا لکھنوی معاشرہ تھا لیکن مصنف ان محرکات کا سراغ لگانے کی کوشش نہیں کرتا جو اس اخلاقی گراوٹ کے پیچھے موجود تھے۔

جب کسی قوم کے ہاتھ سے اس کی معیشت تعلیم اور دفاع کے شعبے نکل جائیں۔ جب اس ملک کی عوام وخواص کو سیاسی فیصلوں سے بے دخل کر دیا جائے تو پھر ان کے پاس بٹیر لڑانے، چوری چھپے کی آشنائیوں اور افیم میں پناہ لینے کے سوا کیا بچتا ہے۔ ایسی صورت میں جدت پسند طبقات کی طرف سے حکمرانوں کے قریب ہونا، اس کی تہذیب کو اپنانا، اس کی زبان کو اپنانا رہ جاتا ہے۔ مسٹر فریزر ہندوستانیوں کی بری صفات کی بنا پر ایک ہندوستانی کے ساتھ ریستوران میں بیٹھنے سے انکار کرتا ہے تو وہ ہندوستانی خود کو باقی قوم سے الگ قرار دیتا ہے اور اپنی صفائی میں کہتا ہے۔

"مجھے ہمیشہ انگریزوں سے صحبت رہی ہے اور میں بالکل مثل یوروپین کے زندگی بسر کرتا ہوں۔"[۲]

گویا تمام یوروپین اعلیٰ اوصاف سے متصف اور تمام ہندوستانی وعدہ خلاف، جھوٹے اور برے ہیں اور ایک تیسری دنیا کے باشندے کے لیے باعزت کہلوانے کے لیے لازم ہے وہ اپنی طرز زندگی کو مسترد کر کے انگریزی معاشرت کو اختیار کرے۔

وہ بنگالی بابو مسٹر فریزر کو بار بار یہ صفائی پیش کرتا ہے کہ سب ہندوستانی وعدہ خلاف نہیں ہوتے بلکہ انگریزی ادب و آداب سے واقف مہذب ہوتے ہیں۔ لیکن جواباً مسٹر فریزر کا تفاخر اس سے کہلواتا ہے کہ ہندوستانی لاکھ پڑھ لکھ جائیں پھر بھی ہندوستانی رہیں گے گویا ہندوستانی ہونا اور برا ہونا مترادف ہے اور یوروپین ہونا اور اعلیٰ اخلاقی اوصاف کا حامل ہونا لازم وملزوم ہے۔

---

(۱) سرشار، رتن ناتھ، سیر کہسار، ص ۱۰۳

(۲) ایضاً، ص ۲۰۱

اور یہ رویہ صرف انگریز حکام اور دیگر یوروپین کی طرف سے ہی نہیں خود مقامی لوگ بھی خود کو ان کی عینک سے دیکھتے ہیں اس کی مثال یہ ہے کہ سیر کہسار کی دوسری جلد کا آغاز ہی ایک مقامی شخص کے دو لیکچروں سے ہوتا ہے جو ہندوستانیوں کی ابتر حالت کا ذمہ دار خود ان کو ٹھہراتے ہیں اور ابتر حالت سے نکلنے کا ایک ہی ذریعہ ان کے لیے تجویز کرتا ہے وہ ہے انگریز کی پیروی، انگریزی زبان، انگریزی لباس، انگریزی علوم اور انگریزی تمدن کو اپنا کر ہی اہل ہند اس ادبار سے نکل سکتے ہیں۔

اس ناول میں ایک دوسرا طبقہ بھی موجود ہے جنہیں عموماً قدامت پسند کہا جاتا ہے جو یورپ کو دشمن سمجھتا ہے اور اس کی تقلید کا حامی نہیں۔ ناول کا راوی اس طبقے کو بار بار پرانے فیشن کے بزرگوں پر مشتمل گروہ کے نام سے یاد کرتا ہے۔

ڈاکٹر ریاض ہمدانی لکھتے ہیں:

> "نوابی عہد کی بدکاری اور عیاشی دکھانے کا ایک مقصد انگریز کی نظر میں سرخرو ہونا اور اپنے لوگوں کو گھٹیا ثابت کرنا تھا تاکہ ہندوستانی لوگ سب کچھ چھوڑ کر سامراجی نظام میں داخل ہو جائیں اور اس نظام کو مضبوط کریں۔" (۱)

اس کے ساتھ ساتھ ریاض ہمدانی کہتے ہیں:

> "ناول نگار نے ہندوستانی معاشرے کے منفی پہلوؤں کو اجاگر کیا تاکہ انگریزی عمل داری میں لوگوں کو کوئی عیب دکھائی نہ دے۔ دراصل ناول میں یہ بتانا مقصود تھا کہ ہندوستان کے سابقہ حکمران اور لوگ جاہل اور بدتہذیب ہیں جنہیں مہذب بننے کے لیے گوروں کی نقالی کرنی چاہیے۔" (۲)

یہ ناول اس دور میں لکھا گیا جب ۱۸۵۷ کے بعد برصغیر میں انگریزی عملداری قائم ہو چکی تھی لہذا اس میں عالمگیریت کے مظاہر، سوچ اور وہ پورا نظام نظر آتا ہے جو آج بھی دنیا میں اپنے عروج پر ہے۔ جو کام اس وقت یہ ناول نگار کر رہے تھے وہ آج عالمی طاقتوں کا خریدہ ہوا طاقتور میڈیا کر رہا ہے آج بھی یورپ اور امریکہ کی تہذیب کا نقش لوگوں کے ذہن میں راسخ کرنے کے لیے اسی طرح میڈیا کوشاں ہے جیسے اس وقت کے لکھنے والے اور بعض 'رفارمرز' تھے۔

---

(۱) ریاض ہمدانی، ڈاکٹر، اردو ناول کا نوآبادیاتی مطالعہ، ص ۱۹۶

(۲) ایضاً

# چو گان ہستی

**چو گان ہستی** پریم چند کے تمام ناولوں میں سب سے ضخیم ہے یعنی ایک ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ ناول ۱۹۲۴ میں گنگا پستک مالا آفس کے زیر اہتمام ہندی میں شائع ہوا۔ اردو میں اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۲۷ میں دارالاشاعت لاہور کے زیر اہتمام شائع ہوا۔ [1]

یہ زمانہ ہندوستان کی تاریخ میں سکون اور اطمینان کا تھا۔ ۲۱-۱۹۱۹ کی ملک گیر شورش اور ہنگامہ دارو گیر کے نتیجہ میں ۱۹۲۳ تک ملک میں جو ہیجان اور خوف وہراس طاری تھا وہ ختم ہو گیا۔ سیاسی قیدیوں کی رہائی اور حکومت کی عارضی صلح پسندی کی وجہ سے ملک کی سیاسی فضا ظاہری طور پر پر سکون نظر آرہی تھی۔ اس دوران ملک کے باشعور طبقے کو اپنے سیاسی و سماجی مسائل پر سنجیدگی سے غور کرنے کا موقع ملا۔ پریم چند نے بھی گہرائی اور باریک بینی کے ساتھ حالات کا مطالعہ ومشاہدہ کیا اور عصری حقائق کو فنکارانہ مہارت کے ساتھ چو گان ہستی میں پیش کر دیا۔

چو گان ہستی کا پلاٹ ایک اندھے بھکاری سورداس کی سرگذشت ہے اس پلاٹ کے متوازی مصنف نے ونے سنگھے اور صوفیہ کی کہانی بھی پیش کی ہے۔ اہمیت کے اعتبار سے یہ کہانی سورداس کے قصہ کے مساوی ہی ہے لیکن سورداس کا قصہ قاری کے ذہن کو زیادہ شدت سے گرفت میں لے لیتا ہے۔ لہٰذا اس ناول کا کبیری کردار سورداس اور ونے سنگھ ہیں۔ سورداس بنارس کے قریب کسانوں اور مزدوروں کی بستی پانڈے پور میں رہتا ہے۔ اسے ایک قطعہ اراضی اپنے پرکھوں سے وراثت میں ملا ہے۔ جو گاؤں کے جانوروں کی چراگاہ کے طور پر کام میں آتا ہے۔ سورداس فطرتاً نیک دل اور گہری بصیرت کا حامل ہے۔ شہر کا ایک عیسائی جان سیوک سورداس کی زمین پر سگریٹ تیار کرنے کا کارخانہ کھولنا چاہتا ہے لیکن سورداس کسی طور پر بھی اپنی زمین بیچنے کو تیار نہیں۔ جان سیوک شہر کے اعلیٰ حکام اور امرا میں اثر ورسوخ رکھتا ہے۔ وہ ایک انتہائی ہوشیار، خود غرض اور آزمودہ کار انسان ہے وہ اپنے تعلقات کو استعمال میں لاکر سورداس کی زمین پر قابض ہونا چاہتا ہے۔ وہ نہایت خوبصورتی اور چالاکی سے سورداس کے اہل علاقہ کو اچھے مستقبل کے خواب دکھا کر زمین کی فروخت کے سلسلے میں حائل رکاوٹوں کو دور کر لیتا ہے۔ ایک طرف وہ اعلیٰ عہدیداروں مسٹر کلارک اور راجہ مہیندر سنگھ کو سورداس کے خلاف اکساتا ہے دوسری طرف وہ پانڈے پور کے رہائشیوں کو مطمئن کر دیتا ہے کہ اس کارخانے کے لگنے سے انھیں کاروباری فوائد حاصل ہوں گے۔ پانڈے پور کے مزدور اور رہائشی سورداس کو سمجھاتے ہیں کہ زمین جان سیوک کے ہاتھ فروخت کر دے۔ لیکن سورداس کسی طور زمین بیچنے پر آمادہ نہیں ہوتا کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ کارخانہ لگنے سے لوگوں کے اخلاق میں بگاڑ پیدا ہو گا۔ گاؤں کی پر سکون زندگی تباہ ہو جائے گی۔ وہ اپنی زمین دے کر اس اخلاقی تباہی کی ذمہ داری اپنے سر لینے کو تیار نہیں۔ وہ نڈر ہے کہ جس بات کو حق سمجھتا ہے اس کی حمایت کرتے ہوئے وہ ذرا بھی ہچکچاتا نہیں۔ جان سیوک اور اس کے حمایتی اسے طرح طرح سے پریشان کرتے

---

(۱) قمر رئیس، ڈاکٹر، *پریم چند کا تنقیدی مطالعہ: بحیثیت ناول نگار*، (نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۲۰۰۵ء) ص ۲۱۷

ہیں۔ اس پر جھوٹا مقدمہ چلایا جاتا ہے لیکن اس کے پائے استقلال میں لرزش نہیں آتی۔ اپنی اس جدوجہد میں اسے جان سیوک جیسے سرمایہ دار اور بر سر اقتدار طبقے کی سازشوں کے خلاف کئی مورچوں پر کامیابی بھی ہوتی ہے لیکن آخر کار جان سیوک اس کی زمین پر قابض ہو کر سگریٹ کا کارخانہ تعمیر کرنا شروع کر دیتا ہے۔ اب کارخانے کے مزدوروں کی رہائش کے لیے پانڈے پور کے مزدوروں اور کسانوں کو ان کے آبائی گھروں سے بے دخل کیا جاتا ہے۔ سورداس اپنا جھونپڑا چھوڑنے کے لیے تیار نہیں اس کا استقلال اور ہمت دیکھ کر سارا گاؤں اس کے گرد جمع ہو جاتا ہے۔ چاروں طرف پولیس اور فوج کا پہرہ ہے۔ سورداس کو ہٹانے کے لیے تشدد کا استعمال کیا جاتا ہے حاکم ضلع کلارک اس پر گولی چلا دیتا ہے وہ زخمی ہوتا ہے اور ہسپتال میں دم توڑ جاتا ہے لیکن مرتے وقت بھی اس کا حوصلہ اور اعتماد قائم ہے۔ وہ کہتا ہے:

> ''ہم ہارے تو کیا میدان سے بھاگے تو نہیں۔ روئے تو نہیں۔ دھاندلی تو نہیں کی۔ پھر کھیلیں گے جرا دم تو لے لینے دو۔ ایک نہ ایک دن ہماری جیت ہوگی۔ جرور ہوگی۔'' (۱)

سورداس کے پلاٹ کے متوازی ونے اور صوفیہ کی کہانی ہے۔ صوفیہ جان سیوک کی تعلیم یافتہ لڑکی ہے۔ مذہبی معاملات میں آزاد خیال اور وسیع القلب ہے لیکن اس کی آزاد خیالی اس کی تنگ نظر ماں کے لیے قابل قبول نہیں۔ وہ مذہبی رسومات کی ادائیگی کے سلسلے میں اس پر جبر کرتی ہے۔ صوفیہ پریشان ہو کر منزل کا تعین کیے بغیر گھر چھوڑ جاتی ہے اور ایک اتفاقی حادثہ کا شکار ہو کر راجہ بھرت سنگھ کے گھر پہنچ جاتی ہے۔ یہاں اس کی ملاقات اس کی سہیلی اندو سے ہوتی ہے اور وہ اندو کے ساتھ رہنے لگتی ہے۔ اندو کا بھائی ونے سنگھ صوفیہ کے حسن پر فریفتہ ہو جاتا ہے۔ ایک راجہ کا بیٹا ہوتے ہوئے بھی ترک، ایثار اور نفس کشی کی زندگی گذارتا ہے۔ اس کا نصب العین ملک و قوم کی خدمت ہے۔ صوفیہ ونے کے کردار کی پاکیزگی اور اس کی خوبیاں دیکھ کر اس سے محبت کرنے لگتی ہے لیکن ونے کی ماں جانہوی کو جب اس رشتے کی بابت علم ہوتا ہے تو وہ اسے پسند نہیں کرتی اور ونے کو سیوا سمتی کارکنوں کے ساتھ اودے پور بھیج دیتی ہے۔ یہاں اس کی مقبولیت سے خائف ہو کر ریاست اسے ایک جھوٹے مقدمے میں جیل میں ڈال دیتی ہے۔ ونے کے جانے کے بعد صوفیہ کو بھی اس کا گھر چھوڑنا پڑا۔ اس کے والدین انگریز حاکم ضلع کلارک کے ساتھ اس کی شادی کروانا چاہتے ہیں۔ لیکن صوفیہ کے دل میں کلارک کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ تاہم وہ کلارک کے سامنے محبت کا سوانگ بھرتی ہے اور اسے اودے پور لے جاتی ہے تاکہ ونے کی مدد کی جاسکے۔ یہاں قید خانے میں وہ ونے سے ملتی ہے اور پھر کلارک کو مجبور کر کے ونے کی رہائی کا پروانہ لے لیتی ہے۔ شہر میں فساد کے دوران باغی ویرپال صوفیہ کو اغوا کر لیتا ہے۔ ونے جیل سے رہا ہو کر ریاست کے حکام کے ساتھ مل کر صوفیہ کی رہائی کی کوشش کرتا ہے۔ صوفیہ باغیوں کے درمیان آرام سے زندگی گذارتی ہے۔ وہ ونے کے باغیوں پر مظالم کی خبریں سن سن کر اس سے نفرت کرنے لگتی ہے اور ایک ملاقات میں اسے سخت ملامت بھی کرتی ہے۔ اب ونے کی آنکھیں کھل جاتی ہیں وہ دوبارہ سے ملک و قوم کی خدمت پر کمربستہ

---

(۱) پریم چند، منشی، مجموعہ منشی پریم چند، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳)، ص ۴۶۶

ہو جاتا ہے اور بنارس کے لیے روانہ ہو جاتا ہے۔ صوفیہ بھی باغیوں کی تشدد پسندی سے بیزار ہو کر ونے کے ساتھ جا ملتی ہے۔ لیکن ونے کے مظالم کی بابت جان کر بنارس اور پانڈے پور کے عوام ان پر اعتماد نہیں کرتے۔ چنانچہ ان کے طعن و تشنیع سے تنگ آکر ونے خودکشی کر لیتا ہے۔ اس کی موت کے بعد صوفیہ بھی اپنے ہی ہاتھوں اپنا خاتمہ کر لیتی ہے۔

چوگانِ ہستی کے پلاٹ کا یہ اجمالی خاکہ ہے۔ یہ دونوں کہانیاں ایک دوسرے کے متوازی چلتے ہوئے آخر میں مل جاتی ہیں۔ یہ ناول پریم چند کے آدرش واد کا حامل ہے، سورداس، جانہوی اور صوفیہ کے کردار مثالیت کے آئینہ دار ہیں۔ ان تینوں کرداروں کی مثالی زندگی اور ان کے تصورات کا سرچشمہ روحانیت ہے۔

بقول ڈاکٹر قمر رئیس:

> ”یہی سبب ہے کہ **گوشۂ عافیت** اور **پردۂ مجاز** کی طرح اس ناول میں بھی پریم چند کا گاندھی واد کھل کر سامنے آتا ہے سورداس مہاتما گاندھی کے عقائد کا بہترین ترجمان ہے۔ وہ ایک آہنی عزم و حوصلے کا انسان اور پکا ستیا گرہی ہے۔ ستیا گرہ معنی ہیں بدی سے عدم تعاون خواہ وہ کسی صورت میں ہی ہو اور اس کے لیے کتنے مصائب جھیلنے پڑیں، سورداس بھی بدی کی قوتوں کو مہاتما گاندھی کی نظر سے دیکھتا ہے اور اپنی خلقی نیکی سے ان کو مٹا دینے یا دور رکھنے کی جدوجہد کرتا ہے وہ ہار کر بھی ہمت نہیں ہارتا۔ اس لیے کہ سچائی کی آخری فتح پر کامل اعتقاد ہی ایک سچے ستیا گرہی کے کردار کا سب سے بڑا وصف ہے۔“ (۱)

اس ناول میں پریم چند نے سرمایہ داری جو عالمگیریت کی روحِ رواں ہے کی لعنتوں اور اس کے جلو میں آنے والی آلودگیوں کا نقشہ کھینچا ہے۔ جان سیوک سرمایہ دار طبقے کا نمائندہ ہے جو سراپا خود غرضی، چالبازی، عیاری کا نمونہ ہے۔ جو اپنی مطلب براری کے لیے دوسروں کا حق غصب کرنے سے بھی اجتناب نہیں کرتا۔ اس کا مقصد زیادہ سے زیادہ دولت سمیٹنا ہے اور اس کے لیے وہ ہر جائز ناجائز ہتھکنڈے کو استعمال کرتا ہے۔ ایک اندھے فقیر سورداس کی آبائی زمین پر بااثر اشخاص کی اشیرباد سے قبضہ کر لیتا ہے اور کارخانے کے مزدوروں کی رہائش گاہوں کی تعمیر کے لیے وہاں آباد کسانوں مزدوروں کے گھر چھین لیتا ہے۔ پریم چند سرمایہ داری کے ساتھ معاشرے میں پیدا ہونے والی اخلاقی گراوٹ سورداس کی زبان سے بیان کرتے ہیں۔

"سورداس: سرکار بہت ٹھیک کہتے ہیں۔ محلہ کی رونق ضرور بڑھے گی روزگاری سے لوگوں کو فائدہ بھی خوب ہو گا لیکن جہاں یہ رونق ہو گی وہاں تاڑی شراب کا بھی تو پرچار بڑھ جائے گا۔ کسبیاں بھی تو آکر بس جائیں گی۔ پردیسی آدمی ہماری بہو بیٹیوں کو گھوریں گے۔ کتنا ادھرم ہو گا؟ دیہات کے کسان اپنا کام چھوڑ کر مجوری کی لالچ دوڑیں گے یہاں بری بری باتیں سیکھیں گے اور اپنے

---

(۱) قمر رئیس، ڈاکٹر، *پریم چند کا تنقیدی مطالعہ: بہ حیثیت ناول نگار*، ص ۲۱۹

برے اچرن (چال چلن) اپنے گاؤں میں پھیلائیں گے۔ دیہاتوں کی بیٹیاں مجوری کرنے آئیں گی اور یہاں پیسے کے لوبھ میں اپنا دھرم بگاڑیں گی۔"[۱]

سورداس کا فہم اسے اپنے علاقے کی سطح پر کارخانہ لگنے کے اثرات کا ادراک کراتا ہے۔ اور وہ سماجی اور ثقافتی تبدیلیوں کی جانب اشارہ کرتا ہے۔ یہ وہی تبدیلیاں ہیں جو عالمگیریت بھی اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے جو دور دراز علاقوں کی ثقافت اور سماج اثر انداز ہو کر انھیں عالمگیریت کے زیر اثر بڑی بڑی معاشی قوتوں اور کاروباری اداروں کی منشا کے مطابق ڈھال دیں گی۔ سورداس قدیم قدروں کا امین ہے اور نہیں چاہتا کہ کارخانہ لگنے سے یہاں خود غرضی بے رحمی اور اخلاقی تنزلی کے عوارض جنم لیں۔ اسی طرح آج بھی مختلف ممالک اپنی اپنی ثقافتوں کے تحفظ کے لیے عالمگیریت کی اس لہر کے آگے بند باندھنے کی کاوش کر رہے ہیں سورداس تیسری دنیا کا استعارہ ہے۔ وسائل کا مالک ہوتے ہوئے سیلاب کا ادراک رکھتے ہوئے اسے روک نہیں پارہا۔

پانڈے پور کی یہ زمین جہاں سرمایہ داری اور قدیم جاگیر دارانہ اقدار کے درمیان کشمکش جاری تیسری دنیا کی نمائندہ ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام اس وقت بھی اتنا ہی بے رحم اور خود غرض ہے جتنا اس نظام کے نمائندے کے طور پر جان سیوک کو پریم چند نے پیش کیا ہے۔ جان سیوک پانڈے پور کے باسیوں کو اپنی چکنی چپڑی باتوں سے قائل کر لیتا ہے کہ کارخانہ لگنے سے انہی کا فائدہ ہو گا۔ لیکن بعد کے حالات نے ثابت کیا کہ فائدہ صرف سرمایہ دار کا ہے۔ نچلے طبقے اور ان کے وسائل کو صرف استعمال کیا جاتا ہے اور اس کے لیے تمام حکومتی مشینری بھی اپنے مفاد کے لیے سرمایہ دار کی پشت پناہی کرتی ہے۔ بعینہٖ یہی صورتحال عالمگیریت کی ہے عالمگیریت کے اس خوبصورت نقاب کے پیچھے سرمایہ داری کا مکروہ چہرہ پوشیدہ ہے۔ جمہوریت انسانی حقوق اور عالمی معاشرے کا قیام جیسے نعرے صرف غریب اور ترقی پذیر ملکوں کے وسائل کو لوٹنے کے لیے لگائے جاتے ہیں۔

اس ناول کے آئینہ میں ہمیں برطانوی استعمار اور اس کی سامراجی ریشہ دوانیوں کے انتہائی عروج کا ہندوستان نظر آتا ہے ہم دیکھتے ہیں کہ ایک طرف سامراجی حکومت جاگیر داروں اور سرمایہ داروں کی سازشوں سے عوام کو لوٹنے کے نئے نئے وسائل پیدا کر رہی ہے اور دوسری ریاستوں میں راجاؤں کو کھلونا بنا کر عوام کی بڑھتی ہوئی طاقت اور ان کی آوازوں کو کچلنے میں من مانے ظلم ڈھا رہی ہے۔[۲]

گویا اس میں عالمگیریت کی قدیم صورت برطانوی استعمار کی شکل میں نظر آتی ہے۔ مقصد ان کا بھی مقامی لوگوں اور ہندوستان کا استحصال ہے اور تاریخ کی کتب میں اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں کہ کس طرح انہوں نے اس سونے کی چڑیا کو نوچا اور نیم مردہ کر کے بالآخر سے چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔

---

(۱) پریم چند، منشی، مجموعہ منشی پریم چند، ص ۲۹۷

(۲) ڈاکٹر قمر رئیس، پریم چند کا تنقیدی مطالعہ: بہ حیثیت ناول نگار، ص ۲۲۴

پریم چند کا شعور اس دور کے عام پڑھے لکھے لوگوں سے زیادہ ترقی یافتہ تھا تبھی وہ انگریزوں کی برصغیر میں کی گئی عنایات کے پردے میں ان کے استعماری مقاصد کو بھانپ لیتے ہیں۔ ناول میں اس کی مثالیں موجود ہیں مثلاً

"مسٹر سیوک (روکھے پن سے) تو کیا آپ یہ نہیں مانتے کہ انگریزوں نے ہندوستان کے لیے جو کچھ کیا وہ شاید کسی قوم نے کسی ملک یا قوم کے ساتھ نہ کیا ہو؟

کنور صاحب: نہیں۔ میں یہ نہیں مانتا۔

مسٹر سیوک: (تعجب سے) تعلیم کی اتنی اشاعت اور بھی کسی زمانہ میں ہوئی؟

کنور صاحب: میں اسے تعلیم نہیں کہتا جو انسان کو سراپا خود غرض بنادے۔

مسٹر سیوک: ریل، تار، ڈاک، جہاز یہ ساری کرامات انگریزوں ہی کے ساتھ آئیں۔

کنور صاحب: انگریزوں کے بغیر بھی آسکتی تھیں اور اگر آئی بھی ہیں تو زیادہ انگریزوں ہی کے فائدے کے لیے۔

مسٹر سیوک: ایسا قانون پہلے کبھی نہ تھا۔

کنور صاحب: بجاہے ایسا قانون کہاں تھا جو ناانصافی کو انصاف اور جھوٹ کو سچ ثابت کر دکھائے یہ انصاف نہیں انصاف کا گورکھ دھندا ہے۔" (۱)

بہر حال یہ ناول عالمگیریت کی تصویر پیش کرتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ وسیع تر تناظر میں دیکھا جائے تو یہ آنے والے دور میں عالمگیریت کی جدید صورت کو بھی محدود پیمانے پر پیش کرتا ہے۔

اس ناول میں کہیں کہیں انگریزی طرز معاشرت کی جھلکیوں کے ساتھ ساتھ کچھ انگریزوں کے ساتھ بھی ہم متعارف ہوتے ہیں جن میں مسٹر کلارک، ریزیڈنٹ صاحب، مسٹر جان برڈ، پروفیسر چارلی سیمین وغیرہ ضمنی کردار نظر آتے ہیں۔ اس میں ضمناً پریم چند نے بین المذاہب شادیوں کے مسائل نمایاں کیے ہیں۔

اپنے اس ناول کو پریم چند نے اپنے دیگر ناولوں پر ترجیح دی ہے اس کے کردار ہر طبقے اور ہر مسلک کے نمائندہ ہیں جن کے اجتماعی عمل سے ناول میں زندگی کی جو تصویر نظر آتی ہے وہ عہد غلامی کے اس دور کا مرقع ہے جب ہندوستان میں جاگیر دارانہ سماج آخری سانسیں لے رہا تھا اور سرمایہ دارانہ معاشرت آنکھیں کھول رہی تھی۔ پریم چند کی نظر ہندوستان کی اس بدلتی ہوئی زندگی کی وسعت گہرائی تضاد اور تصادم کا احاطہ کرتی ہے۔ ان کا تخیل مرتی اور ابھرتی ہوئی قوتوں کو مادی صورت میں دیکھ رہا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ سرمایہ داری کا غلبہ اور صنعتی دور کی لعنتیں ہماری زندگی کی بہت سی اعلیٰ اقدار کو پامال کر دیں گی۔ لیکن وہ یہ بھی جانتے تھے کہ تاریخی قوتوں کے اس دھارے کو نہ مہاتما گاندھی کی ستیاگرہی روک سکتی ہے اور نہ غلامی کے دکھوں سے نڈھال قوم کا احتجاج کیونکہ احتجاج کمزوروں کا شیوہ ہے اور احتجاج سیلاب کو نہیں روک سکتا۔

---

(۱) پریم چند، منشی، مجموعہ منشی پریم چند، ص ۳۶۸

# میدانِ عمل

پریم چند کے ناولوں میں **میدانِ عمل** خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ میدان عمل پریم چند کے تخلیقی ارتقا کے آخری دور کے ناولوں میں شمار کیا جاتا ہے جو غالباً ۱۹۳۰، ۱۹۳۱ میں ضبط تحریر میں آیا۔ ناول کے شروع میں دو کرداروں امر کانت اور سلیم سے ہمارا تعارف کروایا جاتا ہے۔ دونوں متضاد کردار ہیں۔ امر کانت میں ایک طرح کی سنجیدگی، زود حسی اور دروں بینی نظر آتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کے چہرے پر ایسی ذہانت ہے جو ایک بار دیکھ لے اس کے لیے اسے بھول جانا ناممکن ہے۔ موخر الذکر بقول ناول نگار ایک مرنجامرنج کھلنڈرااور شوقین مزاج نوجوان ہے البتہ دونوں کے درمیان دوستی، محبت اور لگاؤ ہے جو حالات کے مدوجزر کے باوجود قائم رہتا ہے لیکن امر کانت کی نسبت اہم کردار اس کے باپ لالہ سمر کانت کا ہے۔ سمر کانت کا کاروبار ہی سود پر روپیہ چلانا، چوری کا مال سستے داموں خریدنا اور پھر اسے گراں قیمت پر بیچنا، استحصال و زر اندوزی پر مبنی ہے۔ وہ امر کانت کو بھی اسی کاروبار میں لگانا چاہتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مذہبی رسومات وواجبات پر بھی تن دہی سے عمل پیرا ہے۔ یہ مذہبی وابستگی اس کے غیر قانونی و غلط کاروباری طریقوں میں کسی قسم کی رکاوٹ کا باعث بنتی ہے اور نہ ہی وہ ضمیر پر کوئی بوجھ محسوس کرتا ہے۔ امر کانت اپنے باپ کے برعکس شخصیت کا مالک نوجوان ہے جو ایسے کسی کاروبار کا حصہ نہیں بننا چاہتا جس میں کسی قسم کی بددیانتی اور بے ایمانی شامل ہو۔ لہٰذا ناول کے آغاز سے ہی باپ بیٹے کے درمیان غلط فہمی، تلخی اور باہمی اعتماد کے فقدان کی فضا نظر آتی ہے۔

سمر کانت بیوی کے انتقال کے بعد دوسری شادی کرلیتا ہے ماں کی محبت سے محرومی امر کانت کی شخصیت میں بہت سی الجھنوں کا باعث بنتی ہے۔

سمر کانت کی دوسری بیوی سے ایک لڑکی نینا ہے۔ جو امر کانت کے ساتھ محبت رکھتی ہے اور اس کی یہ محبت آخر تک قائم رہتی ہے۔ یہ جذباتی سہارا بھی ایک حد تک امر کانت کے لیے ڈھارس کا باعث ہے۔ امر کانت کی شادی سکھدا سے کردی جاتی ہے جو ایک متمول، فارغ البال اور خوش باش گھرانے کی لڑکی ہے اور زندگی کے حوالے سے سطحی نقطہ نظر کی حامل ہے لیکن امر کانت کو سکھدا کی ذات سے آسودگی یا ذہنی رفاقت کا احساس نہیں ملتا۔ امر کانت کے اندر بغاوت کا ایک خاموش جذبہ ہے اپنے ماحول سے باہر نکلنے اور اپنی دنیا آپ پیدا کرنے کا۔ ایک طرف امر کانت اپنے باپ کے غیر اخلاقی کاروبار کے خلاف ہے۔ جس کی بنیاد سراسر استحصال اور انتفاع پر ہے اور دوسرے طرف وہ زندگی کے ان طور طریقوں سے بھی باغی ہے جن کی سکھدا بچپن سے عادی ہے اور بالواسطہ طور پر وہ مذہب کی اس ظاہر داری کے بھی خلاف ہے جسے سمر کانت نے آڑ بنا رکھا ہے۔

سمر کانت کے کاروبار کے سلسلے میں ہمارا دو کرداروں سے تعارف کروایا جاتا ہے ان میں ایک کالے خاں ہے جو چوری کا مال سمر کانت کے ہاتھوں اونے پونے داموں بیچتا ہے دوسری ایک بیوہ عورت پٹھانی ہے جس کا مرحوم شوہر سمر کانت کے ہاں خدمت پر مامور تھا۔ یہ عورت لالہ جی کے ہاں سے پانچ روپے ماہوار پاتی ہے اور نہایت فقر و عسرت کی زندگی بسر کرتی ہے۔ پٹھانی کی بیٹی سکینہ ہے

جس سے امر کانت کی ملاقات اس کے تنگ و تاریک اور اجاڑ و ویران گھر پر ہوئی۔ سکینہ ایک خاص دلکشی کی حامل ہے امر کانت پہلی ہی ملاقات میں گھائل ہو جاتا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے امر کانت کو سکھدا سے وہ جذباتی آسودگی نہ مل سکی جس کا وہ تمنائی تھا تو اس کی توجہ سکینہ کی جانب مبذول ہوئی کیونکہ سکھدا اپنی بے نیازی اور خود پروری سے اس پر حکومت کرتی تھی۔ وہ حکومت اسے ناگوار تھی۔ سکینہ اپنے انکسار اور شیریں زبانی سے اس پر حکومت کرتی تھی، وہ حکومت اسے قبول تھی۔ سکھدا میں اختیار کا غرور تھا۔ سکینہ میں تسلیم کی عاجزی۔ (۱)

اس ناول کا ایک اور اہم کردار رامادیوی ہے جو سکھدا کی ماں اور امر کانت کی خوش دامن ہے۔ امر کانت کے حوالے سے دور اندیشی کو بروئے کار لاتے ہوئے نرمی اور شفقت کا اظہار کرتی ہے جس سے وہ عرصے سے محروم ہے۔ اس طرح سمر کانت جو بات سختی اور رعب و دبدبے سے نہیں منوا سکتے رامادیوی اپنی شفقت نرمی اور گہری انسانی ہمدردی سے وہ بات منوا لیتی ہے۔ اس ناول کا موضوع وہ استحصال ہے جو کھاتے پیتے، فارغ البال اور غریبوں کا خون چوسنے والے افراد کی طرف سے مظلوم و مجبور طبقے کا کیا جا رہا ہے۔

اس ناول کا پس منظر آزادی سے پہلے کا ہندوستان ہے جس میں انگریزوں کی استعماریت اور ان کے ظلم و ستم ہیں اس کے علاوہ ہندوستانیوں کا پر جوش احتجاج ہے جو اس ناول میں نظر آتا ہے۔ ناول میں طبقاتی تقسیم، طبقاتی کشمکش، عدم مساوات اور استحصال کی تمام تر شکلیں نظر آتی ہیں۔ اس حوالے پریم چند براہ راست اس استحصال کو سامنے لاتے ہیں۔

"امر کانت نے اختلاف کیا۔ مجھے تو گاؤں میں ایک بھی ایسا کسان نہ ملا۔ مہاجن اور عملے انہی غریبوں کا خون چوستے ہیں۔ میں کہتا ہوں ان لوگوں کو ان بے کسوں پر رحم نہیں آتا۔" (۲)

اسی طرح اسی صفحے پر پریم چند ان غریب بے کس کسانوں کی تصویر کشی کرتے ہوئے کہتے ہیں "مجھے تو اس آدمی کی صورت نہیں بھولتی جو چھ مہینے سے بیمار پڑا تھا اور ایک پیسے کی دوا بھی نہ خرید سکا تھا۔ اس پر طرہ یہ کہ زمیندار نے لگان کی ڈگری کرالی جو کچھ اثاثہ تھا نیلام کرالیا۔ اس اندھیر نگری کا خالق کوئی دانا و بینا وجود ہے۔ مجھے تو اس میں شک ہے غریب کے بدن پر چیتھڑے تک نہ تھے۔ اس کی ضعیف ماں کتنی پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی۔" (۳)

اس ناول کا ایک اہم کردار شانتی کمار ہے جو نوجوانوں کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیتا ہے اور خود بھی اصلاح کا متمنی ہے۔

سکینہ سے محبت کا راز افشا ہونے پر امر کانت گھر سے بھاگ کر چماروں کے ایک گاؤں میں جا بستا ہے۔ ان کی تنظیم کرتا ہے۔ ادھر شہر میں سکھدا شہر کے غریبوں کے مکانات بنوانے کو میونسپلٹی سے قطعہ اراضی کا مطالبہ کرتی ہے اور ہڑتال کر کے جیل چلی جاتی ہے۔ ادھر امر کانت کساد بازاری کے پیش نظر کسانوں کی مدد سے تخفیف لگان کی تحریک چلاتا ہے اور گرفتار ہو کے جیل چلا جاتا ہے۔

---

(۱) پریم چند، منشی، *میدان عمل* (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۴) ص ۵۵

(۲) حوالہ بالا، ص ۲۳

(۳) حوالہ بالا، ص ۲۳۔ ۲۴

آخر میں حکومت سے سمجھوتہ ہو جاتا ہے تو امر کانت بھی سکھدا اور دوسرے قیدیوں کے ساتھ ساتھ رہا ہو جاتا ہے اور میاں بیوی کا دل ایک دوسرے سے صاف ہو جاتا ہے۔ اس ناول میں مصنف نے شہر اور دیہات دونوں کے مطالبات کو ایک جگہ اکٹھا کر دیا ہے۔ دیہات کی تحریک کا ہیرو (امر کانت) اور شہر کی تحریک کی ہیروئن (سکھدا) ہے۔ دونوں معاملات بیک وقت طے پا جاتے ہیں اور پھر سب لوگ ایک ہی وقت میں رہا ہو جاتے ہیں۔ مصنف نے ان تحریکوں میں متضاد اور مختلف اغراض و مقاصد رکھنے والے تمام افراد کو آخر میں ایک ہی جھنڈے تلے لا کر کھڑا کر دیا۔ جن میں سرمایہ دار، مزدور، کاشت کار، صنعت کار، پروفیسر، ڈاکٹر سرکاری ملازم مرد عورت بوڑھا جوان سبھی شامل ہیں۔[۱]

پریم چند نوآبادیات اور اس سے جنم لینے والے استحصال کے خلاف تھے۔ پریم چند نے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار ادب کے ذریعے کیا۔ وہ اس لحاظ سے منفرد تھے وہ اپنے پیشروؤں کے مقابلے میں انگریز پرستی کی روش سے انحراف کرتے ہیں۔ اپنے سماج اور اپنے گرد و پیش جنم لیتے سیاسی، سماجی اور معاشی مدوجزر پر گہری نظر تھی۔ میدان عمل کا موضوع اصلاح ہے۔ گاندھی جی کی ستیہ گری کی تحریک ہو یا آریہ و برہمو سماج کی تحریکیں، پریم چند کی شخصیت اور فن پر ان کے گہرے اثرات دکھائی دیتے ہیں۔ اسی وجہ سے پریم چند نے اپنی ملازمت سے استعفیٰ دے کر کل وقتی طور پر ادب سے ناطہ جوڑ لیا۔ میدان عمل بھی اسی پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ ناول نگار اپنے لوگوں کے سماجی سیاسی اور تعلیمی شعور کو بلند کرنے کا خواہش مند دکھائی دیتا ہے اور ان کے ناول کا ہیرو امر کانت بھی اپنے سماج کی خدمت کرنا چاہتا ہے اور پسماندہ طبقات کو معاشرے میں جائز مقام دلوانا چاہتا ہے جبکہ اس کا باپ ان نظریات کو پسند نہیں کرتا۔ لالہ سمر کانت اپنے بیٹے کو کہتا ہے:

> "لیکن دین، سود، بٹہ، غلہ، کپڑا، تیل، گھی سبھی روزگاروں میں داؤ پیچ ہیں۔ جو داؤ گھات سمجھتا ہے وہ نفع اٹھاتا ہے جو نہیں سمجھتا اس کا دیوالیہ پٹ جاتا ہے مجھے کوئی ایسا روزگار بتا دے جس میں جھوٹ نہ بولنا پڑے۔ بے ایمانی نہ کرنی پڑے۔"[۲]

لالہ سمر کانت جیسے افراد موجودہ دور کی ان ملٹی نیشنل کمپنیوں کی نمائندگی کرتے ہیں جن کا مقصد بھی اس لالے کی طرح منافع خوری ہے خواہ اس میں غریبوں کا کتنا ہی استحصال ہو۔ اور اس سلسلے میں ان کا کوئی اصول اور کوئی ضمیر نہیں ہے۔ عالمگیریت میں آڑ میں یہی کھیل آج بھی نظر آتا ہے۔

---

(۱) پریم چند، *میدان عمل*، ص ۴۲

(۲) ایضاً، ص ۴۲

پریم چند نو آبادیات، جو عالم گیریت کی ہی ایک شکل ہے، کے حوالے شدید رد عمل کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ انھیں ہندوستانی سماج میں موجود طبقاتی تقسیم اور ہر قسم کے استحصال کا ذمہ دار سمجھتے ہوئے جہاں بھی انگریزوں کا تعارف کرواتے ہیں انھیں غیر مہذب اور گھٹیا ظاہر کرتے ہیں۔

اسّی ہزار انگریزوں نے چھتیس کروڑ ہندوستانیوں پر حکومت کی۔ انگریزوں نے مسلم اشرافیہ کو معاشی طور پر تباہ کر دیا۔ ہندوستان میں غیر موروثی جاگیر داری نظام تھا۔ انگریزوں نے اسے موروثی بنا کر اپنے حمایتی اور خیر خواہ پیدا کیے اور ہندوستانی سماج کو طبقات میں بانٹ دیا۔ ہندوستانی معاشرے میں عوام کو دو سطحوں پر معاشی استحصال کا سامنا کرنا پڑتا۔ ایک جاگیر داروں کے ہاتھوں اور دوسرے سرکاری عمال کے ہاتھوں۔ ان کے علاوہ مذہبی اجارہ داروں کی طرف سے بھی استحصال سامنے آتا ہے۔ پریم چند استحصال کی سبھی شکلوں کو سامنے لے کر آتے ہیں تاہم اس غلام سماج میں ناول نگار کا سیاسی سماجی اور معاشی شعور اس سطح پر نظر نہیں آتا جہاں وہ ان مسائل کو گہرائی میں سمجھ کر کوئی حل تجویز کر سکیں۔ ڈاکٹر خالد اشرف کے مطابق:

> ''گاندھی جی عوام کو مروجہ سماجی برائیوں جن میں غلامی سر فہرست تھی اور فرسودہ روحانی اقدار کے خلاف جہاد کے لیے تیار کر رہے تھے لیکن ان کے پاس کوئی ٹھوس اقتصادی پروگرام نہ تھا۔ اسی بنا پر انہوں نے اپنے ہم عصر اہم ترین مسائل مثلاً جاگیر داری اور مہاجنی لوٹ کھسوٹ کے خلاف عوام کو منظم نہیں کیا بلکہ بنیادی اقتصادی رشتوں کو تبدیل کیے بغیر ملک میں افلاس اور اونچ نیچ کو مٹانے کی بات کرتے رہے۔'' (۱)

پریم چند بھی اپنے ناولوں میں معاشی استحصال کی نشاندہی کرتے ہیں۔ لیکن اس استحصال کی جڑیں تلاش کرنا اور وجوہ ڈھونڈنا شاید اس وقت مصنف کے شعور سے بالاتر تھا۔ پریم چند اس معاشی استحصال کی بات تو کرتے ہیں لیکن اس طبقاتی سماج کی پیداوار میں کس طبقے کا حصہ کس قدر ہونا چاہیے یہ بتانے سے قاصر ہیں۔ انگریز سامراج کی وجہ سے ہندوستانی معاشرہ مختلف طبقات میں تقسیم ہو گیا کیونکہ نئے حکمرانوں کو اپنی معاونت کے لیے مقامی طور پر نئے طبقات پیدا کرنے کی ضرورت تھی جو ان کی حکومت کو قائم رکھنے میں معاون ہوں اور بوقت ضرورت افرادی قوت اور معاشی تعاون فراہم کر سکیں۔ یہی طبقات ان انگریز حکمرانوں کے ساتھ شامل ہو کر عام آدمی کا استحصال کر رہے تھے اور جس کے لیے جہاں تک ممکن تھا یہی سوچ اس ناول میں نظر آتی ہے۔

ناول کا ہیرو امر کانت اپنے باپ سے اختلاف کی وجہ سے شہر چھوڑ کر گاؤں میں رہائش پذیر ہوتا ہے تو وہاں کسانوں کے بچوں کو تعلیم دینے لگتا ہے لیکن وہ یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ یہ نظام تعلیم بھی اسی بر سر اقتدار استحصال کرنے والے طبقے کا پیدا کردہ ہے جس کے خلاف وہ بر سر پیکار ہے اور نچلا طبقہ یہ تعلیم حاصل کر کے ویسی ہی استحصالی اور ظالمانہ ذہنیت کا حامل ہو گا اور ایسی تعلیم کسی معاشرے میں

---

(۱) خالد اشرف، ڈاکٹر، *برصغیر میں اردو ناول*، (لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۰۵ء)، ص ۱۵

انسان دوست سماجی و معاشرتی تبدیلی کی بنیاد نہیں بن سکتی۔ اس ناول کے اختتام پر ایسی کوئی بڑی سماجی تبدیلی رونما بھی نہیں ہوتی۔ شاید اس سامراجی معاشرے میں کوئی انقلاب برپا ہوتے دکھانا ناول نگار کے لیے ممکن بھی نہ تھا۔

جبکہ سرمایہ داری عہد سائنس، عالمگیریت، صنعت جمہوری نظام، نئے پیداواری رشتوں اور مابعد الطبیعاتی افکار نے تاریخ کو بدل کے رکھ دیا ہے۔ نقل و حمل اور رسل و رسائل کے ذرائع، آلات پیداوار اور سیاسی سماجی نظاموں کی جدید ترین صورتوں نے دنیا کو ایک گاؤں میں تبدیل کر دیا ہے۔ غلام، کسان میں اور کسان مزدور میں بدل گیا۔ ہم مہذب انسان رعایا میں اور رعایا عوام میں بدل گئی۔ سردار بادشاہ میں اور بادشاہ صدر و وزیر اعظم میں بدل گیا۔

# طاہرہ

عبدالحلیم شرر اردو ناول کی روایت میں اس لحاظ سے منفرد ہیں کہ وہ اردو میں تاریخی ناول نگاری کا نقطہ آغاز تھے اور انہوں نے روایتی ناول نگاری سے ہٹ کر تاریخی ناول نگاری میں طبع آزمائی کی اس کی وجوہات پر وہ خود روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں:

"ہمارے ہم وطنوں اور ہم قوموں کو اپنی زندگی کے اس حصے کے واقعات میں مزا آ سکتا ہے جو کامیابی و عروج کا زمانہ تھا اور نصیحت و عبرت کے لیے بھی ہم انہیں ان کے اوج و عروج کے کارنامے دکھائیں تو شاید وہ زیادہ متنبہ ہوں گے۔" (۱)

تاریخی ناولوں کے ساتھ ساتھ انہوں نے معاشرتی ناول بھی لکھے جن میں طاہرہ، آغا صادق کی شادی، بدرالنسا کی مصیبت شامل ہیں۔ **طاہرہ** ایک ایسا ناول ہے جس میں عالمگیریت کے کچھ اثرات موجود ہیں۔ یہ ناول ۱۹۳۲ میں لکھا گیا۔ ناول میں ہندوستانی معاشرے کے افراد کے انگریزوں کے ساتھ میل جول کو موضوع بنایا گیا ہے۔

ناول کا راوی اپنے والد کے ملنے والوں میں ایک قابل بزرگ لائق الدولہ کا تذکرہ کرتا ہے جو نہایت وضع دار اور نفاست پسند تھے۔ فارسی کے بہت بڑے عالم تھے۔ راوی کے والد کو بھی انشا پردازی کا شوق تھا۔ یہی شوق ان بزرگ اور راوی کے والد کے مابین انسیت و لگاؤ کا باعث ہوا اور راوی کے والد نے انہیں فارسی سیکھنے کے لیے لائق الدولہ کے سپرد کیا۔

یہیں راوی کو لائق الدولہ کو قریب سے دیکھنے اور جاننے کا موقع ملا۔ راوی کے استفسار وہ اپنے حالات یوں بیان کرتے ہیں کہ

" میں نصیر الدین حیدر کے زمانے میں آٹھ نو سال کا بچہ تھا اور نہایت شریر اور ڈھیٹ تھا والد شاہی ڈیوڑھی کے منشی تھے۔ کبھی کبھی میں بھی ان کے ساتھ در دولت پر چلا جاتا۔ ایک دن دربانوں کی آنکھ بچا کر بادشاہ کی خلوت گاہ میں پہنچ گیا نصیر الدین حیدر شراب پیئے خواصوں میں بیٹھے تھے مجھے دیکھتے ہی اٹھ کے دوڑے اور میرے کپڑوں پر پیک کی کلی کر دی۔ ناک میں شراب کی بو آئی تو میں نے ناک سکوڑ دی۔ بادشاہ نے پوچھا: 'یہ تم نے ناک کیوں سکوڑی؟' میں نے کہا: 'اور تم نے کلی کیوں کر دی؟' اس جواب پر انہوں نے تلوار کھینچ لی اور کہا 'ماروں؟' میں نے کہا: 'مارو مارو دیکھوں کیسے مارتے ہو؟' میرے اس جواب پر بادشاہ کو ہنسی آ گئی اور پوچھا یہ کس کا لڑکا ہے۔ سب ڈرے سہمے ہوئے تھے۔ میرے والد ڈرتے کانپتے بادشاہ کے سامنے گئے اور عرض کی یہ میرا لڑکا ہے۔ بادشاہ نے کہا 'یہ بہت بہادر لڑکا ہے۔ میں نے اسے رسالۂ نادری کا رسالدار مقرر کیا۔' اس طرح مجھے شہسواری کی تعلیم دی جانے لگی مگر میں پڑھنے لکھنے کی طرف سے بے پروا ہو گیا اور شاید میری بد شوقی مجھے جاہل رکھتی مگر

---

(۱) ممتاز منگلوری، مقدمہ ملک العزیز ورجینیا، (لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۵ء)، ص ۱۳

ایک بیگم صاحبہ میرے حال پر مہربان ہوگئیں اور انہوں نے مجھے فارسی پڑھنا لکھنا سیکھادی۔"[۱]

راوی کے تجسس اور استفسار پر وہ بزرگ طاہرہ بیگم کا قصہ یوں بیان کرتے ہیں:

"رسالہ نادری کا رسالدار مقرر ہونے کی شہرت سارے شہر میں ہوگئی۔ ان دنوں لکھنؤ میں ان کا مکان لوہے کے پل کے قریب بیلی گارد (ریذیڈنسی) کی شرقی دیوار کے نیچے تھا اور ہمارے مکان کے ساتھ ایک عالی شان محل تھا جس میں ایک بیگم صاحبہ اکیلی رہتی تھیں۔ بہت خوشحال تھیں کئی کئی پیش خدمتیں کام کاج کو ہر وقت موجود رہتیں۔ ان بیگم صاحبہ کا نام طاہرہ تھا لیکن وہ کسی سے ملتی جلتی نہیں تھیں لائق الدولہ سے انھیں بڑا انس تھا۔ لیکن لائق الدولہ کی والدہ ان بیگم صاحبہ کو اچھا نہیں سمجھتی تھیں اور وہ سمجھتی تھیں کہ وہ کرانی (عیسائی) ہیں۔ جب طاہرہ بیگم کو اس بات کا علم ہوا تو انہوں نے لائق الدولہ کی والدہ کو اپنے ہاں کھانے کی دعوت دی۔ اس پر تکلف دعوت کے موقع پر طاہرہ بیگم نے اپنے حالات لائق الدولہ کی والدہ کے اصرار پر انھیں سنائے اور طاہرہ کی جگہ ننھی بیگم نام بتایا۔ ننھی بیگم چھوٹی تھیں کہ سندیلے میں ان کے والد، والدہ اور بھائی ہیضے سے مر گئے۔ ننھی بیگم کے ایک چچا مولوی عزیز اللہ لکھنؤ میں رہتے تھے۔ ننھی بیگم کو ان کے پاس پہنچا دیا گیا۔ مولوی عزیز اللہ انگریزوں کے بہت قریب تھے۔ مولوی صاحب اور ان کی بیگم نے ننھی کو اپنی بیٹیوں کی طرح نہایت شفقت سے پالا ان کا ایک بیٹا ولی اللہ تھا۔ ننھی کی تعلیم و تربیت مولوی عزیز اللہ کے آقا کرنل مکنتاش کی بیگم لیڈی مکنتاش نے کی تھی اور ننھی بیگم کو عربی، فارسی اور انگریزی کی تعلیم دی تھی۔ جب ننھی بیگم اور ولی اللہ دونوں جوان ہوگئے تو والدین نے ان کی شادی طے کردی۔ ولی اللہ کو جب اس شادی کی خبر ملی تو اس نے شادی سے انکار کر دیا۔ کیونکہ اس کے خیال میں انگریزی تعلیم نے ننھی بیگم کے عقائد کو خراب کر دیا ہوگا اور وہ کرانی ہو چکی ہوں گی۔ بہت سمجھانے اور سختی کرنے پر بھی ولی اللہ کا انکار اقرار میں نہ بدلا اور وہ گھر سے بھاگ گیا۔ بہت ڈھونڈا مگر بے سود۔ اسی غم میں پہلے مولوی عزیز اللہ کی بیگم اور پھر چند دنوں کے وقفے سے مولوی صاحب خود بھی انتقال کر گئے۔ ننھی بیگم کا اب دنیا میں کوئی نہ رہ گیا لیکن مولوی صاحب جاتے جاتے کرنل مکنتاش اور ان کی اہلیہ کو ننھی بیگم کا

(۱) شرر، عبدالحلیم، طاہرہ (لکھنئو: دلگداز پریس، ۱۹۲۳ء) ص ۴۔۵

سرپرست بناگئے۔ انہوں نے ننھی بیگم کو بہت محبت اور آسودگی کے ساتھ رکھا۔ اس کے لیے علیحدہ مکان لیا گیا تاکہ وہ اپنے مذہبی عقائد کے مطابق زندگی بسر کرسکے۔ ننھی بیگم بہت سلیقہ شعار اور صاحب جمال خاتون تھیں۔ ان کے لیے کئی رشتے آئے لیکن انہوں نے منظور نہ کیے۔ کچھ عرصے بعد کرنل مکنتاش ریٹائر ہوکر کلکتہ منتقل ہوگئے۔ اب وہ ننھی کی رہبری لیڈی گف مین کے سپرد کرگئے۔ اور ہر ماہ کلکتے سے اسے اچھی خاصی رقم بھجواتے رہے۔ ننھی اس میں سے کچھ خرچ کرلیتی اور کچھ غریبوں میں تقسیم کردیتی۔ اس عرصے میں ایک شخص ننھی بیگم کا بھائی بن کر آیا۔ لیکن تحقیق سے یہ بات واضح ہوگئی کہ وہ محض جائیداد کے لالچ اور ننھی بیگم کے حسن و جمال کی بابت سن کر آیا تھا تاکہ بھائی کے دھوکے میں اس تک رسائی حاصل کرکے شادی کرے اور دولت بھی ہتھیالے۔ لیکن لیڈی گف مین اور مسٹر گف مین کی مداخلت سے ایسا نہ ہوسکا اور اسے پانچ سال کی قید بامشقت سنادی گئی۔ اسی دوران کرنل مکنتاش کا انتقال ہوگیا اور انہوں نے اپنی پانچ لاکھ دولت کا وارث ننھی بیگم کو بنایا۔ بیگم مکنتاش شوہر کے انتقال کے بعد انگلینڈ اپنے والد کے پاس چلی گئیں۔ ننھی بیگم اپنے دکھ اور ملال کے ساتھ تنہا رہ گئیں۔ لیکن قدرت نے انھیں دکھ سے نکالنے کا سامان یوں کیا کہ ان کا منگیتر ولی اللہ واپس آگیا اور اپنی غلطی پر نادم ہوکر ننھی بیگم سے معافی کا طلبگار ہوا۔ ننھی بیگم کے پوچھنے پر وہ اپنے سفر کے حالات بیان کرتا ہے کہ اس نے ایران، افغانستان، مصر، عراق اور سعودی عرب کے مختلف علما اور فقہا سے رائے لی ہے اور ان کا کہنا ہے کہ اہل کتاب کے ساتھ ملنا جلنا کھانا پینا اور کتابیہ عورت سے نکاح جائز ہے۔ ولی اللہ اپنے نصیب پر بہت نادم ہیں۔ کچھ سوالات دے کر تسلی بخش جوابات ملنے کے بعد طاہرہ بیگم ولی اللہ سے شادی پر رضامند ہوگئی۔ شادی کے بعد وہ اپنے دونوں مکان لائق الدولہ کے نام کرجاتی ہیں پھر کلکتہ اور کلکتہ سے مصر منتقل ہوگئیں۔ اسی دوران لکھنو کا زوال ہوگیا۔ غدر میں سب گھر بار لٹ گیا۔ نہ وہ رسالہ رہا نہ وہ رسالدار رہے اور نہ ہی وہ دولت جو ننھی بیگم سے ان کو ملی تھی۔ ننھی بیگم سے رابطہ بہر حال رہا، کافی عرصے بعد ننھی بیگم ایک بیٹا دو بیٹیاں چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت ہوگئیں ولی اللہ نے عقد ثانی کرلیا اور قصہ اختتام پذیر ہوگیا۔"

اس ناول کا پلاٹ بھی سیدھا سادھا ہے جس میں اوسط درجے کی دلچسپی اس بدمعاش کے بھائی بن کر آنے کی صورت میں پیدا ہوجاتی ہے لیکن دراصل یہ قصہ انگریزوں کے ساتھ میل جول کی ترغیب دلاتا ہے۔

اس ناول میں انگریز کردار شروع سے تقریباً آخر تک موجود رہتے ہیں ان کرداروں میں کرنل مکنتاش اور لیڈی مکنتاش اور گف مین اور لیڈی گف مین کے کردار عالمگیریت کے مظہر کے طور پر موجود ہیں۔ ناول میں ان کرداروں کو مثبت اور اعلیٰ اوصاف کا حامل پیش کیا گیا ہے اور اس عالمگیریت کے جو نتائج اس وقت ہندوستان کو قحط اور استحصال کی صورت میں پیش آئے ان کا تذکرہ کہیں نہیں ملتا۔ یہ انگریز نہایت بے لوث ہمدرد اور ہندستانیوں کے خیر خواہ ہیں۔ مکنتاش جسے مولوی عزیز کپتان صاحب اور میرے آقا کہتے ہیں ولی اللہ کو سمجھاتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''ولی اللہ اول تو یہ یاد رکھو کہ ہم لوگ ہندوستان میں جو آئے ہیں تو ملکی اصلاح اور سارے ملک میں امن و امان اور تہذیب و اخلاق پھیلانے کو آئے ہیں ہم کسی کا دین لینے اور اس کو بہکانے اور بگاڑنے کو نہیں آئے ہیں یہ ہمارے پادری البتہ انجیل کی وعظ کہا کرتے ہیں مگر ہم لوگ اس امر میں ان کے خلاف ہیں۔'' (۱)

یہی عالمگیریت کا ظاہری چہرہ ہے اس وقت یہ لوگ تہذیب و اخلاق سکھانے کے لیے آئے تھے اور آج امریکہ بہادر جمہوریت اور انسانی حقوق کے نام پر شب خون مار کر اپنے عمل کو جواز فراہم کر رہا ہے۔ ان کرداروں کے مقابلے میں ہندوستانی اور مسلمانوں کے کرداروں کو تنگ ذہن بنیاد پرست اور اوہام پرست دکھایا گیا۔ جو عیسائیوں کے ساتھ کھانا کھانے تک کا روادار نہیں اور انگریز کے ساتھ میل جول کو ناپسند کرتا ہے۔

دوسری طرف انگریز کردار جو سراپا شرافت نیک نفسی کا نمونہ ہیں ہندوستانیوں کی اس نفرت کو جاننے کے باوجود ان کے ساتھ اعلیٰ ظرفی اور حسن سلوک کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ جب طاہرہ کی سرپرستی کرتے ہیں تو حقیقی بیٹیوں سے بڑھ کر اس کا خیال رکھتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ برصغیر کے مقامی حکمرانوں پر بھی طنز کرتے ہیں کہ وہ رعایا کو کسی طرح کی آزادی نہیں دیتے یعنی جبر سے کام لیتے ہیں یہ مکالمہ اس کی مثال ہے۔

> ''صاحب (پھر قہقہہ مار کے) خوب، جس طرح آپ کے یہاں سلطنت میں بادشاہ رعایا کو کسی بات کی آزادی نہیں دیتا اسی طرح معاشرت میں بھی آپ اپنے ہر ماتحت کو چاہے وہ بیٹے بیٹی ہی کیوں نہ ہوں آزادی دینا گوارہ نہیں کرتے۔'' (۲)

ایک آدھ جگہ انگریزی تمدن کا ذکر بھی ملتا ہے جب طاہرہ بیگم لائق الدولہ کو گھر دعوت پر بلاتی ہیں تو چونکہ ان کی تربیت بیگم مکنتاش نے کی ہے تو وہ کھانا انگریزوں کی طرز پر میز کرسی پر بیٹھ کر کھانے کی عادت کی بابت بتاتی ہیں کہ طاہرہ بیگم کے گھر میں جو صفائی ستھرائی اور نفاست و سلیقہ ہے اسی بھی بیگم مکنتاش اور انگریزوں کے ساتھ میل جول کا نتیجہ بتایا جاتا ہے۔

---

(۱) شرر، عبد الحلیم، طاہرہ، ص ۴۴۔۴۵

(۲) ایضاً، ص ۴۷

"اماں تم نہیں جانتے۔ سنتی ہوں کہ فقط دکھانے کے لیے مسلمان ہیں دل میں کرانی ہیں۔ فرنگیوں کی چال پر چلتی ہیں اور یہ صفائی جو تم نے ان میں دیکھی یہ بھی کرانیوں سے ملنے کا اثر ہے۔"(۱)

دوسرے لفظوں میں ہندوستانیوں میں صفائی کا شعور بھی ناپید ہے۔

یہ ناول اگرچہ سیدھا سادھا معاشرتی ناول ہے جس میں اس وقت کے حالات کے تحت مسلمانوں میں پیدا ہونے والی بعض مذہبی غلط فہمیوں کے ازالے کی ایک کوشش کی گئی ہے لیکن دراصل عبدالحلیم بھی عصری حالات اور بشری کمزوریوں سے ماورانہ تھے۔ حکمرانوں کو خوش کرنے کے لیے انگریزوں کو مجسمہ نیکی بنا کر پیش کیا گیا جو ہزاروں کوس کا فاصلہ طے کر کے صعوبتیں اٹھا کے اپنے پیاروں کو چھوڑ کر محض اس لیے ہندوستان آئے ہیں کہ یہاں کے لوگوں کی فلاح و بہبود اور ان کی خدمت کی جا سکے۔ کرنل کی بیوی بھی اپنے شوہر کی طرح مولوی صاحب کو یقین دلاتی ہے۔

"یہ بھی یقین رکھیں کہ ہمیں اختلاف مذہب کا بالکل خیال نہیں۔ ہم ہزاروں کوس اپنا وطن چھوڑ کر اس لیے نہیں آئے ہیں کہ لوگوں کے ایمان اور عقیدوں میں خلل ڈالیں۔ ہم ان کی خوشی اور فلاح کے خواہاں ہیں۔" (۲)

کرنل صاحب اس قدر بے لوث ہیں کہ مولوی صاحب کے صاحبزادے کو بغیر کسی معاوضے کے انگریزی پڑھاتے ہیں۔ مرتے وقت اپنی ساری دولت کا وارث ننھی کو بنا جاتے ہیں۔

غرضیکہ اس ناول میں سرشار نے عالمگیریت کے ساتھ وابستہ ذہنیت کا بھرپور استعمال کیا ہے۔ اس ناول میں اگرچہ انگریزی استعمال بہت کم ملتا ہے لیکن انگریز عورتیں جو اردو انگریزی لہجے میں بولتی ہیں اس کی کئی مثالیں موجود ہیں۔

"ول ٹم کون ہے؟"

"او ٹم ہی بچہ رسالدار ہے؟ ہم ٹم کو دیکھ کے بہت خوش ہوا۔ طاہرہ بیگم کو بھی تمہارے دیکھنے کا اشتیاق ہے چلو ٹم کو ان سے ملا دے۔"(۳)

یہ انگریزی نما اردو جو اس ناول میں موجود ہے رفتہ رفتہ بعد کے ناولوں میں اردو کی جگہ انگریزی کے الفاظ لے لیتے ہیں۔ یہ ایک لحاظ سے آغاز تھا اس لسانی سامراجیت کا جس کی بنا پر آج دنیا کی اکثر زبانیں ختم ہو جانے کے خطرے سے دوچار ہیں۔ بہر حال اس ناول میں انگریزوں کو عالم گیریت کی سوچ کے مطابق مہذب اور برتر بنا کر پیش کیا گیا ہے۔

---

(۱) شرر، عبدالحلیم، طاہرہ، ص ۸

(۲) ایضاً، ص ۸۱

(۳) ایضاً، ص ۷۔۸

# گئو دان

**گئودان** پریم چند کے آخری دور کا ناول ہے۔ اس ناول کی تکمیل کے ساتھ ہی پریم چند کی ناول نگاری کا دور بھی ختم ہو جاتا ہے۔ یہ ناول ۱۹۳۶ میں ان کے اپنے پریس سرسوتی پریس بنارس سے شائع ہوا۔ اس ناول میں پریم چند کا فن اپنے عروج پر نظر آتا ہے اور ان کے وہ ناقدین مثلاً کرشن پرشاد کول جو انھیں ناول نگار ماننے میں متامل ہیں گئودان کو اونچے درجے کا اردو ناول قرار دیتے ہیں۔

چوگان ہستی کی طرح گئودان لکھنے کی تحریک بھی پریم چند کو گاؤں کے ایک کسان ''ہوری'' کو دیکھ کر پیدا ہوئی۔ یہ ناول انھوں نے ایک ایسے دور میں لکھا جب ملک کی سیاسی حالت دگر گوں تھی۔ ملک کے سیاسی افق پر مایوسی کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ انگریز سامراج ایک بار پھر پوری قوت سے آزادی پسند قوتوں کو کچلنے کا بیڑا اٹھا چکا تھا اور ان حالات میں سب سے زیادہ مظلوم اور دکھی کسان تھا۔ جو ایک طرف حکومت کے ظلم و ستم کا نشانہ بن رہا تھا اور لگان بندی کے جرم کے نام پر اسے کچلنے کی کوشش کی جا رہی تھی اور دوسری طرف مہاجن بنیئے سود کے نام پر اس پر عرصہ حیات تنگ کر رہے تھے۔ ایک طرف زمیندار کے کارندے دوسری طرف مہاجن، اور چکی کے دو پاٹوں کے درمیان پستا ہوا کسان۔ یوں لگتا ہے کہ پایم چند نے خون دل میں انگلیاں ڈبو کے یہ شاہپارہ تخلیق کیا ہے۔ اس میں آزادی سے قبل ہندوستان جیتا جاگتا نظر آتا ہے۔ اس ناول کے آئینے میں ہمیں دیہات کے ساتھ ساتھ شہر بھی نظر آتے ہیں۔ کسان بھی نظر آتے ہیں اور سود خور بھی، زمیندار، مہاجن، پٹواری بھی، برہمن، وکیل، پروفیسر اور دلال بھی۔ معاشرے کا کوئی ایسا فرد نہیں جو اس ناول میں نظر نہ آتا ہے۔

گئودان بنیادی طور پر ''ہوری'' نامی ایک کسان کی سرگذشت ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ جاگیردار رائے صاحب اور ان کے شہری دوستوں کی زندگی کا خاکہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ ہوری بیلداری گاؤں کا ایک غریب کسان ہے جبکہ زمیندار رائے صاحب قریب کے دوسرے گاؤں سمری میں رہتے ہیں۔ ہوری کا خاندان پانچ افراد ''ہوری اس کی بیوی دھنیا بیٹے گوبر بیٹیوں سونا اور روپا پر مشتمل ہے۔ تین چار بیگھے زمین پر کھیتی باڑی کرتا ہے۔ اسی پر اس کے خاندان کی زندگی کا دارومدار ہے۔ تمام خاندان کھیت میں سخت محنت کرتا ہے لیکن خوش حالی تو کجا خاندان کو پیٹ بھر روٹی بھی میسر نہیں۔ ہوری وقتاً فوقتاً اپنے زمیندار کو سلام کرنے کے لیے اس کے گاؤں جاتا رہتا ہے۔ اس کے دل میں یہ خواہش کروٹ لیتی رہی ہے کہ اگر اس کے پاس ایک گائے ہوتی تو وہ بچوں کو دودھ پلا سکتا اور گھر پر گائے بندھنے کی وجہ سے گھر کی رونق بھی بڑھ جاتی۔ ایک دن وہ زمیندار سے ملنے جا رہا ہے اور دل میں سوچتا ہے کہ بھگوان کہیں گو سے برکھا کر دیں اور ہانڈی بھی بھری رہے تو ایک گائے ضرور لوں گا... وہ پچھائی گائے لے گا۔ اس کی خوب خدمت کرے گا کچھ نہیں چار پانچ سیر دودھ ہو گا۔ گوبر دودھ کے لیے ترس ترس کر رہ جاتا ہے۔ اس عمر میں نہ کھایا پیا تو پھر کب کھائے گا... پھر گائے سے ہی تو دروازے کی رونق ہے۔ سویرے سویرے گائے کے درشن ہو جائیں تو کیا کہنا! نہ جانے کب وہ مبارک دن آئے گا!" [1]

---

(۱) پریم چند، منشی، *گئودان*، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء) ص ۵

اچانک اس کی ملاقات بھولا اہیر سے ہو جاتی ہے جو جنگل میں اپنی گائیں چرا رہا ہے۔ ہوری بھولا کو دوسری شادی کرانے کی لالچ دے کر اس سے ایک گائے لے لیتا ہے۔ گائے دروازے پہ کیا بندھتی ہے تمام گاؤں گائے دیکھ کر امنڈ آتا ہے۔ لیکن ہوری کا بھائی ہیرا اپنے بھائی کے دروازے پر گائے بندھی دیکھ کر جل جاتا ہے اور ایک دن حسد کا شکار ہو کر گائے کو زہر دے دیتا ہے۔ اسی دوران ہوری کے بیٹے گوبر کا تعلق بھولا اہیر کی بیوہ بیٹی جھنیا سے ہو جاتا ہے۔ اس کے حاملہ ہونے پر گوبر اسے اپنے گھر چھوڑ کر لکھنؤ چلا جاتا ہے۔ ہوری اور اس کی بیوی دھنیا جھنیا کو اس حالت میں دیکھ کر اپنے گھر پناہ دیتے ہیں۔ جس پر تمام گاؤں اس کے خلاف ہو کر اس کا حقہ پانی بند کر دیتا ہے۔ برادری سے جڑے رہنے کی غرض سے ہوری کو بہت بڑی رقم بطور تاوان دینی پڑتی ہے۔ زمین کی ساری پیداوار بطور تاوان دے کر بھی جرمانہ پورا نہیں ہوتا لہٰذا اسے گھر رہن رکھنا پڑتا ہے۔ دوسری طرف بھولا بھی اپنی عزت کا بدلہ لینے کے لیے گائے کی قیمت طلب کرتا ہے اور عدم ادائیگی پر ہوری کے بیلوں کی جوڑی کھول کر لے جاتا ہے اس طرح ہوری کی زندگی کا یہ آخری سہارا بھی ختم ہو جاتا ہے۔ اس کی بیوی بچے دانے دانے کے محتاج ہو جاتے ہیں۔ ان حالات میں ہیرا کی بیوی ان کی مدد کرتی ہے۔ انہی حالات میں جھنیا کا بیٹا پیدا ہوتا ہے۔ گوبر لکھنؤ میں ایک سال کے دوران ایک معقول رقم اکٹھی کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو اسے اپنی بیوی کا خیال آتا ہے۔ اب وہ اپنے والدین اور بیوی سے ملنے آتا ہے تو ایک غریب کسان کا بیٹا نہیں بلکہ باشعور مزدور بن کر آتا ہے۔ اب وہ کسی سرکاری کارندے زمیندار سے دبنے کی بجائے ہر ایک سے ٹکر لینے کو تیار ہو جاتا ہے بلکہ وہ اپنے باپ کو بھی استحصال کرنے والوں کے مقابل کھڑے ہونے کی ترغیب دیتا ہے لیکن ہوری قدیم روایات کا پابند وضع دار انسان ہے جو اپنے کردار کی عظمت ان حالات میں بھی قائم رکھے ہوئے ہے چنانچہ گوبر ہوری سے جھگڑا کر کے اپنی بیوی کو لے کر شہر چلا آتا ہے۔ ہوری کو اب بیٹیوں کی شادی کی فکر بھی دامنگیر ہے۔ قرض، ادھار اور سود کے بوجھ تلے دبے ہوری کی فصل زمیندار کے کارندے لے جاتے ہیں۔ آخر کسی نہ کسی طرح وہ سونا کی شادی کا فریضہ سرانجام دے دیتا ہے۔ دوسری طرف گوبر لکھنؤ جا کر ایک کارخانے میں ملازم ہو جاتا ہے وہاں ہڑتال ہو جاتی ہے۔ اس ہڑتال کے نتیجے میں وہ تشدد کا شکار ہو کر بستر پر پڑ جاتا ہے ایسی حالت میں اس کی بیوی جھنیا گھاس بیچ کر گھر کا خرچ چلاتی ہے۔ اس زمانے میں ان کا بیٹا مر جاتا ہے دوسرا بیٹا پیدا ہوتا ہے۔

رائے صاحب زمیندار اپنے دوست احباب اور سرکاری عمال کو دعوتوں اور تحفے تحائف کے ذریعے خوش رکھتے ہیں۔ ان دعوتوں میں مہتا صاحب فلسفہ کے پروفیسر، کھنا صاحب ایک بینکر، ایک دلال ٹنخا اور ایک خاتون ڈاکٹر مس مالتی شامل ہوتی ہیں۔ مس مالتی ماڈرن سوسائٹی کی پروردہ اور انگلینڈ سے ڈاکٹری کی ڈگری لے کر آئی ہے۔ خوش لباس ہے گفتگو کے ہنر سے واقف ہے، ذہین ہے، کھنا جیسے مردوں کو اداؤں سے لبھانا جانتی ہے لیکن مہتا کی ذہانت اور شخصیت سے گھائل ہو کر اس کی سوچ میں تبدیلی آجاتی ہے۔ اب سماج سیوا میں اسے مسرت ملتی ہے۔ ایک دن مالتی جب جھنیا گوبر کو دیکھتی ہے اور اس کے چھوٹے بچے کو بیمار دیکھتی ہے تو اس پر رحم کھا کر وہ انھیں اپنے گھر کے اندر لے آتی ہے۔ یوں گوبر کے دن تو پھر جاتے ہیں لیکن ہوری کے مصائب اور وسائل جوں کے توں ہیں۔

اپنی دوسری بیٹی کی شادی دو سو روپے کے عوض وہ اپنے ایک ہم عمر سے کر دیتا ہے۔ مزدوری کرکے اپنے کنبے کا پیٹ پالتا ہے لیکن اس حالت میں ساہوکار اس کی تین چار بیگہ زمین پر قبضہ کرنا چاہتا ہے لیکن وہ اپنے بزرگوں کی نشانی کسی قیمت پر دینے کو تیار نہیں ہے۔ گوبر روپا کی شادی میں شرکت کے لیے جھنیا اور بچے کو لے کر آتا ہے۔ پھر بچے اور جھنیا کو چھوڑ کر دوبارہ شہر چلا جاتا ہے۔ ہوری ان تمام مشکلات کے باوجود گائے پالنے کی خواہش دل سے نہیں نکال سکتا۔ اس لیے وہ دن رات محنت مزدوری کرکے ایک گائے لینے کی خواہش کو پورا کرنا چاہتا ہے لیکن آخر کار سخت گرمی اور لو کا شکار ہو جاتا ہے اور وہیں اس کی زندگی کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

ہوری اور رائے صاحب کی کہانیاں آپس میں مربوط ہو کر چلتی ہیں۔ لیکن یہ دونوں کہانیاں اپنی اپنی جگہ بھی مکمل ہیں۔ ناول میں ایک طرف ہوری کی پریشانیاں اس کا افلاس اس کی روایت پرستی ہے تو دوسری طرف رائے اگرپال جیسے زمیندار، ان کی لوٹ کھسوٹ دکھاوے کی زندگی، مقدمہ بازیاں، کونسل کے انتخاب کے لیے ان کی کاوشیں ان کی چالیں سب کچھ اس ناول میں ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ گئودان میں پریم چند نے مقامی جاگیر داروں اور سرمایہ داروں کی ہم وطنوں پر کی جانے والی زیادتیوں اور استحصال کو موضوع بنایا ہے۔ لیکن ظلم کے اس سلسلے کو کڑی در کڑی جوڑا جائے تو اس کے آخری کڑی وہ انگریز حکمران نظر آتے ہیں جنہوں نے مغلوں کا غیر موروثی جاگیر داری نظام ختم کرکے موروثی جاگیر داری نظام رائج کیا۔ جاگیر داروں کو وسیع اختیارات دِیے، لگان کی وصولی میں سختی کا رویہ اپنایا۔ غریب کسان کو مالگزاری دینی ہے خواہ اس کے اپنے بچوں کے لیے روٹی کا لقمہ بچے یا نہ بچے۔ زمیندار نے یہ مالگزاری اکٹھی کرکے جاگیر دار تک پہنچانی ہے اور جاگیر دار نے انگریز سرکار اور حکام کو نذر نیاز اور نذرانے پیش کرنے ہیں۔

اس ناول میں عالمگیریت کے اثرات براہ راست نظر نہیں آتے۔ لیکن اگر معاشی مفادات جو عالمگیریت کی اصل قوت محرکہ ہیں کو مد نظر رکھا جائے تو بے رحمانہ معاشی استحصال جیسے پریم چند نے اس ناول میں پیش کیا جو عالمگیریت کے پس پشت بڑی بڑی مالیات کمپنیوں اور اداروں کا وطیرہ ہے وہی استحصال یہاں مہاجن اور سود خور بنیئے کی طرف سے غریب کسان کا کیا جارہا ہے۔ اسی استحصال کو پریم چند موضوع بناتے ہیں اور غریب کسانوں خاص کر ہوری کی زندگی کا ایسا مرقع پیش کرتے ہیں کہ ہر صاحب دل کو ان سود خوروں جاگیر داروں، زمینداروں اور حکومتی کارندوں سے نفرت ہونے لگتی ہے۔ مثال کے طور پر گوبر جب گھر آتا ہے تو دیکھتا ہے۔

"سارے گاؤں پر یہی مصیبت تھی ایسا ایک بھی آدمی نہیں جس کی حالت زار نہ ہو گویا جسم میں جان کے بجائے کلفت ہی بیٹھی ہوئی لوگوں کو کٹھ پتلیوں کی طرح نچا رہی تھی۔ چلتے پھرتے تھے، کام کرتے تھے، پستے تھے صرف اس لیے کہ ایسا ہونا ان کی قسمت میں لکھا تھا۔ زندگی میں نہ کوئی امید ہے اور نہ کوئی امنگ۔ گویا ان کی زندگی کے سوتے سوکھ گئے ہوں اور ساری ہریالی مرجھا گئی ہو، جیٹھ کے دن ہیں، ابھی تک کھلیانوں میں اناج موجود ہے۔ مگر کسی کے چہرے پر خوشی نہیں ہے، بہت کچھ اناج تو کھلیانوں میں ہی تل کر مہاجنوں اور کارندوں

کی نذر ہو چکا ہے اور جو کچھ بچ رہا ہے وہ بھی دوسروں کا ہی ہے۔ مستقبل تاریکی کی طرح ان کے سامنے ہے۔ جس میں انہیں کوئی راستہ نہیں سوجھتا۔" [۱]

اس حوالے سے ڈاکٹر قمر رئیس لکھتے ہیں:

"یہاں پریم چند صاف دیکھ رہے ہیں کہ کسانوں کا مسئلہ ان کی معاشی لوٹ کھسوٹ ہے اور ان کی اصلاح یا قلب ماہیت نہیں بلکہ اس طبقے کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دینا ہے۔ اب ان کے سامنے ہندوستان کی آزادی کا نصب العین صرف انگریز کو ہندوستان سے نکالنا نہیں تھا بلکہ ان کے سامراجی اقتدار کی استحصالی مشین کے ان پرزوں کو بھی نکالنا ہو گا جو گاؤں میں بسنے والے اسی فیصدی غریبوں کا خون چوس رہے تھے۔ ہوری، دھنیا اور گوبر ہندوستان کے ان کروڑوں کسانوں کے نمائندہ ہیں جن کی ساری زندگی زمین دار کو لگان، ساہوکار کو سود، برہمن کو دچھنا برادری کو تاوان اور تھانیدار کو رشوت دینے میں گزر جاتی ہے۔" [۲]

یہ زمیندار، ساہوکار، تھانیدار ان ملٹی نیشنل کمپنیوں کے نمائندے ہیں جن کا ہدف اب صرف کسان نہیں بلکہ تیسری دنیا کے تمام طبقات مرد عورت بچے امیر غریب ہیں جن کو برانڈز کے نام پر لوٹا جاتا ہے۔ اشتہارات کے ذریعے ترغیبات دی جاتی ہیں مصنوعی ضرورتیں پیدا کر کے انھیں مجبور کر دیا جاتا ہے کہ وہ اپنی تمام جمع پونجی ان کے حوالے کر دیں۔ اس حوالے سے دیکھیں تو اس میں عالمگیریت کے اثرات معاشی استحصال کی صورت میں غریب کسانوں کی کسمپرسی کی صورت میں نظر آتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ شہری زندگی جس پر انگریزی تہذیب و معاشرت کے اثرات نظر آتے ہیں۔ دعوتوں میں مہمانوں کی مدارت کی خاطر وہسکی اسکاچ سے کی جاتی ہے مس مالتی جیسے کردار ہیں جو مغرب کی تحریک نسواں سے متاثر ہیں سروج کا کردار ہے جو مشرق کے عورت کو چار دیواری میں رکھنے کے تصور کے خلاف ہے۔

لیکن اس میں زمیندار کے کردار سے بھی مصنف کو ہمدردی ہے کئی ایسے مکالمے ہیں جن میں زمیندار کے مسائل اور ان کے اندرونی کرب کا اظہار ملتا ہے اور ان مسائل کے ڈانڈے بھی ان انگریز حکمرانوں سے جا ملتے ہی جو بالواسطہ کسانوں کے مصائب کا ذمہ دار ہیں۔ گئودان کا جاگیر دار رائے صاحب ہوری کے سامنے اپنے دل کی بات کہتا ہے کہ وہ کسانوں پر ظلم کر کے ان کی کمائی لوٹ لیتا ہے۔ ساتھ ہی اپنی زندگی کے مسائل کو کسانوں کی آہوں کا نتیجہ قرار دیتا ہے وہ کہتا ہے کہ اس کا طبقہ ہر گھڑی اندیشوں اور پریشانیوں کی

(۱) پریم چند، گئودان، ص ۴۳۰

(۲) قمر رئیس، ڈاکٹر، پریم چند کا تنقیدی مطالعہ بہ حیثیت ناول نگار، ص ۲۹۲

آگ میں جلتا ہے بظاہر اپنی آن بان قائم رکھنے کے لیے اسے اپنے حکمرانوں کے تلوے چاٹنا پڑتے ہیں اور یہ حکمران انگریز ہیں جو مقامیوں پر احسانات بھی اپنے مفادات کے لیے کرتے ہیں۔

"دنیا سمجھتی ہے کہ ہم بڑے سکھی ہیں، ہمارے پاس علاقے، محل، سواریاں، نوکر چاکر، قرض بیسوائیں کیا نہیں ہیں۔ جو حاکموں کے تلوے چاٹتا ہو اور اپنے ماتحتوں کا خون چوستا ہو اسے میں سکھی نہیں کہتا۔ وہ تو دنیا کا سب سے بڑا بدنصیب ہے۔" (۱)

اور اس سلسلے میں ان حکمرانوں کو نذریں، ڈالیاں اور ملازم کو دستوریاں پیش کرنی پڑتی ہیں دراصل رائے صاحب خود بھی انھیں خرچوں کو پورا کرنے کے لیے مقروض ہو چکے ہیں وہ مزید کہتے ہیں۔

"صاحب شکار پر آئیں یا دورے پر میرا فرض ہے کہ ان کی دم کے پیچھے لگا رہوں۔ ان کے ابروؤں پر شکن پڑی اور ہماری جان نکلی۔ انھیں خوش کرنے کے لیے ہم کیا نہیں کرتے۔ مگر وہ سب کہنے لگیں تو شاید تمہیں یقین نہ آئے۔ ڈالیوں اور رشوتوں تک خیر غنیمت ہے ہم سجدے کرنے کو بھی تیار رہتے ہیں۔" (۲)

ڈاکٹر ریاض ہمدانی نے اس معاشی استحصال کو نو آبادیاتی تناظر یعنی عالم گیریت کے تناظر میں دیکھا ہے وہ لکھتے ہیں:

"پریم چند کے اس ناول میں نو آبادیات کے زیر سایہ ایک بند اور گھٹن زدہ ہندوستانی سماج کا عکس کرداروں پر بہت گہرا دکھائی دیتا ہے۔ اسی لیے ناول نگار اپنے ہر ایک کردار کے ساتھ رحمدلی کا رویہ رکھتا ہے... انھیں طبقاتی حقیقتوں کی سمجھ نہیں اسی لیے وہ سامراجی ہتھکنڈے بھی سمجھنے سے قاصر ہیں۔" (۳)

اس طرح دراصل وہ عالمگیریت کی اس قدیم شکل کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو نو آبادیاتی سامراج کی شکل میں موجود تھی لیکن عالمگیریت کی اس قدیم اور جدید صورت کے درمیان استحصال مشترک نقطہ ہے۔ اس کے علاوہ عالمگیریت کے سماجی پہلو کے حوالے سے وہ لکھتے ہیں:

"اس ناول میں ایک خوبصورت خاتون مالتی کا کردار مغربی تمدن کو نمایاں کرتا ہے جس نے ولایت سے تعلیم حاصل کی ہے مالتی اور اس کی جو بہنیں مغربی اقدار کی دلدادہ ہیں وہ اپنے عہد کی آزاد خیال خواتین ہیں جو عورتوں کی آزادی کے لیے تنظیم سازی کرتی ہیں۔" (۴)

---

(۱) پریم چند، *گئودان*، ص ۱۵

(۲) ایضاً

(۳) ریاض ہمدانی، ڈاکٹر، *اردو ناول کا نو آبادیاتی مطالعہ* ص ۲۴۳

(۴) ایضاً

ڈاکٹر محمد اشرف کمال لکھتے ہیں:

"گئودان اپنی نوعیت کا پہلا ناول ہے جس میں انھوں نے مرکزی کردار ایک غریب جاہل مفلوک الحال اور جاگیر داری نظام کے ظلم وستم کا نشانہ بننے والے کسان کو بنایا ہے۔ اس ناول میں پہلی بار پریم چند ٹالسٹائی کی مثالیت پسندی سے زیادہ گورکی کی حقیقت پسندی کے قریب ہوتے ہیں۔" (۱)

دراصل پریم چند نے روسی کسانوں کی صورت حال کا مشاہدہ کیا تھا اور پھر اپنے کسانوں کی مفلوک الحالی نے انھیں ایسا شاہکار تحریر کرنے پر مجبور کر دیا۔ یوں عالمگیریت کے اثرات ان کے ناول میں ان کے طرز فکر اور انداز تحریر میں بھی ملتے ہیں۔

(۱) محمد اشرف کمال، ڈاکٹر، اردو ناول، *تاریخ وارتقا آغاز سے اکیسویں صدی تک*، (کراچی: رنگ ادب پبلیکیشنز، ۲۰۱۷ء) ص ۶۸۔۶۹

# لندن کی ایک رات

سجاد ظہیر کے ناول لندن کی ایک رات سے اردو ناول کی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ ناول اردو ناول نگاری کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے جو ۱۹۳۶ میں معرض تخلیق میں آیا لیکن ۱۹۳۸ میں اشاعت پذیر ہوا۔ چونکہ ناول نگار نے اپنے ناول کے دیباچے میں اسے افسانہ یا ناول نہیں کہا ہے اس لیے بعض ناقدین نے اس کو ناول تسلیم نہیں کیا۔ اس میں مصنف نے ناول کی جدید تکنیک اپنائی ہے اس حوالے سے یہ اردو ناول میں ایک نیا تجربہ تھا۔ بعض ناقدین اس حوالے سے بھی اسے ناول تسلیم کرنے سے گریزاں رہے۔ تاہم یوسف سرمست نے ناول کے فن اور جمالیاتی اقدار کی روشنی میں لندن کی ایک رات کو ناول قرار دیا ہے۔ (۱)

وہ کہتے ہیں:

"لندن کی ایک رات اردو کا اہم اور اچھوتا ناول ہے اردو میں نہ صرف جدید ناول نگاری کی ابتدا اس سے ہوتی ہے بلکہ اس ناول سے اردو ناول نگاری شعور کی تکنیک سے سب سے پہلے متعارف ہوتی ہے۔"

یوسف سرمست کی اس رائے کی تائید ڈاکٹر محمد عظیم اللہ نے بھی کی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

"یہ صحیح ہے کہ اردو میں پہلی مرتبہ شعور کی رُو سے تکنیک کو لندن کی ایک رات میں جزوی طور پر برتا گیا ہے۔" (۲)

اس حوالے سے ڈاکٹر محمد اشرف کمال لکھتے ہیں:

"لندن کی ایک رات" میں انھوں (سجاد ظہیر) نے ملک سے باہر مقیم ہندوستانیوں کے مسائل کو موضوع بنایا ہے۔ اس ناول میں انہوں نے شعور کی رُو کا بھی استعمال کیا ہے۔" (۳)

ناول کے موضوع کے حوالے سے ڈاکٹر محمد اشرف سے اختلاف کیا جاسکتا ہے۔ یہ ناول اپنے عہد کے ہندوستان کے سیاسی و سماجی حالات کا آئینہ دار ہے اور ہندوستانی زندگی کے مختلف رجحانات، اہم مسائل اور نوجوان ذہن کے جذبات و نفسیات کا ترجمان ہے۔ یہ ناول ایک مربوط پلاٹ کی بجائے کرداروں پر مبنی ناول ہے۔

اس حوالے سے ڈاکٹر ریاض ہمدانی لکھتے ہیں:

"بنیادی طور پر لندن کی ایک رات ایک مربوط پلاٹ کے بجائے کرداروں پر مبنی (Character Oriented) ناول ہے۔ جس میں ایک کردار کو نمودار کر کے کہانی کا ماحول بنایا جاتا ہے اور اسی تکنیک کے مطابق کردار عمل (Act) کرتا ہے۔ منصوبہ بندی کے ساتھ

---

(۱) یوسف سرمست، بیسویں صدی میں اردو ناول، ص ۶۵

(۲) محمد عظیم اللہ، ڈاکٹر، اردو ناول پر انگریزی ناول کے اثرات، ص ۱۹۵

(۳) محمد اشرف کمال، ڈاکٹر، اردو ناول، تاریخ و ارتقا، ص ۹۶

پہلے سے کوئی پلاٹ نہیں بنایا گیا کہ جس کے ساتھ کہانی کو جوڑا جائے اور اسی میں کردار اپنا عمل ظاہر کرے۔ اس کے بر عکس ایک کردار نمودار ہوا جس کے مطابق ماحول بنا اور اسی ماحول کے اندر سبھی کردار ایکٹ کرتے ہیں۔ چنانچہ اردو ناول میں پہلی بار پلاٹ کے بجائے کرداروں کو مرکزیت دے کر ان کے ذریعے کہانی کو آگے بڑھایا گیا۔" [۱]

اس ناول میں چھ الگ الگ کردار ہیں۔ سبھی کرداروں کا تعلق متوسط یورپی اور ہندوستانی معاشرے سے ہے۔ ناول کا موضوع ان ہندوستانی نوجوانوں کا تحصیل علم کے لیے برطانیہ جانا ہے جو سامراجی تعلیم وتربیت حاصل کرنے کے بعد اپنے وطن میں حکمرانی کے خواہشمند ہیں۔ مغربی اقدار سیکھنے والے یہ نوجوان وہاں کے کلچر اور اپنے سیاسی حالات کو کس نظر سے دیکھتے ہیں۔

ان کرداروں میں ایک کردار اعظم کا ہے جو لندن آکر ایک سفید فام لڑکی جین کی محبت میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ حسب وعدہ اس کے نہ آنے پر فراق کی کلفتوں، لاحاصل انتظار کی اذیت اور اس کی بے وفائی کے اندیشہ ہائے دور دراز میں گرفتار ہے۔ غصہ اور تشویش سے پریشان ہے لیکن محبوبہ کو چھوڑنے کی ہمت اس میں نہیں ہے۔

ایک کردار راؤ کا ہے جو زندگی، رومان اور صحبت جنس مخالف کو ایک خاص فاصلے پر رکھتا ہے۔ زیادہ خود مختار اور آزاد ہے۔ رشتوں کے فریب کو خود پر مسلط نہیں کرنا چاہتا۔ ہندوستان اور ہندوستانیوں کی غلامی اور غلامانہ ذہنیت کا ادراک رکھتا ہے۔ نوآبادیاتی صورتحال کو سمجھتا ہے۔

"ہم کالے آدمیوں کی جان کیڑوں مکوڑوں کے برابر ہے اور قصور ہمارا ہی ہوگا۔ ہم ہندوستانی اسی لائق ہیں، کمینے، ذلیل، بزدل۔ جوتا کھاتے ہیں مگر انگریزوں کی خوشامد سے باز نہیں آتے۔ گولی نہیں میرا بس چلے تو ساری قوم کو توپ کے سامنے رکھ کر اڑا دوں۔ اس قوم کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔ خیال کرو تو ۳۵ کروڑ انسان اور ایک لاکھ سے بھی کم انگریز ان پر مزے سے حکومت کرتے ہیں اور حکومت بھی کیسی حکومت، ہندوستان میں ذلیل سے ذلیل انگریز کا رتبہ بڑے سے بڑے ہندوستانی سے بڑھ کر ہے۔ یہاں انگلستان میں چاہے انگریز مرد ہمارے جوتے صاف کرتے اور انگریز لڑکیاں ہم سے محبت کریں مگر سویز کے اُس پار تو ہم سب "کالا لوگ" نیٹوز غلاموں سے بدتر سمجھے جاتے ہیں۔ میں بیرسٹر ہو جاؤں اور تم انجینئر مگر ہندوستان میں وہی نیٹو کے نیٹو ہوگے اور انگریزوں کی ٹھوکریں کھاؤ گے اور باوجود اس کے پھر الٹ کے انہیں کو

(۱) ریاض ہمدانی، ڈاکٹر، *اردو ناول کا نوآبادیاتی مطالعہ*، ص ۲۵

سرکار سلام "خداوند" اور باپ کہو گے۔ اتنی ذلت برداشت کرنے پر بھی جس قوم کے کان پر
جوں تک نہ رینگے اس کا توصفحہ ہستی سے ناپید ہو جانا ہی بہتر ہے۔" (۱)

یہ تصویر ایک ایسے ذہین نوجوان کی ہے جو نہ صرف اپنے سیاسی و سماجی حالات کا ادراک رکھتا ہے بلکہ اپنی قوم کی نفسیات کا اچھا نباض بھی ہے اور بقول ساجدہ زیدی "جسے شکست فریب نے تلخ بنا دیا ہے۔"(۲)

اس کے فہم و ادراک نے اسے اپنی مشرقی اقدار کی برتری کا شعور بھی عطا کیا ہے وہ مغرب کی تہذیب کی چکا چوند سے قطعاً متاثر نہیں ہوتا بلکہ اس تہذیب کی کجی کا پردہ یوں چاک کرتا ہے۔ وہ شیلا سے کہتا ہے:

"وہی جو میں تم سے ہمیشہ سے کہتا آیا ہوں کہ تم عشق کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دیتی ہو جنسی تعلقات کے علاوہ اس میں کچھ بھی نہیں اور باقی جو کچھ محبت کے بارے میں لوگ کہتے ہیں وہ سب اصلیت کو چھپانے کے لیے شاعری کے پردے ہیں۔ چونکہ ہم ہندوستانیوں میں تم مغرب کے وحشیوں کے مقابلے میں روحانیت زیادہ ہوتی ہے اس لیے ہم ہر چیز کی اصلیت کو تم سے بہتر سمجھتے ہیں اور حقیقت کے راستے پر تم سے زیادہ آسانی کے ساتھ پہنچ سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مرد اور عورت کے باہمی تعلقات کی جڑ تک پہنچ کر ہماری سوسائٹی نے اس کو مضبوطی سے تھام لیا ہے۔ ہم نے اپنے گھروں سے عشق و محبت کو کوڑے کی طرح نکال کر پھینک دیا ہے۔" (۳)

راؤ کا کردار عالمگیریت کی پیداوار ہے۔ راؤ وہ ہندو راجپوت نوجوان ہے جو بیرسٹری کی تعلیم حاصل کرنے انگلینڈ آیا ہے۔ وہ نوآبادکاری کے بیانیوں سے واقف ہے اس کے ساتھ ساتھ وہ نوآبادکار کی حکمت عملی اور اپنے ہم وطنوں کی کمزوریوں سے بھی آگاہ ہے۔ وہ وطن کی ترقی کے لیے کوشاں لوگوں پر بھی تنقید کی جرات رکھتا ہے۔

"وطن کی بھلائی کے لیے کوشاں؟ ذرا مجھے بتائیے تو سہی راؤ نے تیزی سے پوچھا' کسی کو یہ تک معلوم نہیں کہ وطن کی بھلائی ہے کس چڑیا کا نام۔' اس کے لیے کوشاں ہونا تو درکنار زنانہ بن کر چرخا کاتنے میں وطن کی بھلائی ہے...... ہر شخص پکار پکار کر کہتا ہے وطن کی بھلائی کے لیے کام کر رہا ہے۔ حد ہو گئی، ان کی دیکھا دیکھی انگریزی گورنمنٹ تک کہنے لگی کہ وہ بھی

---

(۱) سجاد ظہیر، *لندن کی ایک رات*، (اسلام آباد: الحمد پبلشنگ، ۲۰۰۱ء) ص ۱۶

(۲) ساجدہ زیدی، لندن کی ایک رات مشمولہ *سجاد ظہیر ادبی خدمات اور ترقی پسند تحریک* مرتبہ گوپی چند نارنگ، (نئی دہلی، ساہیہ اکادمی، ۲۰۰۷ء)، ص ۵۱

(۳) سجاد ظہیر، *لندن کی ایک رات*، ص ۹۶

ہندوستان کی بھلائی چاہتی ہے اور ملک کی حالت کیا ہے ایک طرف تو غربت اور بھوک کا سایہ ملک پر پھیلتا جارہا ہے دوسری طرف ظلم و جبر کا جال چاروں طرف سے ہم کو جکڑتا جارہا ہے۔"[۱]

اس ناول کا ایک کردار نعیم ہے جو مہذب، شریف النفس، فراخ دل، سست اور کاہل انسان ہے۔ خیالوں کی دنیا میں رہتا ہے۔ عملی قدم اٹھانے کی جرات نہیں رکھتا۔ اس کے اپنے کمرے میں محفل جمی ہے لیکن اس میں اس کی شرکت برائے نام ہے۔ وہ میزبان ہے لیکن ناول میں زیادہ اہم کردار کا حامل نہیں۔

راؤ کے کردار کے برعکس ایک کردار عارف کا ہے وہ سطحی ذہنیت کا حامل ہے۔ جس کی زندگی کا واحد مقصد ہندوستانی سول سروس میں ملازمت حاصل کرکے اپنے ہم وطنوں پر حکومت کرنا ہے۔ اس کے ہر انداز میں اقتدار پرستی اور خود پرستی کی خو بو ہے۔ ہندوستان میں برسر اقتدار طبقے کا رکن بننے کے لیے وہ سول سروس کی راہ اختیار کرتا ہے اور سول سروس کے امتحان میں کامیابی کے لئے ہمہ وقت کوشاں ہے۔ تفریحات میں شرکت بھی اسے تضیع اوقات معلوم ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ گوری میم کو دیکھ کر ریشہ خطمی ہو جاتا ہے اور اپنی خوش لباسی سے اسے متاثر کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن رستے میں جب وہ اپنی بس پر بیٹھ کر اسے کچھ کہے بغیر چھوڑ جاتی ہے تو پشیمانی، غصے اور بے بسی سے اس کے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔

ایک غیر اہم کردار خان صاحب کا ہے جو نشے میں دھت ہے۔ لڑکھڑاتی زبان، تلفظ عجیب انگریزوں اور پروفیشنل طلبہ کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے لیکن خود انگریز لڑکی کو پٹانے کی فکر میں ہے۔ ایک جوشیلا اور انقلابی کردار احسان کا ہے جو بظاہر کمیونسٹ ہے۔ دوسرے لڑکوں کی گفتگو سن کر کہتا ہے کہ تم سب کے سب رئیس بنئے مہاجن بیرسٹر وکیل ڈاکٹر پروفیسر سرکاری نوکر جونک کی طرح ہو ہندوستان کے مزدور اور کسانوں کا خون پی کر زندہ رہتے ہو۔ ایسی حالت قیامت تک نہیں رہے گی۔ کسی نہ کسی دن تو ہندوستان کے لاکھوں کروڑوں مصیبت زدہ انسان خواب سے چونکیں گے بس اسی دن تم سب کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو جائے گا۔

اس کے جواب میں خان صاحب جھنجھلا کر پوچھا یہ بالشویک یہاں کہاں سے آ گیا۔

جناب احسان صاحب، آپ خود کیا کرتے ہیں جو اوروں پر اس طرح اعتراض کر رہے ہیں۔ آپ کے جو ہر مہینہ گھر سے بیس پاؤنڈ آتے ہیں وہ آپ کے والد کے پاس آسمان سے تو نہیں ٹپکتے۔ جہاں تک مجھے علم ہے وہ بھی سرکاری ملازم ہیں ان کو جو تنخواہ ملتی ہے وہ آپ ہی کے قول کے مطابق ہندوستانی مزدوروں اور کسانوں کا خون ہے۔[۲]

---

(۱) حمیرا عشان، *نوآبادیاتی عہد کے اردو ناول کا مطالعہ*، مابعد نوآبادیاتی تنقید کی روشنی میں، (لاہور: شعبہ اردو اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی، ۲۰۱۶ء)، ص ۲۳۲

(۲) سجاد ظہیر، *لندن کی ایک رات*، ص ۸۲

احسان کا کردار بھی اسی مخلوطیت کا حامل ہے۔ جس کی جانب حمیرا اشفاق نے اپنے مقالے میں اشارہ کیا ہے۔ یہ کردار بھی عمل سے عاری محض گفتار کا غازی ہے۔ جسے اپنے اہل وطن کی دکھوں تکلیفوں سے آگاہی حاصل ہے اور ان کے لیے ہمدردی کا اظہار بھی کرتا ہے لیکن عملاً وہ بھی اسی طبقے کا ایک رکن ہے جس کی گذراوقات دوسرے طبقے کے استحصال پر ہے۔

ناول کا ایک اور کردار بنگالی نوجوان ہیرن پال ہے اور یہ ایسا کردار ہے جو سارے ناول میں کہیں موجود نہیں صرف شیلا کی یادوں اور باتوں میں اپنا وجود رکھتا ہے۔ شیلا ایک انگریز لڑکی ہے جسے ایک بنگالی نوجوان ہیرن سے محبت ہو جاتی ہے۔ ہندوستان کے متعلق ایک عمومی تصور کے مطابق شیلا بھی ہندوستان کو پراسرار اور امیر لوگوں کا ملک سمجھتی ہے۔ لیکن انگریزوں کی لکھی ہوئی تواریخ سے اس کا ذہن تبدیل ہو جاتا ہے اور وہ ہندوستان کو کالے لوگوں کا ملک سمجھنے لگتی ہے اور سیاہ فام لوگوں سے اسے خوف محسوس ہوتا ہے۔ وہ کہتی ہے:

> "میں بچپن میں ہندوستان کو ایک پرستان سمجھتی تھی جہاں خوبصورت شہزادے اور حسین سانولی عورتیں زروجواہر میں لدے سنگ مرمر کے بڑے بڑے محلوں میں عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ جب میں بڑی ہوئی اور میں نے سکول جانا شروع کیا اور وہاں میں نے تاریخ پڑھی تو میرے بچپن کے تصورات رفتہ رفتہ بدلنے لگے سراج الدولہ اور بلیک ہول کے قصے پڑھ کر اور ہندوستانیوں اور کالے آدمیوں کی برائیاں سن سن کر میرے دل میں ہر سیاہ فام انسان کی طرف سے کچھ خوف بیٹھ گیا۔۔ میرے والدین ہمیشہ مجھ سے تاکید کرتے تھے کہ کالے لوگوں سے بچتی رہوں۔۔۔" (۱)

لیکن پھر شیلا کی ملاقات ہیرن پال سے ہوئی تو یہ باشعور ہندوستانی نوجوان اس انگریز عورت کی محبت کو محسوس کرتا ہے لیکن اس کا اصل مقصد ہندوستان کی آزادی اسے اپنی جانب بلاتا ہے وہ اپنے سماج میں تبدیلی کے لیے عملی طور پر تیار ہے لیکن وطن واپسی کے صرف چھ ماہ بعد کی لاپتہ ہو جاتا ہے۔ جیل میں ہے یا مر گیا شیلا اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ یہ صورتحال دوستوں کے لیے غیر یقینی ہے شیلا اس سے شدید محبت کرتی ہے۔ یہ کردار ناول کے سارے منظر سے غائب ہی رہتا ہے۔

نسوانی کرداروں میں جین کا کردار ہے جس سے اعظم محبت کرتا ہے۔ اس کے علاوہ شیلا کا کردار اور کریمہ ایک ہندوستانی لڑکی کا کردار ہے۔ یہ خاصا مضحکہ خیز کردار ہے۔ یہ لڑکی بغرض تعلیم لندن میں مقیم ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکی ہے لیکن یہ کردار بھی سطحی ذہنیت کا حامل ہے۔ یہ شیلا کی طرف مردوں کی توجہ دیکھ کر سوچتی ہے۔ "ان ہندوستانی لڑکوں کو آخر کیا ہو گیا ہے گورا چڑا دیکھ کر انہیں اپنے اوپر بالکل قابو نہیں رہتا۔ سوا سفید چمڑے کے اور اس فرنگن میں کیا ہے؟ کیا کیا بن کر باتیں کرتی ہے۔ دیدہ دلیری سے آنکھوں

(۱) سجاد ظہیر، لندن کی ایک رات، ص ۶۵

میں آنکھیں ڈال کر، چست کپڑے صرف اس لیے پہنتے ہیں کہ مرد اس کے جسم کی بہار دیکھیں۔ بے شرم، بے غیرت، بے حیا ایسی عورتوں میں اور زنان بازاری میں کیا فرق ہے؟ چڑیل کی طرح بال بکھرے ہوئے، منہ پر پاؤڈر لگا ہوا، لہنگے میں سے گز گز بھر کی ٹانگیں باہر نکلیں۔ جرابیں ریشمی، اتنی باریک کہ ان کا ہونا نہ ہونا برابر، کھڑی ہوں تو اکڑ کر، چلیں تو سینہ تان کر، سگریٹ یہ پئیں، ناچیں یہ، رہ گئی عصمت آبرو، اسے تو یہ ہتھیلی پر لیے پھرتی ہیں۔ آج اس مرد پر ڈورا ڈالا تو کل دوسرے کو پھانسنے کی فکر۔" (۱)

کریمہ بیگم کی سوچ تقریباً دو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے لیکن حیرت ہوتی ہے کہ یہ ایک ایسی لڑکی کی سوچ ہے تو اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے اور تعلیم کے لیے گھر بار سے بہت دور لندن میں موجود ہے۔ ایک طرف اسے مغربی تہذیب کی یہ برائیاں شیلا میں نظر آ رہی ہیں تو دوسری طرف رات کے وقت وہ مردوں کی اس ناؤنوش کی محفل میں شریک ہے۔ اس کردار کو ایک جاہل اور تنگ نظر عورت کا پروٹوٹائپ کہا جا سکتا ہے۔ یا مصنف کا مشرقی عورتوں کے حوالے سے عمومی تصور ایسا ہے کہ اسے مشرق کی عورت اسے ایسی سطحی تنگ نظر اور جاہل نظر آتی ہے کہ اس نے کریمہ ایسا کردار تخلیق کیا ہے۔

ان مختلف کرداروں اور ان کی کہانیوں کا پھیلاؤ ہی ناول کا پلاٹ ہے۔ نعیم کے گھر اس کے سبھی دوست اکٹھے ہیں۔ ان کے درمیان خوب بحث و مباحثہ جاری ہے وہ شراب پی کر ناچتے ہیں غل مچاتے ہیں۔ اس کے بعد ان کے مکان کی مالکہ مداخلت کرتی ہے اور انہیں شور شرابے سے روکتی ہے کہ پورا محلہ ان کی وجہ سے تنگ ہو رہا ہے۔

سجاد ظہیر کے اس ناول میں ان کی اشتراکی فکر کے ساتھ ہندوستان کے حالات کا ایک خاکہ بھی ملتا ہے اس ناول کے کردار زیادہ تر ہندوستان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کرداروں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے ان میں سے عارف کا کردار ایسا ہے جو اعلیٰ تعلیم محض اس لیے حاصل کر رہا ہے کہ اپنے ملک پر قابض قوت یعنی استعماری نظام کا ایک حصہ بن سکے۔ اپنے لوگوں یعنی مقامی لوگوں پر حکومت کر سکے۔ راؤ کا کردار ایسا ہے جو استعماری قوت اور اس کے ہتھکنڈوں سے اچھی طرح واقف ہے۔ نطشے نے علم کو طاقت قرار دیا (knowledge is power) جبکہ ایڈورڈ سعید نے اسے (knowledge is colonization) میں بدل کر اسے استعمار پسندانہ نظام کو فروغ دینے والی حکمت عملی سے تعبیر کیا ہے۔ ایڈورڈ سعید کی اس ترمیم کو موجودہ تناظر میں knowledge is globalization کہا جا سکتا ہے کیونکہ اگر ہم نو آبادیات کو عالمگیریت کی ایک قدیم شکل کہتے ہیں تو موجودہ دور میں علم ہی عالمگیریت ہے۔ البرٹ میمی نے اپنی کتاب The colonizer and colonized (1965) میں یہ خیال پیش کیا ہے کہ یہ تصور ہی بے بنیاد ہے کہ نو آبادکار نئی کالونیوں کے لیے کوئی تہذیبی یا اخلاقی مشن لے کر آئے تھے۔ ان کا مقصد صرف اور صرف ایک ہے اور وہ ہے اقتصادی۔ آج عالمگیریت کے اصل ایجنڈے پر غور کیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ عالمگیریت کی سرپرست قوتیں بھی معاشی مقاصد کے حصول کے لیے تمام تر تنگ و دو ہر جائز اور ناجائز طریقے سے کر رہی ہیں۔ راؤ کے کردار میں غصہ اور طیش بھرا ہوا ہے اس کے پس پردہ اس کا یہی شعور کار فرما ہے جو ایک طرف سے

---

(۱) سجاد ظہیر، *لندن کی ایک رات*، ص ۶۷، ۶۸

اپنے اہل وطن کی ناعاقبت اندیشی، ان کی کاہلی، آپس کی نااتفاقی کی آگاہی دیتا ہے تو دوسری طرف برسرِاقتدار استعماری طاقت کے ہتھکنڈوں کے متعلق آگاہ کرتا ہے۔ وہ ان کی اس نفرت سے بھی واقف ہے جس کے تحت وہ مقامی لوگوں کے لیے نسلی امتیاز پر مبنی القاب "کالے لوگ" نیگرو، نیٹو استعمال کرتے ہیں اور ہندوستانیوں کو جانوروں سے بھی کمتر سمجھتا ہے۔ فرانز فینن اپنی کتاب (Black skins and White Masks 1967) میں بتاتے ہیں۔ نو آبادکار مقامی کلچر کی خلقیت کو موت کے گھاٹ اتارنے اور اسے زمینوں کے اندر دفنانے کے باعث ہی ان میں احساس کمتری بھی پیدا ہوئی ہے۔ اس طرح ان کی حیثیت محض ایک بے جان چیز یا معدوم ہستی کی ہو کر رہ گئی ہے۔ فینن کا یہ بھی خیال ہے کہ نو آبادکار نیٹوز کے بارے میں مستقلاً حیوانیاتی اصطلاحات Zoological Terms میں گفتگو کرتے تھے۔ جنھیں نہ تو اخلاق کی تمیز ہے نہ قدروں کا احساس۔[1]

آج عالمگیریت کے ساتھ بھی یہی مقصد وابستہ ہے کہ مقامی کلچر کو ختم کر دیا جائے۔ ایک یونی کلچر دنیا کی تخلیق۔ امریکی کلچر اور اس کے ساتھ ساتھ کچھ اور غالب معاشی قوتوں کے کلچر کو ملا کر ایک ایسی دنیا کی تخلیق جس میں مقامی ثقافتوں کے لیے کوئی جگہ نہیں ہو گی۔ مقامی کلچر احساس کمتری کی علامت جبکہ یہ عالمی کلچر ترقی یافتہ اور تہذیب یافتہ ہونے کی سند۔ یہی ایجنڈا نو آبادکاروں کا تھا اور یہی ایجنڈا آج کی عالمگیریت کا ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ سجاد ظہیر کچھ انگریز مزدوروں کے مکالمات بھی درج کرتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے۔ انگلستان میں بھی انگریز مزدور طبقہ حاشیہ نشین تھا۔ اور میڈیا ان کے مسائل کی عکاسی کی بجائے پاور کی آئیڈیالوجی کے مطابق اپنی راہ کا تعین کرتا ہے۔ انگلستان کے مزدور اپنی حکومت کی استعمار پسندانہ پالیسیوں سے آگاہ تھے اور جانتے تھے کہ کس طرح وہ ہندوستانیوں کا استحصال کر رہے ہیں۔

راؤ کے لہجے میں تلخی انہیں حالات کے ادراک کی دین ہے۔ وہ کہتا ہے۔

> "یہ دنیا بھر میں گولیاں چلا کر اور آسمان سے بم برسا کر تہذیب پھیلانا اور امن قائم رکھنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔"[2]

دونوں مزدوروں میں سے ایک اس غلط فہمی کا شکار ہے کہ اگر انگریز ملک چھوڑ کر چلے گئے تو ہندو اور مسلمانوں میں لڑائی ہو جائے گی کہ یہ دونوں ایک دوسرے کے جانی دشمن ہیں۔ "اگر ہم اس ملک کو چھوڑ کر چلے گئے تو ہندوستان میں بہت خون خرابے کا ڈر ہے۔"[3]

سجاد ظہیر جلیانوالہ باغ کے سانحے کا ذکر راؤ کے خواب کے طور پر کر کے نو آبادکاروں کے ظلم و ستم اور جبر دستیوں کو سامنے لائے ہیں۔

---

(۱) عتیق اللہ، لندن کی ایک رات: ایک نو آبادیاتی مطالعہ، مشمولہ *سجاد ظہیر، ادبی خدمات اور ترقی پسند تحریک* مرتبہ گوپی چند نارنگ (نئی دہلی: ساہتیہ اکادمی، ۲۰۰۷ء) ص ۷۷۔۷۸

(۲) سجاد ظہیر، *لندن کی ایک رات*، ص ۲۶

(۳) حوالہ بالا، ص ۲۸

# ٹیڑھی لکیر

عصمت چغتائی جن کا اصل نام عصمت چغتائی خانم ہے اگست ۱۹۱۵ء میں بدایوں میں پیدا ہوئیں گویا جس وقت عصمت چغتائی نے ہوش سنبھالا ان کے سامنے غلام ہندوستان تھا۔ ان کے والد مرزا تسنیم بیگ چغتائی علی گڑھ کے گریجویٹ تھے لکھنے پڑھنے کا شوق عصمت کو اپنے مورث اعلیٰ چغتائی خان سے ورثے میں ملا تھا۔

عصمت چغتائی کے ناولوں میں ضدی، معصومہ، سودائی، ٹیڑھی لکیر اور عجیب آدمی، کاغذی ہے پیرہن، جنگلی کبوتر شامل ہیں۔ فنی محاسن کے لحاظ سے **ٹیڑھی لکیر** عصمت چغتائی کا شاہکار ناول ہے۔ اور اردو ناول نگاری کی تاریخ میں بھی اہم مقام کا حامل ہے۔ ٹیڑھی لکیر کا کبیری کردار شمن ہے۔ شمن اپنے والدین کی دسویں اولاد تھی۔ اس کا گھرانہ متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والا ایک آسودہ حال گھرانہ ہے۔ دسویں اولاد ہونے کے ناطے وہ والدین کی عدم توجہی کا شکار ہے۔ ظاہری بات ہے کہ جب وہ پیدا ہوئی تو اس کی ماں کے اندر سے مزید بچوں کی خواہش ختم ہو چکی تھی۔ ناول کے آغاز سے اس ناقدری کا پتہ چلتا ہے جو شمن کے حصے میں آئی۔

"وہ پیدا ہی بہت بے موقع ہوئی۔ بڑی آپا کی چہیتی سہیلی سلمہ کی شادی تھی۔ اور وہ بیٹھی جھپا جھپ سردئی کریپ کے دوپٹہ پر لچکا ٹانک رہی تھی۔ اماں اتنے بچے جننے کے بھی ننھی ہی بنی ہوئی تھیں۔ بیٹھی جھانوے سے ایڑیوں کی مردہ کھال گھِس گھِس کر اتار رہی تھیں کہ ایکا ایکی گھٹا جھوم کر گھر آئی اور وہ دہائی ڈالی کہ میم کو بلانے کا ارمان دل کا دل ہی میں رہا اور وہ آن دھمکی... نو بچوں کے بعد ایک کا اضافہ جیسے گھڑی کی سوئی ایک دم آگے بڑھ گئی اور دس بج گئے۔ کیسی شادی اور کس کا بیاہ حکم ملا ننھی سی بہن کے نہلانے کے لیے پانی تیار کرو۔ پانی سے زیادہ کھولتے آنسو بہاتے، آپا نے کوستے ہوئے چولھے پر پتیلی چڑھا دی۔ پانی بھی مذاق میں ذرا سا چھلک گیا اور سارا ہاتھ ابل کر رہ گیا۔ 'خدا غارت کرے اس منی سی بہن کو... اماں کی کوکھ کیوں نہیں بند ہو جاتی۔'" (۱)

بڑی آپا کی یہ ناپسندیدگی عمر بھر قائم رہی۔ خیر آگرے سے شمن کے لیے انا بلائی جاتی ہے۔ لیکن انا اپنے عاشق کے ساتھ ایک روز رنگے ہاتھوں پکڑی جاتی ہے تو اسے واپس بھیج دیا جاتا ہے۔ شمن کی ذمہ داری منجھو سنبھال لیتی ہے۔ منجھو نے جہاں شمن کی صفائی ستھرائی کا خیال رکھا اسے پالا پوسا وہاں معمولی لغزشوں پر بڑی بے رحمی سے مارا پیٹا بھی۔ یوں شمن منجھو جی کی سختی کے نتیجے میں ضدی اور ہٹ دھرم ہو گئی۔ منجھو چونکہ ماں نہ تھی اس لیے ماما دینا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ محبت سے اس محرومی نے شمن کی شخصیت میں نفسیاتی کجی پیدا کر دی۔

ضد کے ساتھ ساتھ اس کے مزاج میں جارحیت بھی شامل ہو گئی۔ سب اسے بھتنی کہتے تو وہ خونخوار بلی کی طرح انہیں نوچتی۔ تصور میں منجھو بی کو اسی طرح گھِس گھِس کر نہلاتی اور تصور ہی تصور میں اس کی ٹھیک اسی طرح پٹائی کرتی جیسے وہ شمن کی کرتی تھی۔

---

(۱) عصمت چغتائی، ٹیڑھی لکیر، (لاہور: مکتبہ اردو، ۱۹۴۹ء) ص ۹

ثمن کی پڑھائی شروع کرنے کا وقت آیا تو منجھو بی اسے الف سے انار کہنے کو کہتی ہے تو ثمن نے انکار کر دیا کہ الف تو لمبا ہے جب کہ انار گول۔ اس لیے الف سے انار نہیں ہو سکتا۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ثمن ایک ذہین بچی تھی جو بلا سوچے سمجھے کسی بھی بات کو قبول نہیں کرتی۔

پھر منجھو بی کی شادی کی گھڑی آ گئی اور ثمن کا کوئی پرسان حال نہ رہا تھا۔ وہ بے نتھے بیل کی طرح بے مقصد ادھر اُدھر گھومتی پھرتی ہے اور اپنے نظر انداز کیے جانے کا بدلہ وہ جہیز کے جوڑوں کو نوٹ کھسوٹ کے غسل خانوں کے مٹکوں میں شکر گھول کے اور کھانوں میں نمک ڈال کر لیتی ہے۔

منجھو بی کے سسرال جانے کے بعد وہ اسے بہت یاد کرتی اور اس کے شوہر کے مرنے کی دعائیں مانگتی ہے لیکن منجھو بی کی بجائے بڑی آپا بیوہ ہو کر میکے آ بیٹھتی ہے تو ثمن کی مشکلات میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ وہ ہر بات میں اپنی بیٹی نوری کا مقابلہ ثمن سے کرتی ہے اور اسے کمتر ثابت کرتی ہے اس کے ساتھ ساتھ وہ بلاوجہ ڈانٹ ڈپٹ سے ثمن کی زندگی اجیرن بنائے رکھتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ثمن احساس کمتری کا شکار ہو جاتی ہے۔

کچھ عرصہ کے لیے ثمن کو منجھولی کی سسرال بھیج دیا گیا۔ وہاں نہ تو اسے منجھولی کا گھر پسند آیا نہ ہی اس کی بڑھیا ساس اور اس کا پوتا کدن۔ جلد ہی دل برداشتہ ہو کر ثمن واپس اپنے گھر لوٹ آئی لیکن پھر اسے سکول داخل کرا دیا گیا۔ نوری اور ثمن کی آپس میں مصالحت ہو گئی اور دونوں مل کر مسجد کے ملاجی کی عجیب و غریب حرکتیں دیکھتی ہیں۔ سکول میں اس کی ٹیچر مس خیرن سے ملاقات ہو گئی۔ مس خیرن بھی شرارتی لڑکی کے اندر چھپی ذہین لڑکی کو تلاش کر لیتی ہے تو ثمن ان پر فریفتہ ہو جاتی ہے اور وہ مس خیرن کو اپنے آس پاس چلتا پھرتا پاتی ہے۔ رات میں سوتے میں اٹھ کر خود کو ان کے کمرے کے باہر کھڑا پاتی ہے لیکن جلد ہی مس خیرن کو لڑکیوں کا اخلاق بگاڑنے کے جرم میں ملازمت سے سبکدوش کر دیا گیا لیکن مس خیرن کی قربت نفسیاتی حوالے سے ثمن کے لیے اہم رہی۔

بلوغ کی عمر میں رونما ہونے والی جسمانی تبدیلیوں نے اس کے احساس کمتری میں اضافہ کر دیا۔ سکول ہاسٹل میں رسول فاطمہ ثمن کی روم میٹ ہے لیکن وہ ہم جنسیت کا شکار ہے۔ اس سے بچنے کے لیے ثمن سعادت کے کمرے میں منتقل ہو گئی لیکن سعادت نجمہ پر مرتی ہے یوں ہم جنسیت کی لت میں اکثر لڑکیاں مبتلا ہیں۔ خود ثمن بھی نجمہ پہ مرتی ہے۔

سعادت خرابی صحت کی بنا پر پہاڑ پر چلی گئی تو بلقیس ثمن کی نئی دوست بنتی ہے بلقیس کی بڑی بہن سکول کی پرنسپل بن کر آ گئی۔ بلقیس اپنی چار بہنوں کے ساتھ سکول کے احاطے میں پرنسپل کی رہائش گاہ میں رہائش پذیر ہے۔ یہاں ثمن کی سوچ میں بلقیس کی وجہ سے تبدیلی آتی ہے جو اسے بتاتی ہے کہ لڑکی کو لڑکے پر مرنا چاہیے اور اپنے عاشقوں کے متعلق بتاتی ہے۔ بلقیس ثمن کا رابطہ اپنے بھائی رشید سے کرواتی ہے۔ رشید اور ثمن کا عشق تیزی سے پروان چڑھنے لگتا ہے اور بلقیس قاصد کا کردار ادا کرتی ہے۔ لیکن پھر درمیان میں

ایک امیر زادی نسیمہ حائل ہو جاتی ہے اور رشید کا رجحان نسیمہ کی طرف ہو جاتا ہے۔ رشید اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلینڈ چلا جاتا ہے اور ثمن کا پہلا عشق ناکام ہو جاتا ہے۔

گذرتے وقت کے ساتھ ساتھ بڑی آپا میں بھی کئی تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ انہیں اپنے دیور ڈاکٹر رشید کی آمد سے بیماری میں افاقہ معلوم ہوتا ہے لیکن دراصل اس بیماری کے پس پردہ وہ ڈاکٹر رشید سے قریب ہو جاتی ہے لیکن ڈاکٹر رشید کا ایک محبت نامہ پکڑ جاتا ہے تو ڈاکٹر کی گھر آمد سے ممانعت ہو جاتی ہے۔ سماجی دباؤ کی وجہ سے کسی مرد سے آپا کا رابطہ ممکن نہیں تو اب ان کی دوستی مونچھوں والی بیگم سے ہو جاتی ہے۔ یعنی ہم جنسیت کا رشتہ استوار ہو جاتا ہے۔ انہی دنوں ثمن کا خالہ زاد بھائی اجو یعنی اعجاز ان کے ہاں رہنے آجاتا ہے جو بدوضع اور کم عقل ہونے کے ساتھ ساتھ ازلی بھوکا ہے یہاں تک کہ جوٹھا کھانا بھی اسی شوق سے کھاتا ہے اور گھر کا کام مستعدی سے کرتا ہے۔ اس کی شادی ثمن سے طے ہوتی ہے تو وہ بڑے بھونڈے انداز میں ثمن سے محبت کا اظہار کرتا ہے جسے ثمن ناپسند کرتی ہے۔ اجو کے بعد ثمن کا ایک چچازاد عباس وارد ہوتا ہے جو انگلینڈ سے انجینئرنگ کی ڈگری لے کر آیا ہے اور اپنے والدین کے لیے وجۂ افتخار ہے۔ ثمن کے گھرانے میں تمام مائیں اپنی اپنی بیٹیوں کے لیے عباس کو پسند کرتی ہیں اور اسی لالچ میں عباس اور اس کے والدین کی خوب خاطر مدارت کی جاتی ہے۔ عباس سبھی جوان لڑکیوں سے چھیڑ چھاڑ کر کے ان کی توقعات ابھار کے اور ان کے جذبات سے کھیل کر رخصت ہوتا ہے اور اس کے والدین سبھی کو اس کی شادی کا نیوتا دے کر مایوس کر کے چلے جاتے ہیں۔

اس کے بعد ثمن میں زندگی میں رائے صاحب آتے ہیں۔ رائے صاحب ثمن کی دوست پریما کے والد ہیں لیکن اپنی بیٹی سے دوستانہ اور بے تکلفی کا رویہ رکھتے ہیں۔ ثمن کو بھی وہ اپنی بیٹی سمجھ کر اس سے ویسا ہی دوستانہ برتاؤ کرتے ہیں لیکن ثمن ان کی بے تکلفی سے غلط فہمی کا شکار ہو جاتی ہے اور ان سے اظہار محبت کر بیٹھتی ہے لیکن پریما کو پتہ چلنے پر خفت کا شکار ہو جاتی ہے۔ جلد ہی رائے صاحب کا انتقال ہو جاتا ہے ثمن بھی بیماری کا شکار ہو کر چڑچڑی ہو جاتی ہے۔ انہی دنوں اعجاز عرف اجو کا ورود ہوتا ہے لیکن اب وہ پرانا اجو نہیں ہے بلکہ ایک پڑھا لکھا، خوبرو اور اعتماد سے بھرپور نوجوان ہے۔ ثمن کا گھرانہ حسب روایت اپنی اپنی بیٹیوں کے لیے اعجاز کو پھنسانے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ ثمن کی دوست بلقیس کو پسند کر کے ثمن سے مدد مانگتا ہے۔ ثمن اپنی ہتک محسوس کرتے ہوئے اسے صاف انکار کر دیتی ہے۔

کالج میں ثمن کی دوست ایلما ہے جو سماج کے مروجہ قواعد وضوابط اور روحانی اقدار کی منحرف ہے۔ لڑکیوں سے زیادہ اسے مردوں کی صحبت پسند ہے۔ ایلما کے توسط ثمن کی ملاقات افتخار اور سیتل سے ہوتی ہے۔ اور ثمن ایک بار پھر محبت میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ اب کی بار افتخار ہے جس سے وہ متاثر ہوئی ہے لیکن افتخار ثمن کا استعمال کرتا ہے اس سے رقم بٹورتا رہتا ہے اس سلسلے کا اختتام حسین بی بی جو افتخار کی بیوی ہے کی ثمن سے ملاقات کے نتیجے میں ہوتا ہے۔

اسی دوران نوری بیاہ کر سسرال چلی جاتی ہے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد ثمن ایک قومی سکول کی ذمہ داری قبول کر لیتی ہے لیکن سکول کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ سکول کی نوکری کی یکسانیت سے اکتا کر ثمن کچھ روز کی چھٹی لے کر گھر کی طرف چل پڑتی ہے۔ رستے میں ایک بچے سے اس کی ملاقات ہوتی ہے جو اپنی حرکتوں اور باتوں سے ثمن کی توجہ اپنی جانب کھینچ لیتا ہے۔ اس کی ماں سے مل کر ثمن کو پتہ چلتا ہے کہ یہ تو اس کی دوست ایلما ہے جو سیتل کے بچے کی ماں ناچاہتے ہوئے بھی بن چکی ہے۔ اور اب اپنی نفرت کا نشانہ اپنے بچے کو بنا رہی ہے۔ ثمن ماں بیٹے کے درمیان خلیج کو دور کر کے صلح کروا دیتی ہے۔ سکول واپس آ کر ثمن اپنی زندگی میں خلا محسوس کرتے ہوئے کلب جوائن کر لیتی ہے وہیں اس کی ملاقات ایک رئیس منظور صاحب سے ہوتی ہے جو ملک و قوم کی خدمت کا جذبہ رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ پروفیسر رحمان، کامریڈ اور انقلابی شاعر کے ساتھ اپنے اندر کے خلا کو پر کرنے کے لیے وقت گذارتی ہے لیکن جلد اکتا کر سب کو جھٹک دیتی ہے پھر اپنے خاندان سے کوئی بچہ گود لینے کی کوشش کرتی ہے اور منجھو کی بیٹی اس نے گود لے لی لیکن جلد وہ بچی مر جاتی ہے۔

دوبارہ ثمن ایلما کے پاس چلی گئی وہیں اس کی ملاقات رونی ٹیلر سے ہوتی ہے جو فوج میں افسر ہے۔ ثمن کو سفید فام لوگوں سے فطرتاً نفرت ہے لیکن رونی ٹیلر کی محبت سے مجبور ہو کر اس سے شادی کر لیتی ہے۔ لیکن ان کی یہ شادی نہ تو ثمن کے ہندوستانی سماج کو قبول تھی اور نہ ہی رونی ٹیلر کی سفید فام کمیونٹی کو۔ جس کے نتیجے میں دونوں ایک دوسرے سے بیزار ہونے لگے۔ دونوں کے بیچ کی محبت کو نفرت کی آگ جلا کر خاکستر کر دیتی ہے۔ آئے روز کے جھگڑوں سے تنگ آ کر رونی ٹیلر محاذ جنگ پر چلا جاتا ہے۔ ثمن بھی تنہا رہ جاتی ہے مگر تبھی اسے ڈاکٹر سے اپنے ماں بننے کی نوید ملتی ہے تو وہ پر امید ہو جاتی ہے اور اسی کے ساتھ ناول اختتام پذیر ہو جاتا ہے۔

عصمت کا یہ ناول ایک کرداری ناول ہے۔ کبیری کردار ثمن کا ہے اس کی شخصیت کی تعمیر جن عناصر سے ہوئی اس کی زندگی جن نشیب و فراز سے گذری ناول کا موضوع وہی عناصر اور وہی نشیب و فراز ہیں۔ ناول میں اگرچہ اور بہت سے کردار ہیں لیکن یہ تمام کردار ثمن کے کردار کے ارتقا اور کہانی کو بڑھانے میں معاون کی حیثیت رکھتے ہیں۔

عصمت چغتائی نے یہ ناول سیدھے سادھے قصے کے انداز میں پیش کیا گیا اور ناول کی ہیئت میں مغربی ناولوں کے زیر اثر جو تجربات ہو رہے تھے وہ ٹیڑھی لکیر میں نظر نہیں آتے۔ لہٰذا اس میں فلیش بیک کی تکنیک نہیں اپنائی گئی یعنی ناول کا آغاز ثمن کی پیدائش سے ہوتا ہے اور اس کے بچپن اور جوانی سے گذرتا اور اس کی زندگی کے واقعات، سانحات اور نشیب و فراز کا احاطہ کرتا ایک اہم اور نازک موڑ پر جا کر اختتام پذیر ہو جاتا ہے۔

تکنیک کی حد تک نہیں لیکن موضوع کے اعتبار سے عالمگیریت کے اثرات عصمت کے ہاں ملتے ہیں۔ اس حوالے سے ڈاکٹر محمد عظیم اللہ لکھتے ہیں:

> ”عصمت چغتائی کی بے باک تحریر، ژرف بینی اور حقیقت پسندی اچانک منظر عام پر نہیں آئی۔ ٹیڑھی لکیر کی تخلیق کے زبانی پس منظر میں معاشرتی واقعات کی تیز رفتار تبدیلیوں کا ایک طویل سلسلہ ہے جس نے انسانی زندگی کو نئے انداز فکر اور جدید طرز احساس سے آشنا کیا۔“(۱)

یہ جدید انداز اور نیا طرز احساس خلا میں پیدا نہیں ہوا تھا بلکہ اس کے پیچھے یورپ میں جنم لینے والے صنعتی انقلاب کے نتیجے میں رونما ہونے والی سائنسی انکشافات اور ایجادات کا ایک طویل سلسلہ تھا۔ انسان نے عناصر فطرت پر غلبہ پا کر زندگی کو قریب سے دیکھا تو اس پر سوچ اور فکر کے نئے در وا ہوئے۔ جمہوریت اور مساوات کی آواز بلند ہونے کے ساتھ ساتھ سرمایہ اور محنت کے درمیان کشید گی بڑھ گئی جو اس مہاجنی نظام میں مزور کے استحصال کی وجہ پیدا ہوئی تھی، جس نے صنعتی انقلاب کے نتیجے میں جنم لیا تھا۔ یہی مہاجنی نظام عالمگیریت کی اصل روح ہے۔ سائنسی ایجادات کے ساتھ ساتھ فلسفے میں بھی پیشرفت ہوئی۔ بیسویں صدی میں جہاں ایک طرف آئن سٹائن جیسے سائنسدان نے جنم لیا وہیں کارل مارکس نے انسان کے معاشی مسائل اور فرائیڈ نے انسان کے نفسیاتی مسائل کے ضمن میں نئے نظریات پیش کر کے انسانی سوچ و فکر میں انقلاب برپا کر دیا۔ بھوک اور جنس اہم موضوع قرار پائے۔

ادب نے ان تغیرات و انقلاب کو اپنا موضوع بنایا۔ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر زندگی کے معاملات پر بے باکانہ تنقید کا دروازہ کھل گیا اور اس کے ساتھ ساتھ دیگر جدید علوم و فنون کا ورود ادب میں ہونے لگا۔

موضوع کے لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو عالمگیریت کے اس ابتدائی دور میں جب ابھی اس تحریک کو یہ نام بھی نہیں دیا گیا لیکن اس تحریک کا وجود بہر حال تھا۔ لہٰذا اس تحریک کے زیر اثر مغرب کے ادبا کی تحریروں کا اثر اردو ادب اور بالخصوص اردو ناول پر بھی ہوا۔ اس حوالے سے خود عصمت چغتائی کہتی ہیں کہ انہوں نے سائیکالوجی پر بہت سی کتابیں پڑھیں اور ان سے انہوں نے شمن کے کردار کا نفسیاتی تجزیہ کرتے ہوئے مدد لی۔

اس ناول میں مختلف کرداروں کی بنیاد اور اٹھان فرائڈین نقطہ نظر سے کی گئی ہے۔ فرائڈ انسانی نفسیات کو جنسی حوالے سے دیکھتا ہے اور انسان کو نفسیاتی تناظر میں دیکھتا ہے۔ شمن کے کردار کو اس حوالے سے دیکھیں تو بچپن میں والدین کی محبت و شفقت سے محرومی اس کی شخصیت میں نفسیاتی الجھنوں کو جنم دیتی ہے۔ عصمت حقیقت نگاری کرتے ہوئے انتہائی بے باکی کا مظاہرہ کرتی ہے۔ اس ناول میں انگریز عہد کا متوسط طبقہ ان کی زندگیاں، ان کی دلچسپیاں، ان کی معاشرت کو پیش کیا گیا ہے اور یہ عہد دوسری جنگ عظیم کے آس پاس کا زمانہ ہے اور ہندوستان میں انگریز حکمران ہیں۔ عوام کا رویہ ان کے ساتھ محبت اور نفرت کا ہے۔ وہ حکمران ہیں لہٰذا ان کی طرز زندگی کی نقالی کی جاتی ہے۔

---

(۱) محمد عظیم اللہ، ڈاکٹر، اردو ناول پر انگریزی ناول کے اثرات، ص ۲۳۳

متوسط گھرانے میں بچوں کو مشن سکول میں پڑھایا جاتا ہے۔ بڑی آپا اپنی بیٹی کو انگریزی نظمیں یاد کرواتی ہیں اور نہ صرف یاد کرواتی ہیں بلکہ آنے جانے والوں کے سامنے فخریہ اسے یہ نظمیں سنانے کو کہا جاتا ہے گویا یہ تعلیم و تہذیب کا کمال ہے کہ انگریزی سیکھی جائے اور انگریزی تعلیم حاصل کی جائے۔

> ''یہ کیا بات تھی کہ وہ یورپ کی اتنی بڑی مخالف ہوتے ہوئے بھی انجام طور پر اسی رنگ میں رنگتی جارہی تھی۔ وہ میز پر چھری کانٹوں سے کھانا کھاتی، بیڈ پر سوتی اور چھوٹے چھوٹے قواعد پر عمل بھی کرتی۔'' (۱)
>
> ''یہ ہے اصل گانا'' وہ (ٹیلر) جھوم کر کہتا۔
>
> ''ہنہ جیسے پٹا ہوا کتا رو رہا ہے۔'' وہ جل کر کہتی: ''تم ہندوستانی گانا سمجھنے لگو تو یہ کائیں کائیں سنو ہی نہیں۔'' (۲)

نفرت کا یہ تعلق دو طرفہ ہے۔ ایک طرف ٹیلر جو یوں تو آئرش نہیں ہے لیکن رنگت کے اعتبار سے حکمران طبقے کا ایک فرد ہے۔ وہ ہندوستانی لوگوں کو غیر مہذب سمجھتا ہے اور یہ سوچ فردِ واحد کی سوچ نہیں۔ یہ سوچ عالمگیریت کے ذریعہ اپنے تہذیب و معاشرت کی اشاعت کرنے والوں کی مشترکہ سوچ ہے۔ لہٰذا وہ کہتا ہے:

> ''تم جانتی ہو کہ تمہارا رنگ پھیکا ہے تمہارے مرد زیادہ عقلمند ہیں۔ وہ یورپین لڑکی سے شادی کر کے کس قدر مہذب ہو جاتے ہیں۔ کھانا پینا رہنا سہنا بول چال سب میں سلیقہ آجاتا ہے۔'' (۳)

گویا اس وقت کے انگریز حکمرانوں اور آج عالمگیریت کے حامیوں کا یہ خیال ہے کہ چھری کانٹے سے کھانا، انگریزی لباس پہننا اور انگریزی زبان میں گفتگو کرنا تہذیب و شائستگی کی علامت ہے۔ ہندوستانی انگریز سے مرعوب و متاثر ضرور ہیں لیکن دوسری طرف وہ اس سے نفرت کا اظہار بھی کرتے ہیں اور انگریزوں کے دوہرے معیار ان نفرت کو مزید ہوا دیتے ہیں۔

> ''ہنہ خوب۔ یہ ایک اور امپیرل ازم کو پھیلانے کی چال ہے کہ اپنی لڑکیاں الوؤں کو پھانسنے کے لیے لگا دی ہیں۔ اسی طرح انگریزیت کا پرچار ہو جاتا ہے۔ ان کا لباس پہن کر ان کی زبان منہ لے کر ان کی عورتوں کی آغوش میں بھلا ان کے خلاف چوں کرنے کی سکت رہ جاتی ہے۔ پھر نہ وہ ہندوستانی ہی رہتے ہیں اور نہ ان کی سیاہ چمڑی انگریز بننے دیتی ہے۔'' (۴)

---

(۱) عصمت چغتائی، ٹیڑھی لکیر، ص ۴۵۵

(۲) ایضاً، ص ۴۵۴

(۳) ایضاً، ص ۴۵۴

(۴) ایضاً، ص ۴۵۴

ناول میں انگریزی تہذیب کے لوازمات ہندوستانی تہذیب کے ساتھ ساتھ موجود ہیں۔ ۱۸۵۷ کی جنگ آزادی میں ہندوستانیوں نے جس نفرت اور بغاوت کا اظہار کیا وہ اب سرد پڑ چکی تھی۔ متوسط گھرانوں اور اعلیٰ طبقے میں انگریزی تہذیبی مظاہر کو فخریہ طور پر اپنا لیا گیا تھا اور اگرچہ ہندوستان میں ابھی بھی وہ طبقہ موجود تھا جو ہندوستانی اور مسلم تہذیبی اقدار کے لیے ان جدید مغربی اقدار کو خطرہ سمجھ کر اس کے آگے بند باندھنے کے لیے کوشاں تھا لیکن عمومی طور پر مغربی اقدار کو مہذب اور روشن خیالی کی علامت کے طور پر لیا جا رہا تھا۔ لہٰذا اس ناول میں بھی یہ اقدار جابجا اپنائی جا رہی تھیں۔

ناول میں لڑکیوں کا بورڈنگ میں رہنا اور میک اپ لپ اسٹک کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ زلفوں کی آرائش جدید طریقے سے کرنے کا بھی ذکر ہے۔ "جدھر دیکھو لال پیلے گال اور مصنوعی گھونگروالے بال نظر آتے۔ بجلی کے آلے نہ ملے تو سلاخیں گرم کر کے ہی بال الجھا لیے۔" [۱]

پکنک اور سالگرہ کی پارٹی جیسی تفریحات بھی اسی انگریزی تمدن کی بدولت ہیں جو عالمگیریت کے زیر اثر ہندوستان میں وارد ہوا۔ ہندوستان میں رواج پذیر ہوا۔

اس کے علاوہ ناول میں ترقی پسند گروہ اور اشتراکیت اور اشتراکی رنگ کی اصطلاحات بھی ملتی ہیں۔ یہ بھی عالمگیریت کی تحریک کے زیر اثر برصغیر میں در آئی۔ اس تحریک کی اصل جڑیں تو روس میں تھیں لیکن ایسے نظام کے خواب اور اس کے لیے جدوجہد میں ہندوستان کا نوجوان طبقہ بھی پیچھے نہ تھا۔

اس ناول کے کرداروں میں انگریز کردار بھی موجود ہیں بالخصوص رونی ٹیلر کا کردار ہے۔ جو ایک آئرش تھا اور انگریز فوج میں بھرتی ہونے سے بیشتر کسی اخبار کا نمائندہ تھا۔

جگدیش چندر ودھاون کے نزدیک:

> ''وہ ہندوستانیوں کے جذبات و احساسات کی قدر کرتا تھا اور ان کے تئیں دل میں ہمدردی کے جذبات موجزن رہتے تھے وہ جانتا تھا کہ ہندوستان کی غلامی کے اسباب کیا ہیں اور وہ غلامی کے جوئے کو کیوں کر اتار پھینک سکتا ہے۔'' [۲]

لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اپنی تمام تر روشن خیالی کے باوجود وہ ہندوستانیوں کو کم عقل اور غیر مہذب سمجھتا ہے اور اس کے نزدیک وہ اس قابل نہیں کہ ہندوستان کی حکومت سنبھال سکیں اور یہ انگریزوں کا ان پر احسان ہے کہ وہ اپنے وطن سے اتنی دور یہاں پر ان کو تہذیب سکھانے آئے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اس ناول میں بین الاقوامی سیاست کے مباحث جنگ عظیم کے پس منظر میں موجود ہیں۔

---

(۱) عصمت چغتائی، ٹیڑھی لکیر، ص ۱۳۲

(۲) جگدیش چندر ودھاون، عصمت چغتائی شخصیت و فن، (دہلی: کتابی دنیا، ۲۰۰۳ء)، ص ۳۷۴

اگرچہ جگدیش کے مطابق:

"ایسے موضوعات پر عصمت کی گرفت ڈھیلی ہے اور وہ ان سے بطریق احسن عہدہ بر آ ہونے سے قاصر ہیں۔ کہنے کا حاصل یہ ہے کہ ان مباحث میں عمومیت ہے اور وہ اپنی پست سطح سے اٹھ نہیں پاتے۔ در حقیقت انٹیلیکچول ازم عصمت کو راس نہیں آتا۔" (۱)

ناول میں بین المذاہب شادیوں کو بھی موضوع بنایا گیا۔ خود شمن کا رونی ٹیلر سے شادی کرنا۔ لیکن یہ شادی دو ایسے کناروں کا ملاپ تھا جن کے درمیان میں گہری خلیج حائل تھی۔ اس حوالے سے ڈاکٹر فرزانہ اسلم لکھتی ہیں:

"لیکن شمن جو مردوں کے خلاف انتقامی جذبہ رکھتی تھی اور جسے اپنے معاشرے کو شاک پہنچانا تھا ایک ہی جست میں اس خلیج کو طے کر کے ٹیلر سے شادی کر لیتی ہے لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ یہ بے تکی حرکت اس نے کس طرح کی۔ کیوں کہ وہ تو کٹر قوم پرست تھی۔ اس میں ہندوستانیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ایسے میں ایک غیر ملکی سے شادی کر لینا، جس کی پلکیں، رنگت، دانت سب اسے ناپسند تھے ناقابل فہم حرکت نظر آتی ہے۔" (۲)

حالانکہ شمن کو برابر یہ احساس رہتا ہے کہ وہ اپنی قوم کی نظروں میں ایک رنڈی سے بھی زیادہ کمینی ہو گئی ہے۔ ٹیڑھی لکیر میں انگریزی مدرسوں میں پڑھانے والی انگریز استانیوں اور ان کی ثقافت کا بھی ذکر ملتا ہے۔ ہندوستان گذشتہ کئی صدیوں سے ان یورپینز کے لیے ایک پر اسرار اور رومانوی سرزمین تھی لہٰذا اس کے سحر اور اسرار کو دریافت کرنے کے لیے انگریز مردوں کے ساتھ ساتھ انگریز عورتوں نے بھی ہندوستان کا رخ کیا۔ یہاں انہیں کئی طرح سے نامساعد حالات کا سامنا تھا۔ مقامی مردوں سے وہ خوفزدہ رہتیں یہاں کے موسموں کی سختی ان کے ناقابل برداشت تھی۔ یہاں کی لڑکیوں سے تنگ آنے کا گلہ بھی کرتی ہیں لیکن واپس جانا نہیں چاہتیں کیونکہ ایسی اجرت اور ایسے مواقع انہیں اپنے ملک میں میسر نہیں۔

"ہائے بے چاری سفید دیو داسیاں بجائے وجیہہ قباؤں والے کاہنوں کے ان کالے بھنگیوں کے ہتھے چڑھ رہی تھیں۔ ان کی سیاہ روحوں کو خدا باپ کے قدموں تک گھسیٹ لے جانے میں وہ خود غلاظت کی دلدل میں گھسٹ جاتیں۔ ایک فاتح قوم کی ہندوستان کی جھلسا دینے والی ہوا اور ہندوستانیوں کی پاگل کر دینے والی تاریک ذہنیت کے آگے بالکل ہاری ہوئی اور پر شکستہ نظر آنے لگتی۔" (۳)

---

(۱) جگدیش چندر ودھاون، *عصمت چغتائی شخصیت و فن*، ص ۴۱۰

(۲) فرزانہ اسلم، ڈاکٹر، *عصمت چغتائی بحیثیت ناول نگار*، (نئی دہلی، سیمانت پرکاش، ۱۹۹۶ء)، ص ۱۷۵

(۳) عصمت چغتائی، *ٹیڑھی لکیر* ص ۱۶۵

انگریزوں کے ساتھ ساتھ اینگلو ایڈین لوگوں کی ثقافت بھی ناول میں نظر آتی ہے۔ ہندوستان کے عیسائی اچھوت اور نچلے طبقے سے عیسائیت قبول کر کے یا انگریزوں کے مقامی عورتوں سے تعلقات کے نتیجے میں جنم لینے والی دوغلی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ اینگلو ایڈین نسل دوغلی مخلوط نسل تھی جس کا نصف ہندوستانی اور باقی نصف انگلش تھا۔ لیکن وہ مقامی عناصر سے نفرت کے باوجود اس سے چھٹکارا پانا ان کے لیے ممکن نہ تھا۔ لیکن اقدار لباس زبان کے اعتبار سے وہ حکمران طبقے کی نقالی کرنے میں فخر محسوس کرتے تھے لیکن انگریز انہیں قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔

باب سوم

# عالمگیریت اور اردو ناول قیام پاکستان کے بعد

(قیامِ پاکستان تا ۱۹۸۰)

# عالمگیریت اور اردو ناول آزادی کے بعد (۱۹۴۷- ۱۹۸۰)

۱۹۴۷ء کا سال ہندوستان کی تاریخ میں نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ آزادی کا حصول اس خطے کے باشندوں کے لیے جہاں فخر و انبساط کا باعث تھا وہیں درندگی، بہیمیت، وحشت و بربریت نے انسان کو اسفل السافلین کے درجے تک پہنچا کر تاریخ میں اس کے لیے ہمیشہ کی شرمساری اور ننگ رقم کی۔ لاکھوں انسانی جانوں کے ضیاع اور عزت و ناموس کی قربانی دے کر خریدی جانے والی اس آزادی نے اس خطے میں انسانوں کی زندگیوں کو طوفان آشنا کر دیا۔ سیاسی، سماجی، معاشی حوالوں سے انھیں اپنے لیے نئے قالب تراشنے پڑے۔ یہ دور شدید مایوسی کا دور ہے۔ آزادی حاصل کرنے کے بعد ہندوستانیوں اور پاکستانیوں نے فسادات کی صورت میں جو کچھ کیا اور فسادات میں جو کچھ ہوا، نفرت ورقابت، قتل و غارت گری، املاک کی بربادی، حرمتوں کی پامالی کے جو انسانیت سوز مظاہرے چشم فلک نے دیکھے وہ اس قدر روح فرسا اور مایوس کن تھے کہ تمام انسانی قدریں ہیچ، تمام مذہبی و اخلاقی فلسفے بے سود اور انسانی زندگی بے ثبات اور بے اصل نظر آنے لگی۔ زندگی کے تعلق سے بے اطمینانی میں اضافہ ہوا۔ اخلاقی و مذہبی قدروں پر اعتقاد متزلزل اور تشکیک میں اضافہ ہوا۔ مایوسی، حرماں نصیبی کی کیفیت کے ساتھ تنہائی، بے وطنی، ہجرت، بے بسی اور بے چارگی کے احساس میں اضافہ ہوا اور ایک دور ختم ہو جانے اور مشترکہ تہذیب کے مٹ جانے کا کرب احساس کی شدت کی صورت میں ظاہر ہوا۔ یہ حالات محض جنوبی ایشیا میں ہی نہ تھے بلکہ پوری دنیا میں اضطراب و مایوسی پھیلی ہوئی تھی۔ دوسری عالمی جنگ کا خاتمہ ۱۹۴۵ء میں ہوا تو وہ اپنے پیچھے تباہی و بربادی کی بے مثل داستان چھوڑ گئی جس نے ان احساسات میں شدت پیدا کر دی۔ انسان نے جوہری توانائی کا استعمال سیکھ لیا تھا لیکن اس نے اپنی توانائی کھو دی تھی۔ زندگی میں توازن مفقود ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور میں جو ناول لکھے گئے ان میں بھی انہی احساسات کی کارفرمائی ملتی ہے۔

تقسیم اور فسادات کے موضوعات پر بہت سے ناول لکھے گئے جن میں ایم اسلم کا رقص ابلیس، رشید اختر کا ۱۵ اگست، قیس رامپوری کا خون بے آبرو اور فردوس رئیس احمد جعفری کا مجاہد، نسیم حجازی کا خاک اور خون اور رامانند ساگر کا اور انسان مر گیا وغیرہ شامل ہیں۔ یہ ناول مقبول ناول کے زمرے میں آتے ہیں اور وقتی اور صحافتی حیثیت کے حامل ہیں۔ ان میں نئی اقدار کی تلاش بے سود ہے۔ ان وقتی اور ہنگامی موضوعات کے ناولوں سے ہٹ کر سنجیدہ ناول بھی لکھے گئے جن میں قرۃ العین حیدر کا میرے بھی صنم خانے، عزیز احمد کا ایسی بلندی ایسی پستی اور ڈاکٹر احسن فاروقی کا شام اودھ ۱۹۴۷ سے ۱۹۵۰ تک کے تین سالوں میں لکھے گئے۔ اس کے بعد پے در پے اچھے ناولوں کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس دور میں اس صنف میں ہیتی، تکنیکی اور اسلوبیاتی تجربات بھی ہوئے اور اس میں ترتیب و تنظیم اور فنی سلیقہ بھی پیدا ہوا اور وقت کے ساتھ ساتھ اس میں فکری بلوغت بھی در آئی۔ اسی دور میں آگ کا دریا جیسا وقیع ناول بھی اشاعت پذیر ہوا اور عبد اللہ حسین نے اداس نسلیں اور نادار لوگ لکھ کر اردو ناول میں قابل قدر اضافہ کیا۔ نگری نگری پھرا

مسافر، نے چراغے نے گلے، خدا کی بستی، آنگن،، تلاش بہاراں، دشت سوس، نشان محفل، دستک نہ دو، علی پور کا ایلی اور ایک چادر میلی سی، خونِ جگر ہونے تک، چاکیواڑہ میں وصال، پنگل کا جزیرہ، کالے کوس، رات چور اور چاند، لہو کے پھول، جھوک سیال، ایوان غزل، گرگ شب، گوندنی والا تکیہ جیسے ناول لکھے گئے۔ موضوعاتی تنوع کے ساتھ ساتھ ان ناولوں میں ناول کے فنی لوازمات کو مد نظر رکھا گیا تھا۔ لہذا یہ ناول کی روایت میں قابل قدر اضافہ ثابت ہوئے۔ اور اردو ناول کو نئی بلندیوں سے ہمکنار کرنے کا باعث بنے۔

جدید اردو ناول کا آغاز آگ کا دریا سے ہوا اوراس ناول سے اردو ناول کو ایک نئی سمت اور رفعت ملی اور وہ نئی فنی بلندیوں سے ہمکنار ہو کر آنے والے ناول نگاروں کے سامنے نئے معیار پیش کرنے لگا۔

# ایسی بلندی ایسی پستی

عزیز احمد کا ناول **ایسی بلندی ایسی پستی** (۱۹۴۸) میں شائع ہوا۔ اس ناول میں ریاست حیدر آباد کے جاگیر دارانہ معاشرے کو پیش کیا گیا ہے جو اب قصہ پارینہ ہو چکا ہے لیکن مصنف کی اس سے واقفیت بھرپور اور مکمل ہے۔ معاشرے کے طبقہ اشرافیہ کی زندگی جو شراب اور جنس کے گرد گھومتی ہے، ناول اسے موضوع بناتا ہے۔ اس میں بگڑے ہوئے نواب، رئیس، نواب زادے اور رئیس زادے ہیں جن کی زندگی کا انحصار دولت کی ریل پیل، جنسی تلذذ، ظاہری شان و شوکت اور کروفر کے مظاہروں پر ہے۔ عزیز احمد ایک ایسے کرم خوردہ اور زوال آمادہ معاشرے کو پیش کرتے ہیں جو لمحہ موجود کو اصل مان کر ہر طرح سے اپنی خوشی کا سامان تلاش کرتا ہے۔ اس معاشرے کے سربر آوردہ نمائندوں میں قابل جنگ، مشہور الملک، سر تاج الملوک، شجاعت شمشیر سنگھ، کوثر نواز جنگ، آرائش جنگ، مہدی حسن کار جنگ، ذی جاہ ملک وغیرہ شامل ہیں جو اپنی اپنی موروثی جائیدادوں پر متصرف ہیں اور صرف دادِ عیش دینے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ ایک دوسرے سے رقابت بھی رکھتے ہیں جوڑ توڑ بھی کرتے ہیں۔ خواصیں رکھنے کا چلن عام ہے یہ لوگ اونچی اونچی محل سراؤں میں رہتے ہیں۔ رقص و سرود اور ناؤنوش کی محفلوں میں شامل ہوتے ہیں۔

ان رئیسوں اور نوابین کی اولادوں کے سامنے زندگی کے کچھ اور رخ بھی ہیں۔ فرخندہ نگر اور اس کی زندگی کش پلی کے نو تعمیر شدہ مکانات اور ان کے مکینوں سے ہمارا تعارف ہوتا ہے تو ان کی سرگرمیوں کے دوسرے مرکز مسوری، اس کی تفریح گاہیں اور ان رئیسوں کی سرگرمیاں ہماری توجہ اپنی جانب کھینچ لیتی ہیں۔ جہاں ان جاگیر داروں اور رئیسوں کی ذریات اور باقیات اور نئے ابھرتے ہوئے کاروباری سال بہ سال جمع ہوتے ہیں اور رنگ رلیوں میں وقت بتاتے ہیں۔ یہاں مسز مشہدی ہیں جو ایک نہایت اعلیٰ خاندانی پس منظر رکھتی ہیں اپنی بیٹیوں فاطمہ اور جلیس کے ساتھ مسوری کو رونق بخشتی ہیں۔ ڈاکٹر رائے اور اس کی بیوی ہلڈا ہے جو نیازی، قابل جنگ اور اس کی انگریز بیوی کی اولاد پر فریفتہ ہے۔ پروفیسر ٹوکی اور اس کی تینوں لڑکیاں ساوتری، کملا سریش اور چندر لیکھا ہیں جو ہر سال گرمیاں مسوری میں گذارتی ہیں اور خاصی آزاد خیال ہیں۔

اس ناول کے اہم کرداروں میں خورشید زمانی بیگم، قابل جنگ کی بیٹی اور سنجر بیگ کی بیوی ہے اس کی تین بیٹیاں مشہور النسا، سر تاج اور نور جہاں اور دو بیٹے خاقان اور اصغر ہیں۔ خاقان ایک کند ذہن اور غبی جبکہ اصغر ایک انتہائی عیاش انسان ہے۔ پھر خورشید زمانی کی سوتیلی بہنیں نازی، فاطمہ اور کہکشاں ہیں۔ نیازی اور محمود شوکت اس کے سوتیلے بھائی ہیں۔ اوباش اور عورت باز یہ سوتیلے بھائی خورشید زمانی بیگم کے والد قابل بیگ کی دوسری بیوی، جو عیسائی تھی جس کا نام اسکندر بیگم رکھا گیا، کی اولاد ہیں۔ خورشید زمانی بیگم کی بیٹی سر تاج بے پناہ حسن و جمال کی مالک ہے اس کی شادی ایک جاگیر دار سے ہوئی ہے جو بھدی شخصیت کا مالک ہے لیکن سر تاج کو اس کی دولت سے سروکار ہے جو پرانے ماڈل کی رولس رائس کار، بارڈر والی مہنگی ساڑھیوں اور دیگر لوازمات آسائش کے ساتھ خوش و خرم زندگی بسر کر رہی ہے۔

خورشید زمانی بیگم کی بیٹی سر تاج کو دولت، آسائشوں انگریزی تمدن اور خوبصورت اور مہنگی ساڑھیوں کا شوق ہے وہ جاگیر دار محی الدین سے شادی کرنے کے لیے محض اس لیے راضی ہو جاتی ہے کہ اسے جاگیر کے روپے، بھڑکدار چوڑے بارڈر کی ساڑھیوں، زیور، رولس رائس، آرام اور شان و شوکت سے محبت ہے۔ اسے اپنے شوہر کی بدصورتی بھی محض اس لیے گوارا ہے کہ اسے دولت سے محبت ہے۔

خورشید زمانی بیگم کی دوسری بیٹی مشہور النسا اپنے باپ سنجر بیگ کی مرضی کے بر خلاف ایک مال دار شخص ابوالہاشم انجینئر سے شادی کے لیے تیار ہو جاتی ہے۔

اسی ماحول میں ایک تعلیم یافتہ شخص انجینئر سلطان حسین کا کردار منظر عام پر آتا ہے جو باروزگار اور مال دار ہونے کی وجہ سے طبقہ اشرافیہ میں خاص مقام رکھتا ہے۔ آزاد خیال انسان ہے شادی کو جبر سمجھتا ہے لیکن عاشق مزاج ہے جن لڑکیوں سے عشق کرتا ہے (یہاں جس کا لازمی نتیجہ جنسی روابط ہے) ان سے شادی کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ لیکن عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ اب کوئی نئی چڑیا اس کے جال میں آنے کو تیار نہیں لہٰذا خورشید زمانی بیگم کی بیٹی نور جہاں کے لیے اپنی ماں اور بیوہ بہن زبیدہ کے ذریعے رشتہ بھیجتا ہے۔ شادی کے بعد ہنی مون کے لیے جب یہ جوڑا مسوری جاتا ہے تو وہاں نور جہاں کو کمرے میں آرام کرنے کا کہہ کملہ پریش کے ساتھ رنگ رلیاں منانے چل دیتا ہے۔ اس کی بیوی نور جہاں کو اس ملاقات کا علم ہو جاتا ہے اس کے دل میں اپنے شوہر کے لیے محبت اگر پیدا ہو بھی سکتی تو اب اس کی جگہ غصے اور بد اعتمادی نے لے لی۔

سلطان حسین کی آزاد خیالی اور رنگین مزاجی کے رد عمل کے طور پر نور جہاں نے بھی مخلوط محفلوں میں جانا شروع کر دیا۔ وہیں اس کی ملاقات اپنے بچپن کے دوست اطہر سے ہوتی ہے جو خود بھی عورتوں کا رسیا اور عیاش انسان ہے۔ یہ بات سلطان حسین کو ناگوار گذرتی ہے اور وہ اپنی بیوی کو حرافہ اور رنڈی جیسی مغلظات سے نوازتا ہے جس سے میاں بیوی میں فساد شروع ہو جاتا ہے۔ سلطان حسین اپنی تمام تر آزادروی کے ساتھ نور جہاں پر کلی ملکیت چاہتا ہے۔ نور جہاں کے جسم کو مسخر کر لینے کے باوجود اس کے دل تک رسائی نہ پا کر اس کی مردانگی کو ٹھیس لگتی ہے وہ نور جہاں پر ہاتھ اٹھاتا ہے۔

> ”اور دفعتاً سلطان حسین نے مرد کی بے انتہا ظالمانہ طاقت کا نشہ محسوس کیا۔ اس نشے کے عالم میں تو اس کے اجداد نے عورت کو اپنی کنیز بنایا تھا تڑ سے اس نے ایک تھپڑ نور جہاں کے پہلے سے سرخ گال پر رسید کیا...... ہندوستان میں عورت کے جسم پر مرد کی جو حکومت تھی اب وہ مٹ رہی تھی۔ یہ تھپڑ اس مٹتی ہوئی حکومت کو پھر سے قائم کرنے کی کوشش تھی۔“ (۱)

بہر حال انہی نشیب و فراز کے شکار سلطان حسین اور نور جہاں کی ازدواجی زندگی خلع کے بعد اختتام پذیر ہو جاتی ہے۔

(۱) *عزیز احمد کے چار ناول* مرتبہ طاہر منصور فاروقی، (لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۱۶ء)، ص۷۷۸۔۷۷۹

نور جہاں اطہر سے شادی کر لیتی ہے جبکہ سلطان حسین خدیجہ سے دوسری شادی کر لیتا ہے۔ متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والا ایک اہم کردار سریندر ہے جو سلطان حسین کا دوست ہے معمولی شکل وصورت کا ہونے کی وجہ سے معشوق بننے کی بجائے ہمیشہ لڑکیوں کا عاشق ہی رہتا ہے۔ آل انڈیا ریڈیو میں ملازم ہے لیکن شراب، سگریٹ، جوا اور کلب ہی اس کی زندگی ہے۔ کمیونسٹوں کی ہر تحریر کو پڑھنا اس کے لئے لازم ہے۔ بڑے طبقے کے ساتھ ساتھ متوسط طبقے کی چاپلوسی، خود غرضی اور مفاد پرستی پر بھی کڑی تنقید کرتا ہے کہ یہ لوگ (متوسط طبقہ) راجاؤں مہاراجاؤں کے خلاف کتابیں اور مضامین بھی لکھتے ہیں لیکن اگر کسی مہاراج کے ہاں سے چائے کی دعوت آجائے تو سگے بھائی کو مرتا چھوڑ کے ضرور جائیں گے۔ لیکن وہ یہ بھی سمجھتا ہے کہ یہ متوسط طبقہ ہی ہے جو زیادہ عقلمند ہے اور مزدور اور اعلیٰ طبقے کو استعمال کر سکتا ہے۔ چنانچہ ناول کے اختتام پر جب اسے ہندوستان کی تقسیم کی بابت پتہ چلتا ہے تو کہتا ہے:

> ''کیا مزہ آئے گا۔ ہاہاہا۔ ہندوستان میں رام راج اور پاکستان میں حکومت الٰہیہ۔ اور دونوں جگہ ہمارا متوسط طبقہ، اعلیٰ طبقے اور مزدور طبقے کو پھر سے بے وقوف بنائے گا۔'' (۱)

عزیز احمد کا یہ ناول اونچے اور متوسط طبقے کی ذہنیت کی عکاسی کرتا ہے۔ بالخصوص انگریزوں نے اپنے وفادار طبقے کو جاگیریں اور مراعات عطا کر کے ہندوستان میں ایک نیا طبقہ اشرافیہ پیدا کیا انہی کے شب وروز رہن سہن، تقریبات، دلچسپیوں، طرز فکر اور انداز زیست کو اس ناول میں موضوع بنایا گیا ہے اور اس نام نہاد مہذب طبقے کی اخلاقی اور معاشرتی گراوٹ کو پیش کیا گیا ہے۔ انگریز سامراج کے زیرسایہ پروان چڑھنے والا یہ طبقہ انگریزی تمدن کا اندھا نقال ہے۔ ان کی زندگیوں کو دیکھ کر کہیں یہ شائبہ تک نہیں ہوتا کہ یہ ہندوستانی معاشرہ ہے۔ عالمگیریت کے اثرات یہاں ایک تو معاشرتی اور سماجی سطح پر نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر ناول کے ابتدائی صفحات میں ہی مصنف لکھتا ہے:

> ''اس زمانے میں تہذیب کے معنے تھے کنگ ایڈورڈ کے عہد کے سوٹ، عورتوں کے لیے فراکیں، آکس ٹنگ، کبھی کبھی شراب، بیرا، کموڈ۔۔'' (۲)

ڈاکٹر ریاض ہمدانی لکھتے ہیں:

> "عزیز احمد نے اس نام نہاد مہذب طبقے کے گھٹیا پن کو طنزاً بیان کیا ہے ان لوگوں میں جو بظاہر بلندی دکھائی دیتی ہے لیکن وہ اندر سے اخلاقی اور معاشرتی پستی کا شکار ہیں۔ سامراج کے زیرسایہ پروان چڑھنے والے یہ مغربی نقال ایسی سماجی اور اخلاقی گراوٹ کا شکار ہیں کہ وہ عام آدمی کی مشکلات کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ یہ سامراجی کٹھ پتلیاں مغرب کی دی ہوئی سماجی و

---

(۱) عزیز احمد کے چار ناول، ص ۸۴۱

(۲) ایضاً، ص ۶۳۴

معاشی آزادی کے علاوہ کچھ سوچنے کے قابل ہی نہیں۔ ناول نگار ان لوگوں کی تمدنی زندگی کو انگریز کی نقالی اور ان کی سیاسی بصیرت کو ان کا ذاتی مفاد سمجھتا ہے۔" [۱]

انگریزی تمدن کے یہ نقال سوچ و فکر سے عاری ہیں۔ ان کی زندگی صرف شراب اور جنس کے گرد گھومتی ہے۔ ابوالہاشم انجینئر کے خوبصورت مکان کی تعمیر و آرائش میں جو ساز و سامان استعمال ہوا وہ ہندوستانی مذاق کے برعکس انگریزی رنگ لیے ہوئے تھا۔

"ڈرائنگ روم فرخندہ نگر کے تمام مذاق کے برعکس بہت بڑا تھا۔ جس میں بروک ہسپانوی انداز کا فرنیچر تھا۔ صوفوں پر ہسپانوی بروکیڈ، روکوکو فرنیچر اور بید کے آرام دہ فرنیچر۔۔۔ اور اس برآمدے میں فرخندہ نگر کا سب سے خوبصورت بار تھا۔ امریکن وضع کا۔ ہر طرح کی بیئر، مری کی گولڈ رین سے لے کر جرمنی کی میونشز ہاف براؤ تک۔ ہر قسم کی اسکاچ وہسکیاں پرانی پرانی برگنڈی کی شرابیں، ہر قسم کی جن میں تمام انواع کے بنے بنائے کاک ٹیل۔ روس کی ووڈکا، ایلاصہ کی کیانتی، پرتگالی برانڈیاں، مڈیرا کے شاہکار۔" [۲]

ایک طرف گھر میں اس (ابوالہاشم) نے عیش و عشرت کا انواع و اقسام سامان جمع کر رکھا ہے لیکن دوسری طرف ملک و قوم کی امانت یعنی سرکاری روپے پیسے کو اس کی اصل جگہ استعمال کرنے کی بجائے ذاتی عیاشی کے لیے خرچ کیا اور اس حوالے سے مصنف نے لکھا ہے:

"یہ ساری دولت جو الکحل میں منتقل ہو گئی تھی۔ ٹھیکے داروں کی دی ہوئی ان رشوتوں سے اکٹھا ہوئی تھی جن کی وجہ سے سرکاری اور رفاہِ عام کی عمارتوں میں گھٹیا سامان استعمال ہوا۔ جن کی وجہ سے ہسپتالوں اور اسکولوں کی چھتیں ہمیشہ ٹپکتی رہتی تھیں۔" [۳]

یہ اخلاقی دیوالیہ پن صرف فردِ واحد کے ساتھ ہی مخصوص نہیں تھا بلکہ وہ پورا طبقہ کم و بیش انہی خصائص کا حامل تھا۔ جس میں ان کی اپنی ذات، خواہشات اور لذتوں کے حصول کے علاوہ ہر قسم کے مقصد سے ان کی زندگیاں عاری تھیں۔ نئی تہذیب کی چکا چوند نے ان کی آنکھیں خیرہ کر رکھی تھیں

---

(۱) ریاض ہمدانی، ڈاکٹر، *اردو ناول کا نوآبادیاتی مطالعہ*، ص ۳۱۰

(۲) *عزیز احمد کے چار ناول*، ص ۶۵۷

(۳) ایضاً، ص ۶۵۸

اس ناول کے تمام مردانہ کردار شراب و شباب کے رسیا ہیں۔ عورتوں سے جنسی روابط بڑھانے میں طاق ہیں۔ عورت مرد کا رشتہ انسانیت یا احترام کا نہیں محض جنس کا ہے۔ یعنی یہاں شعور و عقل کی کار فرمائی نہیں محض جہالت اور صرف جبلت نظر آتی ہے۔ ایک ایسا معاشرہ ہی عالمگیریت کے لیے ساز گار ہے جو اپنی اقدار سے بیگانہ ہی نہ ہو بلکہ ان اقدار کی پیروی میں فخر محسوس کرے جو میڈیا کے ذریعے ان کے سامنے پیش کی جائیں۔ یہ فرد اور افراد معاشرہ کی سوچ کا بگاڑ ہی ہے کہ ان کی سوچ کے محور محض جنس اور شکم رہ جائیں کوئی بلند تر مقصد حیات ان کے پیش نظر نہ رہے۔

مردوں سے قطع نظر اس ناول میں نسوانی کردار بھی آرائش و زیبائش کے رسیا ہیں۔ زرق برق پہناوے، گہنے پاتے اور مخلوط محافل کے گرد ان کی زندگیاں گھومتی ہیں اور ہر عورت خود کو زیادہ سے زیادہ سنوارتی ہے تاکہ پر کشش دکھائی دے۔ کم عمر نظر آنے کے جنون مبتلا امیر نوجوانوں کو رجھاتی اور لبھاتی نظر آتی ہیں۔ تہذیبِ مغرب کی چکاچوند سے متاثر یہ خواتین طوائفانہ مزاج کی حامل ہیں جو خود بھی جنسی جبلت کی غلام ہیں اور زیادہ سے زیادہ مردوں کو بھی مائل کرنا چاہتی ہیں۔

بہرحال اس ناول میں عزیز احمد نے اس طبقہ اشرافیہ کو پیش کیا جو عالمگیریت (نو آبادیاتی) کے زیر اثر ہندوستان میں پیدا ہوا اور جس نے انگریز سامراج کے تمدن کی تقلید میں اپنے لیے عیش و نشاط کا سامان تلاش کیا۔ یہ کردار کٹھ پتلیوں سے زیادہ کچھ نہیں۔ یہ دیسی حکمران اور ان کی ذریت نے روشن خیالی کا لیبل اپنے اوپر لگانے کے لیے مغربی تہذیبی معیارات و اقدار کو اپنا لیا۔ یہاں تک کہ تقسیم ہندوستان میں یا آزادی ہندوستان میں ان کو کوئی دلچسپی نہیں۔ ایک طرف لاکھوں لوگوں پر اس تقسیم کے نتیجے میں عرصہ حیات تنگ ہو گیا لیکن یہ طبقہ اپنے حال میں مگن اپنے لوگوں کے مسائل سے بے پروا ہے۔ ان کے مفادات انگریز سامراج کے عہد میں بھی محفوظ تھے اس لیے ان کو ملکی سیاست سے بھی دلچسپی برائے نام تھی۔

اس حوالے سے ڈاکٹر محمد اشرف کمال لکھتے ہیں:

> "ایسی بلندی ایسی پستی میں عزیز احمد نے دکن کے طبقہ امراء کی عکاسی کی ہے۔ اس ناول میں امراء کی مغربی تہذیب کی اندھی تقلید دکھائی گئی ہے۔ اس ناول کی ہیروئن نور جہاں ہے مگر اس کا کردار اتنا جاندار نظر نہیں آتا۔"(۱)

مغربی تہذیب کی ایسی تقلید ہی عالمگیریت کے معاشی مفاد میں ہے۔ یہی تقلید عالمگیریت کے اثرات کو واضح کرتی ہے کہ لوگ ترقی یافتہ اور روشن خیال کہلوانے کے لیے مغربی تہذیب کی پیروی کر رہے تھے۔

---

(۱) محمد اشرف کمال، ڈاکٹر، اردو ناول، تاریخ و ارتقا، ص ۱۱۲

# میرے بھی صنم خانے

جب قرۃ العین نے ناول نگاری کا آغاز کیا تو اس وقت ایک طرف سیاسی سطح پر حالات ہنگامہ خیز اور غیر یقینی تھے تو دوسری طرف ادبی دنیا نئے ادبی نظریات کی بازگشت سے گونج رہی تھی۔ ۱۹۳۶ء میں ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا اور ادب کا رشتہ زندگی سے جوڑ کر اسے روزمرہ مسائل کی عکاسی کا ہنر سکھایا جانے لگا۔ ترقی پسند تحریک کے ساتھ ساتھ بعض ادیب رومانویت کے زیر اثر ادب تخلیق کر رہے تھے۔ ادبی تصورات کے حوالے یہ دو رویئیں بیک وقت چل رہی تھیں لیکن قرۃ العین حیدر کے حوالے سے دیکھا جائے تو کسی بھی تحریک سے منسلک ہوئے بغیر انہوں نے اپنے لیے الگ راہ تراشی۔ جس میں رومانویت اور حقیقت نگاری دونوں کا امتزاج تھا۔ رومانوی اسلوب نے ان کے ہاں دلکشی کو جنم دیا تو حقیقت نگاری سے انہوں نے عصری مسائل اور تہذیبی تاریخ کو اپنے ناولوں میں جگہ دے کر ادب میں اپنے لیے ایک بلند ترین مقام مختص کر لیا۔ تقسیم ان کا خاص موضوع ہے۔ انہوں نے اس اضطراب اور کرب کو گرفت میں لانے کی سعی کی ہے جس نے اس تقسیم کے باعث جنم لیا اور جس کے اثرات ذہنوں پر بہت گہرے تھے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ان کے ناول میرے بھی صنم خانے اور اس سے زیادہ سفینہ غم دل ان تہذیبی اقدار کا نوحہ ہیں جن کا انہدام تقسیم کے باعث ہوا۔

میرے بھی صنم خانے قرۃ العین حیدر کا پہلا ناول ہے جو انہوں نے انیس سال کی عمر میں لکھا۔ اس ناول کو پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ برصغیر کا ہر طبقہ اور گروہ آہستہ آہستہ بکھر رہا ہے۔ شکست و ریخت کا شکار ہو رہا ہے۔ گویا گنگا و جمن کا وہ معاشرہ جو ہندوؤں اور مسلمانوں کا مشترکہ معاشرہ تھا وہ ۱۹۴۷ء میں بکھر گیا۔

قرۃ العین حیدر نے جس ماحول میں آنکھ کھولی اور ابتدائی بیس برس گزارے۔ وہ اودھ کے جاگیرداروں اور اعلیٰ طبقے کی پر آسائش اور خوبصورت دنیا تھی۔ اسی طبقے کی زندگی کو اس ناول میں پیش کیا گیا ہے۔ اس طبقے کے افراد اپنے گردوپیش سے بے خبر آراستہ و پیراستہ ایوانوں میں صوفوں پر بیٹھ کر انقلابی مضامین لکھتے ہیں لیکن تقسیم ان کے ارادوں، امنگوں اور آرزوؤں کا المیہ بن جاتی ہے۔

قرۃ العین حیدر اس عہد کی ایک عظیم فنکارہ ہیں۔ انھیں ایک نابغہ کی حیثیت حاصل ہے۔ وہ ایک کثیر الجہت ادبی شخصیت ہیں۔ افسانوں کے علاوہ ناول، تراجم نگاری، رپورتاژ کے علاوہ بچوں کا ادب بھی تخلیق کیا لیکن یہ بھی حقیقت ہے جو مقام انھیں اردو ناول کے میدان میں حاصل ہوا وہی ان کے نام کو زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔

ڈاکٹر فتح محمد ملک کے بقول:

"قرۃ العین حیدر نے اردو فکشن کو سوچنا سکھایا ہے۔ اس باب میں وہ اردو فکشن کی معلم اول ہیں۔" [۱]

---

(۱) فتح محمد ملک، پروفیسر، پیش لفظ مشمولہ قرۃ العین کا تصور تاریخ و تہذیب ڈاکٹر رحمت علی شاد (لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۱۷ء) ص۶

"قرۃ العین حیدر کے ہاں تاریخ ناول کی صورت میں قوموں کی تہذیبی سرگزشت بن جاتی ہے لیکن تاریخ و فلسفہ، سیاست، تہذیب و معاشرت ان کے بیانیے پر مسلط ہونے کی بجائے بیانیے میں رچ بس کر نئی بصیرت عام کرتے چلے جاتے ہیں۔ ان کے ہاں ہندی تہذیب خصوصاً جس پر مغربی تہذیب کی گہری چھاپ ہے نظر آتی ہے۔ ان کے ہاں انسانی جذبوں اور رشتوں کی شکست و ریخت، سماجی آدرشوں اور تہذیبوں کے انہدام کے منظر نامے کے ساتھ ساتھ بنی نوع انسان کے کھوج میں تہذیبوں، ثقافتوں، مذہبی کتابوں اور حکایتوں کو کھنگالنے کے عمل کی بدولت ان کا فکری کینوس اس قدر وسیع ہو گیا کہ جس کا ایک سرا ازل اور دوسرا ابد کی طرف پھیلتا دکھائی دیتا ہے۔ انہوں نے تاریخ و تہذیب کے عروج و زوال کی داستان اس طرح بیان کی ہے کہ ان کے ہاں ہمیں تہذیبی تاریخ مکمل تاریخ دکھائی دیتی ہے۔"(۱)

تاریخ اور تہذیب قرۃ العین حیدر کے خاص موضوعات ہیں اور یہ موضوعات ان کے تقریباً تمام ناولوں میں پس منظر میں موجود رہتے ہیں۔ اس حوالے سے پروفیسر محی الدین بمبئی والا اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

"قرۃ العین حیدر ہمارے عہد کی ایک عظیم فنکارہ ہیں۔ جنہوں نے ہندوستان کی تہذیبی دھاروں کے مربوط تسلسل کو ضبط تحریر میں لانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ انہوں نے ملک کے بدلتے ہوئے منظر نامے کو اپنی فنکارانہ صلاحیتوں کے ساتھ پیش کیا ہے۔ قرۃ العین کے ناول اور کہانیاں ہند آریائی تہذیب سے لے کر جاگیر دارانہ نظام تک اور آزادی کے بعد عالمی سطح پر پیش آنے والے مسائل کے ادبی نقطہ نظر سے ترجمان رہے ہیں۔ ان کی تخلیقات میں فن اپنی اس معراج کو چھوتا ہوا نظر آتا ہے جہاں سے ہم ایک اعلیٰ فن پارہ کی شناخت کرتے ہیں۔" (۲)

مختصراً یہ کہ قرۃ العین حیدر کے ناول کی دنیا بہت وسیع ہے۔ جس میں تاریخ، تہذیب، فلسفہ، مذہب، انسانیت، انسان اور اس سے متعلق ہر چیز ان کا موضوع ہے۔

---

(۱) فتح محمد ملک، پروفیسر، پیش لفظ مشمولہ *قرۃ العین کا تصور تاریخ و تہذیب* ڈاکٹر رحمت علی شاد (لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۱۷ء) ص۷

(۲) محی الدین بمبئی والا، پروفیسر، *قرۃ العین ایک مطالعہ* (گجرات: ساتینہ اکادمی، ۱۹۹۹ء) ص۱۰

میرے بھی صنم خانے قرۃ العین حیدر کا پہلا ناول ہے جو ۱۹۴۹ء میں شائع ہوا۔ ناول کا عنوان انہوں نے اقبال کے اس شعر سے لیا ہے۔

میرے بھی صنم خانے، تیرے بھی صنم خانے
دونوں کے صنم خاکی، دونوں کے صنم فانی

قرۃ العین حیدر نے ناول کو تین حصوں تراشیدم، پرستیدم اور شکستم میں تقسیم کیا ہے۔ ناول کی کہانی غیر منقسم ہندوستان کے آخری دور سے لے کر ۱۹۴۷ء میں آزادی کے فوراً بعد تک کے احوال پر مبنی ہے۔

یہ ناول لکھنؤ کے ایک خاص طبقے ''تعلقہ دار'' کی زندگی کو موضوع بناتا ہے۔ اودھ کے یہ تعلقہ دار ایک جداگانہ طبقہ تھا۔ یہ طبقہ قدیم وجدید تہذیبی روایات کا حامل تھا۔ یہ وہ روادار طبقہ تھا جس میں ہندو مسلم کی تفریق نہیں تھی۔ ان کی زندگی اس مشترک ہندو مسلم تہذیب کی آئینہ دار تھی جو کئی صدیوں کے بعد ہندو مسلم کے باہمی اشتراک سے پروان چڑھی تھی۔ ان کے یہاں اگر کوئی تفریق تھی تو تعلقہ دار اور غیر تعلقہ دار یعنی معاشی بنیادوں پر تھی۔ دوسرے لفظوں میں یہ ناول اودھ کی مٹتی ہوئی زوال پذیر ثقافتی اور تہذیبی اقدار کی عکاسی کرتا ہے اور اس تہذیب سے منسلک لوگوں کی ذہنی، نفسیاتی کیفیات اور بحران کو موضوع بناتا ہے اور اس بحرانی صورتحال نے جن رویوں کو جنم دیا وہ اس ناول میں ملتے ہیں۔

اس ناول کا مرکزی کردار رخشندہ ہے جو کانونٹ کی تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے خاندان کی روایات کی امین ہے۔ تعلقہ داروں کے مسلم گھرانے سے اس کا تعلق ہے۔ اس کی زندگی بے فکری اور آزاد خیالی سے عبارت ہے۔ رقص گاہوں، کلبوں، پارٹیوں کی شائق ہونے کے ساتھ ساتھ وہ اپنے سماج کی خدمت کی کر رہی ہے۔ رخشندہ کا کردار اپنے پورے طبقے کی نوجوان نسل کا نمائندہ کردار ہے کیونکہ اس کے دوستوں کے حلقے میں ڈائمنڈ، گنی، کرسٹابل، راجہ حفیظ احمد، پی جو کرن، ومل، فیروز شامل ہیں مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے یہ نوجوان غفران منزل میں جمع ہو کر گوسپ کرتے ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ پڑھے لکھے باشعور انسان ہیں۔ جو اپنے مسائل کا ادراک رکھتے ہیں۔ یہ کردار اپنی ذات کے اسیر بھی ہیں۔ یہ اسیری انھیں کھل کر اظہار محبت کرنے سے روکتی ہے۔ رخشندہ سلیم سے محبت کرتی ہے لیکن اس کا اظہار نہیں کرتی۔ محبت تقریباً ان سب کا مشترکہ مسئلہ ہے اور ناکامی ان سب کا مقدر رہے۔

ان کی زندگیاں افسانوی انداز کی ہیں۔ ہنسنا گانا، پارٹیاں کرنا، لیکن تقسیم ہند ایک بڑے طوفان کی صورت میں ان کی زندگیوں کو اتھل پتھل کر کے رکھ دیتی ہے اور ان کے ذہنی اور فکری رویوں پر بری طرح اثرانداز ہوتی ہے یعنی یہ ایک ایسا واقعہ ہے جس نے ان کی تصورات کی دنیا کو درہم برہم کر ڈالا ہے اور حسین مستقبل کے خوابوں کو چکنا چور کر دیا۔

اس حوالے سے ڈاکٹر عبد الغنی لکھتے ہیں:

”جنگ عظیم اور تقسیم ہند کی بلائے ناگہانی نے تصور کے سارے صنم خانوں کو پاش پاش کر دیا۔ ایسا معلوم ہوا کہ سرزمین ہند میں ارتقائے انسانی کی رفتار رک گئی ہے اور ایک محیط طوفان نے زندگی کے سارے آثار مٹا دیئے ہیں۔ مستقبل کی تمام آرزوئیں تباہ ہو چکی ہیں۔ گذرے ہوئے وقت کے لمحات ضائع ہو چکے ہیں۔ کائنات فنا کے قریب آچکی ہے۔“[۱]

خود قرۃ العین کے نزدیک تقسم ہند کے اثرات کیا تھے:

”۱۹۴۷ء میں برصغیر کی تقسیم عمل میں آئی۔ والد مرحوم کی وفات کے بعد میرے لیے یہ دوسرا زبردست ذہنی صدمہ تھا۔ ہندوستان کے بٹوارے نے ۴۷ کے آخر میں ساڑھے انیس سال کی عمر میں مجھ سے میرے بھی صنم خانے لکھوایا جو میرا پہلا ناول تھا۔ اس کے بعد میں نے جو کچھ لکھا اسی صدمے کے زیر اثر لکھا۔“[۲]

رخشندہ کے کردار کے ذریعے قارئین ۱۹۴۷ء میں ہونے والی تقسیم کے متعلق اس وقت کے پڑھے لکھے باشعور نوجوان طبقے کے خیالات سے آگاہ ہوتے ہیں جس کی ساری شخصیت کی تعمیر متحدہ ہندوستانی شناخت سے ہوئی تھی۔ مصنفہ نے حقیقت پسندی سے ہندو مسلم فسادات کو بیان کیا ہے لیکن ان فسادات کی ذمہ داری اس نے مسلم لیگ اور مسلم رہنماؤں کے سر ڈالی ہے اور نہرو گاندھی جیسے ہندو رہنماؤں کو ہیرو کے طور پر پیش کیا ہے۔ مسلم لیگی رہنماؤں کو موقع پرست کے طور پر پیش کیا ہے اور اس سارے المیے سے یہ نتیجہ اخذ کیا:

”تہذیب کے مرکزوں اور گہواروں میں پلنے والے دربدر کی ٹھوکریں کھانے کے لیے صحراؤں کی طرف نکل گئے۔ امام باڑے ویران اور مسجدیں شکستہ ہو گئیں۔ پرانے خاندان مٹ گئے۔ زندگی کی پرانی قدریں خون اور نفرت کی آنکھوں کی بھینٹ ہو گئیں۔ ایک عالم تہہ و بالا ہو گیا۔ وہ تہذیب، ہندوؤں اور مسلمانوں کا وہ معاشرتی اور تمدنی اتحاد وہ روایات وہ زمانے سب ختم ہو گیا۔“[۳]

---

(۱) عبد الغنی، ڈاکٹر، *قرۃ العین حیدر کا فن* (نئی دہلی: ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۸۵) ص ۲۵

(۲) ماہنامہ نصرت، فروری ۱۹۶۴ بحوالہ اسد ایوب نیازی، *قرۃ العین حیدر کی ناول نگاری*، (لاہور: گورنمنٹ کالج شعبہ اردو ۱۹۸۹) ص ۲۶

(۳) قرۃ العین حیدر، *میرے بھی صنم خانے* (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۴) ص ۹

قرۃ العین کی اردو ادب کے ساتھ ساتھ انگریزی ادب پر بھی گہری نظر تھی۔ انہوں نے کئی انگریزی ناولوں کے اردو تراجم بھی کیے ہیں۔ ان کے ناولوں میں مقامی روایات کے ساتھ ساتھ مغربی روایات کا ایک خوبصورت امتزاج نظر آتا ہے۔ ان کی زبان میں گہرا تہذیبی رچاؤ موجود ہے، جہاں انہوں نے منظر کشی کی ہے وہاں ان کی نثر شاعرانہ اور خوبصورت ہے۔

مغربی ادبی روایت کے زیر اثر قرۃ العین حیدر کے ہاں شعور کی رو کی تکنیک کا استعمال ملتا ہے۔ قرۃ العین کے ہاں جیمز جوائس اور ورجینا وولف کے اثرات کا سراغ کئی ناقدین نے لگایا ہے

اس ناول میں بے شمار کردار ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ان سب کی طبائع ایک دوسرے سے مختلف ہیں لیکن یہ کردار نہ تو جمود کا شکار ہیں اور نہ ہی منفعل کردار ہیں۔ یہ اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس طبقے میں جنس کے بارے میں غیر معمولی اظہار نہیں ملتا۔ یہ کردار ہلکے پھلکے رومانس کے قائل ہیں لیکن کھل کر اظہارِ محبت نہیں ہے۔ میرے بھی صنم خانے میں سبھی لڑکے لڑکیاں آپس میں بے تکلف دوست ہیں۔

یہ کردار سیاسی، رفاہی اور سماجی معاملات میں دلچسپی بھی تفنن طبع کے لیے لیتے ہیں لیکن تقسیم ایسا واقعہ ہے جس نے ان کے خوابوں کو چکنا چور کر دیا۔

قرۃ العین حیدر نے اس ناول میں تقسیم ہند اور دو قومی نظریے کی مخالفت کی ہے۔ رخشندہ کے کردار کے ذریعے ہم قرۃ العین حیدر کے نظریات سے آگاہ ہوتے ہیں جس نے اپنی ساری شناخت ہندوستانی قومیت اور ایک قومی نظریے سے وابستہ کی ہوئی ہے۔

قرۃ العین حیدر اردو ناول کا ایک معتبر نام ہیں۔ انہوں نے جس دور میں ہوش سنبھالا وہ دوسری جنگ عظیم اور پھر اس کے بعد برصغیر میں سیاسی افراتفری، ہنگامہ خیزی کا دور تھا۔ غیر ملکی قبضے کے خلاف کانگریس اور مسلم لیگ کی جنگ شدت سے جاری تھی اور فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو چکی تھی۔ پھر تقسیم کا واقعہ پیش آیا جس کے نتیجے میں مذہب کے نام پر انسانیت کو ذبح کر دیا گیا۔ ظلم و بربریت اور حیوانیت کا وہ ننگا ناچ ناچا گیا کہ جس نے ہر حساس دل کو خون کے آنسو رونے پر مجبور کر دیا۔ یہی وہ دور تھا جس میں جدید عالمگیریت کے نقش و نگار واضح ہوتے گئے تھے۔ یورپ کے صنعتی انقلاب کو بھی ایک طویل عرصہ گزر چکا تھا اور تاریخ عالم نے پہلی اور دوسری عظیم جنگوں کی صورت میں جو تباہی و بربادی کے خونچکاں منظر دیکھے اس کے پیچھے بھی دراصل بڑی صنعتی طاقتوں کے معاشی مفادات پوشیدہ تھے اور یہ جنگیں دراصل زیادہ سے زیادہ منڈیوں پر قبضے کے لیے لڑی گئیں لہٰذا اس دور میں جو بھی ادب تخلیق کیا گیا اس میں ایک طرف تو انسان کے ان فلسفوں اور نظریوں کے قلعے مسمار کر دیے جن کے تحت انسان زمین اس کائنات کا کلی مرکز اور اشرف المخلوقات تھا اور تمام مسائل کا حل اس کی دسترس میں تھا لیکن ان جنگوں نے انسان کے ان فکری مغالطوں کو اڑا کے رکھ دیا اور اب وجودیت جیسے فلسفے سامنے آئے اور فکری دنیا جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے فلسفوں کی روشنی میں ادب کی تشریح و توضیح کی طرف مائل ہوئی۔ اس کے ساتھ ادب

میں طبقاتی تقسیم پسماندہ طبقے کے مسائل اور عالمگیریت کے مظاہر اپنی جگہ پانے لگے۔ قرۃ العین کے ہاں بھی جو تہذیب و ثقافت نظر آتی ہے وہ ہندوستان کے طبقہ امراء کی ثقافت ہے جو عالمگیریت کے اثرات سے براہِ راست متاثر ہوئی۔

مثال کے طور پر ان کے ناول میرے بھی صنم خانے میں جو نوجوان نسل پیش کی گئی ہے ان کی تربیت یورپین گورنسیں کرتی ہیں۔ ان کا طرز زندگی مغربی طرز زندگی کا عکس نظر آتا ہے اور کہیں سے بھی یہ ایک ہندوستانی معاشرہ نظر نہیں آتا ہے مثلاً ناول میں جابجا ڈانس پارٹیوں، کلبوں، انگریزی تعلیمی اداروں کا تذکرہ ملتا ہے۔ شراب ان کی زندگی کا لازمہ ہے۔

> "ڈوک چلو ناچیں۔ آج تو چھٹی کی رات ہے۔ بالکونی میں ناچ کے لیے سازوں نے جاز کی ایک دھن چھیڑ دی۔ شراب کے گلاس اونچے کیے گئے۔ برطانیہ کے لیے، روس کے لیے، امریکہ کے لیے، شیشے ایک دوسرے سے ٹکرائے، ناچ شروع ہوا۔" (۱)

ناول کی مرکزی کردار رخشندہ بھی اسی ماحول کی پروردہ ہے۔ اسے بھی ایسی رقص و سرود کی محافل سے احتراز نہیں۔

> "دوسرا ناچ شروع ہوا تو وہ اس کے قریب گیا۔ اسے اپنی طرف مخاطب دیکھ کر وہ خود ہی اٹھ کھڑی ہوئی اور خاموشی کے ساتھ ٹیرس پر آکر ناچ میں شامل ہو گئی... اس سیاہ آنکھوں والے خوبصورت اور مغرور اجنبی کے ساتھ ساتھ ناچ کے قدم رکھتے ہوئے اس نے سوچا: 'واہ بھئی، ریگستانوں اور پہاڑیوں کے اتنے طویل اور پریشان کن سفر کے بعد اس خوشگوار رات کی خنکی کتنی اچھی معلوم ہو رہی ہے۔' وہ ایک ہلکا پھلکا شب بخیر کہہ کر اس کے بازوؤں سے الگ ہو گئی۔" (۲)

اس ناول میں جہاں موسیقی کی بات ہوتی ہے تو وہاں مقبول مغربی میوزک جاز کا حوالہ آتا ہے یا پھر اگر کوئی کردار کوئی گیت گنگناتا بھی ہے تو اسے اردو یا ہندی یا مقامی زبان میں نہیں بلکہ انگریزی گیت ہی گنگناتا ہے، والز کرتا ہے۔ (۳)

"دور کشتی میں بیٹھی ہوئی کوئی لڑکی گانا شروع کر دیتی۔ او مائی ڈارلنگ کلمنٹائن یا اولڈ فوکس ایٹ ہوم یا فیئر دی ویل مائی فیری فے... "(۴)

یہاں اس ناول میں اس دور کی ذہنیت کے عین مطابق انگریزی طور طریقے اور انداز نشست و برخاست کو مہذب ہونے کی علامت ہیں۔

---

(۱) قرۃ العین حیدر، *میرے بھی صنم خانے*، ۹۔۱۰

(۲) ایضاً، ص۲۹

(۳) ایضاً، ص۳۸۷

(۴) ایضاً

"انگریزی تعلیم بھائی جان! صحیح تلفظ... ڈنر ٹیبل کے قاعدے یہ سب سکھانے کے لیے تمہیں اپنے بچوں کو انگریزی سکولوں میں بھیجنا چاہیے..." (۱)

کنور صاحب نے ولایت سے آنے کے بعد اپنے مصاحب سے کہا تھا۔ یہ وہ ذہنی غلامی تھی جس کی بنا پہ اس وقت بھی انگریز آقا اپنے غلاموں کے ذہن میں پیدا کر کے چند ہزار انگریزوں کی مدد سے کروڑوں ہندوستانیوں کو غلام بنا کے رکھ دیا تھا۔

آج بھی طاقتور ذرائع ابلاغ یورپین اور امریکن طرز زندگی کو فروغ دینے کے لیے ذہن سازی کر رہا ہے۔ خواہ کوئی افریقہ کا شہری ہو یا ایشیا کا۔

اس حوالے سے ڈاکٹر سید جاوید اختر لکھتے ہیں۔

"قرۃ العین حیدر کے ابتدائی دونوں ناولوں میں اودھ کی اینگلو انڈین تہذیب کی داستانِ عروج وزوال بیان کی گئی ہے۔" (۲)

اس تہذیب کو اینگلو انڈین تہذیب کا نام دیں یا موجودہ عالمگیریت کی پیش کردہ تہذیب کہہ لیں ایک ہی بات ہے کیونکہ عالمگیریت کا منشا بھی ایک ایسی مشترکہ تہذیب ہے جس میں غالب عناصر یورپین بلکہ امریکن تہذیبی عناصر ہوں گے اور جو تمام دنیا کے لیے قابل قبول ہو۔ عالمگیریت کے ادبی اثرات کے حوالے سے ڈاکٹر سید عبداللہ کے اظہار خیال کو ڈاکٹر سید جاوید اختر اپنے مضمون کا حصہ بناتے ہیں۔

"قرۃ العین حیدر کے دو ناول "میرے بھی صنم خانے" اور "سفینہ غم دل" دراصل مغرب کے بعض تجربات اور بعض مغربی مصنفین مثلاً پروست، جوائس، کونراڈ اور ورجینیا وولف وغیرہ کے خیالات اور نمونوں کی تقلید ہے۔ ان تجربات سے فائدہ اٹھا کر انہوں نے اردو ناول کی توسیع میں حصہ لیا ہے۔" (۳)

ڈاکٹر سید عبداللہ کی یہ رائے نہایت درست اور وقیع ہے۔ دیگر کئی محققین اور ناقدین نے بھی قرۃ العین حیدر کے ہاں ان اثرات کو بیان کیا ہے۔

کیونکہ قرۃ العین حیدر کی آمد سے اردو ناول کا مزاج بالکل تبدیل ہو کر رہ گیا۔ وہ ایک نئے اسلوب ایک نئے ذائقے سے آشنا ہوا غالباً اس کی وجہ مصنفہ کا مغربی ادب کا مطالعہ تھا۔ جس نے ان کے شعور کو پختگی، اسلوب کو ایک منفرد رنگ و آہنگ عطا کیا۔ اگرچہ ان کے اسلوب پر اعتراضات بھی کیے گئے۔

---

(۱) قرۃ العین حیدر، *میرے بھی صنم خانے*، ۹۔۱۰

(۲) سید جاوید اختر، ڈاکٹر، تحت الشعور کی بازگشت مشمولہ سطور قرۃ العین حیدر کا خصوصی نمبر مرتبہ سید عامر سہیل (لاہور: بیکن بکس، ۲۰۰۳) ص ۶۵۲

(۳) *سطور، قرۃ العین حیدر خصوصی مطالعہ*، ص ۶۵۲

ہمایوں ظفر زیدی لکھتے ہیں۔

"قرۃ العین حیدر نے برطانوی عہد میں پرورش پائی۔ اس لیے ان کی ذہنی وابستگی برطانوی کولونیل عہد اور اس دور کے ہندوستانی معاشرے کی قدروں سے ہے۔ لہٰذا انہوں نے اس عہد اور معاشرے کی تہذیب کی جیتی جاگتی تصویریں اپنی تحریروں میں پیش کی۔" [۱]

لیکن ان کے اسلوب کو بہت سے لوگوں نے خراج تحسین پیش کیا ہے۔

"قرۃ العین حیدر کو زبان وبیان پر قدرت حاصل ہے۔ وہ جس طرح چاہتی ہیں الفاظ کو اپنے جملوں میں استعمال کرتی ہیں۔ ان کی تحریروں میں ہندی، انگریزی اور فارسی کے الفاظ شامل ہوتے ہیں۔ وہ متعدد زبانوں کے الفاظ کا استعمال بڑی خوبی سے کرتی ہیں کہ وہ ذہن پر گراں نہیں گزرتے۔" [۲]

عالمگیریت کے زبان وبیان پر گہرے اثرات قرۃ العین کے ہاں انگریزی زبان کے الفاظ کی صورت میں دیکھا جا سکتا ہے۔ بہت سے نقادوں نے اس جانب اشارہ کیا ہے اور اس پر اعتراض بھی کیا ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر سید جاوید اختر اپنے مضمون تحت الشعور کی بازگشت میں لکھتے ہیں۔

"انگریزی الفاظ کی البتہ قرۃ العین حیدر کے ہاں بھرمار ہے اور ان کے نقادوں نے اس چیز پر اعتراض کیا۔ متعدد جگہ تو وہ غیر ضروری طور پر انگریزی زبان کو استعمال کرتی ہیں۔ یہ سقم ان کے پہلے دو ناولوں میں زیادہ ہے۔ مثال کے طور پر سفینہ غم دل کے صفحہ نمبر ۳۷۳ پر درج عبارت میں سے محض دو تین سطریں ملاحظہ ہوں۔ "ہر چیز کا تجزیہ کر کے اسے پاتال پہنچا دیا گیا ہے۔ محبت بکواس تھی اور محض فکشن۔ ساری کمزوریاں Inhibitions کا نتیجہ تھیں۔ جرائم اور غلطیوں کی بنا پیتھالوجیکل تھی۔" [۳]

قرۃ العین حیدر نے اپنے اس ناول کے ذریعے طبقہ اشرافیہ کی خوشحال زندگی کے نقوش پیش کیے ہیں کیونکہ وہ خود بھی اسی طبقے سے تعلق رکھتی تھیں۔ انھیں اپنے طبقے میں موجود تضادات کا احساس ضرور تھا لیکن اس کے باوجود ان کی ہمدردیاں اسی طبقے کے ساتھ تھیں۔ وہ کھل کر اس طبقے اور ان تضادات کی مخالفت نہیں کر سکتی تھیں۔ اصل میں یہ سارا معاملہ احساس برتری کا تھا۔ اپنے طبقے کی روایات، اپنی تہذیب، اپنی اقدار کے حوالے سے تفاخر کا احساس ان کے یہاں موجود تھا اور یہ ناول دراصل اس تہذیب کے زوال کا نوحہ ہے۔

---

(۱) ظفر زیدی، ہمایوں، *قرۃ العین حیدر شخصیت وفن* (لاہور: دارالشعور۔ ۲۰۱۵ء) ص ۱۲۳

(۲) ایضاً

(۳) سید جاوید اختر، ڈاکٹر، *سطور قرۃ العین حیدر خصوصی مطالعہ*، ص ۶۶۹

ناول کے ابتدائی تین صفحات میں ناول کے تقریباً تمام اہم کردار کو متعارف کروایا گیا اور یہ تعارف اس انداز سے کروایا گیا ہے کہ قاری پڑھتے ہی اس کردار کو اس کے طبقے کے حوالے سے شناخت کر لیتا ہے۔ مثلاً ڈاکٹر سلیم کا کردار (متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والا انسان)، شہلا رحمن (متوسط طبقے کی نمائندہ)، کنور عرفان علی، رخشندہ بیگم، کنور رانی، پی چو، پولو (سب اس جاگیردانہ طبقے سے تعلق رکھنے والے نئی تہذیب سے متاثر خاندان)۔ کرن، ومل، گنی، ڈائمنڈ، کرسٹامل اور راجہ حفیظ احمد پی چو اور رخشندہ کے مشترکہ دوست۔ خورشید (چھوٹے کنور کا بیٹا) جو مارکسزم سے شدید طور پر متاثر، خورشید کی بہن قمر النسأ اور دیگر کرداروں میں ڈاکٹر لینا دینا اور خاندانی ملازم جو مسلم اور ہندو دونوں ہیں۔

رخشندہ بیگم عرف روشی اس ناول کا کبیری کردار ہے اور اعلیٰ طبقے کا نمائندہ بھی۔ اس طبقے کی تمام روایات واقدار سے مزین اور اس طبقے کے مشاغل کی شائق۔ یہ ایک Intellectual کردار ہے۔ جس کا Intellectualism متوسط طبقے کے Intellectualism سے بالکل مختلف ہے۔ جس پر قرۃ العین حیدر طنز کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ اس کردار میں خود مصنفہ کے کردار کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔

یہ ناول اپنے عہد کے معاشرے کا ایک معروضی مطالعہ پیش کرتا ہے جس کے کردار اپنے طبقے کی خصوصیات کے ساتھ نمودار ہوتے ہیں۔ مثلاً کنور عرفان علی کا کردار جو اعلیٰ طبقے کی منہدم ہوئی تہذیب کا مکمل المیہ نظر آتا ہے۔ اس دور میں اعلیٰ طبقے اور نچلے طبقے کے درمیان متوسط طبقہ ابھر رہا تھا۔ جس کی اپنی روایات اور کمپلیکسز تھے۔ اعلیٰ طبقے کے لیے ناپسندیدہ طبقہ۔ کنور عرفان علی کے خیالات اس طبقے کے متعلق دراصل ان کی کلاس کے خیالات تھے مثلاً انھیں چند چیزوں سے بے پناہ نفرت تھی۔ مثلاً وہ ان حقیر نو دولتیوں کا ناقابل معافی وجود کسی طرح برداشت نہ کر سکتے تھے جنھیں اب تکلفاً اوپری یا متوسط طبقہ کہا جاتا ہے۔ اس طبقے نے ہر ملک میں ہر جگہ اور ہر زمانے میں بڑی گڑبڑ پھیلائی ہے۔ بڑی بڑی گستاخانہ جرأتیں کی ہیں۔ اس لڑتی جھگڑتی خود غرض کاروباری، بورژوار دنیا میں سب سے الگ تھلگ صرف اپنے طبقے کے مٹھی بھر افراد کے ساتھ وہ پرانی تہذیب پرانی روایات کے ورثے کو لیے بیٹھے تھے۔

اسی طرح رخشندہ کا کردار بھی تضاد کا مجموعہ ہے۔ وہ جدید تعلیم سے آراستہ نوجوان نسل کی نمائندہ اور بڑے بڑے آدرشوں کی حامل ہے لیکن جہاں بات طبقاتی تقسیم کی آتی ہے۔ وہاں اس کی سوچ بھی باپ اپنے سے مختلف نہیں۔

"جب وہ سب قہوے کی پیالیاں لینے کے لیے پینٹری کی طرف جا رہی تھیں۔ اس وقت رخشندہ نے اس گھنگھریالے بالوں اور چینی رنگت والی لڑکی کو دیکھا جو بے حد کوشش سے بن بن کر کچھ لوگوں سے گفتگو میں مصروف تھی۔" [۱]

شہلا کے متعلق بناوٹ کا یہ تاثر رخشندہ کے ذہن میں پیدا ہوتا تھا۔ اس میں طنز بھی موجود ہے اور اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اشرافیہ، متوسط طبقے کو اپنی عینک سے دیکھ کر ناپسندیدگی کا اظہار کرتی تھی۔ طبقاتی بنیادوں پر ناپسندیدگی کا یہ تعلق دو طرفہ ہے۔ اس کا اظہار ڈاکٹر سلیم کے کردار کے ذریعے ہوتا ہے۔ جو خود متوسط طبقے سے تعلق رکھتا ہے لیکن غفران منزل کے باسیوں سے اس کا ملنا

---

[۱] قرۃ العین حیدر، میرے بھی صنم خانے، ص ۹۶

جلتا ہے۔ ان کی پارٹیوں میں شامل ہوتا ہے۔ رخشندہ بیگم کو پسند بھی کرتا ہے مگر اشرافیہ کے معاملے میں اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرتا ہے۔

"وہ بے چینی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ یہ بے کار، بے مصرف امیر زادے جو اسی طرح کلبوں میں سگار کے دھوئیں اڑاتے اور کوک ٹیل کے گلاس خالی کرتے کرتے سوسائٹی کے اسکینڈلز پر زندہ رہتے ہوئے اپنی عمریں بتاتے ہیں۔ وہ ان کی اس دنیا سے اتنا عاجز تھا۔" [1]

اس ناپسندیدگی کے باوجود وہ اس طبقے سے قطع تعلق بھی نہیں کرتا۔ ان کی پارٹیوں میں شامل ہو کر وقت گذاری بھی کرتا ہے اور اس طرح سے دوہرے پن کا شکار ہے۔

ایک تیسرا طبقہ یعنی کہ نچلا طبقہ بھی ناول میں موجود ہے جو ملازمین پر مشتمل ہے لیکن یہ اس طبقے کی خصوصیات میں وفاداری اور خدمت گذاری کے علاوہ کچھ اور ظاہر نہیں کیا گیا۔

طبقاتی تقسیم اگرچہ ہر دور میں موجود رہی ہے لیکن نوآبادیاتی دور میں انگریزوں کو اپنے قدم مضبوطی سے جمانے کے لئے اس تقسیم کو مزید گہرا کیا۔

---

(۱) قرۃ العین حیدر، میرے بھی صنم خانے، ص ۱۴۸

# سفینہ غم دل

قرۃ العین حیدر کا دوسرا ناول سفینہ غم دل ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا۔ سفینہ غم دل میں بھی ان کے پہلے ناول میرے بھی صنم خانے کی طرح کولونیل دور کے ہندوستان کے اعلیٰ طبقے کے پڑھے لکھے اور ماڈرن تہذیب کے پروردہ نوجوان طبقے کے آدرشوں، تصورات اور عزائم کی شکست و ریخت اور ان کے انفرادی داخلی انتشار کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس شکست و ریخت کے پس منظر میں تقسیم کا المیہ کارفرما نظر آتا ہے۔ یہ ناول مصنفہ کے مخصوص تصورات، ان کے ماحول اور تہذیبی صورتحال کا عکاس ہے۔

اس ناول کے کردار مختلف مذاہب سے تعلق رکھتے ہیں لیکن وہ پڑھے لکھے اور ایک مشترک تہذیب کے امین ہیں۔ اس کے حوالے سے وہ خود لکھتی ہیں:

> ''ہندوستان کے اوپری متوسط طبقے کی یہ وہ نسل تھی جو انگریزی کورسوں اور مورس ناچوں کے زیر سایہ پروان چڑھی۔ عجب ترحم انگیز اور مضحکہ خیز دوراہے پر یہ لوگ زندہ رہتے تھے۔ اپنے آپ کو پرانی فیوڈل تہذیب کا وارث بھی گردانتے تھے اور ہر وقت اپنی تعریف میں مصروف رہتے تھے۔'' (۱)

ناول کی ابتدا اس دور سے ہوتی ہے جو ہندوستان میں سیاسی، سماجی انتشار کا دور تھا۔ ملک کی آزادی کی جنگ آخری مرحلے میں داخل ہو چکی ہے۔ ۱۹۴٦ء کا دور۔ اس دور میں تہذیبی و معاشرتی اقدار کی شکست و ریخت فرد کے اندر اضطراب کو جنم دے رہی تھی۔ اس حوالے سے ڈاکٹر عبدالغنی لکھتے ہیں۔

> ''یہ ایک مثالیت پسند نئی نسل کی شکست آرزو کی پردرد داستان ہے۔ جس میں مصنفہ اور اس کے ہم عصروں کے شیریں خوابوں اور ان کی ہولناک تعبیروں کا بیان ہے۔'' (۲)

اس میں پیش کردہ کردار لکھنؤ کے چار مختلف گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں جن میں مذہبی تفاوت کے باوجود تہذیبی اشتراک موجود ہے۔ اسی بات کی طرف مصنفہ نے ناول میں اشارہ کیا ہے۔

> ''علی اور ارون کے کمرے بالکل ایک سے ہیں۔ جن دو لڑکوں نے چار سال کی عمر سے لے کر اب تک ساری زندگی اکٹھی بتائی ہو ان کے کمروں سے انفرادیت باقی رہ جانے کا امکان بھی پیدا نہیں ہوتا۔'' (۳)

---

(۱) قرۃ العین حیدر، سفینہ غم دل، (لاہور: سنگِ میل، ۱۹۹۹ء) ص ۱۹۳

(۲) عبدالغنی، ڈاکٹر، قرۃ العین حیدر کا فن (نئی دہلی: ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۸۵ء)، ص ۵٦

(۳) قرۃ العین حیدر، سفینہ غم دل، ص ۱٦۲

قرۃ العین حیدر اپنے عہد کی ہند اسلامی تہذیب اور اس تہذیب میں انگریزی تہذیب کی آمیزش سے پیدا ہونے والی معاشرت کی عکاسی کرتی ہیں۔ اس ناول کے کردار اسی زوال پذیر ثقافت کی عکاسی کرتے ہیں۔

لیکن ان کے اس ناول پر مزید بات کرنے سے پیشتر پروفیسر عبدالسلام کے مضمون قرۃ العین حیدر اور ناول کا جدید متن کا حوالہ دینا ضروری محسوس ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "قرۃ العین حیدر کے نام کے ساتھ ہی لوگوں کی زبان پر ناول کے جدید دور اور شعور کی رو کا تذکرہ آجاتا ہے۔"(۱)

پھر وہ نئے اور پرانے انداز کے مابین فرق کی وضاحت کرتے ہیں کہ پرانے فن میں مصنفین عموماً اپنے کردار کے خارجی عمل کو توجہ کا مرکز بناتے تھے اور اس عمل کو زیر بحث لاتے تھے جبکہ اس عمل کے محرکات یا کردار کی نفسیات کا حوالہ ضمنی طور پر دیا جاتا تھا جبکہ جدید فن میں کردار کے خارج کی بجائے اس کے باطن، اس کی نفسیات اور اس کے ذہن کو اولین دی جاتی ہے۔ یہاں وہ Rober Hemphrey کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان کے مطابق قدیم ناول نگار کی توجہ What one does جبکہ جدید ناول نگار کی توجہ What one is پر رہتی ہے۔ اب اس What one is کو پیش کرنے کے لیے جدید ناول نگار شعور کی رو کی تکنیک اپناتے ہیں۔ یہی تکنیک قرۃ العین حیدر اپنے پہلے ناول میرے بھی صنم خانے اور اس دوسرے ناول سفینہ غم دل میں اپناتی ہیں۔ شعور کی رو والے ناولوں میں عموماً کوئی منظم پلاٹ یا دلچسپ مربوط قصہ نہیں ہوتا۔ یہاں تو سب کچھ کردار کا نفس ہوتا ہے۔ کہانی برائے نام ہوتی ہے۔ یہی بات قرۃ العین حیدر کے ناولوں کے بارے میں کہی جاتی ہے کہ ان میں مربوط پلاٹ کی بجائے کردار ہوتے ہیں اور ان کی نفسی کیفیات ہوتی ہیں۔ کہانی ہو بھی نہیں سکتی کیونکہ شعور کی سطح پر جو خیالات نمایاں ہوتے ہیں وہ آسمان پر چمکنے والی بجلیوں کی طرح ہوتے ہیں۔ ان میں آپس میں کوئی ربط نہیں ہوتا ان میں صرف ایک تعلق ہوتا ہے جسے آزاد تلازم خیال (Free Association of Ideas) کا نام دیا گیا ہے۔

اس حوالے سے دیکھا جائے تو قرۃ العین حیدر اردو ناول کی عظیم مصنفہ ہیں جنہوں نے مغربی ادب کا بغور مطالعہ کر کے اس کا اثر قبول کیا اور پھر اسے سلیقہ مندی کے ساتھ اردو ناول کا حصہ بنا دیا چنانچہ شعور کی رو کے استعمال کے حوالے سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ عالمگیریت کے اثرات ہی تھے جنہوں نے مواد کی پیش کش کا اسلوب تبدیل کر کے اردو ناول کو جدت سے ہم کنار کیا اور اسے عالمی ادب کے ہم پلہ لا کھڑا کیا۔

سفینہ غم دل میں انہوں نے ۱۹۴۷ء کا ہندوستان نہایت موثر انداز میں پیش کیا ہے۔ یہ ناول بھی اس تاثر کو تقویت دیتا ہے کہ وہ تقسیم کے المیے سے خود کو آزاد نہ کرا سکیں اور تقسیم کے نتیجے میں پیش آنے والی انسانی ٹریجڈی نے ان کے باطن میں جس کرب کو جنم

---

(۱) عبدالسلام، پروفیسر قرۃ العین حیدر اور ناول کا جدید فن مشمولہ سطور قرۃ العین حیدر خصوصی مطالعہ (ملتان: بیکن بکس ۲۰۰۳ء) ص ۶۰۷

دیا، اسی کے اظہار کے لیے یہ ناول لکھا گیا۔ اس ناول میں کوئی دلچسپ کہانی نہیں ہے بلکہ اودھ کی تہذیب ہے اور اس کی شکست وریخت کا نوحہ ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ناول میں مصنفہ نے اپنے والد کی وفات کے کرب کو بھی بیان کیا ہے۔ اس طرح اس ناول میں قرۃ العین حیدر نے اجتماعی دکھ کے ساتھ ساتھ اپنی ذات کو بھی سفینہ غم دل میں بہت اچھے طریقے سے پیش کیا ہے لیکن انہوں نے غیر جانب داری اور وابستگی کو بھی برقرار رکھتے ہوئے حالات وواقعات کا مطالعہ و تجزیہ یا حقائق پر تبصرہ کیا ہے۔ اس طرح ناول میں مصنفہ کا سوانحی مواد بھی خاصی مقدار میں ملتا ہے اور ان کے والد سجاد حیدر یلدرم کا کردار، ان کی زندگی، ان دلچسپیوں، ان کے مشاغل کا ایک بھرپور بیان اس ناول میں موجود ہے۔ مجموعی طور پر ناول کا تاثر المیے اور افسردگی کا ہے۔ ملک کے حالات میں تیزی سے تبدیلی نے معاشرے کے معاشی، معاشرتی اور تہذیبی ڈھانچے کی چولیں ہلا کر رکھ دی تھیں۔ ایک بے یقینی کی فضا تھی۔ ایک دکھ کی کیفیت ہے۔ اس حوالے گلِ صبا لکھتی ہیں:

> ”اس ناول میں کوئی دلچسپ یا قابل توجہ کہانی نہیں بیان کی گئی۔ وہ یہاں بھی اودھ کی جاگیردارانہ تہذیب کے مٹنے کا نوحہ لکھنا چاہتی ہیں یہاں یہ سلسلہ خاصے عروج پر نظر آتا ہے۔ جس سے اکثر ترقی پسند نقاد قرۃ العین حیدر سے چڑ جاتے ہیں اور شکایت کرتے ہیں کہ جب ملک میں زمین دارانہ نظام کا خاتمہ ہوتا ہے تو قرۃ العین حیدر اس کا اتنے بڑے پیانے پر سوگ مناتی ہیں کہ انھیں تہذیب انسانی کا خاتمہ ہوتا نظر آتا ہے۔“(۱)

گل صبا کی رائے کسی حد تک درست ہے کیونکہ یہ جاگیرداری نظام ہی تھا جس کی بنیاد پر اودھ کی یہ مصنوعی مگر خوشنما عمارت استوار تھی۔ یہ نظام استحصالی نظام تھا۔ ایک طرف تو ان مقامی کاشتکاروں کی خون پسینے کی کمائی سے ان جاگیرداروں کے گودام بھرتے تھے۔ کسان بے چارہ اپنی جگہ پر تنگدست اور مقروض تھا لیکن جاگیردار طبقے کو پر تعیش زندگی میسر تھی۔ دوسری طرف یہ نظام غیر ملکی آقاؤں کے قدم جمائے رکھنے میں معاون تھا اور یہ تعلق دوطرفہ تھا۔ ان غیر ملکی آقاؤں کی سرپرستی میں یہ نظام پھلتا اور پھولتا اور رواں دواں تھا تو دوسری طرف یہ جاگیردار طبقہ آقاؤں کے مفادات کا محافظ و امین تھا۔

”'”پورب کے ضلعوں کا انتظام بہت خراب ہو رہا ہے سرکار...' دوسری موٹر میں دوپلی ٹوپی نے ابا جان سے کہنا شروع کیا۔ 'کورٹس آف وارڈز کی حالت بھی سقیم ہے۔ دراصل جب سے یہ گول میز کانفرنسوں اور عدم تعاون اور بائیکاٹوں کا سلسلہ شروع ہوا ہے زندگی کا نظام بالکل تہ و بالا ہوتا جارہا ہے۔ رعایا مفسد ہوگئی ہے۔ جب تک انگریز کا اقبال بھاری ہے۔ حضور ہم لوگ خیریت سے ہیں۔ ورنہ جانے کس روز کیا سے کیا ہو جاوے۔'“ (۲)

---

(۱) گل صبا، *قرۃ العین حیدر کے ابتدائی تین ناول ایک مطالعاتی تجزیہ* (دہلی: شاہد پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء) ص ۴۷

(۲) قرۃ العین حیدر، *سفینہ غم دل* (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز ۱۹۹۹) ص ۱۳

اسی نو آبادیاتی نظام کی بقا سے ہی اس جاگیر دارانہ نظام اور اس کی بنیاد پر قائم اس تہذیب کی بقا تھی۔ جس کی بربادی کا نوحہ قرۃ العین حیدر کے ناولوں میں ملتا ہے۔

یہ اس نو آبادیاتی نظام کے معاشی اثرات ہی نہ تھے جن سے یہ معاشرہ متاثر تھا بلکہ اس میں جو تہذیب پیش کی گئی ہے وہ بھی خالص ہندوستانی مسلم تہذیب نہیں ہے بلکہ وہ اینگلو انڈین تہذیب ہے۔ یہ اودھ کے معاشرے کا بالائی طبقہ ہے۔ جن کی زندگی کو مصنفہ نے موضوع بنایا ہے۔ یہ طبقہ اپنے رہن سہن، تہذیب و معاشرت، خورونوش، اپنے مشاغل، تفریح، اپنے فنون لطیفہ اپنے انداز فکر میں اپنے مربی اور سرپرست غیر ملکی حکمران طبقے سے متاثر اور ان کا ایک اچھا نقال ہے۔ اس حوالے سے اس ناول میں جابجا ایسی مثالیں بکھری ہوئی ہیں جو اس عالمگیریت کے تہذیبی اثرات کا بین ثبوت ہیں۔ مثال کے طور پر

''درختوں کے پرے عطیہ کے ہاں رتناواگز کا کارنیول بجا رہی تھی۔''[۱]

''چند گنے چنے خاندان تھے جو اوپری طبقے کی سوسائٹی کے منظر پر حاوی تھے۔ ان کے لڑکے ولایت جاتے اور اکثر جرمن یا فرنچ بیویاں لے کر آتے تھے... ایک آدھ بور قسم کی لڑکی لیڈز جا کر تعلیم کا ڈپلومہ لے کر آتی تھی اور اس کی تصویر السٹرٹیٹڈ ویکلی میں چھپتی تھی۔''[۲]

"اور اس صدی کے شروع میں سلطنت عثمانیہ کے اوپری طبقے کی طرح یورپین تہذیب اختیار کرنی شروع کر دی تھی۔ لڑکیاں پردے میں تھیں لیکن یورپین گورنسیں انہیں انگریزی پڑھاتی اور پیانو سکھاتی تھیں۔ امی اپنی شادی سے پہلے یعنی شاہ ایڈروڈ کے زمانے میں رائج الوقت ایڈورڈین وضع کے سائے پہنتی تھیں اور اپنے والد کے انتہائی مرصع قسم کے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر دوسری تہذیبی بہنوں سے خط و کتابت کرتی تھیں۔"[۳]

ناول میں ایسی کئی مثالیں موجود ہیں کہ ہندوستان کے بالائی طبقے نے حالات کی تبدیلی کے مطابق خود کو ڈھال لیا تھا۔ اور روایتی ہندو اور قدامت پسند مسلم معاشرے کی تہذیبی روایات کے برعکس ایک ایسا طبقہ وجود میں آ چکا تھا جو انداز و اطوار، نشست و برخاست غرض یہ کہ زندگی کے اکثر معاملات میں اس عالم گیر تہذیب کی نقالی میں اپنے لئے راہ فلاح دیکھ رہا تھا جو یہ نئے حکمران اپنے ساتھ لے کر آئے تھے۔

''قریب کی ایک میز پر الٰہ آباد کا ایک مشہور کنبہ بیٹھا تھا۔ 'بھابھی دلہن نے یہ پلکیں اب کی مرتبہ پیرس سے خریدی ہیں۔' ... ایک لڑکی تفریحی لہجے میں دوسری کو بتا رہی تھی۔ 'اے میاں سعید'... دوسری میز پر سے آفاق نے پکارا، 'ابھی ستار ہوٹل میں لیلا ڈیسائی

---

(۱) قرۃ العین حیدر، *سفینہ غم دل* (لاہور سنگ میل پبلی کیشنز ۱۹۹۹) ص ۲۲۰

(۲) ایضاً، ص ۲۱

(۳) ایضاً، ص ۲۴

کو کافی پلا کر آ رہا ہوں۔ غوث محمد سے میں نے کہا۔ بارے اسٹول پر بیٹھے بیٹھے اس نے اتنی وہسکی لی تھی کہ باہر پھیلی ہوئی خنک نقرئی دھوپ اس کی آنکھوں کو تکلیف دہ محسوس ہوئی۔'''[۱]

ناول نگار اس ناول کے ذریعے ایک ایسے ذہین طبقے کو پیش کرتی ہے جو نئی تہذیب کا نمائندہ ہے۔ جو حساس ہے۔ ملک و قوم کو درپیش مسائل کا ادراک رکھتا ہے اور بوقت ضرورت خود عملی طور پر ملک و قوم کی خدمت میں حصہ بھی لیتا ہے۔ جو مہذب ہے۔ کلبوں اور محفلوں میں بیڈ وائٹ ہارس جیسی شرابوں کا استعمال بے تکلف اور بے دریغ کرتا ہے۔

اس ناول میں پیش کردہ کردار اگرچہ انٹلکچوئل ہیں مثلاً فواد پڑھا لکھا ذہین انسان ہے لیکن شراب نوشی کرنے کے ساتھ ساتھ افیمچی ہے۔

علی کا کردار جاندار ہے لیکن کوئی بھی کردار دائمی تاثر چھوڑنے میں ناکام ہے۔ عالیہ بہت پڑھی لکھی اور ذہین خاتون ہے لیکن شادی کے معاملے میں بہت روایتی ذہن رکھتی ہے کہ اس کا منگیتر کوئی ایسا شخص ہونا چاہیے جو سید ہو۔ آئی سی ایس امتیاز کے ساتھ کیا ہو۔ لکھنؤ کا ہو۔ ان سب شرائط کا ایک ساتھ جمع ہونا مشکل ہے۔ اس لیے اس کی شادی نہیں ہو سکی۔ ارون، اسٹیلا، میرا، ایلمر رکسٹن اور راحیل قصے کے ذہین کردار ہیں لیکن ان کا انجام نامرادی اور بے کسی ہے۔ کسی کو بھی اپنا مطمع نظر حاصل کرنے میں کامیابی نہیں ہوتی۔ ریاض الدین اور عالیہ بھی شکست خوردہ تشنہ کام ہیں۔ فواد اور میر اسماج کی گم گشتہ روحیں ہیں۔ یہاں تک بیلا جیسی ایک معمولی قسم کی خاتون بھی بظاہر ایک مسرور مطمئن زندگی بسر کرنے کے باوجود قلبی طور پر ناآسودہ ہے۔ قرۃ العین حیدر یہ ناول لکھتے ہوئے دراصل دیوانی نسلوں کا المیہ رقم کر رہی تھیں۔ اس ناول کے اکثر کردار جینئس ہونے کے باوجود ناآسودہ ہیں۔ خوش اور متمدن گھرانوں کے افراد ہیں انقلاب پسند ہیں لیکن اس انقلاب پسندی کی جڑوں میں جاگیرداری سماج ہے۔ جس کی قدریں ان کی جبلتوں میں شامل ہو گئی ہیں۔ یہ زمانہ بھی انقلاب پسندی کا تھا۔ جنگ عظیم اول اور جنگ عظیم دوم کے بعد تقسیم ہند کے واقعات اس انقلاب پسندانہ رجحانات کی تقویت کا باعث ہیں۔ پرانی تہذیب تیزی سے انحطاط پذیر ہے جبکہ نئی تہذیب کا ہیولا ابھر رہا تھا۔

ان احساسات و جذبات کے مثالی پیکر اس اعلیٰ متوسط طبقے میں پائے جاتے تھے جس کی نقش گری قرۃ العین حیدر نے کی ہے۔ یہ طبقہ دراصل قرۃ العین حیدر کا اپنا طبقہ ہے۔ اس طبقے کے ذریعے ناول نگار نے ہماری تاریخ کے ایک اہم حصہ کی صورت گری کی ہے۔ یہ ناول ان افراد کے روز و شب، احساسات و خیالات، درد و غم، آرزوؤں جستجوؤں کی ایک دستاویز ہے، یہ وہی طبقہ ہے جو اس وقت اپنے حاکموں کا وفادار اور ان کے رنگ کو اپنا کر احساس برتری میں مبتلا تھا۔ اور غیر ملکی آقاؤں کی درسگاہوں سے تعلیم و تربیت پا کر آزادی کے بعد عنان حکومت سنبھالنے والا تھا۔ وہ اپنے طرزِ معاشرت اور طرزِ فکر میں بالکل ان غیر ملکی آقاؤں کے مشابہ تھے۔ انگریزوں کو ان مغرب زدہ ہندوستانیوں پر اعتماد کی ضرورت تھی۔ مذہب، سیاست، ادب، معاشرت، معاشیات کے دائروں میں یہ ہندوستانی طبقہ اینگلو انڈین ذہنیت کا مالک تھا۔ لہٰذا ناول میں نوجوان لڑکے لڑکیوں کے جو کردار پیش کیے گئے ہیں وہ اسی ذہنیت کے نمائندہ کردار ہیں۔

---

(۱) قرۃ العین حیدر، سفینۂ غم دل، ص ۳۱

ان اینگلو انڈین کرداروں کے ساتھ ساتھ بہت سے انگریز کردار بھی ناول میں موجود ہیں۔ ان میں سب سے اہم ایلمر ریکسٹن کا کردار ہے۔ اس کے علاوہ اس کی یورپین گورنس کیتھلین چیوس، سر ایڈگر، مس پمیلا، لیڈی ریکسٹن، پولین ٹامس وغیرہ ہیں، اس ناول کے کردار میکالے، ٹینی سن اور والٹر سکاٹ کا مطالعہ کرنے والے ہیں۔

خود ناول نگار ان کے متعلق لکھتی ہے۔

"ہندوستان کے اوپری متوسط طبقے کی یہ وہ نسل تھی جو انگریزی کورسوں اور مورس ناچوں کے زیر سایہ پروان چڑھی۔ عجیب ترحم انگیز اور مضحکہ خیز دوراہے پر یہ لوگ زندہ رہے تھے۔ اپنے آپ کو پرانی فیوڈل تہذیب کا وارث بھی گردانتے تھے اور ہر وقت اپنی تعریف کرنے میں مصروف رہتے تھے۔ اب عنقریب یہ لوگ اپنی اس سارے تہذیب و مذہب کے بکھیڑے کو چھوڑ کر سرحد پار بھاگنے والے تھے۔" (۱)

جس طبقے کی عکاسی ناول نگار نے کی ہے وہ اس عالمگیر تہذیب و معاشرت کا حامل تھا جو ان کے غیر ملکی آقاؤں کی تہذیب تھی اور ان کے تسلط کے ساتھ ساتھ دنیا بھر میں پھیلی ہوئی تھی اور اس نے مقامی تہذیب پر نئی چھاپ اس طرح گہری لگائی کہ اس کے تمام خدوخال فرنگی تہذیب کی چمک لیے ہوئے تھے۔

اس کے علاوہ اگر زبان و بیان پر انگریزی زبان کے اثرات کا جائزہ لیا جائے تو گل صبا مصنفہ **قرۃ العین حیدر کے ابتدائی ناول** بجا طور پر قرۃ العین حیدر کو اردو کی اینگلو انڈین ادیبہ قرار دیتی ہیں۔ (۲)

سفینہ غم دل میں قرۃ العین بلا تکلف انگریزی الفاظ و محاورات کا استعمال کرتی ہیں۔ فیوڈل، ڈی جنریٹ، سوشل ریفارم، ڈی مورلائز، لیڈیز کانفرنس لٹریچر، پریس سوسائٹی، کلب، ممبر شپ، کلچر، آئیڈیل، ٹپسی، ارسٹو کریٹ، پیٹرن انچیف جیسے وہ الفاظ ہیں وہ مصنفہ کے نوک قلم سے روانی سے نکلتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ غالباً یہ بھی رہی ہو گی کہ مصنفہ جس طبقے کو پیش کر رہی تھیں وہ انگریزی درسگاہوں کا فارغ التحصیل نوجوان طبقہ تھا۔ خود مصنفہ کا تعلق بھی اسی طبقے سے تھا لہٰذا وہ اس طبقے میں مروج الفاظ کو بلا تکان لکھتی چلی جاتی ہیں۔ حالانکہ ان میں سے بہت سے الفاظ ایسے ہیں جو مروج نہیں اور ان کے لیے خوب صورت اردو مترادفات مثلاً زوال پذیر، مخمور اور سرپرست اعلیٰ جیسے موجود ہیں لیکن کچھ الفاظ ایسے بھی ہیں جن کا چلن سماج میں عام ہو چکا ہے۔ مثلاً لٹریچر، پریس سوسائٹی، کلب ممبر شپ، کانفرنس وغیرہ۔ لیکن بطور اردو ناول نگار انہوں نے زبان کے سلسلے میں زیادہ احتیاط نہیں برتی۔ یا یہ انگریزی کے ساتھ

---

(۱) قرۃ العین حیدر، سفینہ غم دل، ص ۱۳۰

(۲) گل صبا، *قرۃ العین حیدر کے ابتدائی تین ناول ایک مطالعاتی تجزیہ*، ص ۷۹

وابستہ احساس برتری ہے جو انھیں اردو لکھتے ہوئے بھی انگریزی الفاظ و محاورات کے استعمال پر اکساتا ہے۔ انھوں نے ایک ایسا اسلوب تیار کیا جو مشرقی و مغربی یا اردو انگریزی زبان کا ایک مرکب کہا جا سکتا ہے۔

## خونِ جگر ہونے تک

فضل کریم فضلی کا ناول خونِ جگر ہونے تک ۱۹۵۷ میں شائع ہوا۔ اس کا پس منظر سرزمین بنگال ہے جو بہتے پانیوں اور لہلہاتی فصلوں کی سرزمین ہے۔ جس کی خوبصورتی اور شادابی قدرت کی فیاضیوں کا نمونہ ہے۔ یہ ناول ۱۹۴۱ یعنی دوسری جنگِ عظیم کے دوران قحطِ بنگال کو موضوع بناتا ہے۔

یہ ناول دوسری جنگ عظیم کے دوران ہندوستان کے سب سے زرخیز صوبے کی صورتحال کو پیش کرتا ہے اور انسانی تاریخ کے ایک بڑے المیے قحط بنگال کو موضوع بناتا ہے۔ جس کے دوران لاکھوں انسان بھوک سے سسک سسک کر موت کے منہ میں چلے گئے۔

فضل کریم فضلی کے اس ناول کا پس منظر حقیقی ہے کیونکہ قحط کے دوران ناول نگار بنگال کے ضلع فرید پور میں بطور کلکٹر تعینات تھے۔ اس قحط کے نتیجے میں بنگال کے سولہ اضلاع متاثر ہوئے جن میں سب سے زیادہ متاثر ضلع فرید پور ہی ہوا تھا۔ وہاں مصنف نے جو دل دہلا دینے والے واقعات دیکھے انہوں نے مصنف کو اس حد تک متاثر کیا کہ ان کا خونِ جگر نوکِ قلم سے اس ناول کی صورت میں ٹپک پڑا۔ قحط، جنگ اور وباؤں کی وجہ سے انسانی زندگی جس المناکی کا شکار ہوئی تھی۔ اسے انہوں نے فنکارانہ مہارت کے ساتھ پیش کر دیا۔

ناول کا آغاز ہوتا ہے تو بنگال کی سرزمین میں ہر طرف زندگی کی چہل پہل نظر آتی ہے۔ دوسری جنگ عظیم جاری ہے لیکن ابھی ہندوستان اس کے اثرات سے محفوظ ہے لیکن رفتہ رفتہ جنگ کا دائرہ پھیلتا ہے اور بنگال بھی اقتصادی بحران کا شکار ہو جاتا ہے۔ برما پر جاپانیوں کا قبضہ ۱۹۴۲ء میں ہو جاتا ہے تو برما سے چاول کی درآمد رک گئی جو بنگالیوں کی روزمرہ خوراک کا ایک اہم حصہ تھا۔ اس کے علاوہ رسد میں کمی کے ساتھ گرانی میں ہوشربا اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ چاول ایک عام آدمی کی پہنچ سے باہر ہو گیا۔ لیکن ایسی صورتحال سے تجارت پیشہ طبقے اور امرا نے فائدہ اٹھاتے ہوئے چاول ذخیرہ کر لیے۔ اس ذخیرہ اندوزی نے صورتحال کو مزید خراب کر دیا۔ ساحلی علاقوں پر خوفناک طوفان نے غلہ کی کثیر مقدار کو ضائع کر دیا اور حکومت کی غفلت اور بے حسی نے قحط کی صورتحال کو بد سے بدتر کر دیا۔

اس حوالے سے B.M. Bhatia لکھتے ہیں۔

> The famine took a heavy toll of life in Bengal. From July to December 1943, during which period famine was at its peak, the death rate in Bengal rose by 108.3 percent. Prof K.D. Chatiopadhyay of Calcutta University, on the basis

of sample surveys of mortality conducted by him put the total number of deaths from famine at 3.5 millions..... Almost the whole of Bengal, in greater or less degree, was affected by the famine and suffered loss of life. (1)

جولائی سے دسمبر ۱۹۴۳ کے دوران بنگال میں قحط کا نتیجہ بہت سی اموات کی صورت میں نکلا۔ بنگال میں قحط کے عروج پر شرح اموات میں ایک سو آٹھ اعشاریہ تین فیصد اضافہ ہو گیا۔ کلکتہ یونیورسٹی کے پروفیسر کے ڈیچٹوپادھیائے نے شرح اموات جانچنے کے لیے خود جو سروے کیے ان کی بنیاد پر دعویٰ کیا کہ یہ قحط پینتیس لاکھ جانیں نگل گیا۔ تقریباً سارا بنگال اس قحط و جانی نقصان سے کہیں کم کہیں زیادہ متاثر ہوا۔

حکومت نے شروع میں اس صورتحال سے اغماض برتا اور موت کے سائے ہر طرف منڈلانے لگے۔ قحط کی صورتحال پر قابو پانے کے لیے حکومت لنگر خانے کھولتی ہے۔ جو متاثرہ آبادی کے مقابلے میں ناکافی ہیں لیکن فاقہ زدہ مرتے سسکتے لوگوں کے لیے ایک آخری امید ضرور ہیں۔ وہ لڑکھڑاتے، گرتے، پڑتے زندہ لاشوں کی مانند لنگر خانوں کی طرف چل پڑے۔ کچھ لوگوں نے راستے میں دم توڑ دیا جو منزل پر پہنچ جاتے ہیں وہاں خوراک حاصل کرنے کے لیے انھیں طویل قطاروں میں انتظار کرنا پڑتا ہے۔

اس ناول کا کبیری کردار جمعدار جلیل الدین ہے جسے بنگالی ذلیل الدین کہتے ہیں۔ وہ اور اس کا خاندان بھی اسی قحط کا شکار ہوتا ہے۔ اس کی بیوی اور بیٹا قحط کا شکار ہو کر مر جاتے ہیں۔ جمعدار صاحب شروع میں اپنی وضعداری قائم رکھنے اور اپنی حالت پوشیدہ رکھنے کی پوری کوشش کرتے ہیں لیکن رفتہ رفتہ ان کا کل اثاثہ بک جاتا ہے۔ جس میں ایک قیمتی گائے جو انھیں گھر کے ایک فرد کے طور پر عزیز ہے وہ بھی بک جاتی ہے۔ بیوی اور بیٹا بھی قحط کا شکار ہو کر مر جاتے ہیں تو وہ اپنی خودی اور عزت نفس کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اپنے زیر کفالت تین افراد کو لے کر انتہائی بے بسی سے لنگر خانے کا رُخ کرتے ہیں لیکن وہاں پہنچنے سے پہلے ہی پھول محمد اور ہاجرہ دم توڑ جاتے ہیں۔ جمعدار بے ہوش ہو جاتے ہیں۔ مجید صاحب آئی سی ایس لنگر خانے کا معائنہ کرنے آتے ہیں تو جمعدار کو ہسپتال پہنچا دیتے ہیں۔ جمعدار کی طبیعت سنبھل جاتی ہے تو لنگر خانے کا سپروائزر بنا دیا جاتا ہے اور پھر اس کی تجویز پر لنگر خانوں کو چھوٹے کارخانوں میں تبدیل کر دیا جاتا ہے۔ مجید صاحب انتہائی دیانت دار آفیسر ہیں لیکن جن غلط افراد کے غیر قانونی اور غلط کاموں میں معاونت سے انکار کرتے ہیں یا ان کا راستہ روکتے ہیں وہ ان کے خلاف ان کے محکمے کو درخواستیں بھیجتے رہتے ہیں۔ آخرکار وہ ان کا تبادلہ کروانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ موزید شاب (مجید صاحب) کے بعد نیا افسر جازایلی (اعجاز علی) آتا ہے جو روایتی اور تنگ نظر انسان ہے۔ وہ مجید صاحب کی ہر دلعزیزی سے جڑ کر اور جمعدار کی مجید صاحب سے وابستگی سے خفا ہو کر جمعدار کو برخاست کر دیتے ہیں۔

(1) B.M. Bhatia, *Famine in India, 1943* (New Dehli: Asia Publishing House,1963) , P324

جمعدار صاحب واپس آکر اپنے ویران گھر سے زندگی کا آغاز نئے سرے سے کرتے ہیں۔

فضلی کا یہ ناول بنگال کی سادہ اور توانائی سے بھرپور زندگی کے بہتے پر سکون دریا میں جنگ عظیم دوم سے پیدا ہونے والے تموج (قحط اور وبا) کی تباہ کاریوں اور ہولناکیوں کو پیش کرتا ہے۔

فضلی نے یہ سارے حالات اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے اس لیے وہ ان دل دوز واقعات کی تصویر کشی بہت مؤثر انداز میں کرتے ہیں۔

بنگال ہندوستان کا وہ صوبہ تھا جو پورے ہندوستان میں سب سے زیادہ زرخیز اور مردم خیز تھا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ انگریزوں نے اپنا تسلط سب سے پہلے بنگال میں ہی قائم کیا اس طرح برطانوی استحصال کا پہلا شکار بھی یہ صوبہ بنا۔ بنگال کی تمام تر زرخیزی کے باوجود غربت کے شکار اس علاقے کو قحط کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے پیچھے کئی عوامل کارفرما تھے۔ ایک تو بنگال کی جغرافیائی صورتحال ایسی ہے کہ سیلاب کھڑی فصلوں کی تباہی کا باعث بنتے تھے۔ دوسری طرف سامراجی حکومت نے بنگال کی صنعت کا گلا گھونٹ کر اپنی صنعتی پیداوار کی کھپت کے لیے منڈی پیدا کی۔ تجارت پر اپنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے اس غیر ملکی حکومت نے استحصال، ظلم وجور اور لوٹ مار کا وہ بازار گرم کیا کہ جس نے صوبے کے خوشحال لوگوں کو مفلوک الحال اور فاقہ کش بنا دیا۔

یہاں کی معیشت بری طرح متاثر ہوگئی۔ تجارت اور صنعت ختم ہونے سے مقامی باشندوں کا انحصار زراعت پر رہ گیا لیکن بنگال کی جغرافیائی صورتحال زراعت کے لیے زیادہ معاون ثابت نہ ہوئی کیونکہ سرزمین بنگال میں دریاؤں کا جال بچھا ہوا ہے۔ زمین چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹی ہوئی ہے۔ ان ٹکڑوں پر کاشت کی گئی فصلیں اکثر طوفان کا شکار ہو جاتی ہے۔ آبادی کی کثرت اور وسائل کی قلت کے شکار اس صوبہ کے عالمگیریت کے اثرات اپنی مہیب صورت میں دیکھے ہیں۔ جنہوں نے لاکھوں کی تعداد میں افراد کو موت کے منہ میں ڈھکیل دیا۔

یہ لوگ جن کی معاشی حیثیت پہلے ہی مستحکم نہ تھی۔ جنگ عظیم کے دوران اقتصادی بحران نے رہی سہی کسر نکال دی۔ جاپانیوں کے قبضے نے چاول کی درآمد بند کر دی۔ مزید کسر طوفان نے نکال دی اور غلے کی کثیر مقدار ضائع کر دی۔ اس طرح بھوک نے آہستہ آہستہ اس علاقے میں پنجے گاڑنے شروع کر دیئے۔

یہ صورتحال مزید ابتری کا شکار یوں ہوئی کہ یہ معاشی انحطاط اخلاقی انحطاط کا سبب بھی بنا۔ مالی لحاظ سے مستحکم اور تجارت پیشہ افراد نے اس صورتحال سے فائدہ اٹھایا اور ذخیرہ اندوزی کے ذریعے مال کمانے کی راہ اختیار کی۔ ان کی بے حسی اور سنگدلی نے موت کا بازار گرم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ بنگال کے دو تہائی غریب افراد بھوک سے ڈھانچوں میں تبدیل ہو گئے۔ اور سسک سسک کر موت کی وادی میں اتر گئے اور بنگال کا سرسبز و شاداب خطہ موت کی وادی بن گیا۔

اس قحط کے پیچھے کار فرما عناصر میں ایک بہت بڑا سبب جنگ تھا۔ یہ جنگ جہاں اسلحہ تیار کرنے والی عالمی طاقتوں کے لیے ایک سنہری موقع تھی وہیں دنیا کے غریب اور پسماندہ ممالک کے لیے مزید بربادی کا سامان لے کر آئی۔ غیر ملکی حکمرانوں نے مقامی لوگوں کے حالات ان کی غربت اور بھوک کی طرف سے آنکھیں بند کر کے وسائل کو جنگ کی بھٹی میں جھونک دیا۔ مقامی انسانوں کی زندگی اتنی ارزاں ہو کر رہ گئی تھی کہ جس کی مثال شاید ہی تاریخ میں ملتی ہو۔ لاکھوں کی تعداد میں انسان دن رات سسک سسک کر موت کے منہ میں چلے گئے۔ حکومت کی طرف سے بروقت حالات کا ادراک کرتے ہوئے اقدامات کیے جاتے تو موت کے اس کھیل کو اگر روکا نہیں تو کم از کم محدود ضرور کیا جا سکتا تھا۔ بہت سی اموات اور تباہی کے بعد بھی جو اقدامات کیے گئے وہ ضرورت کے مقابلے میں ناکافی تھے اور پھر ان مراکز تک رسائی اور وہاں سے خوراک کا حصول بھی ایک جوکھم سے کم نہ تھا۔ جس کی سکت ان استخوانی ڈھانچوں میں شاید باقی نہ رہ گئی تھی۔ پھول محمد اور ہاجرہ کی موت لنگر خانے کے قریب پہنچ کر ہو گئی۔

لوئیس ایل سنائیڈر کی کتاب WWII کے مترجم کتاب کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں۔

"۲۰ویں صدی کے دامن پر نمایاں ترین داغ دو عالمی جنگوں کا ہے۔ جس میں نو آبادیات اور ان کے وسائل کی بندر بانٹ پر عالمی طاقتیں آپس میں لڑ پڑیں۔ کئی سالوں پر محیط ان جنگوں نے کروڑوں انسانوں کو اپاہج بنایا۔ لاکھوں لقمہ اجل بنے اور مالی نقصانات کا تخمینہ تو کھربوں ڈالر سے بھی تجاوز کر جاتا ہے..."(۱)

یہی وہ عالمگیریت کے مقاصد تھے جن کے حصول کے لیے عالمی طاقتوں نے پوری دنیا کو جنگ کی بھٹی میں جھونک دیا۔ مصنف واضح طور پر یہ کہتا ہے کہ یہ نو آبادیات اور ان کے وسائل کی بندر بانٹ تھی اور ان طاقتوں کے خود غرضانہ معاشی مفادات تھے جنہوں نے عالمی امن کو تہس نہس کر کے اتنی بڑی تباہی کو انسانی مقدر بنا دیا جس کی مثال پوری دنیا کی تاریخ پیش کرنے سے قاصر ہے۔

کتاب کے آخری صفحات میں بھی وہ اسی جانب اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"بایں ہمہ بیسویں صدی کے نصف اول میں دو بڑی جنگوں نے ہمہ گیر تباہی اور بد نظمی پیدا کر دی۔ ۱۹۱۴ء میں قومیت کی کشمکشوں، سامراجی عزائم کے تصادم، تجارتی رقابتوں اور عسکریت نے دنیا میں آگ لگا دی..."(۲)

یہ عالمگیریت کے منفی اثرات تھے۔ اپنے لیے زیادہ سے زیادہ تجارتی مفادات کا حصول جس کے نتیجے میں باہمی چپقلش اور پھر جنگ کے مہیب سائے اور ہولناک تباہی و بربادی کی طویل داستان ہمیشہ کے لیے تاریخ میں رقم کی گئی۔

---

(۱) لوئیس ایل سنائیڈر، جنگِ عظیم دوم، صفدر رشید (مترجم)، (لاہور: دارالشعور: ۲۰۰۵) پیش لفظ

(۲) ایضاً، ص ۴۹۴

دو بڑی جنگوں سے ان عالمی معاشی طاقتوں نے سبق سیکھا اور اب انداز بدل کے پھر اس وقت کے نو آبادیات اور آج کے تیسری دنیا کے وسائل کا رخ اپنی جانب موڑنے کی جنگ جاری ہے۔ اس جنگ میں ان کے سب سے بڑے ہتھیار طاقتور ذرائع ابلاغ ہیں۔

اس ناول میں فضل کریم فضل نے بنگال کے علاقے میں قحط کو موضوع بنایا ہے۔ جس کے پس پشت یہی مقاصد تھے جن کا حوالہ اوپر دیا گیا ہے۔

اس ناول کے کرداروں میں جمعدار صاحب، بی بی جان، مجید صاحب، جاز ایلی نیر الاسلام، جنو دھر، مخلص الرحمن، زمیندار بابو، تگن بابو، مسرت، ساہا، پھول محمد، جحیر باب، ابھے بابو شامل ہیں بہر حال فضلی نے بہت مؤثر انداز میں بنگال کے حالات، قحط کی صورتحال اور اس کے نتیجے میں جنم لینے والی انسانی بے بسی، خود غرضی اور موقع پرستی کو ناول میں بیان کیا ہے اور فضلی نے صرف قحط کی داستان ہی پیش نہیں کی بلکہ ان چند سالوں کے درمیان کے بنگال کی پوری زندگی کا مرقع پیش کیا ہے۔ یہ دور سیاسی اعتبار سے بھی بہت اہم تھا۔ ہندوستان کی آزادی کی تحریکیں اپنے عروج پر تھیں۔ جنگ نے برطانیہ جیسی ایک بڑی سلطنت جس کے متعلق کہا جاتا تھا کہ وہاں سورج غروب نہیں ہوتا۔ سیاسی و معاشی اعتبار سے ایسا ضعف پہنچایا کہ جلد ہی وہ اپنے پر سمیٹنے پر مجبور ہو گیا اور سکڑتے سکڑتے ایک محدود حصے تک محدود ہو گیا۔

بہر حال اس دور میں برطانیہ کی تمام تر توجہ جنگ پر مرکوز ہو گئی تھی۔ برطانیہ کو ہندوستانیوں کے تعاون کی ضرورت محسوس ہوئی۔ کانگریس اور مسلم لیگ دونوں ہندوستان چھوڑ دو اور عدم تعاون کے اصول پر گامزن تھیں۔ یہ سارے حالات اس ناول میں نظر آتے ہیں۔ فضلی نے ان حالات کو بہت خوبصورتی کے ساتھ ناول کا حصہ بنا دیا ہے۔

"مسلم لیگ کی روش کچھ کچھ مشکوک ہونے لگی تھی۔ اس بات کا احتمال پیدا ہو چکا تھا کہ حکومت برطانیہ کے خلاف کھلم کھلا بغاوت نہ کر بیٹھے۔ قابل اعتماد افسروں کی ایک کانفرنس کلکتہ میں بصیغہ راز منعقد کی گئی۔ جس میں اس امر پر غور کیا گیا کہ اگر مسلم لیگ نے بھی کانگریس کی روش اختیار کی تو کیا طریقہ اختیار کیا جائے گا۔ جاز ایلی صاحب مسلمان افسروں کی واحد نمائندگی کا شرف حاصل ہوا۔ ان کی طرف امید افزا نگاہوں سے دیکھا گیا۔ یہ نگاہیں ان کے دل کے پار ہو گئیں۔

انہوں نے کہا اصولی بات تو یہ ہے کہ 'اگر مسلم لیگ بھی کانگریس سی ہو جائے تو اسے بھی اسی طرح کچل دینا چاہیے۔'"[۱]

یہاں فضلی نے جاز ایلی کے ذریعے ایک ایسے طبقے کو پیش کیا جو انگریزوں کا پروردہ اور وفادار تھا۔ دراصل انگریزوں نے ہندوستان پر قبضہ کیا تو انہیں اپنے اقتدار کے استحکام کے لیے دو تین طبقوں کو خاص طور پر نشو و نما کی۔ ایک جاگیر داروں کا طبقہ اور دوسرا

(۱) فضلی، فضل کریم، *خونِ جگر ہونے تک*، (لاہور: دبستان، ۱۹۶۰) ص ۳۴۸

جدید تعلیم یافتہ طبقہ جو لارڈ میکالے کے بقول خون و رنگت کے اعتبار سے ہندوستانی مگر مذاق اور رائے، اخلاق اور سمجھ کے اعتبار سے انگریز ہو۔[۱]

جاز ایلی ایسے طبقے کا نمائندہ ہے جو اپنی مشرقی روایات کو بھول کر صاحب بہادر بننے کے شوق میں اپنے تشخص تک کو پس پشت ڈال دیتا ہے اور حکومت کی پالیسیوں میں اس کا آلہ کار بن جاتا ہے۔ جاز ایلی کے کردار کے متعلق فضلی لکھتے ہیں۔

"یہ نئے صاحب جاز ایلی صاحب تھے۔ صاحب بہادر بننے کے بعد سے وہ اپنے نام کا تلفظ یوں ہی کرتے تھے۔ ان کے والد مرحوم جو پہلے ابا سے اباجان ہوئے تھے۔ پھر اباجان سے فادر اور فادر سے ڈیڈ۔ انہوں نے تو اپنے صاحبزادہ کا نام سیدھا سادا اعجاز علی رکھا تھا اور اسی نام سے وہ آئی سی ایس میں آئے تھے لیکن صاحب بننے کے بعد انہوں نے اپنے نام کو صاحبی شان دینی ضروری سمجھی۔ علی کو بجائے اے سے لکھنے کے ای سے لکھنے لگے اور تلفظ جاز ایلی کر دیا۔"[۲]

جاز ایلی کے کردار میں ڈپٹی نذیر احمد کے کردار ابن الوقت کی ایک جھلک نظر آتی ہے لیکن ابن الوقت صرف نوبل صاحب سے متاثر ہو کر انگریزی وضع قطع اختیار کرتا ہے لیکن جاز ایلی آئی سی ایس پاس کرنے کے بعد خود کو حکمران طبقے کا فرد سمجھتے ہوئے اپنی تہذیبی روایات سے انحراف کی راہ اختیار کرتا ہے۔ حکمران طبقے کو ایسے ہی افراد کی ضرورت تھی جو ان سے مرعوب ہوں۔ اپنی ثقافت و روایات کے متعلق کمتری کا احساس رکھتے ہوں۔ اپنے تشخص اپنی تہذیب و روایات کے حوالے سے احساس کمتری کا شکار افراد کبھی بھی برسر اقتدار طبقے کے لیے خطرہ کا باعث نہیں بن سکتے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں اگرچہ انگریز کامیاب رہے لیکن انہیں یہ احساس بہر حال رہا کہ یہ مقامی ان کے لیے پھر خطرے کا باعث بن سکتے ہیں لہٰذا بہت غور و خوض کے باعث انہوں نے یہاں کے تعلیمی اداروں کا نصاب از سر نو مرتب کیا اور اس میں ان کے لئے مشعل راہ میکالے کا اصول تھا۔ ایسی تعلیم کا نتیجہ جاز ایلی جیسے دیسی صاحب تھے۔ اگرچہ مجید صاحب جیسے شریف النفس، دیانت دار افسران بھی تھے لیکن ان کے حوالے سے خود فضلی لکھتے ہیں۔

"پرانے آئی سی ایس افسروں کا جو نقشہ عام طور پر ذہن میں ہے۔ وہ مجید صاحب کے کردار سے مختلف ہے۔"[۳]

اس کا مطلب صاف ہے کہ مجید صاحب ایک مثالی کردار ہیں۔ عموماً افسران جاز ایلی جیسے ہی تھے۔ جاز ایلی مکمل طور پر انگریزی تہذیب کی نقالی کرتا ہے اور گفتگو میں انگریزی الفاظ کا استعمال اس کی عادت ہے۔ جاز ایلی کی اپنے ملازم کرانی بابو سے گفتگو ملاحظہ کیجئے۔

"باہر لکھ کے لگا دو ہمارے ملنے کا ٹائم ٹن ٹو ٹویلو (دس سے بارہ تک)

ڈیلی سر؟ (روز جناب؟)

(۱) ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، *اردو شاعری کا سیاسی، سماجی پس منظر* (لاہور: مطبع جامعہ پنجاب، ۱۹۶۶ء) ص ۱۱۶

(۲) فضلی، فضل کریم، *خونِ جگر ہونے تک*، ص ۳۳۹-۳۴۰

(۳) ایضاً، اختتامیہ ص (د)

نو منڈے وینسڈے فرائی ڈے (نہیں پیر، بدھ اور جمعہ)

سر فرائی ڈے کو توزمہ پریر ہوتا ہے۔ (جناب جمعہ کو تو نماز جمعہ ہوتی ہے)

اوڈیم

سیٹر ڈے سر (جناب ہفتہ؟)

نور ہنے دو اچھا بات ہے کم لوگ آئے گا ملنے۔" (۱)

انگریزی الفاظ کے استعمال کے علاوہ وہ اردو بھی انگریزوں کے انداز میں تذکیر و تانیث کی پرواہ کیے بغیر بولتا ہے۔

وضع قطع سے ہٹ کر بھی وہ سوچ کے اعتبار سے بھی انگریزوں کا وفادار ہے لیکن تب تک جب تک وہ اقتدار میں ہے۔ خود کو انگریز کا وفادار ثابت کرنے کے لیے پہلے وہ سیاسی پارٹیوں کے حوالے سے سختی کا موقف رکھتا ہے لیکن جب مسلم لیگ کو وزارت مل جاتی ہے تو اس کا جھکاؤ مسلم لیگ کی طرف ہو گیا۔ یہ کردار صحیح ابن الوقت ہے اور ذہنی غلام ہے۔ غلامی جو پہلے نو آبادیاتی صورت میں تھی اب عالمگیریت میں ہے ایسے ہی ذہنی غلاموں کو پروان چڑھاتی ہے اور گوارہ کرتی ہے۔ مجید صاحب جیسے کردار ایسے نظاموں میں مس فٹ رہتے ہیں۔ مجید صاحب اور جاز ایلی کے کردار ایک ہی طبقے سے تعلق رکھتے ہوئے بھی مختلف مکاتب فکر کی نمائندگی کرتے ہیں۔

---

(۱) فضلی، فضل کریم، خونِ جگر ہونے تک، ص ۳۲۰

# خدا کی بستی

قیام پاکستان کے بعد لکھے جانے والے ناولوں میں شوکت صدیقی کے ناول خدا کی بستی کو اہم مقام حاصل ہے۔ اس ناول کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ دنیا کی ۲۶ مختلف زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے اور اب تک ۴۷ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور شاید یہ اردو کا واحد ناول ہے جس کا اتنی زیادہ زبانوں میں ترجمہ ہوا۔ یہ ناول ۱۹۵۷ء میں لکھا گیا اور ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا۔ ۱۹۶۰ء میں اسے آدم جی ادبی ایوارڈ سے نوازا گیا۔

شوکت صدیقی سماجی حقیقت نگار ہیں۔ وہ اپنے ناولوں کے ذریعے مختلف سماجی حقائق کو پیش کرتے ہیں۔ ان کے موضوعات متنوع ہیں۔ ایک طرف وہ لکھنوی تہذیب و معاشرت کی زوال پذیری کو اپنا موضوع بناتے ہیں تو دوسری طرف قیام پاکستان کے بعد معرض وجود میں آنے والے پاکستانی معاشرے میں پائے جانے والی طبقاتی کشمکش و تضادات کمزور طبقات کا استحصال عورت کی سماجی حیثیت اور جرم کی دنیا کو پیش کرتے ہیں۔ ان موضوعات کے انتخاب کے پس پشت شوکت صدیقی کی ترقی پسندانہ سوچ تھی۔

شوکت صدیقی کا عہد کئی حوالوں سے بہت اہم تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے خاتمے پر برصغیر میں ایک زبردست معاشی و اقتصادی بحران کو جنم لیا۔ اس کا اثر اخلاقی اقدار اور معیارِ زندگی پر بھی پڑا۔ تقسیم ہندوستان نے انسانی تاریخ کے بہت بڑے المیے کو جنم دیا اور صدیوں ساتھ رہنے والی دونوں اقوام شمشیر بکف ہو کر ایک دوسرے کے خون کی پیاسی ہو گئیں۔ الگ الگ مذاہب کے ماننے والوں کا ساتھ رہنا مشکل ہوا تو لوگ ہجرت کر کے اکثریتی علاقوں کی طرف آنے لگے لیکن اس ہجرت کے نتیجے میں لاکھوں لوگ جان سے گئے۔ لاتعداد عورتوں کی بے حرمتی کی گئی۔ انھیں قتل کیا گیا۔ برصغیر میں خون کی ہولی کھیلی گئی۔ اس سارے ہنگامے نے عام آدمی کو تو متاثر کیا ہی، ادیبوں کو حیران و پریشان کر دیا اور وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ حالات میں سدھار کیسے پیدا کیا جائے۔

شوکت صدیقی کا تعلق ترقی پسند تحریک سے تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے ترقی پسند تحریک کا آغاز، ارتقا، عروج اور پھر زوال بھی اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ ترقی پسند تحریک نے نہ صرف ان کی سوچ و فکر کو نئے زاویے بخشے بلکہ ان کے اسلوب کو بھی نئی آب و تاب دی۔

قیام پاکستان کے بعد ترقی پسند ادیبوں نے ہجرت اور تقسیم کے نتیجے میں جنم لینے والے المیے کو اپنے اپنے انداز سے دیکھا محسوس کیا اور پھر خونِ جگر میں انگلیاں ڈبو کر اس کرب کو صفحہ قرطاس پر منتقل کر دیا۔ لہٰذا ان ادیبوں میں سے کسی نے فسادات کو موضوع بنایا تو کسی کے ہاں ماضی پرستی نظر آتی ہے۔ کسی کے ہاں لکھنوی معاشرت کی زوال پذیری کی نوحہ گری ملتی ہے تو کوئی قحط بنگال کا آنکھوں دیکھا حال بیان کرتا ہے۔ شوکت صدیقی اس حوالے سے منفرد ہیں کہ وہ نئے تشکیل پانے والے ملک اور اس میں متشکل

ہوتے اس معاشرے کو موضوع بناتے ہیں جو نئی صبح اور نئی روشنیوں کی امید لے کر اس نئی مملکت کی جانب چلا تھا۔ اس مملکت میں پھر اس معاشرے اور ان افراد کو اپنی منزل ملی یا نہیں۔ ان کے احوال کو خدا کی بستی میں اپنا موضوع بنایا ہے۔

اس ناول کے آغاز میں سندھ کے ایک پسماندہ علاقے کی کچی بستی کے مکینوں کا حال بیان کیا گیا ہے۔ اس ناول کے کلیدی کرداروں میں نوشا اور راجہ اہمیت کے حامل ہیں۔ نوشا چودہ پندرہ سال کا ایک یتیم لڑکا ہے جس کے والد کا انتقال ہو چکا ہے۔ وہ اس بستی میں اپنی بہن بیوہ ماں اور ایک چھوٹے بھائی انور کے ساتھ رہتا تھا۔ اس کی ماں اور بہن اجرت پر بیڑیاں بنا کر فروخت کرتی ہیں تو تب ہی ان کے گھر کا چولہا جلتا ہے۔ نوشا خود بھی ایک گیراج میں کام کرتا ہے۔ یوں بڑی مشکل سے گذر اوقات ہوتی ہے۔ نوشا کا دوست راجہ ایک بے سہارا لڑکا ہے جو اسی بستی میں ایک کوڑھ زدہ فقیر کے ساتھ رہتا تھا۔ وہ دن بھر اس گداگر کے ساتھ سڑکوں پر بھیک مانگتا اور روکھی سوکھی کھا کر اسی گداگر کی کھولی میں سو رہتا۔

اسی بستی میں نیاز نامی ایک شخص نے کباڑ خانے کی دکان کھول رکھی تھی۔ دراصل وہ چوری کے مال کی خرید و فروخت کا کام کرتا تھا۔ اس بستی میں اس کے دو مکان تھے جن میں سے ایک نوشا کی ماں نے کرائے پر لے رکھا تھا۔ نیاز سفاکی کی حد تک خود غرض انسان تھا۔ ایک دن اس نے نوشا کو ترغیب دلائی کہ وہ گیراج سے پرزے چرا کر اسے لا دے تو اسے معقول پیسے مل سکتے ہیں۔ نوشا پہلے پہل خوف کے تحت انکار کر دیتا ہے لیکن نیاز کے بار بار اصرار پر وہ چوری کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ نیاز کے اکسانے پر رفتہ رفتہ نوشا کو چوری کی لت پڑ جاتی ہے۔

نیاز رشتے میں نوشا کا بہنوئی لگتا ہے۔ (نیاز نوشا کا سوتیلا باپ بننے کی آڑ میں نوشا کا بہنوئی بننے کا خواہشمند ہے۔ وہ نوشا کا رشتہ دار بہت بعد میں جا کر بنتا ہے۔ ابتدا میں وہ کرایہ وصولنے کے بہانے نوشا کے گھر جاتا ہے۔ اس وجہ سے اس کا نوشا کے گھر آنا جانا تھا۔ وہ نوشا کی بہن سلطانہ پر بری نظر رکھتا تھا۔ وہ اکثر نوشا کی ماں کے پاس گھنٹوں بیٹھا باتیں کرتا رہتا لیکن اس کی حریص نظریں سلطانہ کے تعاقب میں رہتیں۔ نوشا کو روز بروز چوری کی کمائی کی چاٹ پڑتی جا رہی تھی تو دوسری طرف گیراج سے روز روز چیزیں غائب ہونے لگیں۔ آخر کار ایک روز نوشا پکڑا جاتا ہے اور سخت سزا کے بعد اسے نوکری سے نکال دیا گیا۔ ماں کو اس صورتحال کا علم ہوا تو اس نے خوب ڈانٹ ڈپٹ کی جس کی وجہ سے نوشا گھر چھوڑ کر راجہ کے پاس جا پہنچا۔ راجہ خود بھی بہت پریشان تھا کیونکہ جس فقیر کے ساتھ وہ رہتا تھا اسے پولیس انسداد گداگری کے تحت پکڑ کر لے گئی تھی۔ یوں راجہ بے یار و مددگار رہ گیا تھا۔ راجہ کی آمدنی کا ذریعہ ختم ہو گیا۔ دونوں اپنے اپنے حالات سے مایوس ہو کر کراچی جانے کا فیصلہ کر لیتے ہیں۔ لہٰذا ایک روز وہ دونوں اپنے تیسرے دوست شامی کے ساتھ کراچی روانہ ہو جاتے ہیں لیکن شامی انھیں راستے میں چھوڑ کر گھر لوٹ آیا۔ چنانچہ راجہ اور نوشا اکیلے کراچی پہنچ گئے۔

نوشا کے اچانک غائب ہو جانے سے ماں اور سلطانہ کا غم سے برا حال تھا۔ سلمان نوشا کی تلاش میں اس کی ماں کی مدد کرتا ہے۔ سلمان ایک مقامی کالج میں سٹوڈنٹ تھا جس کی نوشا نے ایک مرتبہ جان بچائی تھی۔ اس وجہ سے ماں سلمان کو گھر کا فرد سمجھتی تھی۔ سلمان اکثر ان کے گھر آتا جاتا تھا۔ نوشا کو بہت تلاش کیا گیا مگر بے سود۔

نوشا کی گمشدگی کے بعد ایک اور آفت یہ ٹوٹی کہ بیڑی کے کارخانے میں ہڑتال ہو گئی اور نوشا کی ماں کی آمدنی کا یہ واحد ذریعہ بھی ختم ہو گیا۔ نوشا کی ماں بے حد پریشان تھی۔ نیاز جیسا گدھ بھی اس موقع کی تلاش میں تھا۔ اس نے سلطانہ کی ماں پر دباؤ ڈالا کہ اس کے ساتھ شادی کر لے۔ اس شادی سے اس کا ایک زبردست مفاد وابستہ تھا۔ دراصل وہ ایک سوچی سمجھی سکیم کے تحت نوشا کی ماں سے شادی کرنا چاہتا تھا اور وہ سکیم یہ تھی کہ وہ اس سے شادی کر کے پچاس ہزار روپے کی انشورنس کروائے گا۔ ڈاکٹر سے اس نے اپنا سارا منصوبہ بیان کر کے پہلے ہی سازباز کر رکھی تھی کہ وہ ڈاکٹر کے ذریعے اسے زہریلے انجکشن لگوا کر رفتہ رفتہ موت کی گھاٹی اتار کر ایک طرف تو پچاس ہزار روپے اور دوسری طرف سلطانہ کا مالک بن جائے گا۔ جو کہ اس کی ماں کی موجودگی میں ممکن نہ تھا۔

نوشا کی ماں سمجھ دار عورت تھی۔ وہ سلطانہ کے متعلق نیاز کی نیت بھانپ چکی تھی۔ لہٰذا وہ اپنی شادی سے پہلے سلطانہ کی شادی سلمان سے کرنا چاہتی تھی لیکن سلمان اپنی مالی پریشانیوں کی وجہ سے ایسا نہ کر سکا۔ سلطانہ کی ماں اپنی مجبوریوں کے ہاتھوں بے بس ہو کر نیاز سے شادی کر لیتی ہے اور یوں نیاز اس گھر کے سیاہ و سفید کا مالک بن گیا۔ نیاز نے نوشا کی ماں کی مجبوریوں سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ وہ ڈاکٹر موٹو کے ذریعے اسے زہریلے انجکشن لگواتا رہا۔ جس کے باعث سلطانہ اور انو کی ماں انھیں دنیا میں تنہا چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔ نوشا کی ماں کے مرنے کے بعد نیاز کے دن پھر گئے۔ اس نے انشورنس سے ملنے والی رقم سے نیا گھر خرید لیا اور سلطانہ اور انو کے ہمراہ وہاں منتقل ہو گیا۔ وہاں وہ انو پر بے پناہ تشدد کرتا ہے۔ آخر ایک روز وہ اس تشدد کی وجہ سے گھر چھوڑنے پر مجبور ہو گیا اور ہیجڑوں کے ٹولے میں شامل ہو گیا۔ اب سلطانہ اس شیطان کے رحم و کرم پر تنہا رہ جاتی ہے اور نیاز جیسا شیطان اس موقع سے بھرپور فائدہ اٹھاتا ہے۔

راجہ اور نوشا ایک اچھے مستقبل کا خواب لے کر کراچی گئے تھے لیکن وہاں جا کر خالی جیب گذارہ ممکن نہیں تو جرائم پیشہ گروہ کے چنگل میں پھنس گئے۔ حالات نے انھیں مجرم بننے پر مجبور کر دیا۔ تنگ آ کر ایک مرتبہ انہوں نے گناہوں کی زندگی سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش بھی کی لیکن نتیجتاً انہیں جیل کی ہوا کھانا پڑی۔ راجہ کوڑھ کے مرض کا شکار ہو گیا اور اسے کوڑھیوں کے ہسپتال بھیج دیا گیا۔ نوشا اکیلا رہ گیا لیکن وہاں اس کی دوستی عادی مجرموں سے ہو گئی۔ جنھوں نے رفتہ رفتہ اسے بھی اپنے رنگ میں رنگ لیا۔ ایک سال کی سزا کاٹ کر جب وہ رہا ہوا تو جیب کتروں کے گروہ میں شامل ہو گیا۔ سلمان اپنی بے روزگاری سے بہت پریشان تھا کہ ایک روز اس کی ملاقات پروفیسر علی احمد جیسا فرشتہ صفت انسان سے ہو گئی اور ان کے ذریعہ اس نے سماجی فلاح و بہبود کے لیے کام کرنے والی تنظیم فلک پیما میں شمولیت اختیار کر لی۔

فلک پیما کا مقصد سماج سدھار تھا۔ لیکن اس تنظیم کا سامنا خان بہادر فرزند علی جیسے منافق ریاکار اور لالچی لوگوں سے ہوا۔ اس نے تنظیم کو ذاتی مقصد کے لیے استعمال کرنے کی کوشش کی اور تنظیم کے ممبران سکائی لارکوں کو بلیک مارکیٹنگ کی ترغیب دی لیکن فلک پیما کا مقصد معاشرے کی فلاح و بہبود تھا لہٰذا انہوں نے خان بہادر کی ترغیب اور پیش کش کو مسترد کر دیا تو خان بہادر نے اس تنظیم کے لیے طرح طرح کے مسائل کھڑے کر دیے سکائی لارک اس کے سامنے ڈٹے رہے لیکن کب تک؟ آخر ایک روز خان بہادر نے اپنے غنڈے بھیج کر سکائی لارکوں کی مرکزی عمارت کو آگ لگوادی کئی سکائی لارک زخمی اور کئی کو موت کے منہ میں اتار دیا گیا۔ سلمان اس سانحہ سے اس قدر دلبرداشتہ ہوا کہ اس نے اس تنظیم سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ اب وہ بھی دولت کمانے اور معاشرے میں بلند مقام حاصل کرنے کا سوچنے لگا۔ اسی جذبے کے تحت اس نے ایک ایم ایل اے کی بھتیجی سے شادی کر لی تا کہ اعلیٰ ملازمت کا حصول ممکن ہو سکے۔ ابتدا میں رخشندہ ایک مشرقی بیوی ثابت ہوئی لیکن رفتہ رفتہ اس کے رنگ ڈھنگ بدلنے لگے۔ علاوہ ازیں سلمان نے ملازمت میں اپنی ترقی کے لالچ میں اسے اپنے اعلیٰ افسر سے بے تکلف ہونے کا موقع دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ رخشندہ نے سلمان کی دی ہوئی آزادی سے انحراف کرتے ہوئے بے راہ روی اختیار کر لی۔ سلمان نے مجبوراً اسے طلاق دے دی۔ سلمان نے خوشگوار زندگی کے جو خواب دیکھے تھے وہ ٹوٹ کر بکھر گئے۔ وہ دوبارہ فلک پیما تنظیم میں واپس آ گیا۔

نوشا کراچی میں مختلف جرائم پیشہ گروہوں سے وابستہ رہا۔ آخر کار ایک روز اس نے جرائم کی دنیا کو خیر آباد کہہ کر واپس گھر لوٹ جانے کا ارادہ کر لیا لیکن جب وہ اپنے شہر واپس پہنچا تو سب کچھ بدل چکا تھا۔ یہاں آ کر وہ اپنے دوست شامی سے ملا تو اسے پتہ چلا کہ اس کی ماں، بہن اور بھائی پر کیا بیتی۔ اس نے نیاز سے انتقام لینے کا ارادہ کر لیا۔ آخر کار اس نے اپنے دل میں بھڑکتی آتش انتقام کو نیاز کے خون سے ٹھنڈا کر کے اپنی گرفتاری پیش کر دی۔

نیاز کے قتل کے بعد سلطانہ اپنے بچے کے ساتھ تنہا رہ گئی۔ اس کی بے کسی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے خان بہادر نے اپنے غنڈوں کے ذریعے اس کی دولت پر قبضہ کر لیا اور اسے گھر سے نکل جانے پر مجبور کر دیا۔ تقدیر سلطانہ کو فلک پیما کے انڈسٹریل ہوم لے آئی جہاں اس کی دکھ بھری کہانی سن کر پروفیسر احمد علی نے اسے اس کے بچے سمیت اپنالیا اور اسے مزید ٹھوکروں سے بچالیا۔ علی احمد نے نوشا کو چھڑانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا لیکن نوشا کو قتل کے جرم میں پھانسی کی سزا سنادی گئی لیکن اس کی کم عمری کے پیش نظر اس کی پھانسی کی سزا کو عمر قید میں تبدیل کر دیا گیا۔

عالمگیریت کی روشنی میں ناول کو پرکھنے سے پیشتر ناول کے ٹائٹل کے حوالے دلچسپ تجزیہ ملتا ہے۔ پاکستانی ادب کے معمار کے سلسلے کی کتاب شوکت صدیقی شخصیت اور فن میں ڈاکٹر انوار احمد لکھتے ہیں۔

"اس ناول کا عنوان "خدا کی بستی" اپنے اندر طنز و تحقیر کے نشتر چھپائے ہوئے ہے۔ قاری کا ذہن خدا کی عظمت اور بستی کے چھوٹے پن میں موجود تضاد میں چھپے ہوئے مخصوص معنی

تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔ خدا کے لفظ کا بستی کے ساتھ استعمال قاری کو حیرت میں ڈال کر اس میں چھپی کلیت اور زہر خند کو سمجھانے میں اس کی مدد کرتا ہے گویا خدا کی بستی اپنے اندر جو معنویت سموئے ہوئے ہے۔ ڈکنز کا سخت سے سخت ٹائٹل Hard Times بھی انہیں ادا کرنے سے قاصر ہے۔"(۱)

ن۔م۔ راشد کے مطابق "شوکت صدیقی کا ناول خدا کی بستی ایک ایسے معاشرے کی داستان ہے جو اخلاقی طور پر زوال آمادہ ہو اور جس میں جرائم اور تشدد اپنے عروج پر پہنچ چکے ہوں۔"(۲)

ستار طاہر خدا کی بستی کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

"خدا کی بستی وہ بڑا صنعتی اور مشینی شہر ہے جہاں انسان کی حیثیت بے حد معمولی ہے۔ خدا کی بستی میں بسنے والی مخلوق کا اسی فیصد حصہ غربت اور افلاس کا مارا ہوا ہے۔ یہ لوگ اخلاقی اقدار پر عمل بھی کرنا چاہیں تو اس پر عمل نہیں کر سکتے۔ جہد للبقا اتنی پست سطح پر اتر آئی ہے کہ انسان چوری کرتا ہے جرم کرتا ہے بھیک مانگتا ہے فریب کرتا ہے اور گھر سے بھاگ جاتا ہے۔ خدا کی بستی کی یہ مخلوق ایک خاص دور، خاص عہد اور خاص معاشرے کی داستان ہے۔ یہ بڑے شہروں میں بسنے والی اس مخلوق کی داستان ہے۔ جہاں زندگی سستی ہے۔ جہاں زندہ رہنے کے لیے سب کچھ کر گزرنا پڑتا ہے۔"(۳)

شوکت صدیقی کا شمار ان مصنفین میں ہوتا ہے۔ جنہوں نے اس ناول میں ترقی پسندانہ نقطہ نگاہ سے حقیقت نگاری کا ثبوت دیتے ہوئے نو تشکیل شدہ پاکستانی سماج میں جنم لینے والی خرابیوں اور برائیوں کو بے نقاب کرنے کی سعی کی ہے۔ پاکستان دراصل اسلام کے نام پر قائم ہوا تھا لیکن بعد میں جس طرح کی صورتحال کا شکار ہوا وہ اسلامی نظریہ حیات کی مکمل نفی تھی۔

ڈاکٹر انور پاشا اس حوالے سے لکھتے ہیں:

"خدا کی بستی میں نو تشکیل پذیر پاکستانی معاشرہ خصوصاً شہری ماحول و معاشرے کو موضوع بنایا گیا ہے۔ یہ ناول ایک ایسے دور کا آئینہ ہے جس میں نیم جاگیر دارانہ و نیم سرمایہ دارانہ نظام کا طبقاتی کردار اور اس نظام میں موجود طبقاتی کشمکش تو ہے لیکن پاکستان کی شہری زندگی

(۱) انوار احمد، ڈاکٹر،شوکت صدیقی، *شخصیت اور فن* پاکستانی ادب کے معمار (اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۰۶ء) ص ۴

(۲) ن۔م۔ راشد ،خدا کی بستی مشمولہ شوکت صدیقی *افکار و شخصیت* مرتبہ نثار حسین (کراچی: کتاب پبلی کیشنز ،۲۰۱۴) ص ۱۵۷

(۳) ستار طاہر ،خدا کی بستی مشمولہ شوکت صدیقی *افکار و شخصیت*، ص ۱۶۵

کی معاشرتی، تہذیبی اور اقتصادی اقدار کا تعین ہنوز بر احیت اور بحران کا شکار ہے۔ اس ناول میں ان مسائل کا ذکر ہے جن سے پاکستان اور پاکستانی معاشرہ دوچار ہے۔"[۱]

اس ناول کا بنیادی موضوع غربت، افلاس اور بیروزگاری ہے اور اس کے مقابل حرص لالچ اور مذہب کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنے کی مذموم ذہنیت، استحصال بالخصوص عورت کے ہر طرح کے استحصال کو پیش کیا گیا ہے۔ شوکت صدیقی اس ناول میں نوشا، راجہ اور شامی اور سلطانہ اور اس کی ماں رضیہ کے ذریعے استحصالی شکنجوں میں جکڑے بے دست وپا انسانوں کے ذریعے بنیادی معاشرتی المیے کو پیش کرتے ہیں۔ نوشا، راجہ اور شامی وہ بچے ہیں جنہوں نے غربت و افلاس کی آغوش میں جنم لیا اور آخر کار عسرت و تنگدستی کی چکی میں پس پس کر ختم ہو گئے۔ یہ وہ بچے ہیں جنہیں ماں باپ کی گرم آغوش نصیب ہوتی ہے نہ ہی تعلیم و تربیت کے مواقع میسر آتے ہیں۔ ان کے بچپن کو ان کی معاشی مجبوریاں نگل لیتی ہیں اور کھیلنے کودنے کی عمر میں انھیں موٹر گیراج میں کام کرنا پڑتا ہے، بھیک مانگنی پڑتی ہے۔ انہی حالات میں نیاز، استاد پیڈرو اور دیگر منفی کرداروں کے ہتھے چڑھ کر وہ جرم کی دنیا میں داخل ہو جاتے ہیں۔ ناول کا اختتام اگرچہ مثبت ہے اور رجائیت کا پیغام لیے ہوئے ہے لیکن عمومی طور پر اس کی فضا یاسیت گھٹن اور ناامیدی کی حامل ہے۔

دولت کی غیر مساوی تقسیم، زیادہ سے زیادہ دولت سمیٹنے کی ہوس میں مبتلا خان بہادر فرزند علی خان اور اس جیسے دیگر کردار ہیں جو انسانی اوصاف سے بھی عاری ہیں۔ ہر قیمت پر دولت کا حصول جن کا نصب العین ہے۔ قیام پاکستان کے بعد جلد ہی پاکستانی سماج کو جونک کی مانند چمٹ کر اس سے خون کی بوندیں نچوڑ لینے والے نودولتیوں کی وجہ سے معاشرے میں طبقات کے درمیان دولت کی یہ خلیج روز بروز گہری ہوتی چلی گئی۔ جس کے ایک طرف نوشا، شامی اور رضیہ جیسے لوگ ہیں جو کیڑے مکوڑوں کی طرح جیتے ہیں اور کیڑے مکوڑوں کی طرح ہی ایک دن چپ کر کے مر جاتے ہیں۔ دوسری طرف خان بہادر فرزند علی خان اور نیاز جیسے کردار ہیں۔

بہر حال مصنف جہاں ایک طرف غربت اور افلاس سے جنم لینے والے اخلاقی بحران اور المیے کو پیش کیا ہے۔ دوسری طرح مذہبی ریاکاری اور حرص وہوس پر نشتر زنی کی ہے۔ اور ان کے نشتر کی دھار اتنی تیز ہے کہ پڑھنے والا اس کی تیزی کو محسوس کیے بنا رہ نہیں سکتا۔

مثال کے طور پر

"خان بہادر فرزند علی، جو اب الحاج خان بہادر فرزند علی بن چکا تھا اسلام کی سربلندی کا علمبردار تھا۔ نورانی مسجد کے پرشکوہ مینار اس کے جذبہ ایمانی کا جیتا جاگتا ثبوت تھے۔ وہ ملک اور قوم کا بہی خواہ اور محب وطن تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جنھوں نے پاکستان میں متروکہ جائیداد کی طرح اسلام اور حب الوطنی کے جملہ حقوق بھی اپنے نام الاٹ کرا لیے ہیں۔"[۲]

---

(۱) انور پاشا، ڈاکٹر، *ہندو پاک میں اردو ناول* (نئی دہلی: پیش رو پبلی کیشنز ۱۹۹۲ء) ص ۱۵۳

(۲) شوکت صدیقی، *خدا کی بستی* (کراچی: کتب پبلی کیشنز، ۱۹۹۵) ص ۴۷۷

ناول میں کراچی جیسے جدید کاسموپولیٹن شہر کی معاشرت کو بھی پیش کیا گیا ہے جو جدید عالمگیریت کے مظاہر میں سے ایک ہے۔ مثلاً

"بلڈنگ کے عیسائی اور پارسی خاندانوں کی بیشتر نوجوان عورتیں اور لڑکیاں بینکوں اور تجارتی اداروں میں سیکرٹری ٹائپسٹ یا اسٹینوگرافر تھیں۔ وہ تنگ اسکرٹ پہنتیں مردوں کی طرح سر پر چھوٹے چھوٹے ترشے ہوئے بال رکھتیں اور اپنی تنخواہ کا بیشتر حصہ قیمتی لباس اور میک اپ پر خرچ کرتیں۔ ان کی باتیں عام طور پر لباسوں کے جدید ڈیزائنوں نئی فلموں، ڈانس پارٹیوں، پکنک اور شہر کے بڑے بڑے ہوٹلوں کے متعلق ہوتی تھیں۔ کبھی کبھی وہ شہزادی مارگریٹ کے کسی نئے اسکینڈل، شاہ فاروق اور پرنس علی خان کے تازہ ترین معاشقے کے بارے میں بھی بات کر لیتیں اور ان کے تذکرے میں خاص لذت محسوس کرتیں۔"[۱]

ناول میں عالم گیریت کے زیر اثر پاکستانی سماج میں رواج پذیر نئے فیشن، نئی تفریحات اور طرز زندگی میں آنے والی تبدیلیاں بھی جابجا جلوہ گر ہو کر بدلتے ہوئے تغیر پذیر سماج کی عکاسی کرتیں ہیں۔

"سلمان ہفتے کی شام بیوی کے ساتھ پکچر ضرور دیکھتا۔ ہر دوسرے تیسرے دن اس کے ہمراہ شام کو ٹہلنے نکل جاتا۔"[۲]

"بیوی میں شاپنگ کی عادت بڑھتی جا رہی تھی۔ جوتوں اور سینڈلوں کی اس نے درجنوں چوڑیاں خرید ڈالی تھیں۔ ہر فلم دیکھنے کے بعد وہ نیا لباس تیار کراتی تھی۔ میک اپ کا خرچ بھی بڑھ گیا تھا۔ وہ نت نئے لوشن خرید کر لاتی۔ کوئی غسل کرنے کے لیے کوئی صرف ہتھیلیوں کی جلد نرم کرنے کے لیے اور کسی سے چہرے کا رنگ نکھار آتا جاتا۔ درزی سے ایسے کپڑے سلواتی جن سے سینے کی جلد زیادہ سے زیادہ عریاں نظر آتی۔ ان کی فٹنگ ایسی ہوتی کہ جسم کا ایک ایک خم نظر آتا۔"[۳]

قیام پاکستان کے بعد معاشرے نے جو چولا بدلا اور زندگی نے جس طرح رخ بدلا۔ خدا کی بستی اس کی عکاسی ہے۔ انسانی تاریخ کے قصے بڑے خروج کو ہم نے ادب میں جس طرح جگہ دی وہ ایک الگ موضوع ہے۔ مگر اس خروج کے بعد نئے ملک میں بدلتی ہوئی اقدار اپنی جگہ ایک اہم موضوع ہے۔ یہی خدا کی بستی کا موضوع ہے۔ خدا کی بستی نئے معاشرے کی داستان ہے۔ اتنی بڑی قیامت کے بعد جب انسان اپنی زمین سے بچھڑ کر نئے ملک میں آباد ہوا تو اس پر جو بیت گیا وہی خدا کی بستی کا موضوع ہے۔ اس موضوع کو واضح سماجی شعور کے ساتھ مصنف نے اس طرح پیش کیا ہے کہ وہ ایک بڑی تخلیق معرضِ وجود میں آ گئی۔

محمد فاروق اپنے مقالے میں لکھتے ہیں۔

---

(۱) شوکت صدیقی، *خدا کی بستی* (کراچی: کتب پبلی کیشنز، ۱۹۹۵) ص ۲۸۲

(۲) ایضاً، ص ۳۸۳

(۳) شوکت صدیقی، *خدا کی بستی*، ص ۳۸۳

"خدا کی بستی میں پاکستانی سماج کی تصویریں جابجا بکھری ہیں۔ شوکت صدیقی نے اس ناول میں پاکستانی سماج کو دو طریقوں سے پیش کیا ہے۔

پہلا طریقہ مظلوم طبقے کی ذہنی و جذباتی کشمکش کو پیش کرنے کے ذریعے سے۔ اس طبقے میں بے روزگار نوجوان، محنت کش اور مزدور شامل ہیں۔ یہ طبقہ معاشرے میں باعزت زندگی گزارنے کے لیے جدوجہد کرتا ہے اور اس کی یہ جدوجہد انسانیت کے معیار بلند کرنے میں معاون ہے۔۔۔۔ دوسرا طریقہ اس طبقے کو پیش کرتا ہے جو پاکستانی سماج میں اعلیٰ عہدوں پر فائز اور عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اس طبقے میں سرمایہ دار، جاگیر دار اور سیاست دان شامل ہیں۔ اس طبقے کو ان کی عیاشی اور غیر اخلاقی، غیر قانونی سرگرمیوں کے ذریعے پیش کیا گیا ہے۔ یہ طبقہ اپنے غیر اخلاقی ہتھکنڈوں اور دولت کے لالچ میں بار بار انسانیت کی تذلیل کرتا ہے۔"(۱)

ناول کا موضوع اگرچہ نیا نہیں ہے لیکن اس میں جدت یہ ہے کہ ناول نگار نے قیامِ پاکستان کے بعد اسلام کے نام پر وجود میں آنے والی اس مملکت خداداد میں عوام الناس کی حالت زار اور اس کے ساتھ ساتھ استحصال کی مختلف صورتوں کو پیش کیا گیا ہے-ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو عنوان کی مناسبت سے اس میں طنز محسوس ہوتا ہے کہ عوام کی جو حالت اس خدا کی بستی کے وجود میں آنے سے پہلے تھی خدا اور اسلام کے نام پر وجود میں آنے والے اس ملک میں بھی ان کا کوئی پرسان حال نہیں ہے-

(۱) محمد فاروق، شوکت صدیقی کے ناولوں میں پاکستانی سماج کی عکاسی، غیر مطبوعہ مقالہ (لاہور: شعبہ اردو اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی ۲۰۱۴ء)، ص ۱۴۹

# آگ کا دریا

آگ کا دریا اردو ناول کی تاریخ میں منفرد حیثیت کا حامل ہے اور اس کی یہ انفرادیت ہمیشہ قائم رہی کیونکہ یہ ناول رجحان ساز ہونے کی بنا پر کلاسیک کا درجہ رکھتا ہے اور کلاسیک زمان و مکان سے ماورا ہوتے ہوئے بھی روح عصر کے ترجمان ہوتے ہیں۔

آگ کا دریا کو اردو میں جدید ناول نگاری کا نقطہ آغاز بھی کہا جا سکتا ہے۔ یہ ناول ۱۹۵۹ء میں مکتبہ جدید لاہور سے شائع ہوا۔ مصنفہ نے ہندوستان کی ہزاروں سال کی تہذیبی تاریخ اور معاشرتی زندگی کو فنکارانہ چابکدستی چند سو صفحات میں سمیٹ لیا۔ اس طرح انہوں نے صدیوں پر محیط زمان و مکان کی پیش کش کا کامیاب تجربہ کیا۔ یہ ناول بیک وقت تاریخی بھی ہے، علامتی بھی اور جمہوری بھی۔ بودھ ازم، صوفی ازم، مارکس ازم کے ذریعے ہندوستانی تہذیب اور اس کے مختلف ادوار پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس ناول کے حوالے سے ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا لکھتے ہیں۔ کہ اس ناول میں

> ''...ویدک دور سے مسلمانوں کی آمد (دورِ مغلیہ) تک، زوال مغلیہ سے فیض آباد اور لکھنؤ کی سلطنت تک پھر ۱۸۵۷ء سے انگریزی سامراج تک آزادی کی تحریکوں اور بیسویں صدی کے بدلتے ہوئے ہندوستان سے تقسیم ہند کے بعد تک کے واقعات کا احاطہ کیا گیا ہے۔''[۱]

ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ناول میں وقت کو مرکزی کردار کے طور پر پیش کر کے ایک منفرد تجربہ کیا ہے۔ اردو ناولوں میں یہ اپنی نوعیت کا واحد ناول ہے جس نے اردو ناول کو ایک نئی وسعت، نئی گہرائی، نیا تاثراتی اندازِ بیان اور ایک نئی ہیئت عطا کی ہے۔ ہندوستان کی تین ہزار سالہ تاریخ کی تقسیم چار ادوار میں کی ہے۔ پہلا دور وہ جب ہندوستان میں صرف ہندو آباد تھے اور جب بدھ مت کو فروغ حاصل ہوا اور یہ قرۃ العین کے قلم کا اعجاز ہے کہ وہ پورا دور اپنی تمام تر جزئیات اور شخصیات اور ان کے افکار کے ساتھ سانس لیتا محسوس ہوتا ہے۔

ہندوستان میں تہذیبی ارتقا کو قرۃ العین حیدر نے گوتم نیلمبر، کمال الدین اور چمپا کے کرداروں کے ذریعے پیش کیا ہے۔ انہوں نے جہاں ہندوستان کی قدیم تہذیبی زندگی کو پیش کیا۔ وہیں آزادی کے بعد تہذیبی انحطاط اور دیوالیہ پن کی عکاسی بھی کی ہے اور اس تہذیبی تبدیلی نے سوچ کے انداز اور زندگی بسر کرنے کے ڈھنگ کو بدل ڈالا۔ نودولتیا معاشرہ جو ہجرت کے بعد وجود میں آیا۔ اس کی اقدار قدیم وضع دار تہذیب کی اقدار سے جو صدیوں کے بعد وجود میں آئی تھی سے بالکل مختلف تھیں۔ دولت سب سے بڑی قدر بن گئی۔

> ''یہاں نئے دولت مند طبقے کی حکومت ہے۔ ان کا نیا سماج، نئے اصول۔ کراچی بے حد ماڈرن شہر ہے۔ یہاں روز رات کو اعلیٰ درجے کے ہوٹلوں اور کلبوں میں ایک جگمگاتی کائنات آباد

---

(۱) محمد زکریا، خواجہ، *مختصر تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، اردو ادب (آغاز تا بیسویں صدی)* (لاہور: پنجاب یونیورسٹی ۲۰۱۶ء)، ص ۸۲۱

ہوتی ہے۔ ماہرینِ عمرانیات کے لیے یہ انتہائی دلچسپی کا باعث ہونا چاہیے کہ پچھلے نو سال میں کس طرح ایک نئے معاشرے نے اس ملک میں جنم لیا ہے۔ اس معاشرے کی بنیاد روپیہ ہے اور روپیہ بناؤ دولت حاصل کرو۔ آج بہتی گنگا میں ڈبکیاں لگالو۔ کل چاہے گنگا خشک ہو جائے یا رخ بدل لے۔"[۱]

قرۃ العین حیدر کا بنیادی موضوع تاریخ اور تہذیب ہے اور ان دونوں میں موجزن وقت کا بہاؤ اور اس کے اثرات بھی ان کے ناولوں میں نظر آتے ہیں۔ عالمگیریت کا سروکار بھی تہذیب و ثقافت سے ہے۔ اس حوالے سے قرۃ العین کا ناول آگ کا دریا میں یہ تہذیبی تبدیلیاں جلوہ گر ہو کر عالمگیریت کے حوالے سے مواد فراہم کرتی ہیں۔ عالمگیریت کا مطالعہ معاشی استحصال اور تہذیبی تبدیلی کے موضوعات سے متعلق ہے۔ آگ کے دریا میں عالمگیریت کے اثرات بالواسطہ طور پر موجود ہیں۔

ناول میں ہندوستان کی تاریخ کا تیسرا دور انگریزوں کی حکومت سے شروع ہوتا ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی تجارت کی غرض سے ہندوستان آتی ہے اور پھر ہندوستانیوں کی قسمت کی مالک بن جاتی ہے۔ یہاں وہ ایک غریب پادری کے بیٹے سرل ایشلے کو، جو کیمبرج کا گریجویٹ اور کمپنی کا ملازم ہے، انگریزوں کے نمائندے کے طور پر پیش کرتی ہیں جو ہندوستان پہنچ کر ایک اینگلو انڈین عورت کو شادی کا جھانسا دے کر اپنا مطلب پورا کرتا ہے۔ لکھنؤ میں وہ وہاں کی مشہور طوائف چمپا بائی سے تعلق استوار کر لیتا ہے۔ کلکتہ میں ملازمت کے دوران وہ شیلا نامی ایک لڑکی کو اپنی کوٹھی میں رکھتا ہے۔ بنیادی طور پر وہ بدعہد اور حریص انسان ہے۔ جو دنیا سے لینا سب کچھ چاہتا ہے دینا کچھ نہیں۔ یہی رویہ انگریزوں کا ہندوستان اور ہندوستانیوں کے ساتھ تھا۔ اس میں ہر قسم کا استحصال شامل تھا۔ اس رویے کے خلاف عوام میں بے چینی پھیلی کا جائزہ بھی ناول میں پیش کیا گیا۔ اس دور کا انسان جن سیاسی حالات سے دوچار تھا اور اس پر اس کے اثرات دو طرح سے تھے۔ ایک وہ جو مغربی شاعری اور موسیقی کا دلدادہ تھا اور دوسرا وہ جو ذہنی طور پر بیدار اور حالاتِ حاضرہ پر گہری نظر رکھنے ہو۔

لیکن ۱۹۴۷ء کے حوالے سے انہوں نے اس میں کچھ نہیں لکھا۔ صرف اس قدر لکھا ہندوستان ۱۹۴۷ء لیکن ۱۹۴۷ء کے حالات کے متعلق اتنا کچھ لکھ دیا گیا ہے کہ مزید لکھنا ان کے نزدیک تحصیل حاصل تھا۔

ناول میں وہ انسان کی تنہائی، تھکاوٹ اور شکست کو بھی موضوع بناتی ہیں لیکن اس کے باوجود امید کا چراغ روشن رکھتی ہیں۔ وہ ہندوستانی شخصیت کی عظمت پر یقین رکھتی ہیں اور ناول کا اختتام بھی اسی شخصیت کی عظمت اور امید کے ساتھ کرتی ہیں۔

ناول میں جنگ کی ہولناکیوں اور اسے موت کے دوسرے روپ کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ گوتم کو جنگ اور اس کے نتیجے میں بے گناہ انسانوں کی موت اور زندوں کی تباہی اور اذیت کی زندگی بسر کرنے والوں کو دیکھ کر دکھ کا احساس ہوتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ

---

(۱) قرۃ العین حیدر، *آگ کا دریا* (لاہور: سنگِ میل پبلیکیشنز، ۲۰۱۲ء) ص ۲۶۵

شاکیہ منی نے کہا تھا کہ فتح نصرت پیدا کرتی ہے کیونکہ مفتوح دکھ کی نیند سوتے ہیں جنگ کے ہولناک تصور کے ساتھ استحصال کا تصور بھی آگ کا دریا میں تفصیل سے آیا ہے جب برطانوی سامراج تجارت کے نام پر ہندوستان پر قبضہ کر لیتا ہے۔ سرل ایشلے جس کی تین نسلیں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ساتھ منسلک ہیں۔ دراصل برطانوی سامراج کی علامت کے طور پر پیش کیا گیا ہے سامراجیت کی گھناؤنی ترین شکل نو آبادیاتی دور میں ملتی ہے۔

> ''۸ جون ۱۷۹۸ء کو سرل ایشلے یک بیک چونک اٹھا۔ اسے ہندوستان آئے پورے پانچ سال ہو گئے تھے۔ ان پانچ سالوں میں وہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا تھا۔ نیل کی تجارت دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہی تھی۔ گجرات میں نیل کی صنعت دم توڑ چکی تھی۔ اس کی جگہ کمپنی کے انگریز پلانٹرس دلی سے بنگال تک پھیل چکے تھے۔ بنگال کا کسان انگریز سے قرض لے کر نیل بوتا تھا۔ پھر مختلف طریقوں سے اس پر ظلم توڑے جاتے تھے۔ عدالتوں میں اس کی شنوائی نہیں ہوتی تھی۔ انصاف کرنے والے ان پلانٹرس کے بھائی بند تھے۔ چھالیہ، تمباکو، نمک، چاول اور دیگر اشیا کی تجارت پر کمپنی بہادر نے قبضہ جما کر قیمتوں کو بڑھا دیا ہے۔ یوں برطانیہ امیر سے امیر تر ہو رہا تھا جبکہ ہندوستان نیم جاں۔''[۱]

یہی ایسٹ انڈیا کمپنی آج کی ملٹی نیشنل کمپنیوں کی پیش رو کہی جا سکتی ہے۔ آج بھی استحصال ہو رہا ہے۔ آج بھی سرمائے کا رخ غریب ممالک سے ترقی یافتہ ممالک کی طرف ہے۔ عالمگیریت کی اس ترقی یافتہ صورت کو آج خوشنما نعروں کی صورت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ صورت میں تبدیلی کے باوجود استحصال کل بھی ہو رہا تھا۔ استحصال آج بھی ہو رہا ہے۔ اسی استحصال کو قرۃ العین حیدر پیش کرتی ہیں۔

---

(۱) قرۃ العین حیدر، آگ کا دریا، ص ۴۵۵

# نشانِ محفل

الطاف فاطمہ دورِ حاضر کی ایک معروف ناول نگار، افسانہ نگار اور استاد ہیں۔ ان کے دو ضخیم ناول دستک نہ دو اور نشانِ محفل شائع ہو کر قارئین میں خاصے مقبول ہو چکے ہیں اور اب تک ان ناولوں کے دسیوں ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور یہ اس بات کی بھی دلیل ہے کہ الطاف فاطمہ کو ناول نگاری کے فن پر عبور حاصل ہے اور ان کے ناول طوالت کے باوجود دلچسپی سے خالی نہیں ہوتے۔

نشانِ محفل الطاف فاطمہ کا پہلا ناول ہے۔ اس ناول کا تعلق ایک مخصوص عہد سے ہے۔ وہ عہد جو قیام پاکستان سے چند سال پہلے اور چند سال بعد کا احاطہ کرتا ہے۔ بنیادی طور پر یہ ایک رومانی ناول ہے۔ جس کا مرکزی کردار روبینہ ہے جو ایک خود سر اور لاابالی خاتون ہے جو اگرچہ انگریز ہے تاہم وہ اپنی تہذیب و ثقافت سے بیزار اور مشرق کے اسرار میں دلچسپی رکھتی ہے۔

ناول میں مصنفہ نے مشرق و مغرب کا موازنہ روبینہ کے کردار کے ذریعے پیش کیا ہے اور مشرق و مغرب کے درمیان پائے جانے والے تضاد کو اجاگر کیا ہے۔ اس طرح یہ ناول دو مختلف تہذیبوں سے تعلق رکھنے والے انسانوں کے مزاج، عادات و اطوار اور تہذیبی اقدار کے فرق کو نمایاں کرتا ہے۔

ناول کے آغاز میں روبینہ کو دکھایا گیا ہے جو سوچوں میں گم ہے اور روبینہ اپنے ماحول میں پروان چڑھنے کے باوجود اس ماحول سے بیزار ہے۔ پارٹیاں ہنگامے جو ان کی زندگیوں کا لازمی جزو ہیں روبینہ ان سے متنفر ہے لیکن وہ مشرق کی سرزمین اور اس کی فضاؤں کو دیکھنے اور جاننے کا تجسس رکھتی ہے۔ ایک دن دسمبر کی چھٹیوں میں اس کا بھائی بوب اپنے ساتھ اپنے دوست نادر کو لے کر آتا ہے جو ہندوستانی ہے اور گہرے سانولے رنگ کا مالک ہے۔ روبینہ نادر سے متاثر ہو جاتی ہے۔ نادر بھی اسے مشرق کے متعلق دلچسپ باتیں بتاتا رہتا ہے۔ آخر کار روبینہ اپنا سب کچھ چھوڑ کر نادر کے ساتھ ہندوستان آجاتی ہے۔ نادر کے گھر والے کھلے دل سے دونوں کا بھرپور استقبال کرتے ہیں لیکن روبینہ ان کے ساتھ گھلنے ملنے پر آمادہ نہیں ہوتی۔

رفتہ رفتہ روبینہ نادر کے گھر والوں یعنی نادر کی ماں اور بہن رابعہ سے بیزار ہو کر بد مزاجی اور چڑچڑے پن کا مظاہرہ کرتی ہے۔ نادر اگرچہ اپنی ماں اور بہن سے بے حد محبت کرتا ہے لیکن وہ روبینہ کو بھی خوش رکھنا چاہتا ہے لہٰذا وہ اپنا تبادلہ لکھنؤ سے الٰہ آباد کروالیتا ہے کیونکہ لکھنؤ میں رہ کر گھر الگ کرنے کی ہمت اس میں نہیں َ۔ الٰہ آباد میں آکر روبینہ، نادر اور ان کا بیٹا محمود ایک نئی زندگی کا آغاز کرتے ہیں۔ روبینہ شروع میں گھر اور اس کی ہر چیز میں بڑے جوش و خروش سے دلچسپی لیتی ہے لیکن جلد ہی اس کا جوش ختم ہو جاتا ہے اور اب اس کی دلچسپی کا محور اس کا گھر نہیں ہے۔ اب وہ اپنے گھر سے زیادہ دوسرے یورپین خاندانوں کے ساتھ دن گذارنا پسند کرتی ہے اور اس کا حلقہ احباب یورپی لوگوں تک محدود ہو جاتا ہے۔ دوسری طرف نادر اپنی ملازمت اور اس کی مصروفیات پرچے، امتحانات

اور کانفرنسوں میں وقت صرف کرتا ہے اور فرصت کے اوقات اپنی کتاب کی تکمیل کے لیے مواد کی تلاش میں صرف کرتا ہے۔ ان کی زندگی پھر ٹھہراؤ اور یکسانیت کا شکار ہو جاتی ہے۔

نادر امتحانات کے قریب اپنے کچھ ہونہار اور عزیز شاگروں کو گھر پر وقت دیتا ہے جو روبینہ کو ناگوار گزرتا ہے۔ لیکن نادر کے طالب علموں میں ایک شاگرد ایبک بھی ہے جو وجیہہ و شکیل ہے۔ اب کی بار روبینہ کی دلچسپی کا محور ایبک کی ذات ٹھہرتی ہے۔ جو شروع میں اپنے استاد نادر کے احترام میں روبینہ کی دلچسپی کو نظر انداز کرتا ہے لیکن رفتہ رفتہ روبینہ اسے اپنی جانب مائل کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے اور اب وہ نادر سے طلاق کا مطالبہ کر دیتی ہے۔

نادر ایک شریف وضع دار اور محبت کرنے والا انسان ہے۔ وہ روبینہ کی خواہش پر اسے طلاق تو دے دیتا ہے لیکن خود وہ روبینہ کی بے وفائی اور ایبک کے دھوکے پر اندر ہی اندر گھل کر ختم ہو جاتا ہے۔

ایبک کے ساتھ روبینہ کی شادی اس کے لیے ایک نیا ایڈونچر ہے لیکن یہاں بھی ان کے خوشگوار تعلقات کا دورانیہ بہت مختصر ہے۔ اس کی وجوہ میں معاشی تنگدستی سر فہرست ہے۔ کیونکہ ایبک اپنے گھریلو ماحول سے باغی ہونے کی وجہ سے والدین سے قطع تعلق کر چکا ہے۔ دوسری طرف پاکستان معرضِ وجود میں آ جاتا ہے تو روبینہ اور ایبک پاکستان منتقل ہو جاتے ہیں َروبینہ اور ایبک کے ذمے تین بچوں کی کفالت ہے جن میں محمود (نادراور روبینہ کا بیٹا) ہمایوں اور ہما (روبینہ اور ایبک کی اولاد) شامل ہیں۔ ان حالات میں روبینہ کا رویہ پھر گھر اور گھر والوں سے عدم توجہی کا ہے۔ روبینہ ایک دفعہ پھر پارٹیوں، ہنگاموں میں وقت صرف کرنا شروع کر دیتی ہے اور حالات رفتہ رفتہ خراب ہوتے جاتے ہیں۔ انہی حالات میں محمود بحریہ میں بھرتی ہو کر چلا جاتا ہے۔ روبینہ اپنے دوسرے بیٹے ہمایوں کو اس کے دادا کے پاس چھوڑ کر آ جاتی ہے اور بیٹی ہما کو ساس کے بے حد اصرار پر بھی ان کے پاس چھوڑنے کی بجائے اس کی خالہ ایمیلی کے پاس انگلستان بھیج دیتی ہے۔

ادھر ایبک تین سال سے بنگال میں ہوتا ہے جہاں وہ روبینہ سے کنارہ کشی کر کے وقت گزارتا ہے لیکن روبینہ اس سے ملنے بنگال پہنچ جاتی ہے۔ وہاں جا کر اسے معلوم ہوتا ہے کہ ایبک تپ دق کا شکار ہو چکا ہے تو وہ اس کے مرض سے خائف ہو جاتی ہے اور اس سے طلاق لے لیتی ہے۔

لیکن ایبک رفتہ رفتہ صحت یاب ہو جاتا ہے۔ سینی ٹوریم میں اس کی ملاقات عائشہ نامی لڑکی سے ہوتی ہے جو ایک سلجھی ہوئی شخصیت کی مالک ہے۔ ایبک اور عائشہ کی شادی ہو جاتی ہے لیکن روبینہ تنہا رہ جاتی ہے۔ اب وہ اپنے ماضی کے بارے میں سوچتی رہتی ہے لیکن وہ واپس انگلینڈ اپنی بیٹی، بہن اور بھائیوں کے پاس بھی نہیں جاتی۔ وہ اپنے آپ سے سوال پوچھتی ہے کہ وہ یہاں سے جانا کیوں نہیں چاہتی تو اسے جواب ملتا ہے مجھے نہیں معلوم روبی میں صرف یہ جانتا ہوں کہ جو کارواں آگے بڑھ گیا ہے تم اس کی محفل کا نشاں ہو جو ضرور باقی رہتا ہے۔

نشان محفل ایک مربوط پلاٹ کا حامل ناول ہے۔ اس کے اہم کرداروں میں نادر، روبینہ، ایبک اور رابعہ شامل ہیں۔ روبینہ کو مصنفہ نے مغرب کے نمائندہ کردار کے طور پر پیش کیا ہے جو سنگدلی کی حد تک متلون مزاج اور سیمابی فطرت کی حامل ہے۔ اس کی ہی سنگدلی نادر کی موت کی وجہ بنتی ہے۔ وہ مشرق کے اسرار میں تو گرفتار ہے لیکن مشرقی خواتین کی وفاشعاری، شوہر پرستی اور خدمت گزاری سے کوسوں دور ہے۔ بظاہر وہ مشرق سے محبت کرتی ہے لیکن درون خانہ دل وہ ان مشاغل اور دلچسپیوں سے رغبت رکھتی ہے جو مغربی خواتین کی زندگی کا لازما ہیں۔ جس میں کلب، پارٹیز، ڈانس، برج کھیلنا، ڈرنک کرنا اور مخلوط محافل میں شرکت جیسے مشاغل ہیں۔ اس کو ٹھہراؤ سے نفرت ہے۔ اس کے اندر حالات کی پیش بینی کی صلاحیت نہیں۔ مجموعی طور پر یہ ایک منفی کردار ہے جو کئی زندگیوں کو متاثر کرتا ہے۔ دوسری طرف نادر کا کردار ہے۔ جس کے حوالے سے ڈاکٹر سید جاوید اختر لکھتے ہیں:

> "نادر ایک سنجیدہ اور خوددار انسان ہے۔ ہمیشہ دوسروں کے لیے سوچتا اور انھی کے لیے جیتا ہے۔ اس کی محبت میں گمبھیرتا ہے مگر وہ اسے ظاہر نہیں ہونے دیتا۔ اسی لئے وہ روبینہ سے اظہارِ محبت نہیں کرتا۔ اسے اپنی ہمشیرہ رابعہ، ماں اور خاندانی روایات سے بھی گہرا جذباتی لگاؤ ہے۔ باوجودیکہ وہ مغربی فضاؤں کا تربیت یافتہ ہے۔ اس کا دل مشرقی ہے اور لکھنوی تہذیب کا متوالا۔ اسے اپنے آبائی مکان، امرود کے پیڑ، ایک ایک کونے کھدرے سے عشق ہے۔ وہ اپنے شاگردوں اور ملازموں تک کو چاہتا ہے۔ اس کے مزاج میں گوندھا گیا محبت کا یہی خمیر ہمیں اس سے محبت کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔"(۱)

نادر کے حوالے سے ڈاکٹر اے بی اشرف لکھتے ہیں:

> "نادر ایک ایسا کردار ہے جس سے ہم محبت کرتے ہیں اس لیے کہ وہ خود محبت کرنے والا ہے۔"(۲)

اسی طرح محبت کے خمیر سے گوندھا گیا کردار رابعہ کا ہے جو نادر کی بہن ہے۔ وہ بھی اپنے ماحول اور ارد گرد کی اشیاء سے محبت کرتی ہے اور رشتوں ناطوں کو بنائے رکھنے کا ہنر جانتی ہے۔ اسی طرح کا ایک اور کردار بینا کا بھی ہے جو نادر سے چپکے چپکے محبت کرتی ہے اور اس محبت کے آگے اویناش کی محبت بھی اسے دکھائی نہیں دیتی۔ لیکن جب نادر کی شادی ہو گئی اور وہ اپنی زندگی میں مصروف ہو گیا تو بینا کو بھی آخر کار اویناش کی محبت کے آگے ہار ماننا پڑی لیکن نادر کی زندگی کے آخری ایام تک وہ اس کی خدمت دل و جان سے کرتی ہے۔

---

(۱) سید جاوید اختر، ڈاکٹر، *اردو کی ناول نگار خواتین: ترقی پسند تحریک سے دورِ حاضر تک* (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۷ء) ص ۱۶۹-۱۷۰

(۲) اے۔ بی اشرف، ڈاکٹر، *مسائل ادب، تنقید و تجزیہ* (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء) ص ۳۷۴

یوں محسوس ہوتا ہے ناول نگار نے روبینہ کے کردار کے مقابل یہ سارے کردار جو سراپا وفا، ایثار، محبت اور خلوص ہیں مشرقی تہذیب کے نمونہ کردار کے طور پر پیش کئے ہیں اور یہ کردار پیش کرتے ہوئے انہوں نے مذہب و ملت کے فرق کو پس پشت ڈالتے ہوئے ان کرداروں کو تخلیق کیا۔ اس سے یہ تاثر بھی ملتا ہے کہ شاید یہ تاثیر مشرق کی مٹی میں ہے کہ یہاں جنم لینے والے افراد کی سرشت میں ہی وفا و ایثار ہوتا ہے۔ جب کہ ان کرداروں کے مقابل روبینہ کا کردار ہے جو ان مثبت خصوصیات سے یکسر عاری ہے۔

ناول کی کہانی بنیادی طور پر روبینہ کے گرد گھومتی ہے جو مغربی تہذیب و تمدن کا نمائندہ کردار ہے۔ روبینہ بے چین اور بے قرار روح ہے جو زندگی کی دلچسپیوں میں کھو کر اپنا سب کچھ گنوا بیٹھتی ہے۔ آخر کار تنہا اور اکیلی رہ جاتی ہے۔ اس کا انجام کرب ناک ہے۔

رابعہ کے کردار کے حوالے سے ڈاکٹر اے بی اشرف لکھتے ہیں۔

> ''حقیقت یہ ہے کہ رابعہ اور نادر ایک ہی کردار کے دو رخ ہیں اور ہیں بھی بالعکس۔ رابعہ عورت نادر ہے اور نادر مرد رابعہ۔''(۱)

ایبک اس ناول کا ایک اور اہم کردار ہے جس کی تمام تر کمزوریوں کے باوجود ہمیں اس سے نفرت نہیں ہوتی۔ وہ ایک ایسی کشمکش سے دوچار ہے جہاں ایک طرف محبت ہے اور دوسری طرف اس کے اخلاقی اصول لیکن محبت آخر کار غالب آجاتی ہے لیکن اس سے پہلے وہ روبینہ سے اور اس کی محبت سے بچنے کی شعوری کوشش کرتا ہے لیکن اتفاقات اور نادر کا اندھا اعتماد انہیں یہ مواقع فراہم کرتے رہتے ہیں۔ مصنفہ نے ایبک کے کردار کے ذریعے مشرقی تہذیب اور اس کی قدیم روایات اور اصولوں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ مثال کے طور پر جب وہ روبینہ کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہے تو غیر شعوری طور پر وہ مشرق و مغرب کا موازنہ کرتا ہے:

> ''بدنصیب! میری بات سمجھ لے تو اتنی زندگیوں کو تباہ کرنے پر کیوں تلی ہوئی ہے۔ یہ ہندوستان ہے۔ یہاں ایک زندگی کے ساتھ نہ جانے کتنی زندگیوں کے تار منسلک ہوتے ہیں۔ یہاں لوگ پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہیں۔ اس لیے کہ یہاں دلوں کے آبگینے بہت نازک ہوتے ہیں یہ برف کے سفید تودے نہیں۔ یہ جلتی ہوئی چنگاریاں ہیں جو نگر پھونک دیتی ہیں۔''(۲)

ناول میں مغربی تہذیبی مظاہر چند ایک مقامات پر اپنا جلوہ دکھاتے ہیں۔ ناول میں عالمگیریت کے تہذیبی پہلوؤں کے حوالے سے مواد موجود ہے۔ خصوصاً جہاں جہاں مصنفہ نے یورپی خاندانوں اور ان کی طرز زندگی کو پیش کیا ہے خود روبینہ کا کردار عالمگیریت کی تہذیب کو عمدہ انداز میں پیش کرتے ہوئے مشرقی معاشرے کی تہذیبی روایات کو تضاد کے ذریعے اجاگر کرتا ہے اس طرح یہ ناول

---

(۱) اے۔ بی اشرف، ڈاکٹر، *مسائل ادب تنقید و تجزیہ*، ص ۳۷۵

(۲) الطاف فاطمہ، *نشانِ محفل*، ص ۲۲۸

مشرق اور مغرب کا ایک موازنہ ضرور فراہم کرتا ہے اور سوچنے کے لئے سوال بھی پیش کرتا ہے کہ یہ عالم گیر تہذیب مشرق کے روایتی خاندانی نظام پر کیسے کیسے اثرات مرتب کر سکتی ہے۔

لیکن یہاں یہ بھی محسوس ہوتا ہے مصنفہ کی مشرق سے محبت اور اپنی روایات سے لگاؤ کے باعث غیر جانبداری متاثر ہوتی ہے کیونکہ روبینہ کی ماں کے کردار کو اگر دیکھا جائے تو وہ بھی خدمت گزاری اور اپنی خاندان سے محبت میں مشرقی خواتین سے کسی طور پر کم نہیں اور حیرت انگیز طور پر روبینہ کی شخصیت میں اس کی ماں کا عکس کہیں نظر نہیں آتا۔

بہر حال دلچسپی کی حد تک یہ ایک اچھا ناول ہے۔

زبان و بیان کے اعتبار سے دیکھا جائے تو اس ناول میں الطاف فاطمہ کا اسلوب مؤثر اور دل پذیر ہے ان کے ہاں محاورات اور جملوں میں ایک خاص قسم کا حسن موجود ہے۔ اس کے علاوہ انگریزی الفاظ اور پورے پورے جملے اس ناول میں ملتے ہیں۔ مثلاً کاٹیج، اٹیوی، بیڈروم، لومیرج (Love Marriage) اور اس جیسی کئی مثالیں موجود ہیں۔

# اداس نسلیں

اداس نسلیں قیام پاکستان کے بعد لکھے جانے والے بہترین اردو ناولوں میں سے ایک ہے۔ اگرچہ اس کا موضوع قیام پاکستان سے پہلے برصغیر میں رہنے والے لوگوں کی سیاسی بیداری ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ حقیقت پسندی کی ایک ایسی مضبوط روایت ہے جس میں پنجاب کی دیہی زندگی سانس لیتی محسوس ہوتی ہے۔

اداس نسلیں پر کام کا آغاز عبداللہ حسین نے جون ۱۹۵۶ء میں کیا۔ تب تک وہ اپنے والد کی وفات کے سانحے اور نروس بریک ڈاؤن کے تجربے سے گذر چکے تھے۔ یہ دونوں تجربات اور اس پر مستزاد داؤ خیل کی تنہائی ہی وہ محرکات تھے جن کی بدولت مصنف کا خون جگر نوکِ قلم سے صفحہ قرطاس پر بعنوان اداس نسلیں ٹپکا اور پڑھنے والوں کے دل و جگر میں اتر گیا۔ بہر حال یہ منصوبہ پانچ سال میں پایہ تکمیل کو پہنچا۔ ۱۹۶۱ء میں یہ ناول تکمیل پذیر ہوا لیکن اس کی اشاعت دو سال بعد عمل میں آئی۔

اداس نسلیں کی کہانی ۱۹۴۷ء سے قبل کے متحدہ ہندوستانی معاشرے سے متعلق ہے۔ ناول میں تین نسلوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس حوالے سے اسلوب احمد انصاری لکھتے ہیں:

> ”عبداللہ حسین کے ناول ”اداس نسلیں“ کا موضوع ایک فرد نہیں بلکہ ہم عصر زندگی کے مختلف ادوار اور ان میں سے گذرتے ہوئے عمل اور صعوبت کے گرداب میں محصور، کم از کم تین نسلوں کے نمائندے ہیں۔ یہ عمل جس زمانے یا دوران پر محیط ہے۔ وہ پہلی جنگ عظیم سے کچھ پہلے شروع ہوتا ہے اور تقسیم ہند کی پر آشوب اور ہنگامہ خیز مدت تک پھیلا ہوا ہے۔ اس میں اس ذہن کی عکاسی ملتی ہے جو معاشرت، تہذیب اور سیاست کے پس منظر میں اپنے رد عمل کو آشکار بھی کرتا ہے اور ان سے اثر پذیر بھی ہوتا ہے۔“[۱]

اس ناول کا کبیری کردار نعیم ہے۔ دیگر اہم کرداروں میں عذرا، روشن آغا، نجمی، مسعود اور علی ہیں۔

یہ ناول ایک وسیع بساط پر محیط ہے۔ اس میں تاریخ کے اس اہم دور کو تہ بہ تہ کھولا گیا ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ہر لحظہ بدلتی ہوئی متغیر زندگی، دیہاتی زندگی، شہری زندگی اور جنگ کی صورتحال کو پیش کیا گیا ہے۔ اداس نسلیں کی کہانی بنیادی طور پر متحدہ ہندوستانی معاشرے سے جڑی ہوئی ہے۔ اس میں تین نسلوں جو ۱۹۱۳ء سے ۱۹۴۷ء کے درمیانی عرصہ میں برطانوی راج کے تحت برصغیر میں آباد تھیں کی داستان حیات کو پیش کیا گیا ہے۔ ناول پندرہ ابواب پر مبنی ہے۔ اسے ۴ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

---

(۱) اسلوب احمد انصاری، اداس نسلیں مشمولہ عبداللہ حسین تخلیقی سفر کی نصف صدی مرتبہ احمد سلیم (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۶ء) ص۲۲۸

(۱) برٹش انڈیا

(۲) انڈیا

(۳) پارٹیشن (تقسیم ہند) اور

(۴) Epilogue(اختتامیہ)

ناول کی ابتدا میں عبد اللہ حسین اپنے قارئین کا تعارف روشن پور گاؤں سے کرواتے ہیں۔ جو دو ضلعوں کی سرحد پر واقع ہے۔ نتیجتاً دو مختلف مذہبی و ثقافتی گروہوں پر مشتمل ہے لیکن ان اختلافات کے باوجود ان گروہوں کے درمیان دوستانہ روابط موجود ہیں۔

اس مختصر تعارف کے بعد عبد اللہ حسین اپنے ناول کے ایک اہم کردار روشن علی خان کا تعارف کرواتے ہیں۔ جن کے نام پر اس گاؤں کا نام رکھا گیا ہے۔ روشن علی خان برطانوی دورِ حکومت میں ضلع روہتک کے کلکٹر کے دفتر میں ایک معمولی اہل کار تھے لیکن پھر قسمت کے پھیر نے یکا یک ان حیثیت بدل کے رکھ دی۔ نہ صرف ان کی بلکہ ان کی آنے والی نسلوں کی بھی۔

واقعہ تقریباً اس سے ملتا جلتا ہے جیسا کہ ڈپٹی نذیر احمد نے ابن الوقت میں بیان کیا ہے۔ یعنی روشن علی ایک انگریز افسر کی جان بچاتا ہے۔ وہ انگریز افسر شاہ انگلستان کا رشتہ دار ہے۔ اپنی جان بچانے کے عوض وہ روشن علی آغا کو پیش کش کرتا ہے کہ وہ برطانوی حکومت کے زیر تسلط ہندوستان میں کسی بھی جگہ گھوڑے پر بیٹھ کر جتنی زمین کا چکر لگا لے وہ اس کی ملکیت ہو جائے گی۔ یہاں ہمیں ٹالسٹائی کی کہانی کا وہ کردار بھی یاد آتا ہے جس میں ایک غریب کسان کو ایسی ہی پیشکش کی جاتی ہے لیکن وہ زیادہ سے زیادہ زمین حاصل کرنے کے لالچ میں سورج غروب ہونے تک پہنچ نہیں پاتا اور مر جاتا ہے لیکن روشن علی اس معاملے میں خوش قسمت رہا اور پانچ سو مربع زمین کو اپنی ملکیت میں لے لیا۔ انگریز سرکار سے آغا کا لقب حاصل کر کے نواب بن بیٹھا۔ روشن علی لیکن اس موقع پر اپنا دیرینہ دوست مرزا محمد بیگ کو نہ بھولا اور اپنی جاگیر سے پچاس مربع اسے عنایت کر دیئے۔

مرزا محمد بیگ کے دو بیٹے مرزا نیاز بیگ اور مرزا ایاز بیگ ہیں۔ مرزا نیاز کے دو بیٹے محمد نعیم اور دوسرا علی ہے۔ مرزا ایاز بیگ کلکتہ میں بطور انجینئر اعلیٰ عہدے پر فائز ہے۔ اپنے بھتیجے نعیم کو بھی وہ اپنے ساتھ کلکتہ لے جاتا ہے۔

ناول کے دوسرے باب کے آغاز میں ایک تقریب کا ذکر ہے۔ جو روشن محل میں منعقد کی جاتی ہے۔ اس تقریب میں روشن علی خان کے انتقال کے بعد اس کے بیٹے نواب محی الدین کی خاندان کے سربراہ کے طور پر پر تاج پوشی ہوتی ہے۔ اس تقریب میں نعیم بھی اپنے چچا مرزا ایاز بیگ کے ساتھ شامل ہوتا ہے۔ جہاں اس کی ملاقات نواب محی الدین کی بیٹی عذرا سے ہوتی ہے۔ یہ ناول کا ایک اہم نقطہ ہے۔

ناول کا ہیرو دو دنیاؤں کا باسی ہے جو ایک طرف انگریزی سکول کا پڑھا ہوا روشن محل کی پارٹیوں میں شامل ہونے والا فرد ہے۔ مہذب اور متمول سماج کی تمام اقدار سے واقف۔ دوسری طرف پنجاب کی دیہاتی فضا میں رچا بسا سیدھا سادا محنتی نعیم ہے جو باپ کے

ساتھ کھیتوں میں بھی کام کرتا ہے۔ ایمان دار ہے۔ سوروں کا شکار کرتا ہے اور اپنے دوست کے ساتھ اس کی دشمنی نبھانے میں قتل جیسی وارداتوں میں شامل ہونے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ سولہ برس کی عمر میں فوج میں بھرتی ہوتا ہے محض عذرا کو یہ دکھانے کے لیے وہ سرکاری نوکری کا اہل ہے کیونکہ عذرا کا خیال ہے کہ اپنے باپ کی گرفتاری کی وجہ سے وہ سرکاری نوکری کا اہل نہیں رہا۔ ناکافی تربیت دے کر نعیم کو جنگ میں بھیج دیا جاتا ہے۔ میدان جنگ میں جنگ کا ایندھن بننے کے جھونک دیا جانے والا وہ اکیلا نہیں بلکہ اور بھی بہت سے ہیں جو معمولی تربیت کے بعد جنگ میں جھونک دیئے جاتے ہیں۔

بہر حال جنگ کا جو منظر نامہ عبد اللہ حسین نے تحریر کیا وہ لاجواب ہے۔ جنگ کی تفصیلات جاننے کے لیے انہوں نے خاصی محنت بھی کی اور ان کے مطابق وہ ایک ایسے شخص سے ملنے کے لیے سفر بھی کرتے ہیں جسے وکٹوریہ کراس ملا تھا۔

بہر حال نعیم جنگ سے وکٹوریہ کراس لے کر اور ایک بازو گنوا کے لوٹا تو اس کی حیثیت بہت بلند ہو جاتی ہے۔ دیہاتی اور شہری زندگی دونوں میں وہ اپنا مقام منوا لیتا ہے۔

اس وکٹوریہ کراس کی وجہ سے وہ روشن محل میں رہنے والے مہذب اور تعلیم یافتہ طبقے میں بھی عزت اور افتخار کا نشان ہے۔ لہٰذا اس اشرافیہ طبقے میں اپنا مقام بنانے اور عذرا کا ہاتھ مانگنے کا اہل ہو جاتا ہے۔ یہی اس کا مقصد ہے گو کہ اس کے لیے عذرا کو خاصی جدوجہد کرنی پڑی اور اس شادی کے بعد بھی روشن محل والوں میں سے سوائے نجمی کے کوئی اسے پسند نہیں کرتا۔

عذرا سے شادی سے پیشتر وہ تخریب کار گروہ میں رہ کر انھیں متشدد کارروائیوں سے باز رکھنے کی کوشش بھی کرتا ہے اور ڈیڑھ دو سال یونہی بیکار ضائع کر کے لوٹتا ہے۔ اب اس کا مقصد شادی اور سکون سے زندگی بسر کرنا ہے لیکن جنگ میں اس نے جس طرح انسانوں کو مرتے دیکھا اس کے علاوہ انسانی فطرت کی خوبصورتی اور بدصورتی کو برہنہ دیکھ کر اس کی شخصیت میں بہت بڑی تبدیلی رونما ہو جاتی ہے۔ جنگ ایک ایسا تجربہ ہے جو کسی استاد کی طرح زندہ بچ جانے والوں کو زندگی کے بنیادی سبق بھی سکھاتا ہے۔ نعیم جنگ کی ہولناکیوں کا قریب سے مشاہدہ کرتا ہے اور خوف اور تحیر کی ایک ٹھہری ہوئی کیفیت میں رہتا ہے۔

جنگ کے میدان میں ہم کئی نئے کرداروں سے متعارف ہوتے ہیں جن میں حوالدار ٹھاکر داس کا کردار اہم ہے۔ نعیم کی یہ پہلی جنگ ہے لیکن ٹھاکر داس اس کا سینئر ہے۔ اس نے پہلے بھی جنگیں لڑی ہیں اس کے بیوی بچے ہیں جو ہندوستان میں ہیں جنھیں وہ اکثر یاد کرتا رہتا ہے۔ نعیم اور ٹھاکر داس کے درمیان ایک خاص تعلق ہے۔ نعیم ٹھاکر داس سے حسد اور مخاصمت کا تعلق قائم کرتا ہے۔ ٹھاکر داس جب بھی اپنے کسی معاشقے کی روداد سناتا ہے۔ نعیم اس سے حسد محسوس کرتا ہے۔ اس کی وجہ عذرا سے اس کا تشنہ تعلق اور محبت ہے۔ ٹھاکر داس جرمنوں کی گولیوں کا شکار ہو کر مر جاتا ہے۔ نعیم اسے دشمنوں کا بتا کر ان کی گولیوں کی زد میں آنے سے بچا سکتا تھا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ نعیم کی نفرت اور حسد نے اسے ایسا کرنے پر مجبور کیا۔ بعد ازاں یہ حرکت نعیم کے لیے احساس گناہ کی شدید صورت اختیار کر لیتی ہے۔

ناول دوسرا اہم کردار عذرا ہے۔ یہ کردار زیادہ ابھر کر سامنے نہیں آتا جس کی وجہ سے مصنف کی اس سے عدم دلچسپی ہے۔ نعیم سے شادی کے بعد یہ کردار کسی حد تک ابھرتا ہے۔

عذرا ایک جاگیردار گھرانے کی چشم وچراغ ہے۔ وہ انگریزی سکولوں کی تعلیم یافتہ اور نازو نعمت میں پلی ہے۔ اشرافیہ طبقے کی نمائندہ ہے لیکن نعیم سے محبت میں وہ اپنے طبقے کی روایات سے بغاوت کرتی ہے۔ یہ اس کا ایک جذباتی فیصلہ ہے۔ نعیم کے طبقے میں جا کر رہنا اس کے لیے ممکن نہیں ہو پاتا۔ وہ نمودو نمائش کی شدید خواہش رکھتی ہے۔ اپنے شوہر سے محبت کرتی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس میں خاندانی تفاخر موجود ہے۔ شادی کے بعد وہ سیاسی جلسوں میں شامل ہوتی ہے جس میں حکومت وقت کے خلاف تقریریں اور نعرہ بازی کی جاتی ہے۔ مقصد اپنی تشہیر ہی ہے۔

نعیم اور عذرا کے علاوہ دیگر کرداروں میں روشن آغا، ایاز بیگ، علی، پرویز، ٹھاکر داس اور نیاز بیگ شامل ہیں۔ چھوٹے بھائی علی کے ساتھ نعیم کا تعلق بیک وقت نفرت اور محبت کا ہے۔ علی اپنی جوانی کا بڑا حصہ شانتی نگر میں گذارتا ہے جہاں وہ اپنی بیوی عائشہ کے ساتھ مزدوروں پر فیکٹری انتظامیہ کی طرف سے ہونے والے مظالم سہتا ہے۔ اپنے بھائی کے نقش قدم پر چلتا ہوا جنگ عظیم دوم میں بطور سپاہی بھرتی ہوتا ہے لیکن یہ کام بھی اس کے مزاج سے میل نہیں کھاتا۔ دوسری طرف نعیم طویل بیماری کے بعد عذرا کو خوش کرنے کے لیے سرکاری ملازمت کر لیتا ہے۔ جہاں اس کی زندگی جمود کا شکار ہو جاتی ہے لیکن وہاں اس کو ہم مزاج دوست مل جاتا ہے جو اس سے ذہنی ہم آہنگی رکھتا ہے۔ نعیم اب سفید ہوتے بالوں کے ساتھ وقت کو اپنی مٹھی سے پھسلتا دیکھ رہا ہے تو اس کی سوچ میں گہرائی اور وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہاں ناول میں وقت، زندگی اور موت کی ماہیت کے حوالے سے طویل گفتگوئیں ملتی ہیں جو ناول کو بوجھل اور غیر دلچسپ بنا دیتی ہیں۔ تاہم ناول کے اختتام پر علی کی ملاقات نعیم سے پاکستان کی جانب رواں دواں ایک قافلے میں ہوتی ہے۔ جہاں وہ اپنی بیمار بیوی عائشہ کے ساتھ شامل ہے۔ قافلے پر حملے کی وجہ سے علی اپنی بیوی اور بھائی دونوں کو کھو دیتا ہے۔ تاہم نعیم کے برعکس ناول نگار ناول کے اختتام پر علی کو ایک آسودہ زندگی کی دہلیز پر چھوڑتا ہے۔ جہاں اگرچہ آسائشیں نہیں لیکن بانو کی شادی علی کے بعد دونوں کو مطمئن اور خوش دکھایا جاتا ہے۔

ناول میں مصنف نے اگرچہ ایک فرد اور اس کی زندگی کو موضوع بنایا لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس دور کی معاشی اور سیاسی زندگی کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ تاریخ فرد کی داستان حیات کے پہلو بہ پہلو چلتی نظر آتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فرد کی زندگی کا دراصل اس کے اردگرد کے حالات سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔ یوں عبداللہ حسین نے اس چالیس پچاس برس کے زمانے اور اس زمانے سے متعلق نسلوں کی اداسی کو پیش کیا ہے۔ یہ نسلیں ایک ذہنی خلفشار کا شکار ہیں۔ جس سے چھٹکارا پانا ان کے لیے مشکل ہے۔ زندگی کا کوئی واضح نصب العین ان کے سامنے نہیں۔ مثال کے طور پر ہندوستانیوں کو اس جنگ میں حصہ لینے اور دوسرے انسانوں کو مار دینے یا مر جانے پر مجبور کیا گیا جو ان کے اپنے ملک کے لیے نہیں بلکہ غاصب حکمرانوں یعنی انگریزوں کی خاطر لڑنا پڑی۔ جنگ میں مختلف افراد

کو مرتے دیکھنا اس کی روح کو جھنجھوڑ کے رکھ دیتا ہے۔ یہ دکھ اور یہ احساس بطور فرد نعیم اور مہندر سنگھ کے لئے بہت اذیت ناک ہے۔ یہ قتل خون خرابہ آخر کیوں؟ کیوں وہ اس جنگ میں دھکیلے گئے جو ان کی نہیں بلکہ انگریزوں اور جرمنوں کی تھی۔

عالمگیریت کے اثرات کے حوالے سے دیکھا جائے تو اس ناول میں سیاسی، معاشی اور معاشرتی اثرات نظر آتے ہیں۔ سیاسی طور پر یہ دور دنیا بھر میں آزادی کی تحریکوں کا حصہ ہے۔ پہلی جنگ عظیم اور دوسری جنگ عظیم نے دنیا بھر کے انسانوں کو متاثر کیا۔ ہندوستان چونکہ انگریزوں کا غلام تھا۔ اس لیے یہاں یہ اثرات زیادہ بدتر صورت میں نمودار ہوئے۔ ہزاروں ہندوستانیوں کو ایک ایسی جنگ میں جھونک دیا گیا۔ جو ان کی اپنی نہیں تھی۔ انہیں ناکافی تربیت کے بعد بدترین حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا۔

یہ ناول جس دور کا احاطہ کرتا ہے اس دور میں عالمگیریت کی وہ شکل جو آج دنیا کی صورت گری کر رہی ہے اپنی اس صورت میں تو موجود نہیں تھی۔ اس وقت اس کی جو شکل دنیا کے وسیع علاقے اور زیادہ تر اقوام کو متاثر کر رہی تھی۔ اس کو آج کولونیل پیریڈ یعنی نو آبادیاتی دور سے یاد کیا جاتا ہے یعنی دونوں ادوار میں مقاصد مشترک لیکن انداز جدا جدا ہے۔ اس قسم کی عالمگیریت اور اس کے اثرات مثلاً سیاسی اثرات، ثقافتی اثرات اور معاشی اثرات اس ناول میں بخوبی دیکھے جاسکتے ہیں۔ میڈیا کا کردار اس وقت کے جاگیردار ادا کر رہے تھے۔ جنہیں سرکار نے وفاداری کے عوض وسیع جاگیریں عطا کی تھیں اور جو بوقت ضرورت حکومت برطانیہ کے لیے جنگ کے لیے افرادی قوت مہیا کرنے کے ساتھ لوگوں کی ذہن سازی بھی کرتے تھے کہ برطانوی حکومت ان کے لیے ایک نعمت خداوندی سے کم نہیں کیونکہ اس حکومت کی بقا سے ان کے مادی مفادات وابستہ تھے۔ اس لیے وہ چاہتے تھے کہ برطانوی راج یہاں سے کبھی ختم نہ ہو۔ اس کی مثال روشن آغا اور ان جیسے دیگر جاگیردار تھے۔

> "روشن آغا کے پاس بیٹھے ہوئے مجلس خدام ہند کے نمائندے نے سب کو مخاطب کر کے بولنا شروع کیا۔
> 'افواج انگلشیہ کے ملک سے انخلا کا مطالبہ اس وقت سخت غیر دانش ورانہ ہے۔ جنگ عظیم میں انہوں نے اپنی قدر و قیمت واضح کر دی ہے۔ اپنے ملک کے ساتھ ساتھ انہوں نے ہمارے ملک کو بھی جنگ کی ہولناکیوں سے بچایا۔'"[۱]

اسی طرح طبقہ اشرافیہ کا ایک اور فرد بھی ایسے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے۔

> "ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ ہم مرکزی حکومت کی باگ ڈور سنبھال سکیں۔ ہمیں یا خارجہ پالیسی سے تعلق نہیں ہے۔"[۲]

---

(۱) عبداللہ حسین، *اداس نسلیں* (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۵ء) ص ۲۷۴

(۲) ایضاً

ملک میں آزادی کے لیے لڑنے والی جماعتوں کی "دہشت انگیز" کارروائی کی مذمت کی گئی اور ڈومینین سٹینس کا مطالبہ کیا گیا۔

روشن آغا کی بیٹی اور داماد جب سائمن کمیشن کی مخالفت میں نکلے۔ جلوس میں شامل ہوئے ہیں تو روشن آغا اس پر خفگی کا اظہار فرماتے ہیں کیونکہ ان کے مفادات برطانوی راج کے استحکام سے وابستہ ہیں۔ خواہ ملک و قوم کو اس کی جو بھی قیمت چکانا پڑے۔

ناول کے آغاز میں دوسری جنگ عظیم کے جبری بھرتی شروع ہوتی تو اکثر کسان اپنے کھیتوں اور اپنی فصلوں کو سنبھالنے میں مصروف ہونے کی وجہ سے انکار کر دیتے ہیں۔ ایسے وقت میں روشن آغا جنھیں وہ کسان اپنا مالک سمجھتے ہیں۔ دیہات کے نوجوانوں کو جنگ میں بھرتی ہونے کا حکم دیتے ہیں۔ ایک ایسی جنگ جو اپنے ملک ہندوستان کے دفاع کے لیے نہ تھی۔ ایک ایسی جنگ جس کے لیے ان کو ناکافی تربیت دے کر میدان جنگ کا ایندھن بننے لیے میدان جنگ میں جھونک دیا جاتا ہے۔ اجنبی سرزمینوں پر نامانوس موسموں میں مرنے کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے یا ایسے لوگوں کو مارنے کے لیے جو ان کا یا ان کے دیس کا دشمن نہیں بلکہ ان غاصب برطانوی حکمرانوں کا دشمن ہے۔ اس جنگ میں جہاں نعیم کے دوست مہندر جیسے لوگ جان سے جاتے ہیں نعیم ایک بازو گنوا کر لوٹتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ جنگ نے ان کی نفسیات کو مکمل طور پر بدل کر رکھ دیا اور ان کی شخصیت میں کئی قسم کی الجھنوں کو جنم دینے کا باعث بنی۔ ان ہندوستانی فوجیوں کے ساتھ جانوروں سے بہتر سلوک نہیں کیا جاتا۔ مثال کے طور پر:

> "دو منزلہ مکانوں کے تمام کمرے گورے سپاہیوں، اسلحہ بارود، باورچیوں اور راشن کے ڈبوں سے بھرے پڑے تھے۔ مکانوں سے ذرا فاصلے پر دکانیں تھیں۔ ان میں رسالوں کے گھوڑے اور خچر بند تھے جو دکانیں بچ رہی تھیں وہ ہندوستانی فوجیوں کے لیے مخصوص کی تھیں۔"[۱]

یہی احساس تفاخر اور دوسری اقوام کو کمتر سمجھنے کی ذہنیت تھی جو کولونیل پیریڈ میں یورپی اقوام میں موجود تھی اور آج بھی عالمگیریت کے پس پشت موجود ہے۔ جس کی وجہ سے وہ اپنا کلچر اپنی زبان پوری دنیا پر مسلط کرنے کے خواہاں ہیں۔

ہندوستان پر اس کے معاشی اثرات بہت ہولناک تھے۔ بنگال جیسا زرخیز صوبہ قحط کا شکار ہوا اور لاکھوں انسان بھوک اور بیماریوں کی وجہ سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر موت کے منہ میں چلے گئے۔ ہندوستان کے باقی صوبہ جات اور علاقوں میں بھی کسان بہت بدتر حالت میں زندگی بسر کر رہے تھے۔ جاگیر دار نے اگر موٹر خریدی تو اس کا خرچ بھی غریب کسانوں سے موٹرانہ کے نام پر وصول کیا جاتا ہے۔ جو دینے سے انکار کرتا ہے خواہ اس کی وجہ یہ ہو کہ خود اس کے پاس اپنے کنبے کے لیے اناج نہ ہو لیکن موٹرانہ دینا ضروری تھا۔

---

(۱) عبداللہ حسین، اداس نسلیں، ص۹۸

غریب کسان احمد دین کے موٹر انہ دینے سے انکار کیا تو جو سلوک اس سے روار کھا وہ نہ صرف اس کے لیے بلکہ سوچنے سمجھنے والے کسی بھی انسان کے دل و دماغ پر تازیانے سے کم نہیں۔

""بیل کی طرح... بیل کی طرح' منشی نے کڑک کر کہا اور نوجوان لڑکوں کی طرف دیکھا۔ لڑکوں نے اٹھ کر اس کی بغلوں میں ہاتھ دیئے اور گھٹنوں کے بل گرا دیا۔ منشی نے جھٹک کر اس کی پگڑی اتاری اور موڑ کے ہاتھ میں دی۔

'بیل کو رسی دو' اس نے کہا۔ لڑکے نے پگڑی کا ایک سرا اس کے گلے میں باندھا۔ دوسرا ہاتھ میں پکڑ لیا۔ 'اس کے منہ میں چارہ دو' منشی نے کہا۔ ایک لڑکا خشک گھاس لا کر اس کے منہ میں ٹھونسنے لگا۔ احمد دین نے دونوں ہاتھ ہوا میں پھیلائے اور پھٹی آواز میں چلایا 'نہیں... نہیں... نہیں...' اس کی باچھوں سے گھاس کے تنکے لٹک رہے تھے۔ لڑکوں نے گھاس ٹھونس کر اس کا منہ مضبوطی سے بند کر دیا۔ 'چلو' منشی رسی کھینچتے ہوئے بولا۔

> بوڑھا کسان چوپایوں کی طرح زمین پر چلنے اور جلد جلد آنکھیں جھپکنے لگا۔ انتہائی ذلت کے احساس سے اس کا چہرہ بدنما ہو گیا جیسے فالج زدہ یا میدان جنگ میں مرے ہوئے آدمی کا ہوتا ہے۔" (۱)

ہندوستان کا کسان ایک طرف بنیئے اور سود خوروں سے قرض لینے پر مجبور تھا جو اس کا خون چوستے تھے۔ دوسری طرف یہ زمیندار تھے۔ فصل کا آدھا حصہ زمیندار کے گھر پہنچ جاتا تھا۔ خواہ اس کے بعد غریب کسان کی سال بھر کی محنت کے بعد بھی پیٹ بھرنے کو کچھ بچ رہے یا نہ رہے۔ وہاں پیٹ کا دوزخ بھرنا مشکل تھا۔ دو وقت کی روٹی مشکل تھی۔ دیگر ضروریات کے لیے بلکہ بیج خریدنے کے لیے بھی کسان سود پر قرض لینے پر مجبور ہو جاتا تھا۔

یہ ہندوستان کا بدنصیب کسان تھا جس نے ان گنت مصیبتیں بغیر احساس کے جھیلی تھیں۔ اس کے چہرے پر بے شمار لکیریں اور گہری تھکن کے آثار تھے اور اس کا جسم موسموں کی شدت میں ننگا رہ رہ کر قرمزی، نیلا یا سیاہ پڑ چکا تھا۔ اس کے حصے کا اناج زمینداروں کے گھروں میں تھا اور اس کی عورتوں کے زیور مہاجنوں کے پاس رہن تھے۔ اس کے ہاتھ خالی تھے وہ نادار تھا... اس پر جو آفتیں نازل ہوئیں ان میں سبھی کچھ شامل تھا۔ زمیندارا اور مہاجن سے لے کر خشک سالی، سیلاب، ہیضہ، پلیگ، معیادی بخار اور مویشیوں کی وباؤں تک... (۲)

اس کی مثالیں مصنف نے ناول میں کئی مقامات پر بیان کی ہیں جن کو پڑھ کر اس وقت کے مظلوم اور دکھیارے کسان کی حالت آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں:

---

(۱) عبد اللہ حسین، *اداس نسلیں*، ص ۱۴۸۔ ۱۴۹

(۲) ایضاً، ص ۲۴۲

”ایک گاؤں میں چند ماہ پیشتر سیلاب نے تباہی مچادی تھی اور اناج کا ایک دانہ تک کھیتوں میں نہ ملا تھا۔ گاؤں میں قحط سالی کا عالم تھا۔ مٹھی بھر اناج پر کسانوں کا پورا پورا خاندان گذران کر رہا تھا۔ اس وقت زمیندار کے کارندے گذشتہ فصل کی مقررہ مقدار میں عدم ادائیگی پر ٹیکس وصول کرنے اور دوسری صورت میں قرضے کے اندراج پر کاشت کاروں کے نشان انگوٹھا حاصل کرنے کی غرض سے وارد ہوئے۔ وہ سب گھوڑوں پر سوار تھے اور ہر ایک دروازے پر رک کر اونچی درشت آوازوں میں مطالبہ کر رہے تھے۔ یہ وہ کسان تھے دو یا دو سے زیادہ دن سے ٹھوس خوراک کی کوئی مقدار حلق سے نہ اتری تھی۔ دیوار کے پیچھے سے ایک عورت کے رونے کی آواز آئی جو کہہ رہی تھی، میرا خاوند گھر پر نہیں ہے۔ ہمارے پاس کچھ نہیں۔ جواب میں وہی درشت آوازیں گالیاں دیتی ہوئی سنائی دیں... ٹسوے مت بہا تیرا خاوند کہاں ہے؟ ہمارے پاس کچھ نہیں ہے۔ دیکھ لو میرا خاوند گھر پر نہیں... چور، بہانے باز، کتیا کی اولاد“[۱]

یہ رویہ اور سلوک مقامی زمینداروں کی طرف سے اپنے کسانوں سے روا رکھا جاتا ہے اور ان زمینداروں کو حکومت کی مکمل سرپرستی اور پشت پناہی حاصل تھی۔ برطانوی راج کے چھتر چھایا تلے یہ زمیندار غریب کسانوں کا خون چوستے تھے تاکہ ان کی عیش و عشرت والی زندگی رواں دواں رہے۔

لیکن ہندوستان کا یہ استحصال محض جاگیرداروں کے ہاتھوں ہی نہ تھا بلکہ اصل استحصال تو وہ غیر ملکی حکمران کر رہے تھے جنہوں نے ہندوستان کو لوٹ کر اپنی تجوریاں بھرنے کے لیے ان جاگیرداروں کو بھی کھلی چھوٹ دے رکھی تھی۔

مدن اسی حوالے سے کہتا ہے۔

”... ہماری اصل جنگ ان سے ہے جنہوں نے مالکوں کو بنایا ہے۔ جو کاریگروں کے ہاتھ کاٹ دیتے ہیں اور سوچنے والوں کے دماغ شل کر دیتے ہیں۔ وہ غیر ملکی جو ہمارے ملک کو غریب کر رہے ہیں۔“ [۲]

عام تاثر یہ ہے کہ انگریزوں نے ہندوستان کی فلاح و بہبود کے ضمن میں اہم کام کیا ہے مثلاً ریل گاڑی چلانا، سکول کالج ہسپتال بنانا وغیرہ۔ لیکن اس کے پسِ پشت بھی اس کولونیل طاقت کے استحصالی مقاصد کارفرما تھے۔ جن میں سرفہرست مقامی لوگوں کو

---

(۱) عبداللہ حسین، *اداس نسلیں*، ص ۲۴۲۔۲۴۳

(۲) ایضاً، ص ۱۶۶

ایجادات کے ذریعے اپنی طاقت کا مظاہرہ کرکے مرعوب کرنا تھا۔اس کے ساتھ خام مال کو بندرگاہوں تک پہنچانا اور اپنی صنعتی پیداواروں کو ہندوستان کے کونے کونے تک پہنچا کے ہندوسانیوں کے وسائل پر ہاتھ صاف کرنا تھا۔

اس حوالے سے باغی مدن مزید کہتا ہے۔

> ''یہ مت سمجھو کہ میں کسی غلط فہمی میں مبتلا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ ہندوستان انگریزوں کی سلطنت ہے اور ایسے کئی ہندوستان انگریزوں کی ملکیت ہیں۔۔۔ مجھے پتہ ہے کہ وہ کیا حاصل کر رہے ہیں اور کس طریقے سے حاصل کر رہے ہیں۔ انہوں نے سکول اور کالج کھولے ہیں ریل گاڑی چلائی ہے۔ ہسپتال بنائے ہیں۔ لیکن وہ کتنا ریونیو اکٹھا کر رہے ہیں۔ تمھیں ہندوستان کا رقبہ معلوم ہے؟ وہ کتنی کھلی تجارت ہندوستان کے اندر اور باہر کر رہے ہیں اور ہندوستان کی آمدنی کا کتنا حصہ وہ یہاں خرچ کر رہے ہیں؟''(۱)

ثقافتی اثرات کے حوالے سے دیکھیں تو مصنف نے یہاں دیہاتی اور شہری زندگی کو پیش کیا ہے۔ دیہاتی زندگی سادہ، فطرت کے قریب اور استحصال کا شکار ہونے والوں کی ہے۔ ان کے دکھ سکھ، خوشی غمی دن اور رات کا احوال مسلمان دیہاتیوں اور سکھوں کی رہتل کو خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ شہری طبقے میں اینگلو انڈین معاشرت ناول کے صفحات پر نظر آتی ہے جو انگریزوں کے برصغیر میں آمد کے بعد پروان چڑھی۔ اس میں زیادہ تر وہ لوگ ہیں جنہوں نے انگریز سرکار سے فوائد حاصل کیے اور اب ان کی خوشنودی کے لیے رفتہ رفتہ انہوں نے اپنی اقدار و روایات کو مسترد کرتے ہوئے یا کم سے کم اپناتے ہوئے حکمرانوں کے کلچر کو شعوری سعی کے ساتھ اپنایا۔ روشن آغا ان کا خاندان اور ان جیسے دیگر خاندان اور ان کے حلقہ احباب میں شامل افراد حکومت برطانیہ کے وفادار تھے اور اس وفاداری کے ثبوت کے طور پر انہوں نے ان کی تہذیب و ثقافت کو اپنا لیا تھا۔ خود مصنف قوسین میں اس بات کی وضاحت کرتا ہے۔

(یہ اوپری متوسط طبقے کے ہندوستان کی وہ خوش تربیت صحت مند نسل تھی جو انگریزی درسگاہوں میں تعلیم پا رہی تھی یا پا چکی تھی۔ اس وقت یہ لوگ تعداد میں ہندوستان کے شہروں اور دیہاتوں میں بسنے والے کروڑوں کسانوں، مزدوروں اور محنت کش طبقے کے مقابلے میں نہ ہونے کے برابر تھے اور شہروں سے باہر اپنے کھلے ہوادار مکانوں میں رہتے تھے)۔ (۲)

اس وقت یہ لوگ تعداد میں کم تھے۔ انگریزوں کے قبضے کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ عوام کے اندر ان کے خلاف غم و غصہ اور عدم قبولیت موجود تھی۔ دوسری اہم بات یہ کہ الیکٹرانک میڈیا لوگوں کی زندگیوں میں اس طرح دخیل نہیں تھا جیسا کہ آج۔ اس

---

(۱) عبداللہ حسین، *اداس نسلیں*، ص ۱۶۷-۱۶۶

(۲) ایضاً، ص ۱۹۴

وقت انگریز حکمرانوں نے مراعات دے کر اپنا حامی طبقہ پیدا کیا۔ لیکن آج میڈیا کی وجہ سے اذہان پر اثر انداز ہو کر انھیں اپنے رنگ میں ڈھالا جارتا ہے۔ یہ ایک اہم فرق ہے اس قدیم دور کی عالم گیریت میں اور آج کی جدید عالم گیریت میں۔

بہر حال یہ طبقہ اپنی اولادوں کو انگریزی اداروں میں تعلیم دلواتا۔ گھروں پر تربیت کے لیے انگریز گورنس تھیں۔ مخلوط محافل کا چلن عام ہو گیا تھا اس طبقے میں اور اس کے ساتھ ساتھ کھانے پینے میں، لباس میں، انداز میں حکمرانوں کی نقالی کر کے خود کو مہذب ثابت کرنا چاہتا تھا۔ دوسری طرف اپنے ہم وطنوں کے لیے ان کا انداز خود غرضی اور بے رحمی پر مبنی تھا۔

سیاسی اعتبار سے بھی یہ دور ہندوستان کی تاریخ میں عدم استحکام کا دور ہے۔ آزادی کی تحریکیں زور پکڑ گئیں۔ اس میں اہم کردار حکمران طبقے کے اس سلوک کا تھا جو اس نے مقامی باشندوں سے روا رکھا۔ اس حوالے مصنف نے دو واقعات بھی درج کیے ہیں۔ مثلاً ص نمبر ۴۴ پر اس غریب کسان کا واقعہ درج کیا جو رانی کوٹ سے ایک اسٹیشن سے ٹرین پر سوار ہوا۔ سواریوں ہوا کہ نعیم نے اس کا ہاتھ پکڑ کر سوار کرانے کی کوشش کی لیکن گاڑی کی رفتار تیز ہو گئی۔ اب اس کی بیوی پہلے سوار ہو چکی تھی تو اس نے درجہ اول والے دروازے کا ہینڈل پکڑ کر ٹانگیں پھیلا کر چھلانگ لگائی۔

پائیدان پر کھڑا ہو کر اس نکے دروازہ کھٹکھٹانے پر گورے نے دروازہ کھول کر پوچھا۔ "کیا مانگتا... کیوں آیا؟" گورا آنکھیں نکال کر چیخا۔ کسان اپنی سادگی سے کہتا ہے۔ "یہاں بیٹھ جاتا ہوں۔ اگلے اسٹیشن پر جاؤں گا۔ میری بیوی گاڑی میں ہے۔" "نیچے جاؤ مانگتا... آں؟ سنتا؟" پاؤں سے وہ اسے نیچے دھکیلنے لگا۔

گاڑی بھاگ ری اے صاحب، کہاں جاؤں؟ آں؟ نائیں جاؤ؟ آں؟ اور پاؤں کی ٹھوکر سے غریب کسان کی گٹھری باہر اچھال دی جس سے گڑ اور باجرہ بکھر گیا۔

اس سے کسان غصے میں آ گیا اور لاٹھی گورے کی ٹانگوں پر مارنے لگا۔ اصل وجہ وہ اپنی بیٹی کے گھر جا رہا تھا اور بیٹی کے گھر خالی ہاتھ جانا کس قدر توہین آمیز بات ہے۔

انگریز نے اس کی لاٹھی چھین کر پھینک دی اور بڑے بڑے بوٹوں والے پاؤں اندھا دھند اس کے چہرے اور چھاتی پر مارنے لگا... اپنی لڑکی کے لیے ایک سؤر لے جاؤ۔ پھر وہ گالیاں بکنے اور بے تحاشا مارنے لگا۔ کسان کا سر لٹک گیا اور آنکھیں بند ہو گئیں... لو سے جھلسے چہرے پر خون کی دھاریاں بہہ رہی تھیں۔ رانی کوٹ کے اسٹیشن پر جب دو گورے سارجنٹوں نے اسے دروازے سے علیحدہ کیا تو وہ گندم کی بوری کی طرح گرا اور مر گیا۔[۱]

اگرچہ گورے کو گرفتار کر لیا گیا لیکن لوگ جانتے تھے کہ اسے کوئی سزا نہیں ملے گی کیونکہ جیوری بھی گوروں پر مشتمل تھی۔ مقامی لوگوں کی جان کی قدر و قیمت ان کے نزدیک پرکاہ کے برابر بھی نہ تھی۔ اسی طرح جلیانوالہ باغ کا سانحہ پیش آیا۔ مصنف کے

(۱) عبداللہ حسین، اداس نسلیں، ص ۴۴-۴۵

مطابق اگرچہ اس شہر میں اکا دکا واقعات انگریزوں کو مارنے اور ایک انگریز عورت کی عصمت دری کا واقعہ بھی پیش آیا لیکن اس کا انتقام بے گناہ اور نہتے لوگوں سے یوں لیا گیا کہ سینکڑوں انسانوں کو براہِ راست فائرنگ کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ لوگوں کو پیٹ کے بل رینگنے پر مجبور کر دیا گیا۔

ان واقعات نے عوام میں غیض و غضب بھر دیا اور انہوں نے آنے والے وقتوں میں شاہی فرد کی آمد پہ اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ سائمن کمیشن کی واپسی کے نعرے لگائے۔ آزادی کی تحریکات میں تیزی آئی۔ دوسری جنگ عظیم نے سونے پر سہاگے کا کام کیا اور انگریزوں کو اپنی اس کالونی سے بوریا بستر گول کرنا پڑا۔ انگریزوں کی رخصتی برصغیر میں ان کے وفاداروں کے لیے بہت بڑے دھچکے سے کم نہ تھی۔ لیکن بہت غور و خوض کے بعد ان ترقی یافتہ ممالک نے تیسری دنیا کو اپنے شکنجے میں جکڑنے کے لئے عالم گیریت کا نعرہ بلند کیا۔ اب اقوام کو بزور قوت محکوم بنانا ممکن نہ رہا تو انھیں مساوات برابری انسانی حقوق اور جمہوریت کے سنہرے خواب دیکھا کر ان کے وسائل پر قابض ہونے منصوبہ بندی کی گئی اور اسے عالم گیریت کے خوشنما نعرے کے پیچھے اپنے اصل چہرے کو چھپانے کی سعی کی گئی۔

# آنگن

خدیجہ مستور کا ناول آنگن ۱۹۶۲ء میں ادارہ کتاب نما سے شائع ہوا اور آدم جی ایوارڈ کا مستحق ٹھہرا۔ اس ناول کا بنگالی، گجراتی اور روسی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ یہ ناول کئی یونیورسٹیوں مثلاً علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، علی گڑھ یونیورسٹی کے نصاب میں شامل ہے۔

اس ناول میں خدیجہ مستور نے متحدہ ہندوستان کے ایک جاگیر دار گھرانے کی زندگی، روایات اور افراد خانہ کی سوچ کو بیان کیا ہے۔ یہ گھرانہ صوبہ اتر پر دیش کا رہنے والا ہے۔

نیر سلطانہ بٹ آنگن کے حوالے سے لکھتی ہیں:

> ''خدیجہ مستور کا ناول آنگن موضوع کے لحاظ سے دو سطحیں رکھتا ہے۔ ایک جاگیر دارانہ نظام کے حوالہ سے گھریلو زندگی ہے اور دوسرا اس ناول کا موضوع تحریک آزادی ہے۔'' (۱)

لیکن مصنفہ کا کمال یہ ہے کہ تاریخ کے ایک خاص موڑ اور متحرک دور کو گرفت میں لینے کے باوجود وہ اسے ایک خشک تاریخی کتاب نہیں بننے دیتی بلکہ اس سیاسی ماحول کے اثرات ایک ہی آنگن میں بسنے والوں پر کس طرح مرتب ہوتے ہیں اور سیاسی وابستگیاں خونی رشتوں پر کس طرح غالب آجاتی ہیں اور زندگیوں کو کس طرح متاثر کرتی ہیں۔ مصنفہ کا اصل موضوع یہی ہے۔

ناول زمانی اعتبار سے دوسری جنگ عظیم کے زمانے سے تعلق رکھتا ہے۔ ناول کا ماحول یوپی کے ایک شہر بالخصوص شہر کا وہ محلہ جس کے پڑوس میں ہائی سکول کی ایک ادھ بنی عمارت کے سامنے حویلی ہے جس میں ایک مسلمان خاندان رہائش پذیر تھا۔ جس کے مرحوم مورث اپنی حیات میں شہر کے خاصے بڑے زمیندار تھے۔ ان کی بیوی گھر میں ایک مالکہ کی حیثیت رکھتی تھی۔ مرحوم مالک نے مسلمان زمینداروں کے عام دستور کے مطابق چند داشتائیں بھی رکھی ہوئی تھیں۔ جن سے ان کے تین لڑکے تھے۔ دو تو کم سنی میں مر گئے اور تیسرے اسرار میاں تمام گھر کی خدمت کرنے کے باوجود نوکروں تک کی نفرت کا نشانہ بننے کو زندہ رہ گئے۔ بیاہتا بیوی سے مالک مرحوم کے تین لڑکے اور دو لڑکیاں تھیں۔ سب سے بڑے چچا جو باپ کی وفات کے بعد حویلی کے سرپرست اور انڈین نیشنل کانگریس سے وابستہ تھے۔ ان کے دوسرے بھائی مظہر میاں عالیہ کے والد تھے جو اپنے بچوں تہمینہ، عالیہ اور بھانجے صفدر کی کفالت کی ذمہ داریوں کی بنا پر سرکاری ملازمت کرنے پر مجبور تھے لیکن اندرون دل انگریزوں سے شدید نفرت کا جذبہ رکھتے تھے۔ اسی نفرت کے باعث انہوں نے ایک انگریز افسر کو پیٹا اور پھر اقدام قتل کے جرم میں سات سال قید کی سزا پائی اور دورانِ قید ہی ان کا انتقال ہو گیا۔ تیسرے بھائی ظفر میاں تھے جو اپنی خصوصیات کے باعث اپنے والد کے مشابہ تھے۔ ان کی پہلی بیوی ایک اولاد چھمی چھوڑ کر مر گئی جس کے بعد

---

(۱) نیر سلطانہ بٹ، *خدیجہ مستور کی ناول نگاری*، تحقیقی مقالہ ایم۔اے اردو (لاہور: اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۸۹ء) ص۲۹

ظفر میاں نے کئی شادیاں کیں۔ ظفر میاں حیدر آباد (دکن) میں قیام پذیر تھے۔ چھمی کی پرورش بڑے چچا کے گھر بڑی چچی کے ہاتھوں میں ہوئی۔

مالک مرحوم کی دو بیٹیاں سلمٰی اور نجمہ پھپھو تھیں۔ سلمٰی نے گھر کے ایک ملازم کے لڑکے کے ساتھ فرار ہو کر شادی کر لی تھی۔ ان کا ایک لڑکا تھا جسے اس کے ماموں مظہر میاں نے اپنے ساتھ رکھ کر اس کی تعلیم و تربیت کی۔ تہمینہ صفدر بھائی کو پسند کرتی تھی اور مظہر میاں بھی اپنی بیٹی تہمینہ کو اپنے بھانجے سے منسوب کرنے کی خواہش رکھتے تھے لیکن مظہر میاں کی بیوی صفدر سے علانیہ نفرت کا اظہار کرتی رہتی۔ اسی لیے صفدر میاں نے علی گڑھ یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا اور پھر دوبارہ ماموں کے گھر واپس نہیں آیا۔ تہمینہ کی ماں نے اس کا رشتہ بڑے چچا کے بیٹے جمیل رضا سے طے کر دیا۔ لیکن تہمینہ نے شادی والے دن خاموشی سے موت کو گلے لگالیا۔

مالک مظفر مرحوم کی چھوٹی بیٹی نجمہ تھی جس نے انگریزی میں ایم اے کیا تھا اور وہ شہر میں لیکچرار تھیں۔ انہیں اپنی قابلیت پر بہت ناز تھا اور انگریزی زبان کو قابلیت کا پیمانہ سمجھتی تھی اور ان کے تئیں ان کے اپنے علاوہ باقی سب جاہل تھے۔ بڑے چچا کے دو بیٹے جمیل اور شکیل تھے۔ بڑے چچا کی دلچسپی کا تمام تر محور اب سیاست ہے اور ملک کی آزادی ان کے نزدیک ان کے تمام دکھوں کا مداوا ہو گی۔ لہٰذا اس کنبے کے مالی حالات بہت پتلے ہو چکے تھے۔ اسرار میاں جو کچھ کماتے اسی کے سہارے وقت گزر رہا تھا۔ جمیل بھیا نے اسی تنگدستی اور عسرت میں بی اے تک تعلیم حاصل کی تھی اور اب نوکری کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ آخر کار فوج کی نوکری کر کے جنگ پر چلے گئے۔ جمیل بھیا مسلم لیگ کے حامی ہیں۔ یہی بات باپ بیٹوں کے درمیان سرد جنگ کا باعث ہے۔ چھوٹا شکیل پڑھائی میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتا۔ آوارہ لڑکوں کے گروہ میں شامل ہو کر گھر سے فرار ہو جاتا ہے۔

مظہر میاں کی دو بیٹیاں تہمینہ اور عالیہ تھیں۔ تہمینہ اپنی پھوپھی کے لڑکے صفدر سے محبت کرتی تھی لیکن اس کی ماں صفدر سے اتنی ہی نفرت اور بیزاری کا اظہار کرتی ہے۔ چنانچہ تہمینہ کو اس کے تایازاد جمیل سے منسوب کیا گیا تو اس نے شادی سے قبل زہر کھا کر جان دے دی۔ اب مظہر میاں کی اکلوتی اولاد عالیہ رہ گئی ہے۔ یہ ناول کا کبیری کردار ہے اور شاید مصنفہ کا پسندیدہ کردار بھی۔ اسی کی روئیدادِ حیات سے ناول کا تانا بانا بنا گیا ہے۔

ناول کے دو حصے ہیں ماضی اور حال۔ مظہر میاں کی گرفتاری کے بعد بڑے چچا عالیہ اور اس کی ماں کو اپنے ہاں لے آتے ہیں۔ عالیہ بڑے چچا کے ہاں پہلی رات بسر کرتی ہے تو اس رات اس کا ماضی اس کی نگاہوں کے سامنے گھومتا ہے اور یوں قاری کو ماضی کے واقعات سے آگاہی ہوتی ہے۔

ڈاکٹر محمد عظیم اللہ اپنی کتاب اردو ناول پر انگریزی ناول کے اثرات میں لکھتے ہیں:

> ''خدیجہ مستور کے ناول ''آنگن'' میں جین آسٹن کی گھریلو فضاؤں کی دلکش سرسراہٹ سنائی دیتی ہے۔ آنگن میں کائنات کی تمام باریکیاں نظر آتی ہیں۔ جن کا مشاہدہ ہم آسٹن کے

> ناولوں میں کرتے ہیں... آنگن کے ابتدائی حصے میں فلیش بیک کی تکنیک کا خدیجہ مستور نے بڑی خوبصورتی سے استعمال کیا ہے... آسٹن کے ڈرامائی مکالمے آنگن میں ہر جگہ اپنی دلآویزیاں بکھیرتے نظر آتے ہیں۔"(۱)

بڑے چچا کے گھر آنے کے بعد عالیہ کو ایک نئے ماحول کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ناول کا اصل محور اور ماحول یہی بڑے چچا کا گھر ہے۔ یہاں کا ماحول گھٹا گھٹا سا ہے۔ سارے افراد ایک دوسرے سے بیزار رہتے ہیں۔ اس گھر میں ایک متحرک اور شوخ وشنگ کردار چھمی کا ہے۔ جو ایک منہ پھٹ اور بے باک لڑکی ہے۔ محبت کو ترسی ہوئی اور ٹھکرائی ہوئی لڑکی ہے لہٰذا گھر بھر کو پریشان کیے رکھتی ہے۔ بڑے چچا چونکہ پکے کانگریسی ہیں لہٰذا وہ مسلم لیگ کے راگ الاپتی رہتی ہے۔ مسلم لیگ کے لیے جلوس نکالتی ہے۔ بڑے چچا سے اس کی تکرار رہتی ہے۔ ان تمام باتوں کے باوجود عالیہ بڑے چچا سے محبت رکھتی ہے۔ ان کا عزت واحترام کرنا اپنا فرض سمجھتی ہے۔ وہ انھیں اپنے باپ کی جگہ تصور کرتی ہے۔

جمیل بھیا عالیہ کی آمد سے قبل چھمی کو محبت کے جھانسے میں رکھ کر اس کے پیسوں سے تعلیم کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے تھے۔ لیکن عالیہ کی آمد کے بعد وہ عالیہ کا طواف شروع کر دیتے ہیں لیکن عالیہ تہمینہ اور کسم دیدی کے انجام سے خائف تھی اور عشق کے روایتی معنوں سے سخت نفرت کرتی ہے لہٰذا وہ جمیل کی محبت کو قبول کرنے سے انکار کر دیتی ہے۔ یوں ہی کہانی آگے بڑھتی ہے، ارتقائی منازل طے کرتی ہے۔ چھمی کی شادی بڑے چچا ایک غربت زدہ جاہل خاندان میں کر کے سر سے بوجھ کی طرح اتار پھینکتے ہیں۔ عالیہ کو بھی ایک سرکاری سکول میں ملازمت مل جاتی ہے اور نجمہ پھوپھی ایک ایم اے انگلش پاس سے شادی کر لیتی ہے لیکن بعد میں معلوم ہوتا ہے کہ وہ تو صرف ایف اے پاس شخص ہے۔ آخر کار ۱۹۴۷ء میں پاکستان وجود میں آجاتا ہے۔ عالیہ اور اس کی ماں پاکستان آجاتے ہیں جہاں اس کے ماموں ان کے لیے ایک کوٹھی الاٹ کروالیتے ہیں۔ عالیہ کی ماں بڑے چچا کے تمام احسانات کو بھلا کر پاکستان چلی آتی ہیں۔ عالیہ پاکستان آکر کچھ عرصہ مہاجر کیمپ میں بچوں کو تعلیم دیتی ہے۔ پھر اسے ایک سکول میں ملازمت مل جاتی ہے۔ بڑی چچی کے ساتھ اس کی خط وکتابت رہتی ہے۔ چھمی اپنے خاندان کے ساتھ ہجرت کرنے کی بجائے طلاق لے کر بڑے چچا کے گھر آجاتی ہے تو اب وہ ایک تبدیل شدہ دھیمے مزاج کی لڑکی بن چکی ہے۔ عالیہ کی طرف سے مایوس ہو کر جمیل بھیا چھمی سے شادی کر لیتے ہیں۔ آخری حصے میں عالیہ کی ملاقات شکیل سے ہوتی ہے جو ایک بگڑا ہوا انسان ہے۔ عالیہ کے گھر چوری کر کے بھاگ جاتا ہے۔ پھر ایک دن صفدر بھیا عالیہ کو مل جاتے ہیں۔ عالیہ ان کے حالات معلوم کر کے ماں سے کہتی ہے کہ وہ صفدر سے شادی کرے گی۔ صفدر ان کو یقین دلاتا ہے کہ اب وہ پہلی والی زندگی سے کنارہ کشی کر چکا ہے اور بہت جلد امیر ہو جائے گا۔ یہ سب سن کر عالیہ شادی سے انکار کر دیتی ہے۔ جب وہ اپنے کمرے میں آکر لیٹتی ہے تو یوں لگتا ہے کہ چھمی اس کے سینے پر دھم دھم کرتی گذر گئی ہے۔

---

(۱) *محمد عظیم اللہ*، ڈاکٹر، *اردو ناول پر انگریزی ناول کے اثرات* (لاہور: دارالشعور، ۲۰۱۵ء)، ص ۳۰۶

"میں نے آپ کو ہرا دیا بجیا۔ میں نے آپ کو ہرا دیا۔"[۱]

۳۵۲ صفحات کے اپنے اس ناول میں مصنفہ نے ایک خاص عہد کی گھریلو زندگی کی ایک زندہ اور جیتی جاگتی تصویر ہمارے سامنے پیش کر دی ہے۔ ایک ایسی تصویر جس میں رنگ سازی کے لیے وہ تاریخ اور سیاست کی آمیزش کرتی ہیں۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو آنگن ناول پلاٹ، کردار نگاری اور منظر نگاری کی خوبیوں سے مزین ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے عہد کی تہذیب و معاشرت کی جو عکاسی کرتا ہے وہ کسی طور پر کم اہم نہیں، اس میں تلخ حقیقتیں بھی ہیں اور تاریخی شعور بھی۔ جدوجہد آزادی اور سیاسی تحریکوں کے اجتماعی خارجی اثرات کے ساتھ ساتھ فرد پر ان کے داخلی اثرات اور سماجی زندگی پر اثرات مرتب ہونے والے اثرات اس ناول میں تفصیلاً ملتے ہیں۔ ناول کی زبان سادہ سلیس عام فہم ہے۔

منو بھائی آنگن کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "خدیجہ مستور نے آنگن کی واردات کو گھر کی چھت سے یا کسی دریچے سے نہیں دیکھا اپنے ہر کردار کے جسم کی میخیں اسی طرح گنیں جیسے مریم نے عیسیٰ کے جسم کی گنی تھیں۔ خدیجہ مستور نے ۳۶۴ چراغوں کی روشنی میں سپنوں کے سوت کا کوئی تار ٹوٹنے نہیں دیا۔"[۲]

اس ناول کا جائزہ عالمگیریت کے تناظر میں لیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ مصنفہ نے اس ناول میں تاریخ و سیاست کے بہتے دھارے کے اندر موجود افراد کی زندگیوں کو موضوع بنایا ہے۔ زمانے کے اعتبار سے یہ ناول نو آبادیاتی دور کے ہندوستان سے تعلق رکھتا ہے لیکن عالمگیریت کے اثرات اس ناول میں نہیں ملتے۔ ماسوائے ایک دو انگریز کرداروں کے جن کا تذکرہ غائبانہ طور پر ضمناً ناول میں موجود ہے۔ جن میں سے ایک کردار عالیہ کے ماموں کی انگریز بیوی کا ہے جو پورے ناول میں کہیں نظر نہیں آتی لیکن عالیہ کی ماں اس سے بہت زیادہ متاثر ہے۔ یہاں تک کہ جب قیام پاکستان کے بعد اس کا بھائی اپنی بیوی کے کہنے پر انھیں ساتھ رکھنے سے انکار کرتا ہے تو تب بھی برا نہیں مناتی بلکہ اسے بڑے لوگوں یعنی مہذب لوگوں کا ایک انداز سمجھ کر خوش دلی سے قبول کر لیتی ہے لیکن دوسری طرف عالیہ ہے جو اپنی ماں کی مرعوبیت کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتی ہے۔ اس کا دوسرا انگریز کردار عالیہ کے باپ کے افسر کا ہے جو حاکم قوم کا فرد ہونے کے ناطے رعونت اور تکبر سے پر ہے۔ عالیہ کے باپ کی تمام تر برداشت کے باوجود اس کے طرز عمل نے مظہر میاں کو ہاتھ اٹھانے پر مجبور کر دیا۔ اگرچہ اس کے پیچھے وہ نفرت بھی موجود تھی جو محکوم قوم کے اندر اسے اپنے ان حاکموں کے رویے اور ناانصافیوں کے باعث پیدا ہوئی تھی۔ انگریز افسر پر حملے کے نتیجے میں عالیہ کے باپ کو قید کی طویل سزا دی گئی جہاں اس کا انتقال ہو گیا۔

---

(۱) خدیجہ مستور، آنگن (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۲) ص ۳۵۲

(۲) منو بھائی، مردانہ ڈبے کی زنانہ سواریاں، نقوش ستمبر، اکتوبر ۱۹۶۲، ص ۳۶۰

اس ناول کا ایک اہم کردار نجمہ پھوپھی کا ہے جو محکوم قوم کا فرد ہونے کے ناطے احساس کمتری کا شکار ہے اور انگریزی زبان پر عبور کو احساس برتری کا ذریعہ سمجھتی ہے۔ اردو پڑھنے والوں کو بنظرِ تحقیر دیکھتی اور طنز کا نشانہ بناتی ہے۔ نجمہ پھوپھی جیسے کردار عالمگیریت کی اس دنیا میں بکثرت پائے جاتے ہیں۔ آج بھی اردو کو وہ مقام حاصل نہیں جو انگریزی زبان کا ہے۔ آج میڈیا کی زبان انگریزی ہے۔ آج بھی ترقی پذیر ممالک میں ترقی کا زینہ انگریزی ہے اور مہذب ہونے کا پیمانہ بھی لہٰذا اس لسانی عالمگیریت کے تحت انگریزی زبان کی اجارہ داری نئی نظر نہیں آتی بلکہ اس کی جڑیں نو آبادیاتی دور میں بھی ملتی ہیں۔ انگریزی کی ترویج مشن سکولز کے ذریعے اس ناول میں نظر آتی ہے۔

# ایوانِ غزل

ناول کا فن انسانی زندگی کے حالات و مسائل، واقعات و حادثات کو فنکارانہ چابکدستی کے ساتھ مصنف کے مشاہدے و تجربے اور افکار و تصورات کی آمیزش سے پیش کرتا ہے۔ ہر ادیب ایک مخصوص عہد کی پیداوار ہوتا ہے اور اس عہد کے حالات و واقعات، مسائل و حالات، تہذیب و ثقافت، سیاسی و سماجی صورتحال اور بدلتی ہوئی عصری قدروں کو پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس اعتبار سے جیلانی بانو کا ناول ایوانِ غزل خاص اہمیت کا حامل ہے۔ ان کے اس ناول کا تعلق ریاست حیدرآباد سے ہے۔ جہاں ان کی پرورش و پرداخت ہوئی کیونکہ ان کے والد نے بسلسلہ ملازمت حیدرآباد مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ اپنے اس ناول میں جیلانی بانو نے ریاست حیدر آباد کی تہذیبی و معاشرتی زندگی، سیاسی حالات تقسیم سے قبل اور بعد، الحاقِ ریاست اور اس کے ساتھ ساتھ جاگیردارانہ نظام کی اقدار کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ یہ ناول حیدرآباد کی تہذیبی وسیاسی تاریخ ہے۔ جیلانی بانو نے ریاست حیدر آباد کے جاگیردارانہ نظام کے خارجی واقعات وحالات کو ہی پیش نہیں کیا بلکہ جاگیرداروں اور نوابوں اور گدی نشینوں کی داخلی زندگی کے محرکات کی بھی عکاسی کی ہے۔

ایوانِ غزل کی کہانی تین گھرانوں کے ماحول و معاشرت پر محیط ہے۔ واحد حسین کا گھرانہ جو ایوان غزل میں رہائش پذیر ہے اور واحد حسین کے بھائی احمد حسین کا گھر جاگیردارانہ نظام کی ترجمانی کرتا ہے۔ واحد حسین اور احمد حسین اس نظام کے ترجمان ہیں جن کا مقصد حیات دولت حاصل کرنا، شاعری کرنا اور عیش و عشرت کی زندگی گزارنا ہے۔ واحد حسین کی اولاد میں سے ایک بیٹا اور دو بیٹیاں بتول اور بشیر بیگم ہیں۔ بتول بیگم اور بشیر بیگم کے سسرال مختلف حالات کے حامل ہیں۔ بشیر بیگم کے شوہر حیدر علی خاں ترقی پسند خیالات کے حامل ہیں۔ یہاں مغربی تہذیب کی پیروی کی جاتی ہے۔ مثلاً شراب پینا، عورتوں کا کلب جانا اور مردوزن کا ڈانس کرنا باعث عار نہیں بلکہ باعث فخر ہے۔ اس کے برعکس بتول بیگم کا سسرال ہے جہاں مذہب کے نام پر بے جا پابندیاں دم گھونٹتی ہیں۔ ریاکاری ہے۔ بتول بیگم کے سسر الحاج مسکین علی شاہ طوطا چشتی ایک درگاہ کے مجاور ہیں۔ اور مذہب کا نام استعمال کر کے دولت کے انبار لگا رکھے ہیں۔ عوام کو مذہب کے نام پر بیوقوف بنا کر دولت اکٹھی کی جارہی ہے۔ مسکین کملی شاہ تعویذ گنڈے کا کام کرتے ہیں۔

انہی تین گھرانوں اور ان سے وابستہ افراد کی زندگیوں کے حالات و واقعات ناول کی کہانی کو بڑھانے میں معاون ہیں۔ اس ناول کے دو اہم کردار غزل اور چاند ہیں۔ انہی کرداروں کے بچپن، جوانی اور موت کے واقعات کو مصنفہ نے تفصیلاً بیان کیا ہے۔ چاند بشیر بیگم اور حیدر علی خاں کی بیٹی ہے۔ جس کو کونونٹ میں تعلیم دلائی جاتی ہے۔ اس کی پرورش مغربی انداز میں کی جاتی ہے۔ بشیر بیگم کی وفات کے بعد چاند اپنے ننھیال یعنی واحد حسین کی حویلی ایوان غزل منتقل ہو جاتی ہے۔ جہاں اس کے ماموں ممانی بخوشی اس کی سرپرستی کرتے ہیں۔ چاند ڈراموں میں حصہ لیتی ہے۔ فلمیں دیکھتی ہے۔ بارہ سال کی عمر میں ہی اسے اپنے حسن و جمال کا پورا پورا احساس ہے۔

چاند کی فیشن پرستی اور آزادانہ روش واحد حسین کو ایک آنکھ نہیں بھاتی لیکن اب وہ عمر کے اس موڑ پر ہیں جہاں ان کی رائے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ واحد حسین کے برعکس چاند اپنے ماموں راشد اور ممانی رضیہ کی چہیتی ہے۔ چاند کا ماموں راشد اس ٹوٹتے بکھرتے جاگیر دارانہ نظام کے آخری دور میں دنیا کو ایک نئے دور میں داخل ہوتے دیکھ رہا ہے۔ اس جاگیر دارانہ نظام کی جگہ لیتے سرمایہ دارانہ نظام کی چاپ کو سن رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب چاند نارائنا کے عشق میں زہر کھا کر خودکشی کرنا چاہتی ہے تو حیدر علی خان اور واحد حسین اس کی آزادارانہ روش پر پابندی لگانا چاہتے ہیں لیکن راشد اس کی حمایت کرتا ہے کیونکہ راشد ترقی پسند گو نہ تھا مگر مصلحت پسند ضرور تھا۔ اس نے انجینئرنگ کے علاوہ بزنس بھی شروع کر رکھا تھا۔ مٹی، چونے اور پتھر کا بیوپار۔ وہ بزنس کے اصول پڑھ رہا تھا اور جانتا تھا کہ چاند جیسی تہذیب یافتہ، خوبصورت اور فیشن ایبل لڑکیوں کا بھاؤ کتنا بڑھا ہوا ہے۔ اتنا کہ لوگ چاہیں تو ان کے سہارے لاکھوں کا کنٹریکٹ لے لیں۔[1]

حیدر علی خان ایک کمیونسٹ ورکر خاتون سے دوسری شادی کر لیتے ہیں۔ چاند سولہ سال کی عمر میں ایوان غزل آ جاتی ہے۔ یہاں بھی اسے ہر طرح کی آزادی حاصل ہے۔ یہاں چاند کا ماموں راشد اپنی کامیابی اور مالی مفاد کی وجہ سے چاند کی آزادانہ اور فیشن پرستانہ زندگی کو استعمال کرتا ہے۔

دوسری طرف بتول بیگم جو اپنی زندگی میں ہمایوں کے ظلم و ستم کا شکار بنتی ہے پھر ایک دن اسی کے ہاتھوں موت کے منہ میں چلی جاتی ہے تو اس کی بیٹی غزل کو بی بی ایوان غزل لانے کی بات کرتی ہے لیکن ہمایوں بیٹی کے ساتھ ساتھ دونوں بیٹوں سے نجات پانے کے لیے انھیں بھی بیٹی کے ساتھ ایوان غزل بھیجنے کی شرط رکھتا ہے لیکن تینوں کی ذمہ داری لینا بی بی کے بس کی بات نہیں۔ یوں غزل اپنی سوتیلی ماں کے ظلم و ستم کے ساتھ ساتھ باپ کی بے توجہی کا شکار ہو جاتی ہے۔ اس کی روتی بسورتی صورت کی وجہ سے ایوانِ غزل میں بھی سوائے بی بی اور چاند کے اس کا کوئی ہمدرد نہیں۔ چاند غزل کے لیے ایک آئیڈیل کی حیثیت رکھتی ہے تو دوسری طرف چاند کو بھی غزل کی من موہنی صورت اپنی طرف کھینچتی ہے تو وہ اسے اپنے ساتھ ڈراموں میں کردار دلواتی ہے۔ کردار ملنے کی وجہ سے ہمایوں کا رویہ غزل سے بہتر ہو جاتا ہے۔ یہاں اس کا کردار راشد سے مماثلت اختیار کر لیتا ہے اور وہ غزل کے ذریعے اپنی بگڑی قسمت سنوارنے لگتا ہے۔ قسمت کے لحاظ سے غزل بھی چاند جیسی ثابت ہوتا ہے اور بھان صاحب جو پہلے چاند کی حسن و خوبصورتی سے خاطر خواہ فائدہ اٹھا چکے تھے۔ اب ہمایوں کی خستہ حالی کا فائدہ اٹھا کر غزل کو بھارت کلا مندر کے ڈراموں میں کام کرنے کے لیے راضی کر لیا۔ وہیں غزل کی ملاقات بلگرامی سے ہوتی ہے۔ جس نے محبت کی ترسی ہوئی اس بچی کی نفسیات سے فائدہ اٹھا کر اس کی دامن عصمت و عفت کو تار تار کر دیا۔

---

(۱) جیلانی بانو، *ایوان غزل* (لاہور: الوقار پبلی کیشنز ۲۰۱۶) ص ۱۱۲

بلگرامی اپنی ہوس پوری کر کے غزل کو چھوڑ کر چل دیا۔ اس کی بے وفائی غزل پر بری طرح اثر انداز ہوتی ہے۔ بھان صاحب بھی غزل کو چھوڑ دیتے ہیں لیکن ہمایوں کو اب احساس ہو چکا ہے کہ غزل جیسی لڑکی کو کیش کروا کر کے وہ اپنی زندگی کی آسائشات خرید سکتا ہے۔ غزل کی زندگی ایسے ہی نشیب و فراز سے گزرتی ہے۔ جاگیر دارانہ سماج میں اس کا واسطہ ایسے ہی خود غرض اور ہوس کے پتلوں سے پڑتا ہے لیکن اس کی خوش قسمتی کہ راشد جیسے مفاد پرست کا بیٹا شاہین ایک ایثار پسند انسان ہے اور اپنے باپ کے برعکس دولت جمع کرنے کا شائق نہیں لہٰذا لنگڑی بوا جب غزل کا رشتہ اپنے دور کے رشتہ دار بھائی سے کروانا چاہتی ہے تو شاہین کو غزل سے ہمدردی محسوس ہوتی ہے۔ اور وہ اپنے ماں باپ کی تمام تر مخالفت کے باوجود غزل سے شادی کر لیتا ہے اور اس سے بے پناہ محبت کرتا ہے لیکن غزل کے لیے یہ سب کچھ غیر یقینی ہے۔ وہ اب بھی نصیر کو یاد کرتی ہے جو پاکستان میں شادی کر چکا ہے۔ وہ اپنی بیوی بچوں کے ساتھ حیدر آباد آتا ہے اور ایک دن غزل کی انگلی سے اپنی ڈالی ہوئی انگوٹھی اتارتا ہے اور یہیں غزل کی موت واقع ہو جاتی ہے۔

اس سے پہلے چاند بھی جو محفلوں کی جان تھی اونچی سوسائٹی کی ایک ممبر تھی۔ شوخ، ضدی اور منفرد شخصیت کی مالک ہے۔ سنجیوا کے عشق میں گرفتار ہو جاتی ہے لیکن سنجیوا اس کی محبت کو قبول نہیں کرتا کیونکہ اسے چاند سے زیادہ اپنا مقصد عزیز ہے سنجیوا کی بے رخی کی وجہ سے چاند ٹی بی کا شکار ہو جاتی ہے۔ اب چاند کا حسن ماند پڑ گیا ہے۔ وہ راشد کے مزید کسی کام نہیں آسکتی لہٰذا چاند کو راشد اور رضیہ کی نفرت اور بے رخی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ صرف بی بی اور غزل ہی اس سے محبت سے پیش آتی ہیں۔ اس ناول کا ایک کردار فاطمہ بی بی ہے جو واحد حسین کے باپ کی بہن ہیں اور کسی لونڈی کی اولاد ہے جس کی ایک بیٹی قیصر ہے۔ وہ اپنی بیٹی کا نصیب بدلنے کے لیے اسے سکول میں تعلیم دلواتی ہے۔ وہی قیصر کمیونسٹ تحریک میں شامل ہو کر ایک دن سنجیوا سے ٹکراتی ہے اور پھر مشترک مقصد کی بنا پر وہ دونوں شادی کر لیتے ہیں۔ وہی قیصر ایک دن اپنی بیٹی کرانتی کو چاند کے سپرد کرنے آتی ہے۔ کیونکہ قیصر اور سنجیوا دونوں کے سروں پر موت کی تلوار ہمہ وقت لٹکتی رہتی ہے۔ کرانتی کی آمد پر ایوان غزل کے مکین ماسوائے چاند اور غزل کے ناگواری کا اظہار کرتے ہیں لیکن چاند کی وفات تک بہر حال کرانتی کو پناہ مل جاتی ہے لیکن اس کی وفات کے بعد کرانتی کو غزل اپنی آغوش میں لیتی ہے لیکن وہ خود ایوان غزل میں بادل نخواستہ برداشت کی جاتی ہے تو ایسی صورت میں کرانتی کی زندگی مسائل کا شکار ہو جاتی ہے اور لنگڑی بوا اور رضیہ ممانی اسے پولیس کے سپرد کرنا چاہتی ہیں لیکن شاہین بھیا کی ازلی ہمدردی کرانتی کا سہارا بنتی ہے۔ قیصر پکڑی جاتی ہے اور پھانسی کی سزا پاتی ہے۔ کرانتی اپنے والدین اور ان کے مشن کے بارے میں جان کر وہی رستہ اختیار کر لیتی ہے۔ مصنفہ ناول میں غزل اور چاند کی رومانی المیہ کہانیوں کے پس منظر میں نو آبادیاتی دور کی ریاست حیدر آباد کے سیاسی حالات کا جائزہ پیش کرتی ہے اور اس کے بعد ۱۹۴۸ء میں ریاست کے ہندوستان کے ساتھ جبراً الحاق کا تذکرہ ملتا ہے۔

اس حوالے سے مشرف علی لکھتے ہیں۔

"اس ناول میں ریاست حیدر آباد کے روبہ زوال جاگیر دارانہ نظام اور اس معاشرے کے تمام اہم عصری مسائل اور حالات کا بدلتی ہوئی تہذیبی، سیاسی اور سماجی فضا کے پس منظر کا جائزہ لیا گیا ہے۔"(۱)

ایوانِ غزل ایک خوبصورت ناول ہے جس میں حیدر آباد کی زبان وبیان لب ولہجہ، رسوم ورواج، ہندو مسلم باہمی رواداری کے مظاہر اور جاگیر دارانہ سماج کی جھلک ملتی ہے اور جاگیر دار سماج کا جو دور پیش کیا گیا ہے۔ اس میں اس سماج کی رسوم و رواج دم توڑ رہے ہیں۔ اس کی جگہ سرمایہ دارانہ معاشرے اور اس کی روایات اور تقاضے لے رہے ہیں۔ واحد حسین اور احمد حسین اس جاگیر دار سماج کے نمائندے ہیں لیکن اب ان کی حیثیت گھر میں ایسی نہیں کہ وہ فیصلوں پر اثر انداز ہو سکیں۔

بہر حال جیلانی بانو نے اسے اس ناول میں تاریخ کے ایسے دور کو گرفت میں لینے کی کامیاب سعی کی ہے جو کئی حوالوں مثلاً سیاسی، سماجی، تہذیبی اور معاشی حوالے سے بہت اہمیت کا حامل تھا۔

یہ دور ایک عبوری دور تھا جس میں کئی حوالوں سے تبدیلیاں نظر آ رہی تھیں۔ سیاسی لحاظ سے دیکھا جائے تو ہندوستان کی آزادی، ریاستوں کی آزادی و الحاق اور اس سے وابستہ سیاسی ہلچل نظر آتی ہے اور معاشی لحاظ سے دیکھا جائے تو صدیوں پرانا جاگیر داری نظام جس کی اپنی اقدار و روایات و ضع داریاں اور خاص انداز زیست تھا، زمین بوس ہو رہا تھا اور اس کی جگہ سرمایہ داری نظام اور اس کی اقدار و انداز رواج پذیر ہو رہے تھے۔ بہر حال اس ناول میں یہ دونوں نظام پہلو بہ پہلو ملتے ہیں اور یہی سرمایہ داری نظام ہی عالمگیریت کی صورت میں آج دنیا بھر میں اپنے پنجے گاڑ چکا ہے۔ بہر حال اس ناول کے حوالے سے ڈاکٹر ممتاز احمد خان لکھتے ہیں:

"ایوان غزل میں دکنی تہذیب کو موزائیک کی طرح چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بیان کیا گیا ہے۔ جو سب مل کر ایک خوب صورت تحریر کو جنم دیتے ہیں۔ واحد حسین وضع دار انسان ہیں لیکن اب زندگی ان کی وضع داری کا معاشی اور سماجی طور پر ساتھ نہیں دے پا رہی ہے... ایوان غزل حیدر آباد دکن کی تہذیب کی علامت ہے جو حیدر آباد کے سقوط کے ساتھ زمین بوس ہو جاتا ہے۔"(۲)

مصنفہ نے جہاں حیدر آباد دکن کی قدیم تہذیب کی خوبصورت عکاسی کی ہے۔ زبان وبیان کو پیش کیا ہے۔ وہیں اس دور میں بدلتی ہوئی اقدار کو بھی پیش کر کے گویا عالمگیریت کے ان مظاہر کو پیش کر دیا ہے۔ جو اس وقت زندگی میں رفتہ رفتہ جگہ پا رہے تھے۔

---

(۱) مشرف علی، *جیلانی بانو کی ناول نگاری کا تنقیدی مطالعہ* (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۳ء) ص ۸۱

(۲) ممتاز احمد خان، ڈاکٹر، *آزادی کے بعد اردو ناول ہیئت، اسالیب اور رجحانات*، (کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان ۱۹۹۷) ص ۱۲۶-۱۲۷

انگریز اپنی آمد کے ساتھ ساتھ اپنی تہذیب اپنی تعلیم اور اپنی زبان بھی ساتھ لے کر آئے تھے۔ برصغیر کے لوگوں بالخصوص مسلمانوں نے ابتدائی طور پر اور عمومی طور پر ان کی اس تہذیب اور اس کے مظاہر مسترد کر دیا لیکن جب انہوں نے انگریزوں کے اقتدار کو نوشتہ دیوار سمجھ کر قبول کر لیا تو اب ان میں رفتہ رفتہ ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا جو انگریزی طرز زندگی کو اپنے لیے ذریعہ نجات سمجھنے لگا کیونکہ اس طرح حکمران طبقے سے قربت کے نتیجے میں ان کے معاشی مسائل کا حل ممکن تھا اور یہ ایک لحاظ سے وقت کی ضرورت بھی تھی کیونکہ فارسی زبان کے راندہ درگاہ قرار پانے کے بعد وہی لوگ حکومتی مناصب کے اہل قرار پائے جو انگریزی میں مہارت رکھتے تھے اور پھر وہ لوگ جو مغرب سے تعلیم حاصل کر کے آئے تھے اور وہاں کی ترقی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر لوٹے تھے، ان کے نزدیک بھی اب وقت آ گیا تھا کہ قدیم روایات کو سلام کہہ دیا جائے اور وقت کے تقاضوں کے مطابق چلا جائے۔

حیدر علی خان اور ان کا خاندان ایسے ہی طبقے کی نمائندگی کرتا ہے۔ لہٰذا عالمگیریت کے تہذیبی و سماجی اثرات ناول کے اس حصے میں واضح نظر آتے ہیں جہاں بشیر بیگم کے سسرال کے انداز و اطوار کا بیان ملتا ہے۔

> "جب ایوان غزل کی بیبیاں موٹروں میں پردے لگا کر سوار ہوتی تھیں تو چاند کی پھوپھیاں اپنے میاؤں کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے سکندر آباد کلب ڈانس کرنے جاتی تھیں۔ بغیر آستینوں کا بلاؤز، ہونٹوں کی سرخی اور اونچی ایڑی کا سینڈل کا فیشن پہلے پہل حیدر آباد میں اسی گھرانے سے نکلا۔ لڑکے تو خیر اور خاندانوں میں بھی پڑھنے ولایت جا چکے تھے لیکن بال کٹا کر فراکیں پہنے اسی گھرانے کی لڑکیاں پہلی بار کرسٹانوں کے اسکولوں میں بھیجی گئیں۔"(۱)

اسی طرح انگریزی تعلیم کانونٹ سکولوں میں دی جانے لگی جو اپنے ساتھ ساتھ وہ کلچر بھی لے کر آئی جو اس زبان سے منسلک تھا کیونکہ زبان کسی تہذیب کی علامت اور مظہر ہوتی ہے اور زبان محض الفاظ کا مجموعہ نہیں ہوتی بلکہ اس خاص تہذیب کی روح اپنے اندر سموئے ہوتی ہے۔ جس تہذیب سے وہ منسلک ہوتی ہے۔ 'چاند کی تعلیم کے سلسلے میں اس کے والد حیدر علی خان نے طے کر لیا تھا کہ

> "ان کی بیٹی چاند سلطانہ ڈاکٹر بنے گی۔ اس لیے انہوں نے چاند کو کانونٹ میں داخل کیا تھا۔ اسے نئے زمانے کی خود مختار عورت بننا تھا۔ اس لیے شام کو وہ ایک ڈانس اسکول بھی جاتی۔ اسکرٹ پہنتی۔ اس کے بال میموں کے ڈھنگ سے کٹے ہوتے تھے اور وہ اپنے ڈیڈی سے انگریزی میں بات کرتی تھی۔"(۲)

---

(۱) جیلانی بانو، *ایوان غزل*، ص ۵۲

(۲) ایضاً، ص ۲۷

لیکن انگریزی زبان اور انگریزی تہذیب مقامی لوگوں میں اس وقت کے ساتھ احساس کمتری کو جنم دے رہی تھی۔ اس کا اندازہ بھی اس ناول سے ہوتا ہے۔

"چاند کی اس بدلی ہوئی روش پر اس کی ننھیال میں بڑی لے دے ہوئی۔ خود واحد حسین کو اپنی نواسی کی ننگی ٹانگیں بالکل اچھی نہ لگتی تھیں۔ مگر وہ اپنے ولایت پلٹ داماد سے بڑے مرعوب تھے اور ان کی ہر بات کو بات کو بے سوچے سمجھے مان لیا کرتے تھے کہ قابل آدمیوں کی ہر بات میں کوئی نہ کوئی اچھی بات پوشیدہ ہوتی ہے۔"(۱)

چاند سلطانہ ایک خود مختار عورت تو کیا بنتی، والدہ کی وفات کے بعد اور حیدر علی خان کی دوسری شادی کے بعد چاند جب ننھیال منتقل ہو جاتی ہے تو چاند کی اس آزادی کو اس کا ماموں راشد اپنے کاروباری مقاصد کے لیے استعمال کرتا ہے اور سرمایہ دارانہ ذہنیت کے عین مطابق ہر چیز کو برائے فروخت سمجھتا ہے اور خوب جانتا ہے کہ

"چاند جیسی سوشل خوبصورت اور تہذیب یافتہ لڑکیوں کے توسط سے کسی بھی مقصد کی تکمیل ہو سکتی ہے۔"(۲)

سرمایہ داری کے پس منظر کار فرما کلامیہ کہ ہر چیز برائے فروخت ہے اور منافع کا حصول ہر قیمت پر بعینہ یہی نظریہ عالمگیریت کے پس پشت کار فرما ہے۔ راشد کی سوچ آج فرد واحد کی سوچ نہیں بڑی بڑی ملٹی نیشنل کمپنیاں اور عالمگیریت کے موید ترقی یافتہ ممالک ان ہی خطوط پر عمل پیرا ہیں اور اسی مقصد کے لیے انگریزی زبان کی بالادستی قائم کی جا رہی ہے اور دیگر زبانوں کو حاشیے پر دھکیلا گیا ہے اور یکساں تہذیب و ثقافت کو پروان چڑھانے کے لیے طاقتور الیکٹرانک میڈیا کو استعمال کر کے یہ مقصد حاصل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ جس کا لازمی نتیجہ مقامی ثقافتوں کی موت یا کم از کم ان کے حوالے سے احساس کمتری کو پروان چڑھانا ہے۔ عالمگیریت کی یہ روح جسے اس وقت عالمگیریت کا نام بھی نہیں دیا گیا لیکن موجودہ صورت میں ڈھلتی جا رہی تھی۔ عالمگیریت کی سوچ اور روح اس ناول میں راشد کی صورت میں اور غزل کے باپ کی سوچ کی صورت میں نظر آتی ہے۔ جو اپنی بیٹیوں کے حسن کی قیمت پر آسائشیں حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

اس حوالے سے اسلوب احمد انصاری لکھتے ہیں:

"ایوان غزل دراصل ایک چوکھٹا ہے جس میں وہ تمام تصویریں آویزاں ہیں جو ایک پورے عہد اور ایک مخصوص سماج کی نمائندگی کرتی ہیں۔ اس کے اپنے آداب اور قدریں ہیں اور یہ

---

(۱) جیلانی بانو، *ایوان غزل*، ص ۲۷

(۲) ایضاً

زوال آمادہ جاگیر دارانہ طبقہ کو ہمیشہ عزیز رہی ہیں... ایوان غزل کی روایات کے امین واحد حسین اور احمد حسین الف لیلیٰ تہذیب کے نمائندے مسکین علی شاہ اور اس نئی زندگی کے نمائندے بشیر بیگم کے شوہر حیدر علی خان میں یہ کاروباری مغرب زدہ اور مادہ پرستانہ زندگی ہے..."(۱)

بہر حال جیلانی بانو نے اس ناول میں حیدر آباد دکن کی تہذیب کی عکاسی کرتے ہوئے تاریخ کے اہم واقعات جو اس تہذیب پر اثر انداز ہوئے، پیش کیا ہے ان سیاسی حالات کے تناظر میں انہوں نے سماج کے معاشی ڈھانچے میں ہونے والے انقلاب کو پیش کیا ہے- کہ جب سماج جاگیر داری سے سرمایہ داری کی طرف منتقل ہو رہا تھا-اس نئے سماج میں فرد کی ذہنیت بدکمزور طبقات بالخصوص عورت کا استحصال پیش کیا ہے-

(۱) اسلوب احمد انصاری، *اردو کے پندرہ ناول* (علی گڑھ: یونیورسل بک ہاؤس، ۲۰۰۳ء) ص ۲۷۳

# آخر شب کے ہم سفر

قرۃ العین حیدر کا ناول آخر شب کے ہم سفر ۱۹۷۹ء میں زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آیا۔ اس سے قبل ان کے تین ناول میرے بھی صنم خانے، سفینہ غم دل اور آگ کا دریا قارئین اور ناقدین میں اعتبار و وقار قائم کر چکے تھے اور برصغیر پاک و ہند کی مختلف تہذیبوں سے ان کی دلچسپی اور ناول میں انگریزی ناول کی تکنیکوں کے استعمال کے حوالے سے ان کے ناول قارئین اور ناقدین سے سندِ قبولیت حاصل کر چکے تھے۔

ناول کا عنوان فیض احمد فیض کے ایک مشہور مصرعے "آخر شب کے ہم سفر فیض نہ جانے کیا ہوئے" سے ماخوذ ہے۔ ناول میں قرۃ العین حیدر نے بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں بنگال میں چلنے والی بائیں بازو کی دہشت گرد تحریک کو موضوع بنایا ہے۔ یہ تحریک انگریزی سامراج کے خلاف ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۷ء کے درمیان چلتی رہی۔ ناول میں یہ تحریک بہت اہمیت کی حامل ہے کیونکہ ناول کے اہم کرداروں کی اس تحریک سے ذہنی وابستگی نہ صرف ان کی شخصیت کو اجاگر کرتی ہے بلکہ کہانی کو آگے بڑھانے میں بھی معاون ہے۔ اس ناول کے مرکزی کردار ریحان الدین احمد، دیپالی سرکار اور روزی بنیرجی ناول کے آغاز میں اس تحریک سے وابستہ اور اس کی کامیابی کے لیے جانیں ہتھیلی پر لیے نظر آتے ہیں اور بلند آدرشوں کے حامل ہیں اور ان آدرشوں کے لیے وہ اپنا سب کچھ قربان کر دینے پر آمادہ دکھائی دیتے ہیں مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کے یہ عزائم تبدیل ہو جاتے ہیں۔ معاشی حالات کے جبر کے تحت وہ اپنے ان انقلابی نظریات سے دستبردار ہو جاتے ہیں اور مصلحت کی راہ اختیار کر لیتے ہیں۔ اس طرح انقلابی نظریات کا زوال اور حالات سے مصالحت اس ناول کا بنیادی موضوع بن جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی مختلف تہذیبوں کا مطالعہ قرۃ العین کا پسندیدہ ہے وہ اس ناول میں بھی نظر آتا ہے لیکن یہ تہذیبی مطالعہ یہاں ناول کا بنیادی موضوع نہیں۔ یہ ناول بنیادی طور پر انقلابی آدرشوں کے زوال اور انحطاط کو ظاہر کرتا ہے۔

ڈاکٹر ممتاز احمد خان بھی ناول کے موضوع کے حوالے سے اسی خیال کے حامی ہیں وہ لکھتے ہیں:

"یہ ناول تھیم کے اعتبار سے انقلابی آدرشوں کے زوال کو ظاہر کرتا ہے۔"(۱)

قرۃ العین حیدر کے دیگر ناولوں کی طرح اس ناول میں بھی کرداروں کی کثرت ہے۔ ان کرداروں میں ریحان الدین احمد، دیپالی سرکار، کے مرکزی کرداروں کے ساتھ ساتھ اومارائے، روزی بینرجی، جہاں آرا، یاسمین، نجم السحر جیسے کئی ثانوی کردار موجود ہیں۔ ناول کا ہیرو ریحان الدین احمد بنگال میں چلنے والی بائیں بازو کی دہشت پسند تحریک کے رہنما کی حیثیت سے سامنے آتا ہے۔ وہ تحریک کے کارکنوں کا آئیڈیل ہے۔ ذہین اور اپنے آدرشوں سے اس حد تک اخلاص رکھتا ہے کہ ان کی خاطر وہ اپنے بچپن کی منگیتر جہاں

---

(۱) ممتاز احمد خان، ڈاکٹر، *آزادی کے بعد اردو ناول* (کراچی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۹۷) ص ۱۳۴

آرا سے شادی کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ جس سے شادی کی صورت میں وہ ایک پر آسائش زندگی حاصل کر سکتا تھا۔ وہ مقناطیسی شخصیت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تین تین لڑکیاں جہاں آرا، اومارائے اور دیپالی سرکار اس کی محبت کے سحر میں گرفتار ہیں۔ دیپالی سرکار کے ساتھ ساتھ ریحان کی دوستی اومارائے سے بھی ہے جو امیر گھرانے کی چشم وچراغ ہونے کے ساتھ ساتھ فکری اعتبار سے پکی کمیونسٹ ہے۔ وہ بھی دلی طور پر ریحان الدین سے متاثر ہے۔ اومارائے کو جب ریحان الدین اور دیپالی کی محبت کا پتہ چلتا ہے تو وہ سازش کر کے ان میں جدائی ڈال دیتی ہے۔ یہی جدائی ریحان الدین کی زندگی کا رخ موڑ دیتی ہے۔ اس کی آئیڈیالوجی اور محبت سبھی کچھ دم توڑ دیتا ہے اور وقت سے سمجھوتہ کر لیتا ہے۔ کلکتہ آکر وہ کانگریس میں شامل ہو جاتا ہے اور وزارت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

زمانی اعتبار سے ناول اس نو آبادیاتی عہد کو پیش کرتا ہے جس کا خاتمہ ۱۹۴۷ء میں ہوا۔ اسی نو آبادیاتی عہد میں جدید عالمگیریت کے ابتدائی نقوش نظر آتے ہیں اور یہی دور آنے والے عالمگیریت کے جدید دور کا نقیب بھی ہے۔ اس حوالے سے آخر شب کے ہم سفر میں نہ صرف عالمگیریت کے ثقافتی مظاہر ملتے ہیں بلکہ بغور دیکھا جائے تو وہ سوچ اور فلاسفی بھی اس میں ملتی ہے جس کی آڑ میں اس وقت بڑی طاقتوں نے دنیا کے زیادہ تر ممالک پر قبضہ کر کے ان کے وسائل کو بے دردی سے لوٹا اور آج عالمگیریت کی آڑ میں یہی کھیل کھیلا جا رہا ہے۔

> ''پیٹر ہم کو خدا نے یہ ملک اس لیے دیا تھا کہ ہم اسے متمدن بنائیں اور جب ہمارا یہ مشن ختم ہو جائے تو واپس چلے جائیں۔''(۱)

قومی اور نسلی تفاخر نو آبادیاتی عہد یعنی عالمگیریت کے وسطی عہد میں بھی ان غالب اقوام میں موجود تھا اور اسی کی بنا پر وہ دوسرے ملکوں پر زبردستی قبضہ کر لیتے کہ دوسروں کو متمدن اور مہذب بنانے کی ذمہ داری ان کے کاندھوں پر ہے لیکن اس ذمہ داری کو پورا کرتے ہوئے وہ اپنے مفتوحہ علاقوں کے وسائل کو کس طرح لوٹتے اس کی مثالیں ناول میں موجود ہیں۔

> ''سنو دیپالی... یہ یاد رکھو کہ برطانوی سرمایہ داری ہندوستان کے قحط، غلامی، قرضے، ذات بندی اور فرقہ وارانہ کشمکش کی بنیادوں پر کھڑی کی گئی ہے۔ تمھیں معلوم ہے یہی کھلنا اور نواکھلی جو اب ڈاکوؤں اور مفلس ماہی گیروں کا دیس ہے۔ مغلوں اور نوابوں کے عہد میں کتنے اہم تجارتی علاقے تھے؟ یورپ میں جو ۲۰۰ برس تک سب سے زیادہ خونریز لڑائیاں لڑی گئیں ہیں وہ ہندوستان کی تجارت پر قبضہ کرنے کے لیے لڑی گئی تھیں۔ تم جانتی ہو نا کہ سترھویں صدی میں ہندوستان کے فولاد کا پروڈکشن سارے یورپ کے فولاد کے پروڈکشن سے برتر تھا؟''(۲)

---

(۱) قرۃ العین حیدر، آخر شب کے ہم سفر (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء) ص ۱۷۷

(۲) قرۃ العین حیدر، آخر شب کے ہم سفر، ص ۱۰۶

ریحان الدین احمد نے اگرچہ غلام ہندوستان میں جنم لیا ہے لیکن وہ ایک باشعور فرد کے طور پر جانتا تھا کہ یہ سامراجی حکومت کن حربوں اور طریقوں سے اس کے ملک کے وسائل کو لوٹ کر اپنی تجوریاں بھر رہی ہے۔ اسی لئے وہ اپنی اس تحریک کے ذریعے حکمرانوں کو نکال کر اپنے ملک کی آزادی کا حصول چاہتا ہے۔ اگرچہ بعد کے حالات اسے ایک عام سا انسان بنا دیتے ہیں جو وقت اور حالات کے سامنے سپر ڈال دیتا ہے۔ لیکن ان غاصب حکمرانوں کی عیاری اس بات سے ظاہر ہوتی ہے کہ انہوں نے مہذب اور متمدن بنانے کے نام پر ایک ایسے علاقے کا انتخاب کیا جو دنیا میں سونے کی چڑیا کے نام سے مشہور تھا۔ جہاں کا فولاد دنیا بھر سے برتر اور جس کی تیار کردہ ململ کی پوری دنیا میں مانگ تھی۔ جو قدرتی وسائل سے مالا مال تھا۔ جہاں دنیا کی قدیم ترین تہذیبوں نے جنم لیا۔ جو اپنی ایک قدیم تاریخ رکھتا تھا اور ثروت مند تہذیب کا مالک تھا۔ ایک ایسی تہذیب جس نے مختلف اقوام کے مابین صدیوں کے باہمی رشتوں اور ان کی مختلف ثقافتوں کے رنگوں کو اپنے اندر سمو کر جنم لیا اور پروان چڑھی۔ لیکن ان غیر ملکی حکمرانوں نے اپنے مفاد کے پیشِ نظر ان مختلف اقوام کے مابین افتراق اور انتشار کا بیج ایسے بویا کہ وہ اقوام ایک دوسرے کے خون کی پیاسی ہو گئیں۔

> ''پچھلی صدی میں برطانیہ نے یہ ثابت کرنا چاہا کہ امپیریلزم کے سائے میں اس نے ہندوستان کو کتنا ترقی یافتہ بنایا ہے۔ انگریزی تعلیم اور ہسپتال اور ریل گاڑیاں اور مشن کالج۔''(۱)

انگریزی تعلیم کے لیے ہندوستانیوں کا رشتہ ان کے شاندار ثقافتی ورثے اور ماضی سے منقطع کر کے ان کے اندر احساس کمتری کو فروغ دیا گیا کیونکہ اسی صورت میں ہندوستان کو زیر نگیں رکھا جا سکتا تھا حالانکہ ''وہ خود کفیل ہندوستانی سوسائٹی جو مہابھارت کے زمانے سے لے کر مغل عہد تک قائم رہی تھی۔ اسے انگریزی سرمایہ داری نے تباہ کر دیا۔''(۲)

مشرق کی اپنی روایات، اقدار پورا ثقافتی، سماجی اور معاشی ڈھانچہ تھا۔ جسے انگریزوں کی آمد نے برباد کر کے رکھ دیا۔ ٹیکنالوجی میں برتری نے انھیں اس قابل بنایا اور اس کے ساتھ ساتھ سازشوں کے جال بچھا کر انہوں نے ۱۸۵۷ء میں مکمل طور پر علامتی مغل حکمران کو تخت سے اتار کر ہندوستان کو اپنے قبضے میں لے لیا۔ اگرچہ ۱۸۵۷ء سے بہت پہلے ایسٹ انڈیا کمپنی یہاں اپنے پنجے گاڑ چکی تھی۔ تجارت کی آڑ میں ہندوستان کے وسائل کو بیدردی سے لوٹا گیا اور کہا گیا کہ سارا مشرق قانون کے تصور سے ناآشنا ہے۔ سلطنت روم کی وارث مسیحی یورپین تہذیب کے بہترین نمائندے برطانیہ نے پہلی بار اہل ہند کو قانون عطا کیا۔

چارلس بارلو کہتا ہے:

> ''کس جانفشانی اور محنت اور محبت سے گرینڈ ڈیڈ اور ان سے پہلے اور بعد کی پیڑھیوں کے سویلینز نے اس ملک کی حکومت کو دنیا کی بہترین حکومت بنایا۔''(۳)

---

(۱) قرۃ العین حیدر، آخر شب کے ہم سفر، ص ۱۰۶

(۲) ایضاً

(۳) ایضاً، ص ۱۷۹

یہ دعوی بھی کیا گیا کہ کلیولینڈ نے آدی باسیوں کو انسان بنایا۔ گویا ان یورپینز کی آمد سے قبل یہاں تہذیب و شائستگی سے نا آشنا کوئی مخلوق آباد تھی۔ جسے وہ انسان بھی نہیں سمجھتے تھے اور انھیں انسانیت کا درس دینے اور انسان بنانے یہ لوگ اتنا کشٹ اٹھا کر اور صعوبتیں جھیل کر یہاں آئے اور اس انسان نما مخلوق کی فلاح و بہبود کا فریضہ سر انجام دیا لیکن اس فلاح و بہبود نے ان ہندوستانیوں کو کس حال تک پہنچا دیا ہے۔ اس کا احوال بھی ریحان الدین کی زبان سے ناول نگار نے بیان کیا ہے۔

> ''کولونیل نظام اور بڑھتی ہوئی آبادی نے ملک کا کچومر نکال دیا۔ ہندوستان والوں کو جھوٹا اور بے ایمان بنا دیا۔ ہر کولونیل ملک کے باشندے لامحالہ گھٹیا اور کردار سے عاری ہو جاتے ہیں۔ غلامانہ ذہنیت بے معنی اصطلاح نہیں ہیں۔ لیکن اسی ڈھاکہ شہر کا موجودہ فرقہ ورانہ کھچاؤ اور افلاس برطانوی کولونیلزم کا ثبوت ہیں۔'' (۱)

ناول میں جابجا ایسے اقتباسات موجود ہیں جن سے برطانوی حکمرانوں کی بد دیانتی عیاں ہے کہ انہوں نے کس طرح تہذیب سکھانے کے نام پر ہندوستان کا استحصال کیا اور اسی استحصال کی وجہ سے بنگال جیسی زرخیز سرزمین کو بار بار قحط کا سامنا کرنا پڑا۔ جس میں لاکھوں افراد بھوک کے ہاتھوں سسک سسک کر ایڑیاں رگڑ کر موت کے منہ میں چلے گئے۔ ان برطانوی حکمرانوں نے صرف ہندوستانیوں کے منہ کا نوالہ ہی نہیں چھینا۔ انھیں ذہنی افلاس کا بھی شکار کر دیا کہ ان کا اعتماد ہی چھین لیا۔ ان کے ساتھ غیر انسانی سلوک کر کے ان کے خود پر یقین کی بنیاد بھی ہلا دیں اور ایسا کرنا ان کی ایمپائر کی بقا کے لیے وہ ضروری سمجھتے تھے۔

چارلس بابو اپنے گرینڈ ڈیڈ کے متعلق لکھتا ہے:

> ''گو یہ واقعہ ہے کہ وہ نیٹو سے برابری کی سطح پر کبھی نہ ملے اور حاکم و محکوم کی شعوری دیوار قائم رکھی۔ امپائر کی سلامتی اسی میں مضمر تھی۔''(۲)

اہل برطانیہ ہندوستان ملازمت کرنے والے اپنے ہم وطنوں کو ''انڈین'' انڈین سویلین یا ''انڈین باکس والا'' یا ''انڈین آفیسر'' کہتے تھے۔ لیکن ہندوستانی محض ''نیٹو'' تھا اور اس قابل نہ تھا کہ اس کا تذکرہ کسی مہذب سیاق و سباق میں کیا جائے۔ اتنی ہی دل سوزی اور محبت وہ ہندوستانیوں سے رکھتے تھے۔ جنہیں وہ مہذب بنانے کی ذمہ داری کا جوا اٹھا کر یہاں وارد ہوئے۔

> ''اور یہاں آنے برطانوی ان ہندوستانیوں کے متعلق خیال رکھتے تھے کیونکہ یہ رعایا بچوں کی طرح احمق اور جانوروں کی طرح جنگلی تھی۔ نسلاً بعد نسلاً ان سب سویلینز کا یہ عقیدہ تھا کہ خدا نے ایک بڑی عظیم روحانی اور اخلاقی ذمہ داری ان کو سونپی ہے۔''(۳)

---

(۱) قرۃ العین حیدر، آخرِ شب کے ہم سفر، ص ۱۲۰

(۲) ایضاً، ص ۱۸۲

(۳) ایضاً، ص ۱۸۸

اور اس ذمہ داری کو انہوں نے اس طرح نبھایا کہ ”انیسویں صدی کے پہلے نصف میں سات قحط پڑے جس میں پندرہ لاکھ لوگ مرے۔ دوسرے نصف میں چوبیس قحط میں پڑے جن میں ایک کروڑ انسان مرے۔“[۱]

انگریز اپنے ساتھ بعض مفید ایجادات اور نظام بھی لے کر آئے۔ جن کا فائدہ ضمناً ہندوستان اور ہندوستانیوں کو بھی پہنچا دراصل تو وہ یہ انتظامات اپنی امپائر کی بقا، استحکام اور سرمایہ دارانہ مقاصد کی تکمیل کر رہے تھے۔ ان میں ریلوے کا نظام، نہری نظام اور پرنٹنگ پریس وغیرہ شامل ہے۔ ان کے خیال میں ان کی آمد سے قبل ہندوستان مطلق جاہل تھا۔ حالانکہ قدیم دور میں یہاں نالندہ اور ٹیکسلا کی یونیورسٹیاں موجود تھیں خود مسلمانوں کے دور میں یہاں مکاتب اور مدارس پر مشتمل باقاعدہ تعلیمی نظام موجود تھا۔ لیکن ہندوستانیوں کو جاہل، احمق اور جانور ثابت کر کے ہی ان کی حکمرانی کو جواز فراہم کیا جا سکتا تھا۔ لہٰذا ۱۸۱۸ء میں بنگال میں ہندو کالج قائم کیا گیا۔ بظاہر اس کو ہندوستانیوں کی فلاح بہبود کے لئے اٹھایا گیا ایک قدم قرار دیا گیا۔ لیکن دراصل اس کا مقصد نوجوان نسل کو اس کے مذہب اور تہذیب وثقافت سے برگشتہ کرنا تھا۔ شواہد اس کی گواہی دیتے ہیں کہ اس کے طلبہ اپنے مذہب سے برگشتہ ہوتے جا رہے تھے۔

ایک طرف انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ اپنے مذہب اپنی روایات کو بنظر تحقیر دیکھ کر اس سے برگشتہ ہو رہا تھا دوسری طرف انگریز حکمران اس طبقے سے خائف ہو رہے تھے۔ حالانکہ جو تعلیم انھیں دی جا رہی تھی وہ صحیح معنوں میں انھیں سوچ وفکر عطا کرنے کی بجائے ان میں انگریزی تہذیب کی نقالی کے جذبے کو ابھار رہی تھی۔ خود میکالے کی سفارشات اس ضمن میں معروف ہیں کہ وہ ایک ایسے وفادار طبقے کو پیدا کرنا چاہتے تھے جو شکل وصورت کے اعتبار سے ہندوستانی اور ذوق کے اعتبار سے انگریز ہو لیکن یہ طبقہ بھی ان کے نزدیک قابل اعتبار نہ تھا۔ انیسویں صدی میں انڈین ایمپائر کے متعلق اپنی کتاب سر علی بابا کا سفر نامہ میں ایک انگریز طنز نگار نے لکھا۔

> ”ہم بابو ازم کو ایمپائر میں کتنا ہی فروغ دیں۔ بابو کے وجود پر ہمیں آنسو بہانا چاہئیں کہ بابو ایک سخت قابل رحم شے ہے۔ یہ بابو نئے مذہب، نئی موسیقی، آرٹ اور سائنس سے خوب پیٹ بھر کے جب موٹا ہو جائے گا تو ایسی دولتی جھاڑے گا کہ ہم اس کا مذاق اڑانا بھول جائیں گے۔ اس کے پیٹنٹ لیدر جوتے، اس کی ریشمی چھتری، اس کے دس ہزار ہارس پاور کے انگریزی الفاظ اور جملے، اس کی مغربی خیالات کی جگالی۔ سب ایک روز بے حد خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں۔ سائنس، مغربی فلسفے اور مشنریوں نے اس کے دماغ کو اتنا چکا چوند کر دیا ہے کہ اب اس کا اپنی پرانی حیثیت پر واپس جانا مشکل ہے۔“[۲]

---

(۱) قرۃ العین حیدر، آخر شب کے ہم سفر، ص ۱۹۶

(۲) ایضاً، ص ۴۶

ان حکمرانوں کا منشا یہ تھا کہ یہاں ذہنی طور پر مفلوج بونے پیدا کیے جائیں جو آزادانہ سوچ و فکر کے مالک نہ ہوں۔ جو اپنی روایات واقدار کے حوالے سے احساس کمتری کا شکار ہوں اور مغربی اقدار وروایات ان کے نزدیک قابل تقلید نمونہ ہوں۔

> ''ہا... بے چاروں کا احساس کمتری۔ اس احساس کمتری میں ہم ہی نے انھیں مبتلا کیا۔ بڑھیا سے بڑھیا ہندوستانی انگریز سے دو باتیں کر لینا فخر سمجھتا ہے۔ ہائے کس قدر قابل رحم قوم ہے۔ کس فخر سے کوٹھیوں میں رہتے ہیں۔ چھری کانٹے سے کھاتے ہیں۔ انگریزی بولتے ہیں۔ دنیا کا عظیم ترین کونیل سماج۔'' (۱)

اور اس ذہنی غلامی کو بڑھاوا دینے کے لیے ان حکمرانوں نے مختلف حربے اختیار کیے۔

ہندوستان کے اہلکاروں، چپراسیوں اور سائیسوں کی وردیاں، پگڑیاں اور ٹوپیاں برطانوی حکومت نے پچھلی صدی میں قدیم ہندوستانی امرا و شرفا کی ملبوسات کے نمونے کی بنوائی تھیں۔ گویا کہتے ہوں دیکھو جو تمہارا لباس ہے وہ ہم اپنے نوکروں کو پہنائیں گے۔

بہرحال ایسے مختلف طریقوں اور ہتھکنڈوں کا مقصد، ہندوستان میں اپنی حکومت کو دوام بخشنا تھا۔ مالتھس نے برطانیہ میں آبادی اور وسائل کی شرح کے حوالے سے جو نظریہ آبادی پیش کیا تھا۔ اس کے مطابق آبادی میں اضافے کی شرح وسائل اور خوراک کی شرح اضافہ سے کہیں زیادہ تھی۔ جس کا نتیجہ لازماً وہاں قحط کی صورت میں نکلتا۔ جن عوامل نے برطانیہ کو محفوظ رکھا۔ ان میں صنعتی انقلاب کے ساتھ ساتھ برطانیہ سے آبادی کی ہجرت تھی۔ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے مختلف براعظموں اور ملکوں میں جا کر قبضہ کیا وہاں کے وسائل اپنے ملک میں منتقل کیے بلکہ صنعتی انقلاب کے پیچھے بھی یہی سرمایہ تھا۔ جس نے برطانیہ میں صنعت کو ترقی و عروج دی۔ دو عظیم جنگوں کے پیچھے بھی بڑے صنعتی ممالک کے یہی مقاصد تھے جنھوں نے دنیا کے امن کو خطرے سے دوچار کر دیا۔ متذکرہ بالا مثالیں جو نوآبادیاتی دور سے متعلق تھیں وہ آج کی دنیا میں عالمگیریت کے حوالے سے بھی درست ہیں۔ آج عالمگیریت کے ذریعے بڑی بڑی طاقتیں اور ان کی کمپنیاں اقوام کے وسائل کو اپنے زیر تصرف لانے کے لیے اپنی برتری اپنے کلچر کی برتری کا نقش راسخ کر کے دیگر ثقافتوں کے حوالے سے احساس کمتری پیدا کر رہی ہیں۔ یہ ثقافتی رنگارنگی آج بھی عالمگیریت کے راج کے لیے قابل قبول نہیں۔ آج بھی انگریزی زبان کو دنیا بھر میں رائج کرنے کے لیے دوسری زبانوں کی بقا کو خطرے میں ڈالا جا رہا ہے۔ عالمگیریت کی اس جدید لہر کے ساتھ فوج کشی نہیں کی جاتی بلکہ اب بڑی بڑی کمپنیاں اشتہار بازی کی صنعت ہے جس کے ذریعے یہ کمپیناں اپنی مصنوعات فروخت کرتی ہیں۔ اب ٹی وی اور انٹرنیٹ ان کی سپاہ کا کام کر رہے ہیں۔ اب بھاری بھرکم فوج رکھنے کی ضرورت بہت کم رہ گئی ہے۔ اب سینکڑوں ہزاروں میل دور بیٹھ کر کسی بھی ملک کی اکانومی خصوصاً کمزور ممالک کی معیشت کو کنٹرول کر کے ان کے وسائل کا رُخ اپنی جانب موڑ کر اقوام کو قلاش کیا جاتا ہے۔

---

(۱) قرۃ العین حیدر، آخر شب کے ہم سفر، ص ۱۹۳

# باب چہارم

## عالمگیریت کا دورِ جدید اور اردو ناول

## (۱۹۸۰ تا حال)

# اردو ناول اور عالمگیریت کا دورِ عروج

عہد حاضر کا فکری تناظر آسانی کے لیے کہا جاسکتا ہے کہ بیسویں صدی کی آخری دو دہائیوں سے لے کر اکیسویں صدی کے دوسرے عشرے کے آخر تک محیط ہے۔ اس میں ایک غایت درجہ بدلا ہوا سیاسی، سماجی، ثقافتی، لسانی منظر نامہ متعدد سوالات پیش کرتا ہے۔ انہی بنیادی سوالات میں ایک اہم سوال عالم گیریت کا بھی ہے۔ بیسویں صدی کے آخر میں کچھ اہم واقعات و ایجادات نے انسان کے تہذیبی سفر کو نئی مہمیز دی۔ ایجادات نے اس کی زندگی میں آسانیاں پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ پیچیدہ سوالات کو جنم دیا جن کا سامنا انسان کو اس سے قبل کی قرنوں میں نہیں کرنا پڑا تھا۔ مثلاً ۱۹۷۹ میں آپٹیکل فائبر کی ایجاد نے معلومات کی ترسیل کو زیادہ محفوظ، تیز تر اور کم لاگت میں ممکن بنا دیا۔ دسمبر ۱۹۷۹ میں روسی افواج کا افغانستان میں داخلہ جس نے آگے چل کر متحدہ سوویت یونین کو تقسیم کرکے دنیا کو بائی پولر سے یونی پولر بنا کر طاقت کا توازن بگاڑ دیا۔ ستمبر ۱۹۸۸ میں پاکستان کے ہمسائے میں ایران اور عراق کے درمیان ۸ سال پر محیط جنگ کا اختتام ہوا۔ دسمبر ۱۹۸۸ میں پاکستان کی سیاست میں ایک ہلچل اس وقت پیدا ہوئی جب بے نظیر بھٹو پاکستان کی پہلی خاتون وزیر اعظم بن گئیں۔ اور اس سے اگلے سال نومبر ۱۹۸۹ میں دیوار برلن منہدم ہوئی ، اکتوبر ۱۹۹۰ میں مشرقی جرمنی و مغربی جرمنی کا ادغام ہوا اور پھر ۲۰۰۱ میں یورو کرنسی کا اجرا ہوا، آج کی دنیا میں یورو کاروباری لحاظ سے ڈالر کے ساتھ دنیا کی دوسری مضبوط کرنسی بن چکا ہے۔ ستمبر ۲۰۰۱ میں نیویارک ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر دہشت گرد حملہ ہوا اور بارود سے بھرے دو جمبو جیٹ ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے جڑواں ٹاوروں سے ٹکرائے گئے۔ حملوں کے فوراً بعد ان کا ذمہ دار سعودی شہری اسامہ بن لادن کو اور ان کی تنظیم القاعدہ کو ٹھہرایا گیا۔ افغانستان میں روپوش اسامہ بن لادن کی حوالگی سے انکار پر امریکا نے نومبر ۲۰۰۱ میں افغانستان میں طالبان کی حکومت ختم کر دی۔ اور افغانستان ایک طویل خانہ جنگی کی لپیٹ میں آگیا جس سے پورا جنوبی ایشیا بالخصوص پاکستان بری طرح متاثر ہوا۔ جنوری ۲۰۰۴ میں سپرٹ روور روبوٹ کو امریکی خلائی ادارے ناسا نے کامیابی سے مریخ پر اتارا۔ اس روبوٹ نے مریخ سے معلومات کی ترسیل شروع کر دی اور بہت سی قیمتی تصاویر اور مشاہدات زمین پر بھیجے۔ دسمبر ۲۰۰۴ میں سماٹرا انڈونیشیا میں خوفناک زلزلہ آیا اس زلزلے سے بحر ہند میں ایک طاقتور سونامی پیدا ہوا جس نے ایشیا کے ۱۲ ممالک کو متاثر کیا تقریباً ڈیڑھ لاکھ افراد اس زلزلے سے ہلاک جبکہ لاکھوں بے گھر ہوئے۔

دسمبر ۲۰۰۷ میں عالمی مالیاتی بحران عروج کو پہنچ گیا۔ بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں بھی دنیا کو عالمی مالیاتی بحران اور کساد بازاری کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ ۲۰۰۷ کے اس عالمی مالیاتی بحران نے امریکا جیسی مضبوط معیشت کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا اور اس بحران کے اثرات شنگھائی سے لندن کے سٹاک ایکسچینج تک محسوس ہوئے۔ پوری دنیا کے GDP میں انحطاط کا رجحان نمایاں ہوا۔ اس بحران کا نتیجہ بے روزگاری، مہنگائی، افراط زر کی شکل میں پوری دنیا میں پھیل گیا۔

یہ چند اہم واقعات ہیں جنہوں نے بیسوی صدی کے آخر اور اکیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں دنیا کے بہت سے حصوں کو متاثر کیا۔ انہی سالوں میں عالم گیریت کی تیسری رونے بھی دنیا بھر کو متاثر کیا۔ عالم گیریت کی یہ رونو آبادیت اور سامراجیت سے زیادہ سوفسطائی ہے کیونکہ اب یہ فوجی قوت سے بڑھ کر سرمائے اور ٹیکنالوجی کے نفیس حربوں سے لیس ہے۔ یہ عالم گیریت اپنے اس نئے روپ میں سرمایہ دارانہ نظام کی کامرانی اور امریکی انداز فکر اور طرز حیات سے مملو ہے۔ اسی عالم گیریت کی ایک کلیدی خصوصیت تیز رفتاری ہے۔ لیکن یہ تیز رفتاری معاشرتی بے چینی، تشدد اور علاقائی و نسلی کشمکش کا باعث بن گئی ہے معلومات کا سیل رواں گھروں، دفاتر، تعلیمی اداروں بلکہ خوابگاہوں تک پہنچ چکا ہے اور اس سیلاب نے پرانی دنیا اور اس کی اقدار کو تہہ و بالا کر دیا ہے۔ ابتداءً عالم گیریت کو ایک ایسا منصوبہ سمجھا گیا جو مثبت اور بے ضرر تھا لیکن جلدی یہ حقیقت آشکار ہوگئی کہ یہ مقتدر اقوام کا سوچا سمجھا منصوبہ ہے جو دنیا کو اندر باہر سے بدل ڈالنے کے لیے تیار کیا گیا ہے۔ دراصل اس کا ایجنڈا رنگوں نسلوں عقیدوں کی نئی تشکیل سے عبارت ہے جس میں دنیا کی ساری اقوام اور افراد ایک ہی سانچے میں ڈھلے ہوئے زندگی گزارتے نظر آئیں۔ اس میں اقوام اور افراد کی انفرادی شناخت کا ہر حوالہ اور ہر نشان نابود ہو رہا ہے۔ امتیازی نقوش مٹائے جا رہے ہیں تاہم بنیادی طور پر عالم گیریت کوئی فکری تحریک یا نظریاتی رجحان نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک طرز حکمرانی ہے یونی پولر ورلڈ کی وہ طرز حکمرانی، جو روس کی شکست کے بعد، اسّی کی دہائی سے نیو ورلڈ آرڈر کے ساتھ دنیا پر مسلط کی جا رہی ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ عالم گیریت کا بنیادی تعلق اقتدار کی سیاست سے ہے چاہے وہ مقامی ہو یا عالمی۔ اصل میں اس کا تعلق ذرائع پیداوار اور معیشت سے ہوتا ہے۔ گویا عالم گیریت نئی طرح کی سامراجیت ہے جس کے ذریعے مقتدر اقوام صرف صارفیت کو فروغ دے کر ساری دنیا کو اپنے لیے بازار بنانے کی خواہاں ہیں اور اس طرح وہ پسماندہ اقوام کے ذخائر اور ذرائع پیداوار پر قابض ہونا چاہتی ہیں۔ یہ کھیل اس سے قبل بھی تاریخ کے مختلف ادوار میں نظر آتا ہے لیکن اس بار اسے عالم گیریت کا نام دے کر اس کی آڑ میں کھیلا جا رہا ہے اور اس طرح بیک وقت دو فوائد حاصل کیے جا رہے ہیں۔ ایک طرف تو عالم گیریت کے اس نعرے کے توسط سے یکساں ذرائع اور سہولیات کی فراہمی کا تاثر عالم گیریت کی اصلیت اور اس کے اصل حقائق کو کیموفلاج کر رہا ہے اور دوسری طرف اس کے ذریعے طاقتور اقوام کے ہاتھ کمزور اور پسماندہ تہذیبی گروہ کے استحصال کا لائسنس آ جاتا ہے۔

آج کی دنیا اپنے مزاج کے اعتبار سے بالکل الگ ہے۔ یہ اس سے پہلے کی دنیا کے یعنی تاریخ کے کسی دور سے مشابہت یا مطابقت نہیں رکھتی۔ مثال کے طور پر آج طرز حکمرانی اور اقتدار و اختیار کے تصورات بدل گئے ہیں۔ اقتدار کے دو مظاہر ہیں: ایک معیشت اور دوسرا حربی قوت، اس دور میں معیشت کو فوقیت حاصل ہے جبکہ گزشتہ ادوار میں حربی قوت فیصلہ کن کردار ادا کرتی تھی۔ اس کی بڑی مثال روس ہے جو دوسری بڑی عالمی طاقت تھا۔ اسلحے، افواج اور سائنسی ترقی میں ایک بہت بڑی طاقت تھا لیکن اس کے انہدام میں جس عنصر نے غیر معمولی کردار ادا کیا وہ معیشت کا عدم استحکام تھا۔ ویسے بھی اب جنگ کا تصور بھی بدل چکا ہے۔ انتہائی ناگزیر ہو تو افغانستان و عراق جیسی جنگیں لڑی جاتی ہیں ورنہ اب جنگوں سے بہتر نتائج اقوام یا تہذیبوں کے داخلی نظام میں تخریبی کاروائیوں سے حاصل کیے

جاتے ہیں۔ مقتدر اقوام اپنے طے شدہ اہداف میں باہر بیٹھ کر اپنے ہم خیال پیدا کرتی ہیں۔ انھیں خریدتی ہیں اور انھیں قوت و اختیار کے ان مراکز میں داخل کرتی ہیں جہاں سے ان کے ذریعے اس ملک کے وسائل اور ذرائع کو اپنے تصرف میں لایا جاسکے۔ یہ پراکسی وار کا زمانہ ہے۔ اب میدان جنگ بدل گئے ہیں اب جنگیں تہذیبی و ثقافتی دائروں میں لڑی جاتی ہیں اور اس کے لیے الیکٹرانک میڈیا اور سوشل میڈیا کو استعمال میں لایا جاتا ہے اور بڑے پیمانے پر ثقافتی یلغار کی جاتی ہے۔

اس کے نتیجے میں تہذیبی و ثقافتی انہدام جو گزشتہ چار دہائیوں میں نظر آتا ہے اس کی مثال صلیبی جنگوں اور یورپ کی نشاۃ ثانیہ کے ادوار میں بھی نہیں ملتی۔ یعنی خوفناک اور تباہ کن اثرات کی حامل۔

آج کی جس دنیا میں اردو کا ادیب زندہ ہے یہ ایک ایسی دنیا ہے جس میں تہذیبیں مٹ رہی ہیں اور ثقافتوں کے امتیازی نشانات پر کاری ضرب لگائی جارہی ہے۔ یہ کوکا کولا، میکڈونلڈ، کے ایف سی، جینز، برگر، فیس بک اور ورچوئل ریئلٹی کی وہ دنیا ہے جس میں انسانی زندگی روبوٹ کی مانند ہوچکی ہے۔ عالم گیریت کی مخفی یکسانیت اور معیاریت کسی اژدہا کی مانند اقوام کے تہذیبی تشخص اور انفرادیت کو نگل رہی ہے اور اس کی زد میں دنیا کی بہت سی زبانیں اپنا وجود کھو رہی ہیں، برباد ہو رہی ہیں۔ غیر محسوس طریقے سے ہم برطانوی انگریزی بلکہ امریکن انگریزی کی طرف جارہے ہیں۔ انگریزی کی توقیر میں اضافہ ہو رہا ہے اور جب کہ دیگر اقوام میں اپنے لسانی ورثے کے حوالے سے اب احساس کمتری پروان چڑھایا جارہا ہے۔ معاشی لحاظ سے دیکھیں تو دنیا کی معیشت آج بہت زیادہ مربوط اور ثروت مند ہوگئی ہے لیکن اس دولت کی پیدائش اور استفادہ غیر مساوی ہے۔ ٹیکنالوجی کو پیدا کرنے اور کنٹرول کرنے والی ملٹی نیشنل کا دائرہ اثر دنیا بھر میں پھیل رہا ہے۔ معیشت کی اس توسیع کے متنوع اسباب میں ایک اہم سبب یہ بھی ہے کہ ۱۹۴۵ کے بعد بڑی تجارتی اقوام نے ایک نظام قائم کیا اس کا مقصد عالمی اور معاشی استحکام کو یقینی بنانا تھا لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ برطانیہ کی جگہ امریکا نے لے لی۔ جنگ عظیم دوم کی تباہ کاریوں کے مداوے کے لیے صنعتی پیداوار کی شرح نمو بے مثال طور پر زیادہ ہوگئی۔ ۱۹۵۳ تا ۱۹۷۵ مجموعی پیداوار میں ۶ فیصد سالانہ کی شاندار شرح سے اضافہ ہوا۔ ۱۹۷۳ تا ۱۹۸۰ میں یہ شرح ۲ء۴ فیصد کے حساب سے زیادہ ہوئی۔

دنیا میں خوشحالی کی اس لہر اور ملٹی نیشنل کمپنیوں کا جنم ایک ہی دور میں ہوا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو متاثر کیا۔ اپنے وطن کے مفاد اور اقدار سے ان کمپنیوں کی وابستگی تیزی سے کم ہوئی۔ انقلابی مواصلات اور مالیاتی ٹیکنالوجیز کے ذریعے ایک ملک سے دوسرے ملک میں سرمایہ کاری اور پیداوار کی منتقلی کی ایک باقاعدہ سٹریٹیجی کے ذریعے ہوتی ہے۔ اس سے خدمات کی ایک منڈی وجود میں آگئی۔ درحقیقت یہ کمپنیاں نئی نہیں ہیں ان کی ابتدائی شکل انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں غیر ملکی پرائیویٹ بینکوں کی صورت میں موجود تھیں۔ مثال کے طور پر ۱۹۰۰ میں House of Routhchild کی شاخیں فرانکفرٹ، وی آنا اور لندن میں موجود تھیں اور ان کا ہر روز ایک دوسرے سے رابطہ ہوتا تھا۔ ۱۹۱۴ سے پہلے Lloyds of London نے جرمنی کی جہاز سازی صنعت کا بیمہ کیا تھا اور انگریزوں اور جرمنوں کی جنگ کے موقع پر یہ ان کی تمام نقصان کا معاوضہ دینے کو تیار تھیں۔ ابتدائی ملٹی نیشنل

کمپنیوں میں لیور برادرز (یونی لیور کے پیشرو) شامل ہیں۔ ان کی پیداواری سہولتیں مغربی افریقہ سے ہندوستان تک پھیلی ہوئی تھیں۔ ان کے علاوہ تیل کی کمپنیاں ہیں۔ لیکن آج کی ملٹی نیشنل کمپنیاں ان سے مختلف ہیں۔ آج کی توسیع شدہ معیشت میں ان کمپنیوں کا حدود اور سائز بہت بڑھ چکے ہیں۔ آج کی دنیا میں سرمائے کی منڈیوں کی آزادی اور عالمی مواصلاتی انقلاب نے سرمائے کے ارتکاز میں بھی اضافہ کر دیا ہے۔ آج کمپیوٹر کی قوت میں بہت زیادہ اضافہ ہو چکا ہے۔ کمپیوٹر سوفٹ ویئرز، سیٹلائٹس، فائبر اوپٹکس کیبلز اور ہائی سپیڈ الیکٹرانک ٹرانسفر نے آج کاروبار اور تجارت کی صورتحال کو یکسر بدل کے رکھ دیا۔ عالم گیریت کے اس عمل نے قومی ریاست کی سلامتی کے لیے خطرہ پیدا کر دیا ہے۔ اب ریاست کے لیے بہت مشکل ہے کہ وہ اپنے امور کو مکمل طور پر کنٹرول کر سکے۔

دنیا ایک ایسے عہد میں داخل ہو رہی ہے اب مصنوعات یا ٹیکنالوجیز قومی نہیں ہوں گی، کوئی قومی کارپوریشن اور قومی صنعت نہیں ہو گی۔ عالم گیریت کے حامی چاہتے ہیں کہ ملکی حکومتیں اور ایجنسیاں منڈیوں کو کنٹرول نہ کریں لیکن یہ صورتحال مقامی صنعت اور ریاستوں کے حق میں نہیں۔ چونکہ آج کی دنیا میں غریب اور امیر کے درمیان فرق بڑھ رہا ہے تو پھر ایک اعلیٰ درجہ کی ٹیکنالوجی کا مشترکہ کلچر، جو قومی سرحدوں سے ماورا ہو، جو کسی حکومت کا وفادار نہ ہو اور مقامی دائرے سے باہر ہو، ایسا کلچر مستقبل میں دنیا کی ۸ یا ۱۰ بلین کثیر لسانی، بھوکی اور ناآسودہ آبادی کو کیسے مطمئن کر سکے گا؟؟؟ بہر حال عالم گیریت کے اس عمل کی بہت تشہیر ہو چکی ہے اور اب رفتہ رفتہ یہ واضح ہونے لگا ہے کہ اس خوش کن خواب سے کون لوگ مستفید ہو رہے ہیں اور کن کے مفادات پر زد پڑ رہی ہے۔

عالم گیریت کے حوالے سے بہت سا لٹریچر آ چکا ہے اور اس بدلے ہوئے تناظر میں اردو ادیب کی بھی ذمہ داری بڑھ گئی اور ادب کو بھی اہم سوال درپیش ہے کہ عالم گیریت کے اس دور میں جو دراصل سرمایہ دارانہ ہے کہیں ادب بھی جنس بازار اور بکاؤ مال تو نہیں بن جائے گا۔ اور وہ کون سی زبان ادب ہو گی جو عالم گیریت کی عالمگیر اور جہانگیر قوتوں سے سندپذیرائی حاصل کر سکے گی۔ ادب میں ان قدروں اور موضوعات کا فروغ ہو گا جو یا تو عالمگیر قوتوں کو مرغوب ہو گا یا جس کا وہ تقاضا کریں گے لیکن اگر ادیب نے ان کے برخلاف اپنی تخلیقی رو کی پیروی کی کوشش کی تو نتیجہ کیا ہو گا؟ اس صورت میں اس پر بھی رسد اور طلب کے اصولوں کا اطلاق ہو گا؟ ان جوابات کے لیے اسّی کی دہائی اور اس کے بعد کے ادب کی طرف رجوع کرنا ہو گا۔

# راجہ گدھ

۴۵۲ صفحات پر محیط بانو قدسیہ کا ناول راجہ گدھ ۱۹۸۱ میں پہلی بار شائع ہوا۔ یہ کثیر الجہاتی ناول مادی اور روحانی معنویت کا حامل ہے جس میں فلسفیانہ سوالات کے حوالے سے سائنسی انکشافات سے بھی استفادے کا رجحان نظر آتا ہے۔

راجہ گدھ کا متکلم کردار قیوم ہے جو اس ناول کا کیبری کردار بھی ہے اس کے ساتھ سیمی شاہ، آفتاب، عابدہ، امتل اور سر سہیل کے کردار اہمیت کے حامل ہیں۔ راجہ گدھ چار حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ شام سمے ہے جو زمانی اور مکانی منظر پر سیمی شاہ، آفتاب، قیوم اور پروفیسر سہیل کے کرداروں کو ابھارتا ہے۔ شام سمے کا ذیلی عنوان عشق لاحاصل ہے۔ متعارف کروائے گئے ان کرداروں کا سماجی پس منظر مختلف ہے اور ان میں سے ہر فرد اپنے طبقے کی ثقافتی اقدار کا نمائندہ بھی ہے۔ سیمی گلبرگ کی معاشرے کی پیداوار تھی۔ اس کا الٹرا ماڈرن مزاج اس کی ہیئت سے ظاہر ہے۔

"وہ گلبرگ کی معاشرے کی پیداوار تھی۔ اس وقت اس نے موری بند جینز کے اوپر وائل کا سفید کرتا پہن رکھا تھا۔ گلے میں حمائل نمالاکٹ ناف کو چھو رہا تھا۔ کندھے پر لٹکنے والے کینوس کے تھیلے میں غالباً نقدی، لپ اسٹک، ٹیشو پیپر تھے۔ اس کے سیاہ بالوں پر سرخ رنگ غالب تھا۔ اکتوبر کے سفید دن کی روشنی میں بال آگ پکڑنے ہی والے تھے۔" [۱]

سیمی شاہ کا باپ اس امیر طبقے کا فرد تھا جس نے تقسیم ہند کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ وہ غریب گھر سے تعلق رکھتا تھا اور اب پاکستان بنانے والی پود کی طرح بوڑھا ہو رہا تھا۔ اس نے اپنی مردمیت کے سامنے دولت، کار، بنگلے، بینک بیلنس کی سکرین لگا کر اپنے آپ کو پوٹنٹ (Potent) بنا رکھا تھا۔ اس کا وقت لومڑیوں کے لیے تھا بیٹی بڑا بوجھ لگتی تھی جبکہ اپنی ماں کے متعلق سیمی کا کہنا تھا:

"میری ممی کسی بات کی اجازت نہیں دیتیں وہ کسی بات سے agree نہیں کرتیں اور سب کچھ مان جاتی ہیں۔ وہ شراب نہیں پیتیں لیکن کاک ٹیل پارٹیوں میں شریک ہوتی ہیں۔ وہ میرے باپ کے مشاغل سمجھتی ہیں لیکن اعتراض اس لیے نہیں کرسکتیں کہ وہ ڈیڈی کو مجازی خدا سمجھتی ہیں۔ وہ بیوٹی پارلر سے حسن کاری کرواتی ہیں۔ میری ماں بوڑھے ڈھانچے کے ساتھ نوجوان لومڑیوں کے برابر بھاگ رہی ہے... اوہ یہ سب کچھ یہ میرے ماں باپ ان کی زندگی اتنی مضحکہ خیز ہے... اتنی بچگانہ کہ میں... [۲]

اس نو دولتیے معاشرے میں سیمی اپنے والدین کے ساتھ گلبرگ میں رہنے کی بجائے ہوسٹل میں رہنے کو ترجیح دیتی ہے۔ وہ اندرونی طور پر عدم طمانیت، پژمردگی اور ناآسودگی کا شکار ہے۔ ایسے میں وہ کلاس میں آفتاب سے متعارف ہوتی ہے اور کسی کمزور لمحے میں اس کے یونانی حسن کے سامنے کیوپڈ کے تیر کا شکار ہو جاتی ہے۔

---

(۱) بانو قدسیہ، *راجہ گدھ*، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۸ء) ص ۸

(۲) ایضاً، ص ۵۲

آفتاب ایک کاروباری خاندان کا چشم و چراغ ہے۔ وہ سفید رنگ کی پیکنگ میں برتھ ڈے گفٹ کی طرح سجا سجایا کشمیری بچہ ہے۔ خود پسندی کا شکار اور فلموں کا شوقین ہے۔ تاجر پیشہ امیر خاندان کا یہ سپوت اندرون شہر سے تعلق رکھتا ہے۔ ابتداً یہ خود بھی سیمی کے ساتھ محبت کرتا ہے یونیورسٹی میں ان کا سکینڈل ہر کسی کی زبان پر ہے لیکن والدین نے زیبا سے شادی کر دی تو اس نے سیمی کی محبت کو دل کے کنویں میں دفن کر دیا اور کسی قسم کی مزاحمت نہیں کی۔

قیوم جو اس ناول کا مرکزی کردار ہے دیہاتی معاشرے کا پروردہ ہے۔ تعلیم حاصل کرنے لاہور آیا ہے۔ سیمی شاہ اس کی کلاس فیلو ہونے کے ساتھ ساتھ اس سے بے تکلف بھی ہے۔ اس نے سیمی جیسی مکمل شہری اور الٹرا ماڈرن لڑکی پہلے کبھی نہیں دیکھی۔ سیمی کا لب و لہجہ، اٹھنا بیٹھنا، بات چیت اور اس کے جسم سے اٹھنے والی خوشبو اس بات کی گواہ تھیں کہ سیمی اس سے مہذب تر ہے لیکن اب یہ اس کی انا کا مسئلہ بن گیا کہ وہ سیمی شاہ کو پچھاڑ دے۔ اسے گھسیٹ کر اپنے دیہاتی پس منظر میں لے جائے جہاں وہ قیوم کی شخصیت سے پچھاڑ کھا گرے اور مکمل دیہاتن بن جائے۔ دوسری طرف قیوم کو ماسٹر غلام رسول اور تنویر سر کی وجہ سے اپنا قد بونا رہ جانے کا بھی احساس ہے۔ حالات کی گردش کی وجہ سے سیمی کا ہاتھ قیوم کے ہاتھ میں آیا تو اسے احساس ہوا کہ وہ اپنے محلے اور کالج کا بہت بڑا گدھ ہے۔

"شام سمے" کی ابتدا میں مصنفہ نے پرندوں کی ایک کانفرنس کا ذکر کیا ہے کہ جب انسان نے سائنسی طور پر بہت ترقی کر لی کہ زہرہ اور مریخ تک جا پہنچا اور بہت متمدن ہونے کے باوجود اس نے ابھی اپنی بستیوں پر ایٹم بم نہ گرائے تھے۔ لیکن پرندوں کی دنیا میں اس ایٹم بم کی ایجاد کی وجہ سے بہت بے چینی پھیلی ہوئی تھی۔ اس کانفرنس کی صدارت ہما نے کرنی تھی جو ابھی تک کانفرنس میں نہیں پہنچا۔ مکار اور شاطر کوے سیاستدانوں کی طرح اس کے خلاف افواہیں پھیلا رہے ہیں۔

> "لو ہما تو ازل کا احمق ہے بادشاہ چنتا پھرتا ہے دھرتی پر...... بھائی ادھر دنیا کا ہر انسان بادشاہ ...... ہر انسان اپنے آپ کو اشرف المخلوقات سمجھتا ہے جن کے سر پر تکبر کا تاج ہو ان کو بادشاہ کیا بنانا۔" (۱)

ہما کی عدم دستیابی کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اب صدارت کے لئے قرعہ فال سیمرغ کے نام نکلتا ہے جو پرندوں کا بادشاہ ہے۔ کانفرنس کے انعقاد کی وجہ کے بارے میں اس کو بتایا جاتا ہے کہ اگرچہ انسان بہت متمدن اور ترقی یافتہ ہو چکا ہے لیکن اس کی سرشت میں ایک ایسا وصف ہے جو اس کی تباہی کا باعث ہے۔ اس نے ایسے ہتھیار ایجاد کر لیے ہیں جو اس کرۂ ارض کو منٹوں میں تباہ کر سکتے ہیں اور اب پرندوں مثلاً گدھ میں بھی کچھ میں دیوانگی کے آثار ہیں اور ہمیں خوف ہے کہ کہیں وہ اپنے دیوانے پن میں کوئی ایسی روش نہ نکالیں

---

(۱) بانو قدسیہ، راجہ گدھ، ص ۲۵

کہ ان کے ہاتھوں تمام پرندے صفحۂ ہستی سے معدوم ہو جائیں۔ اس کانفرنس میں تمام پرندے اپنامافی الضمیر پیش کرتے ہیں اور اس میں سب سے بڑا ہدف تنقید انسان ہے۔

بحث مباحثہ کے دوران سوال اٹھتا ہے کہ انسان کی دیوانگی کی وجہ کیا ہے۔ نجد کی رہنے والی بلبل اس ضمن میں رائے دیتی ہے کہ انسان کی ساری قوت اس کی جنسی طاقت میں پوشیدہ ہے۔ طاقت کے اس گھوڑے پر اس کے زانو سختی سے کسے ہوں تو وہ عرفان تک پہنچتا ہے ڈھیلا ہو کر بیٹھا ہو تو دیوانہ وار گرتا ہے اور پاگل کہلاتا ہے... عشق لاحاصل کو دیوانگی کی وجہ قرار دیا جاتا ہے لیکن یہ سوال پیش آتا ہے کہ گدھ جاتی کی دیوانگی کا انسان سے کیا تعلق ہے؟ گدھ انسان کی دیوانگی کا سراغ لگانے کی مہلت طلب کرتا ہے اور وہ اپنی گدھ جاتی سے مشورے کا بھی طالب ہے۔ کانفرنس ملتوی کر دی جاتی ہے اور یہیں ناول کا اگلا عنوان عشق لاحاصل کے نام سے آتا ہے۔

اس میں اہم نقطہ گدھ اور انسان کی حرام خوری اور مردم خوری ہے جو دیوانگی کو جنم دیتی ہے۔ جس سے تمام پرندے خوفزدہ ہو کر گدھ کو جنگل سے نکال دینا چاہتے ہیں۔

ناول کا دوسرا حصہ ''دن ڈھلے'' ہے جس کا ذیلی عنوان لامتناہی تجسس ہے۔ اس حصے میں بھی معنویت کی گرہیں کھولنے کی کاوش اور انسان اور حیوان کا تہذیبی تجزیہ منطق الطیر کی روشنی میں کیا گیا ہے۔ راجہ گدھ انسان کی دیوانگی کی حقیقت سال ہا سال تک معلوم نہیں کر پاتا۔ اب پرندوں کی اگلی کانفرنس شیخوپورہ کے علاقے میں منعقد کی گئی ہے جو چندرا کہلاتا ہے اور قیوم کی جنم بھومی ہے۔ راجہ گدھ کو کانفرنس میں حاضر ہو کر رپورٹ پیش کرنے کا کہا جاتا ہے۔ راجہ گدھ اپنی برادری سے مشورے میں مشغول ہے۔ گدھ برادری کے جوشیلے نوجوان جنگل چھوڑنے پر آمادہ نہیں۔ راجہ گدھ گیدڑ سے بھی مشورہ کرتا ہے۔ گیدڑ بھی گدھ کا پروٹوٹائپ ہے جو شیر کا چھوڑا ہوا شکار کھاتا ہے۔ وہ راجہ گدھ کی رہنمائی کرتا ہے اور نیا نکتہ اٹھاتا ہے کہ دیوانگی کا عشق لاحاصل سے کوئی تعلق نہیں بلکہ دیوانگی تلاش سے پیدا ہوتی ہے۔ نئے سوالوں کے غیر تسلی بخش جوابات اور تھکا دینے والی جستجو دیوانگی کا باعث بنتے ہیں اور ساتھ ہی سوال اٹھتا ہے کہ راجہ گدھ کیا تو اور تیری نسل بھی انسان کی طرح تلاش کے سفر میں ہے۔ منطق الطیر کا یہ حصہ یہاں اصل ناول کے ساتھ متعلق نظر آتا ہے اور اس حصے میں دانش مشترک آشکار ہوتی ہے۔

سیمی جو نودولتیے معاشرے کو مسترد کرتے ہوئے آفتاب کی ذات میں پناہ کی متلاشی تھی اب مکمل طور پر اکھڑ جاتی ہے لیکن آفتاب کی شادی کے بعد اس کی محبت کو دل سے نکالنے کی بجائے اس کی پرورش کرتی رہتی ہے۔ قیوم اس کا دوسرا عاشق ہے جس نے دو سال تک اس کی محبت دل کے نہاں خانوں میں چھپا کر رکھی تھی۔ اس کا عشق شاعروں اور مجذوبوں سا تھا۔ آفتاب کی شادی کے بعد وہ حرفِ محبت زبان پر لایا لیکن سیمی آفتاب کی محبت میں، اس کے پیکر میں گم تھی۔ اور اس کی محبت کو یہ کہہ کر نظر انداز کر دیتی ہے کہ تمہاری محبت کو کیا کروں؟ اس کا نکاح ہو گیا ہے اصل والا۔ یہ کہتے کہتے وہ قیوم کے کندھے لگ کر کراہنے لگی۔ لیکن اسے احساس نہیں ہوتا کہ قیوم دوسروں کے لباس پر لگی خوشبو کو اپنے جسم میں اتارنے اور مردار کے گوشت پر جشن منانے والا گدھ تھا۔ سیمی کو یہ احساس

بھی نہ ہوا کہ اپنے غم منانے میں وہ قیوم کی داشتہ بن چکی تھی۔ لیکن اس کے حواسوں پر آفتاب چھایا ہوا تھا اور اسی کی یادوں کے ہجوم میں اس نے اپنی زندگی اس پر نثار کر دی۔ پوسٹ مارٹم سے یہ پتہ چلا کہ اس کی موت طبعی نہیں تھی بلکہ مریضہ نے زیادہ تعداد میں سلیپنگ پلز کھالی تھیں۔

سیمی کی موت نے قیوم کے اعصاب کو معطل کر دیا۔ وہ چرس پیتا ہے اور دائرہ در دائرہ سوالات میں الجھتا ہے۔ میں کون ہوں؟ کہاں سے آیا ہوں؟ مجھے یہاں سے کہاں جانا ہے اور اگر نائٹروجن کی بھاری مقدار بن کر مٹی میں مل جانا ہے تو یہ سارا بکھیڑا کس لیے ہے؟ کائنات کیا ہے اور کائنات سے پرے کون چھپ کر بیٹھا ہے؟ تصورات کی اس یلغار میں پروفیسر سہیل اسے تنتر ایوگا آزمانے کا مشورہ دیتا ہے۔ تنترا کا سنجوگ بظاہر جسمانی ہے لیکن اس کا اصلی جوہر اپنی ذات پر کنٹرول سکھاتا ہے۔ انسان اس آسن سے شکتی حاصل کر کے اپنی کنڈالنی پر، جو تمام تخلیقی قوتوں کی جان ہے، اختیار حاصل کر لیتا ہے۔

سیمی کی موت کے بعد قیوم کی زندگی میں عابدہ داخل ہوتی ہے جو اگرچہ شادی شدہ ہے لیکن اس کے شوہر سے اس کی اولاد نہیں ہے جبکہ وہ اولاد کی خواہش مند ہے۔ قیوم اس کی اسی خواہش کا فائدہ اٹھاتا ہے۔ اولاد کی خواہش میں تنتر عمل سے گزرنے والی عابدہ راجہ گدھ (قیوم) کی حرکتوں کو سمجھ جاتی ہے اور وہ کالج کی تعلیم کو اس کے خرابی ذہن کا باعث سمجھ کر اسے کسی دماغی ڈاکٹر سے ملنے کا مشورہ دیتی ہے۔ قیوم اس پر ناراض ہو جاتا ہے لیکن اگلے روز اسے احساس ہوتا ہے کہ کرگسوں کو منانے کوئی نہیں آئے گا وہ نیچے جاتا ہے لیکن تب تک عابدہ اپنے وحید کے ساتھ پیچھے وطنی جا چکی ہے۔ قیوم کی زندگی میں ایک اور خلا اور ناکامی کا احساس پیدا ہو جاتا ہے۔ یہاں پروفیسر سہیل اس کی زندگی میں امید کی نئی کرن جگاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لئے کچھ مشکل نہیں کہ خاص رزق دے کر عام انسانوں میں پیغمبر بنا سکے، ولی ڈھال سکے، عرفان عنایت کر دے لیکن اپنی ذات میں گدھ قیوم کا مردار خوری کا سفر ابھی جاری ہے۔

ناول کے تیسرے حصے کا عنوان دن چڑھے اور ذیلی عنوان رزق حرام ہے اس حصے میں پروفیسر اپنی حلال و حرام کی تھیوری پیش کرتا ہے۔ مصنفہ یہاں مذہبی تعلیم کی بنیاد پر حرام حلال کا فلسفہ پروفیسر سہیل کے ذریعے پیش کرتی ہے:

> ”مغرب کے پاس حرام حلال کا تصور نہیں ہے اور میری تھیوری ہے کہ جس وقت رزق حرام جسم میں داخل ہوتا ہے وہ انسانی Genes کو متاثر کرتا ہے رزق حرام سے ایک خاص قسم کی Mutation ہوتی ہے جو خطرناک ادویات، شراب اور radiation سے بھی زیادہ مہلک ہے۔ رزق حرام سے جو جینز تغیر پذیر ہوتے ہیں وہ لولے لنگڑے اور اندھے ہی نہیں ہوتے بلکہ ناامید بھی ہوتے ہیں۔ نسل انسانی سے یہ جینز جب نسل در نسل ہم میں سفر کرتے ہیں تو ان جینز کے اندر ایسی ذہنی پراگندگی ہوتی ہے جس کو ہم پاگل پن کہتے ہیں۔ یقین کرلو رزق حرام

سے ہی ہماری آنے والی نسلوں کو پاگل پن وراثت میں ملتا ہے اور جن قوموں میں من حیث القوم حرام کھانے کا لپکا پڑ جاتا ہے وہ من حیث القوم دیوانی ہو جاتی ہیں۔" [۱]

عابدہ کے چلے جانے کے بعد پروفیسر سہیل اسے اپنا کوئی مقصد متعین کرنے کا مشورہ دیتا ہے اور وہ ریڈیو میں نوکری کر کے ایک نئی دنیا میں داخل ہو جاتا ہے وہاں اس کی ملاقات امتل العزیز سے ہوتی ہے جو پیشہ ور طوائف ہے۔ امتل نے اپنے وقت میں ہیرا منڈی سے نکلنے کی کوشش میں شادی کی۔ اس کے ہاں بیٹا بھی پیدا ہوا لیکن اس کا یہ رشتہ زیادہ دن برقرار نہ رہ سکا۔ قیوم کی طرح امتل بھی ایک گدھ تھی۔ اپنی گدھ برادری کے فرد کو قریب پا کر قیوم نے اس سے شادی کی درخواست کی لیکن وہ عجیب انداز میں اسے مسترد کر دیتی ہے اور اسے کسی باکرہ شریف زادی سے شادی کا مشورہ دیتی ہے۔ کچھ روز بعد ایک دن اخبار میں وہ امتل کے قتل کی خبر پڑھتا ہے جو اس کے اپنے بیٹے نے کیا تھا۔

ناول کے چوتھے باب کا عنوان رات کے پچھلے پہر اور ذیلی عنوان موت کی آگاہی ہے۔ اس باب میں بھی دانش کا سرچشمہ پرندے ہیں یہاں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ پرندوں نے اپنے رب سے وعدہ کیا تھا کہ وہ صرف رزق حلال کھائیں گے لیکن گدھ جاتی بدعہدی کی مرتکب ہو کر رزق حرام کھانے لگی اور اب اس میں دیوانگی کے آثار ہویدا ہیں لہٰذا پرندے اسے جنگل بدر کرنا چاہتے ہیں۔ یہاں گدھوں کا وکیل گیدڑ پھر سوال اٹھاتا ہے کہ آیا رزق حرام گدھ جاتی کی سرشت کا حصہ ہے؟ اگر سرشت میں ہی حرام کھانا لکھا ہے تو اس کا حرام کھانا گناہ نہیں عین ثواب ہے۔

یہاں گدھ انسان کی حکایت بیان کرتا ہے اور یہ بھی کہ اس نے مردار کھانا کیسے اور کب شروع کیا۔ اب راجہ گدھ خود اپنی برادری کو ہجرت کا حکم دیتا ہے اور پرندے پرے باندھ کے نکل جاتے ہیں لیکن وہ یہ بات واضح کرتا ہے کہ دیوانگی دو طرح کی ہوتی ہے ایک وہ جو حواس کو مختل کرنے والی اور انسان کو کائنات کی ارذل ترین مخلوق بنا دینے والی ہوتی ہے اور ایک دیوانگی وہ جو انسان ارفع اور بلند منازل کی طرف کھینچتی ہے۔ حتیٰ کہ وہ عرفان کی منازل طے کر لیتا ہے۔

قیوم نے امتل کے مشورے کے مطابق ایک باکرہ لڑکی سے شادی کی اور اس کی بھابھی کے بقول ستاروں نے بھی اس کی صورت نہیں دیکھی لیکن شادی کی پہلی رات ہی وہ قیوم پر انکشاف کرتی ہے کہ وہ حاملہ ہے لہٰذا قیوم روشن کو افتخار کی امانت قرار دیتا ہے اور جدہ سے بلوا کر اس کے حوالے کر دیتا ہے۔ سہیل جو اب امریکا سے واپس آ چکا ہے وہ قیوم کی ملاقات ایک سائیں جی سے کرواتا ہے جو روحوں سے ملاقات کرانے کا عمل جانتا ہے لیکن یہ عمل بھی اس کی تشفی نہیں کر سکتا۔ اب قیوم پر اپنی ایک پرانی کلاس فیلو کے ذریعے انکشاف ہوا کہ آفتاب کو سیمی سے بدظن کرنے والا پروفیسر سہیل تھا جو خود بھی سیمی سے محبت کرتا تھا۔

---

(۱) بانو قدسیہ، راجہ گدھ، ص ۲۷۶

دوسری طرف آفتاب بھی مکافات عمل سے گزر رہا ہے اس کا بیٹا افراہیم ذہنی طور پر نارمل نہیں بلکہ مافوق الفطرت بچہ ہے لیکن افراہیم کی دیوانگی منفی نہیں مثبت ہے۔ وہ دیوانگی کے دورے کے دوران روضہ رسول کی زیارت کرتا ہے اور اس کے مناظر اپنے باپ کو بھی بتاتا ہے۔ ناول کے اختتام پر افراہیم اپنے خوابوں کی آخری سیڑھی پر سربسجود تھا۔ قیوم پاگل پن کی پہلی اور اسفل سیڑھی پر مجوب کھڑا تھا۔ یہاں پھر قیوم کو ایک سوال کا سامنا تھا۔ انسان کو ایک نارمل سے سوپر نارمل تک پہنچنے کے لیے بھی کس کس منزل سے گزرنا تھا۔ راجہ گدھ ایک منفرد ناول ہے اور بانو قدسیہ کے فنی ارتقا میں غالباً سب سے زیادہ اہمیت کا حامل بھی ہے۔ اس ناول میں فلسفیانہ سوالات کے ساتھ سائنسی انکشافات سے استفادے کا رجحان بھی نظر آتا ہے۔ راجہ گدھ مجموعی طور پر ایک ایسے معاشرے کا ناول ہے جس میں قدروں کا نظام متزلزل ہو چکا ہے۔ واقعاتی سطح پر ناول کا تعلق اس دور سے ہے جب آزادی کے بعد دولت کی لوٹ کھسوٹ اور دوسروں کی چھوڑی ہوئی جائیداد کی الاٹمنٹ اور ناجائز قبضے نے انسان کو حریص، خواہشات کا غلام اور اخلاقی زوال کا شکار بنالیا تھا۔ اسی کی دہائی میں سامنے آنے والا یہ ناول عالم گیریت کی اقدار کے زیر سایہ پروان چڑھنے والے معاشرے کی عکاسی کرتا ہے۔ اس سلسلے میں مصنفہ نے اس وقت سیمی کو جس گلبرگی معاشرے کی پیداوار کہا تھا وہ طبقہ عالمگیر معاشرے کا حصہ ہے۔ اس عالمگیر معاشرے کے افراد کے مشترک اقدار میں مشترک لباس جینز ہے ایک مشترک خوراک برگر اور کوک ہے۔ عالم گیریت کے یہ ثقافتی مظاہر اس خاص کلاس کی روزمرہ زندگی کا حصہ ہیں۔

اس کی ساری عمر کونونٹ سکولوں اور کالجوں میں گزری تھی۔ اپنے خالی اوقات میں وہ انگریزی موسیقی سنتی، ٹائم اور نیوز ویک پڑھتی ٹی وی پہ انگریزی سیریز دیکھتی... وہ شیمپو ہیئر سپرے ٹشو پیپر کولون اور سینٹ کے بل بوتے پر سنگار کرتی۔ اس نے کبھی لوٹے اور بالٹی سے غسل نہ کیا تھا۔ بیک برش اور شاور سے نہانے والی......[۱] لیکن یہ عالم گیریت کی کامیابی اور برتری کا بین ثبوت ہے کہ اسی کی دہائی میں بانو قدسیہ جن لوازمات کو گلبرگی معاشرے یعنی ایلیٹ کلاس سے مخصوص قرار دے رہی ہیں وہ آج تقریباً پورے معاشرے کے لیے قابل رسائی بن چکے ہیں اور روزمرہ زندگی کا حصہ بھی۔

پروفیسر تنویر کے کردار کے حوالے سے بھی ناول میں درج ہے:

"پروفیسر تنویر ہمیشہ فارن سگریٹ پیتے۔ ان کے تھری پیس سوٹ بے داغ ہوتے..."[۲]

معاشرے میں کھانے پینے کے آداب میں آنے والی تبدیلیوں کے ضمن میں لکھا ہے:

"پچھلی صدی میں بھوک کی نمائش جنسی آمادگی کے مترادف تھی میلے ٹھیلوں پر یاروں سے لڈو جلیبیاں لے کر کھانے والی بنتو مردوں میں تو مقبول تھی لیکن اپنی ہم جنسوں میں وہ بڑی

(۱) بانو قدسیہ، راجہ گدھ، ص ۱۵

(۲) ایضاً، ص ۱۸

> بدنام تھی...... لیکن اس دور کی ماڈرن لڑکی نے کھانے کے آداب ہوٹلوں سے سیکھے ہیں۔ ڈائننگ ٹیبل سے اخذ کیے ہیں۔ اب بیف برگر چبانے والی، دوہرے سٹر وسے کوک پینے والی، زبان کے چٹخارے سے کون چاٹنے والی لڑکی ندیدی نہیں دلآویز ہے۔ اتنے سارے ٹیلی ویژن کے اشتہاروں میں ماڈلز کو چائے پیتے، چیونگ گم چباتے، بسکٹ کھاتے دیکھنے کے بعد کھاتی پیتی لڑکی مرد کا آئیڈیل بن گئی ہے۔"(۱)

اس اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ آداب اکل و شرب میں یہ تبدیلی صرف ظاہری سطح پر نہیں اس کے پیچھے مشرقی تہذیب سے وابستہ خاص سوچ اور انداز فکر میں بھی تبدیلی ہے۔ پہلے کھلے عام کھانے پینے والی عورت شریف اور باحیا نہیں سمجھی جاتی تھی لیکن اب سر عام کھاتی پیتی عورت بے حیا نہیں بلکہ جدید دور کی ماڈرن عورت ہے اور معاشرے نے اپنا مائنڈ سیٹ، اپنا ذہن اور سوچ تبدیل کرلی ہے اور ایسا اس لیے ممکن ہوا کہ میڈیا کے ذریعے اشتہارات میں جدید ماڈرن لڑکی کو بسکٹ چباتے، کوک پیتے دکھایا گیا ہے اور یہی میڈیا عالمگیریت کے مقاصد کے پیش نظر عوام کی ذہن سازی کرتا ہے اور ملٹی نیشنل کمپنیوں کی مصنوعات کو بہت دلفریب انداز میں پیش کر کے اسے عوام میں متعارف کرواتا ہے، مقبول بناتا ہے اور رفتہ رفتہ عادت بنا دیتا ہے۔ اب دیسی مشروبات سکنجبین، لسی، ستو، شربت، گنے کارس جیسے مشروبات کی جگہ سیون اپ، فانٹا، کوک نے لے لی ہے۔ یہی تبدیلی لباس میں بھی آئی ہے۔ اب برمودا شرٹس، جینز اور اسی نوع کے دیگر ملبوسات نے مقامی پہناووں کی جگہ لے لی ہے۔ ان تبدیلیوں نے رفتہ رفتہ زندگی کے انداز کو مکمل طور پر بدل دیا ہے۔ سیمی کے والدین کی زندگی صرف ایک گھرانے کی زندگی کا نمونہ نہیں بلکہ اس ملک کے بالائی طبقے کے ہر گھر کی زندگی ہے۔

"غور کرو...... سوچو ذرا...... تجزیہ کرو ساری سچویشن کا...... پاکستان کا جو امیر طبقہ ہے...... اس طبقے نے افسر شاہی کی وہ روایتیں اپنائیں جو انگریز کی تھیں۔" (۲)

> "میرا باپ پاکستان بنانے والی پود کی طرح بوڑھا ہو رہا ہے اس نے اپنی بوڑھی مردمیت کے سامنے دولت، کار، بنگلے، بینک بیلنس کی سکرین لگا کر اپنے آپ کو Potent کر لیا ہے...... اس کا وقت لومڑیوں کے لیے ہے...... بیٹی بڑا بوجھ لگتی ہے اسے...... وہ (ممی) شراب نہیں پیتیں لیکن کاک ٹیل پارٹیوں میں شریک ہوتی ہیں وہ میرے باپ کے مشاغل سمجھتی ہے لیکن اعتراض اس لیے نہیں کر سکتی کہ وہ ڈیڈی کو مجازی خدا سمجھتی ہے وہ بیوٹی پارلر سے حسن کاری کرواتی ہے......" (۳)

---

(۱) بانو قدسیہ، راجہ گدھ، ص ۳۷

(۲) ایضاً، ص ۵۱

(۳) ایضاً، ص ۵۲

سوچ و فکر میں یہ تبدیلی میڈیا کی وجہ سے برق رفتار ہے۔ معاشرتی تبدیلی کے ساتھ ساتھ اخلاقی اقدار کی تبدیلی بھی نمایاں ہے۔ مخلوط تعلیمی ادارے، مخلوط محافل، مرد وزن کا آزادانہ اختلاط، مسلم مشرقی معاشرے کا حصہ کبھی بھی نہیں تھے۔ انگریزی تعلیمی اداروں کی وجہ سے کلچر میں تبدیلی آئی جس نے یہاں رائج ان بندشوں اور قیود کو توڑ کر رکھ دیا جو مسلم شرفا کے گھرانوں میں مروج تھیں۔ اسی طرح لسانی سطح پر عالمگیریت کے اثرات اس ناول میں نظر آ رہے ہیں۔ ناول نگار نے ناول کے فنی تقاضوں کے عین مطابق کرداروں کی زبان و بیان میں ان کی تعلیم و تربیت طبقے اور ماحول کو ملحوظ خاطر رکھا ہے۔ یہاں اہم کردار چونکہ یونیورسٹی کے طالبعلم اور ان کے استاد ہیں اور یہ طالب علم سماج کے مختلف طبقات سے تعلق رکھنے کے باوجود ایک ہی تعلیمی درجے کے طالبعلم ہیں۔ اس لیے ان گفتگو میں انگریزی محاورات روانی سے چلے آتے ہیں لیکن یہ عبارت میں کسی قسم کی رکاوٹ یا الجھاؤ کا باعث نہیں بنتے لیکن سماجی مطالعے کے حوالے سے رہنمائی ضرور کرتے ہیں کہ سماج کے اس پڑھے لکھے نوجوان طبقے کی زبان کون سی ہے۔ یا وہ کس زبان کو ترجیح دیتے ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ جس سماجی اور معاشی طبقے سے ان طالبعلموں کا تعلق ہے ان کی اقدار و روایات کے حوالے سے یہ ان کے نمائندے بھی ہیں۔ سیمی اور پروفیسر سہیل کی گفتگو میں انگریزی الفاظ کا استعمال بکثرت نظر آتا ہے اور یہی عالمگیر قوتوں کی پسندیدہ زبان ہے جس کے ذریعے وہ پوری دنیا کو ایک ثقافتی اکائی میں بدلنے کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ اس حوالے سے چند مثالیں درج ذیل ہیں:

"ابھی تک میرا passion کتابیں ہیں۔" (۱)

"اس لیے I wanna you جب تک آپ کلاس میں رہیں ہمیشہ مجھے گرو سمجھیں۔" (۲)

"دراصل خودکشی ایک symptom ہے۔ کسی معاشرے میں اگر کوئی بیرومیٹر فٹ کیا جائے تو خودکشی اس کا آخری درجہ حرارت ہو گا۔" (۳)

"اور ناآسودہ آرزوئیں ان Taboos سے جنم لیتی ہیں جو ہر کلچر میں موجود رہتی ہیں۔" "سر انسان میں پیدائشی نقص ہوتا ہے biological repression سر۔" (۴)

یہ چند مثالیں بطور نمونہ پیش کی گئی ہیں اور اس طرح کی مثالیں ناول میں بافراط موجود ہیں۔ بغور دیکھا جائے تو ان انگریزی الفاظ کے اردو مترادفات موجود ہیں جو نہایت سہل ہیں لیکن مجموعی طور پر معاشرہ عالمگیریت کے سیل رواں میں جس طرح بہہ رہا ہے اس میں ٹھہر کر سوچنے کی فراغت شاید کسی کے پاس نہیں کہ انگریزی کے حوالے اپنی زبان کے متعلق احساس کمتری کا یہ رویہ کن

---

(۱) بانو قدسیہ، *راجہ گدھ*، ص ۱۰

(۲) ایضاً

(۳) ایضاً، ص ۱۲

(۴) ایضاً، ص ۱۴

مضمرات کا حامل ہے اور اس رویے کے پیدا کردہ نتائج کی انتہا کیا ہو گی۔ یہ ہمارے قومی وجود اور تشخص کے لیے کس قدر ضرر کا باعث ہے۔ دنیا ۸۰ کی دہائی سے بہت آگے نکل چکی ہے۔ موبائل فون پر پیغام رسانی کے لیے رومن اردو کا استعمال اور اس میں انگریزی الفاظ کی کثرت اردو زبان کے مستقبل کی خبر دے رہی ہے اور ایسی مثالیں تاریخ میں موجود ہیں جب صرف رسم الخط کی تبدیلی نے قوم کو اس کی اقدار وروایات اور ثقافتی ورثے سے کس طرح محروم کر دیا۔ پچھلی صدی میں ترکی اس کی بڑی مثال ہے۔

ناول میں پیش کردہ حلال و حرام کے نظریہ اور پاگل پن یا دیوانگی کے لیے ناول نگار کی پیش کردہ وجوہات کی سائنسی بنیادوں پر تصدیق یا عدم تصدیق سے ہٹ کر دیکھا جائے تو راجہ گدھ ایک فکری ناول ہے جس میں بانو قدسیہ نے فکر کی نئی راہیں کھولنے کی سعی کی ہے۔

”ہائے پتہ ہے قیوم مجھے پروفیسر سہیل نے بڑا disappoint کیا۔ وہ میرے ہزبنڈ کے ساتھ یونیورسٹی میں ہیں ناں آجکل۔ یاد ہے ہاں ہم سب ان کو کتنا idealize کیا کرتے تھے۔

میں تو اب بھی انہیں پوجتا ہوں۔

چھوڑو بڑے تکلیف دہ آدمی ہیں۔ اتنی بڑی بڑی باتیں کرتے ہیں اور اتنا چھوٹا behave کرتے ہیں۔

واقعی؟...... میں نے مجروح ہو کر پوچھا میرے ہزبنڈ کہتے ہیں ذرا نالج نہیں ہے سارا Mass Media بولتا ہے۔“ (۱)

انگریزی الفاظ کے استعمال کے حوالے سے ڈاکٹر سیّد جاوید اختر لکھتے ہیں:

”مندرجہ بالا ایک چھوٹے سے اقتباس میں نو دس الفاظ انگریزی کے ہیں جو محض اس لیے برے نہیں لگتے کہ یہ ان کرداروں کے منہ سے ادا ہوتے ہیں جو ہماری روزمرہ زندگی میں اسی رجحان سے گفتگو کرنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ ہمارے ملک کی بیشتر آبادی خاص طور پر نئی تعلیم یافتہ نسل دن بدن اسی رجحان کی رسیا ہوتی جا رہی ہے اور ادیب کی یہ مجبوری ہے کہ اسے اپنے کرداروں کے منہ میں انہی کی اچھی یا بری زبان رکھنا ہوتی ہے۔“ (۲)

راجہ گدھ میں پہلی بار سائنٹفک طریقہ سے انسانی جینز کی نمو و پرداخت کے اثرات، عشقِ لاحاصل، دیوانگی، اسباب خودکشی اور رزق حلال و حرام پر قلم اٹھایا گیا ہے اگرچہ راجہ گدھ کے نفسیاتی اور سماجی محرکات سے انکار ممکن نہیں لیکن ناول کی اصل بنت مذہبی حوالے سے ہے ۔اس حوالے سے یہ اردو ناول میں ایک نیا تجربہ ہے اور یقیناً قابل قدر بھی ہے۔

---

(۱) بانو قدسیہ، *راجہ گدھ*، ص ۲۷۱

(۲) جاوید اختر سیّد، ڈاکٹر، *اردو کی ناول نگار خواتین* (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۷ء) ص ۱۶۷

# خوشیوں کا باغ

انور سجاد کا ناول **خوشیوں کا باغ** ۱۹۸۱ میں منظر عام پر آیا۔ ناول کے تھیم کا سانچہ ناول نگار نے ہالینڈ کے مشہور مصور ہائر اینمس بوش(Hieronymus Bosch) کی علامتی پینٹنگ خوشیوں کا باغ کے تین پینل کے سہارے سے بنایا ہے۔ یہ پینٹنگ تین حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا پینل حوا کی تخلیق، دوسرا پینل خوشیوں کا باغ اور تیسرے پینل کا نام موسیقی کا جہنم ہے۔ ناول نگار نے ناول کے شروع میں اس پینٹنگ کے متعلق ایک مختصر مضمون بھی شامل کیا ہے۔ علامتی پیرائے میں بنائی گئی یہ تصویر اپنے عصری سیاق وسباق کی وضاحت کرتی ہے۔ یہ ناول بھی اپنے عصر کی پاکستانی شہری زندگی کے تضادات کو علامتی انداز میں پیش کرتا ہے۔ اس ناول کا کیبری کردار ''میں'' ہے اور متکلم کردار بھی یہی ''میں'' ہے۔ یہ چیف اکاؤنٹنٹ ہے اور تیسری دنیا کے ایک ایسے ملک کا نمائندہ ہے جہاں مذہب کے نام پر ریاستی تشدد، جبر اور بربریت کا بازار گرم ہے۔ میں ایک پسماندہ سماج سے تعلق رکھنے والا فرد ہے۔ جہاں سامراجی قوتیں اپنی فوجی و مذہبی قوت کی بنا پر سارے معاشرے کو لالچ یا خوف کے زیر اثر بدعنوان اور بے عمل بنائے ہوئے ہیں ''میں'' اس بے حس، بے عمل اور گھٹن زدہ معاشرے میں آسائش و آرام کی زندگی بسر کرتا ہے لیکن اس کی روح میں گھٹن اور اندرونی تنہائی اس قدر شدید ہے کہ وہ خوشحالی و آسودگی میں بھی مضطرب ہے۔ ہراساں ہے اور اکیلا اپنی آگہی کے عذاب کو جھیل رہا ہے۔ دراصل اس کی روح لالچ، حرص وہوس کے اس ماحول میں اضطراب کا شکار ہے، گھٹن محسوس کرتی ہے۔

۱۹۴۷ کے بعد پاکستان میں جو معاشرہ وجود میں آیا وہ کسی بلند آدرش کی بجائے مادیت پر قائم ہوا۔ جاگیرداری اور زمینداری سماج تو قیام پاکستان سے قبل یہاں موجود تھا اب اس کی جگہ سرمایہ دار طبقے نے لے لی۔ چنانچہ وضع داری کی جو روایات جاگیرداری سماج میں موجود تھیں عنقا ہو گئیں اور اب ان کی جگہ مادیت پرستی اور نمود ونمائش نے لے لی۔ نودولتیا طبقہ نمائش کا خوگر تھا اس صورتحال سے حساس اور باشعور انسان روحانی اضطراب اور گھٹن کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس ناول کا مرکزی کردار ''میں'' چیف اکاؤنٹینٹ بھی اس غیر جمہوری سماج میں رہتے ہوئے مسلسل کرب کا شکار ہے۔ مادی طور پر خوشحال ہونے کے باوجود، اپنے بیوی بچوں کے ساتھ آسودگی کی زندگی بسر کرنے کے باوجود تنہائی، اکیلاپن اور بے گانگی ذات کا شکار ہے۔ اپنی بیوی سے اچھے تعلقات کے باوجود ایک دوسری عورت سے ناجائز مراسم قائم کر کے سکون و اطمینان حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اپنے مالکوں کو اپنے اعلیٰ کارکردگی سے مطمئن رکھنے کی بھرپور کوشش کرتا ہے لیکن ان سب باتوں سے قطع نظر اس کی ذات کی تنہائی اور کرب کا عذاب بہت اذیت ناک ہے۔ وہ خائف اور ہراساں ہے اس کی زندگی معنویت سے عاری ہے۔

> ''ایک لمحہ، کیا صرف ایک لمحہ بھی میرے اختیار میں نہیں؟ میں ریس کا گھوڑا ہوں جس کی ٹہل سیوا، تھپکی تھپکار محض اس لیے کی جاتی ہے کہ ریس میں دوڑتا ہے اور کبھی کبھی ڈربی

بھی جیت لیتا ہے اور محبت؟ میں انسان نہیں؟ کیا میں ایک لمحہ بھی اپنے بس میں نہیں کر سکتا
کہ میں اپنی مرضی گزار سکوں؟ آزادی کا صرف ایک لمحہ؟" [۱]

اس کی تنہائی اور ذات کی بے گانگی کا اظہار بھی ملتا ہے۔ جب وہ ہجوم میں بھی خود کو تنہا محسوس کرتا ہے۔

"میں کون ہوں؟ اس تنہا ہجوم میں تنہا اس نمونے میں کہاں فٹ ہوتا ہوں میں تنہا..." [۲]

مذکورہ بالا اقتباس تیسری دنیا کے ایک فرد کے ذہن کی عکاسی کرتا ہے۔ ناول نگار نے جبر اور تشدد کے بل بوتے پر قائم حکومت اور اس کے استحصال اور جبر و تشدد کی حقیقت پسندانہ عکاسی کی ہے۔ دراصل ناول اس دور میں لکھا گیا جب ملک میں آمریت قائم تھی فوج نے مارشل لا کے ذریعے ملک کو مفلوج کر کے رکھ دیا تھا۔ ان حالات میں ناول نگار نے علامتی انداز اختیار کیا اور اس میں استعارات کے ذریعے مثلاً حسین جرأت و ہمت کا استعارہ ہے۔ تو حسین کے واقعے کو درج کر کے اپنے ملک پر مسلط آمریت کی جانب بھی اشارہ کر دیا ہے۔

"ہاں تو عزادارانِ حسین نتیجہ کیا نکلا؟ کیا امام حسین کو شہید کیا سنیوں نے؟ کیا نواسۂ رسول کو قتل کروایا کوفیوں نے؟ نہیں میرے عزیزو نہیں۔ امام حسین کو شہید کیا سنیوں نے نہ کوفیوں نے۔ یزید لعین نے کوفے میں لگایا مارشل لا اور جنرل ابن زیاد کو بھیجا وہاں ایڈمنسٹریٹر بنا کے اس نے آتے ہی لگایا کرفیو چھ چھ مہینے کی تنخواہ ایڈوانس..." [۳]

پاکستان کے معرض وجود میں آنے سے لے کر اب تک ملک کے سیاسی اقتدار پر بیوروکریسی اور فوج کا قبضہ رہا۔ اور ان کے ساتھ زمیندار قبائلی سردار بھی ملک کے اہم سیاسی معاملات میں دخیل رہے۔ ان کے ساتھ ساتھ پھر نیا سرمایہ دار طبقہ ابھرا۔ ان حالات میں عالمی سرمایہ داروں نے زیادہ نفع پانے کے لیے پاکستان کو مناسب جگہ پایا۔ پاکستانی حکمرانوں نے اپنے مفادات کے تحت ان سرمایہ داروں کو کھلی چھوٹ دی۔ پاکستان خود کفالت کی بجائے معاشی طور پر امریکا، آئی ایم ایف، ورلڈ بینک جیسی اداروں پر انحصار کرنے لگا۔ لہٰذا ان عالم گیریت کی حامی قوتوں نے پاکستان کی معیشت پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ اس حوالے سے ناول نگار لکھتا ہے:

"مغرب کے ماہر فوجی چالباز اس سراغ رسانی کے خفیہ ادارے اور ان کے فلسفی کیا ہر مقصد کے لیے ساری دنیا کو اکائی کی صورت میں نہیں دیکھتے؟ ہر مقصد کے لیے، ماسوا دولت کی از سر نو تقسیم کے؟ کہ ان کی بھوک نہ مٹنے والی، ان کی گرسنگی نہ بدلنے والی سدا قائم رہتی ہے؟ ان کا طریقہ

---

(۱) انور سجاد، *خوشیوں کا باغ*، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء) ص ۱۰۴

(۲) ایضاً، ص ۲۲

(۳) ایضاً، ص ۷۰

واردات بدلتا نہیں رہتا؟ کبھی پیار، کبھی غصہ، کبھی دھونس کبھی دوستی، کبھی جنگ؟ اس ہاتھ سے اگر آپ کو دیتے ہیں تو دوسرے ہاتھ سے اصل سود در سود وصول کر لیتے ہیں؟ اور آپ کو اپنے وسائل پر قدرت حاصل کرنے والی ٹیکنالوجی کی طرف دیکھنے بھی نہیں دیتے کہ اگر جدید ٹیکنالوجی سے آپ نے اپنا حصہ وصول کر لیا تو آپ ان کے دست نگر نہیں رہیں گے۔" (۱)

مندرجہ بالا اقتباس میں مصنف نے عالمگیریت کی روح رواں بڑی بڑی تجارتی کمپنیوں اور ان کی آلہ کار بڑی طاقتوں کے حوالے سے بالکل درست تجزیہ کیا ہے۔ ۸۰ کی دہائی میں جب عالمگیریت کی یہ تحریک اپنی اس نئی اور تبدیل شدہ صورت میں اتنی واضح نہیں ہوئی تھی اس وقت بھی تیسری دنیا کے فرد کو یہ احساس ہے کہ عالم گیریت دنیا کو ایک اکائی کے طور پر دیکھتی ہے اگر کوئی تفریق پیدا کرتی ہے تو وہ Have اور Have not کی ہے اور اس کے علاوہ وہ عالمگیریت کے طریقہ کار کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ ان کا طریقہ کار بدلتا رہتا ہے اور وہ اپنے مقصد کے حصول کے لیے ہر حربہ اور ہر طریقہ جائز سمجھتے ہیں اور ان کا مقصد زیادہ سے زیادہ دولت کمانا اور اکٹھی کرنا ہے اور جس قوت کے زور پر یہ عالمگیر قوتیں تیسری دنیا کا استحصال کر رہی ہیں وہ جدید ٹیکنالوجی کی قوت ہے۔ اب جنگوں کا زمانہ نہیں بلکہ اب ٹیکنالوجی کے بل بوتے پر اپنا مقصد حاصل کرتے ہیں۔ لہٰذا وہ تیسری دنیا کی رسائی کبھی جدید ٹیکنالوجی تک نہ ہونے دیتے اور اسی مقصد کے لیے وہ تیسری دنیا کے ممالک کو سیاسی عدم استحکام سے دوچار رکھتے ہیں اور بوقت ضرورت فوجی آمروں کو اقتدار میں لاکر عوام کے حقوق سلب کر لیے جاتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ ان ممالک میں دیگر اخلاقی برائیاں رشوت، سفارش، جبر، دھونس دھاندلی اور ناانصافی فروغ پاتی ہیں۔ ناول میں ملک کے سیاسی نظام اور رشوت پر بھی طنز کیا گیا ہے ناول کا متکلم کردار ''میں'' بھی چونکہ اسی سرمایہ دارانہ مشینری کا ایک پرزہ ہے اس لیے وہ خود بھی کہتا ہے:

"میرے پاس کوئی جواب نہیں کہ مجھے پتہ ہے کہ جنگ اندر سے باہر سے کیوں مسلط کر دی جاتی ہے؟ آزادی اور وقار کو کیوں خطرے میں ڈالا جاتا ہے؟ میری فرم اس جنگ سے بہت خوش ہے۔ ان کے کنبے بیرون ملک جا چکے ہیں اور محفوظ ہیں۔ میں بھی خوش ہوں اور زیادہ وقت دفتر میں گزارتا ہوں۔ جنگ میں ملکوں کی معیشت تباہ ہو جاتی ہے لیکن میری فرم کی کمائی کو جنگ نے مہمیز کر دیا ہے بھاری بھاری فوجی نوعیت کے ٹھیکے، فرم کا مستقبل شاندار ہے اور اس کے ساتھ میرا بھی... بعض اوقات جھنجھلا کر بیوی کو ڈانٹ دیتا ہوں کہ اتنی سی بات

(۱) انور سجاد، خوشیوں کا باغ، ص ۱۰۸

نہیں سمجھتی کہ انڈسٹریل ملٹی کامپلیکس والے ملک جو مناسب سمجھتے ہیں جہاں مناسب سمجھتے ہیں کرکرا دیتے ہیں۔" (۱)

عالمگیریت کے پس پردہ ملٹی نیشنل کمپنیاں منافع کے حصول کے لیے کسی بھی حد تک چلی جاتی ہیں۔ ایسی ہی ایک فرم اور اس کے عہدے داروں کے حوالے سے مندرجہ بالا اقتباس اس سرمایہ دارانہ ذہنیت کی عکاسی کرتا ہے جو ممالک کو لڑوا کر ہزاروں لاکھوں انسانوں کو خون نہلا کر اپنے ہتھیاروں کی فروخت کے ذریعے منافع کھرا کرتی ہیں۔ خواہ ملک تباہ ہو جائیں اقوام برباد ہو جائیں ان کی غرض صرف زیادہ سے زیادہ منافع کا حصول ہوتا ہے۔

جدید ٹیکنالوجی کی آمد سے پیشتر فوجی مہمات کے ذریعے ممالک کو فتح کرکے یہی مقصد حاصل کیا جاتا تھا۔ اسی حوالے سے ناول نگار لکھتا ہے:

"آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں کہ بڑی قومیں آنے بہانے ہم جیسی قوموں کو ویسے ہی اپنا غلام سمجھ لیتی ہیں غلام بننے سے یہ بہتر نہیں کہ ملک کو ٹھیکے پر دے دیا جائے اور میری نظر میں انگریز سے بہتر کوئی نہیں چچا سام کی دوستی کو آپ نے آزما لیا بہت بے اعتبار ہیں..... انگریز، ہائے انگریز کہ ہم نے ابھی تک ان کے طور طریقے نہیں چھوڑے۔ تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ آج بھی نظام اسی کا چل رہا ہے تو پھر تکلف کا ہے کا۔ ہمارا لباس انگریز، ہماری تعلیم انگریز، ہماری معاشیات انگریز، ہماری سیاست وہی جو انگریز چھوڑ گیا تھا۔" (۲)

ناول نگار نے یہاں ہماری ذہنی غلامی کو واضح کرتے ہوئے کہا کہ ہر کام میں ہم انگریزوں کے نقال ہیں اور آزادی کے بعد بھی جسے وہ طنزاً کہتا ہے کہ ہم بھول پن اسے آزادی سمجھ بیٹھے ہیں حالانکہ ہم ذہنی طور پر ابھی بھی غلام ہیں اور یہی ذہنی غلامی عالمگیریت کی منشا ہے تاکہ عالمگیریت کی منتخب کردہ زبان اس کا دیا ہوا لباس اور عالمگیریت کی تجویز کردہ خوراک دنیا کے یہ ذہنی غلام بلا چون چرا کیے اپنا لیں۔

اس ناول کے حوالے سے ڈاکٹر سورج دیو سنگھ لکھتے ہیں:

"''میں'' تیسری دنیا کا ایک باشعور انسان ہے اسے اس بات کا احساس ہے کہ وہ جس کمرشل (Commercial) سوسائٹی کا فرد ہے اور جہاں زندگی گزار رہا ہے وہاں سرمایہ داری اور اشیائے صرف (Consumerism) کی ناپاک قوتیں انسان کو سائنس اور ٹیکنالوجی کے

---

(۱) انور سجاد، خوشیوں کا باغ، ص ۵۶

(۲) ایضاً، ص ۱۱۷

تجربات کے لیے استعمال کر رہی ہیں... وہ یہ بھی جانتا ہے کہ بین الاقوامی ملٹری اور سرمایہ دار (Industrial) طاقتوں کے دلال اقتدار پر قابض ہیں اور بے بس مظلوم انسان کی زندگی کو داؤ پر لگا کر اپنی خوش حالی اور عیش و عشرت کے سامان کر رہے ہیں۔" [۱]

عالمگیریت قومی حکومتوں کے کردار کو کم کر کے اپنی تجارت و ثقافت کے فروغ میں حائل مشکلات کو دور کرنے کی خواہاں ہے اور اس مقصد کے لیے یہ عالمگیر قوتیں مختلف حربے اختیار کرتی ہیں۔ کہیں فوجی آمروں کے ذریعے جمہوریت کی بساط لپیٹ دی جاتی ہے اور کہیں حکمرانوں کو خرید کر یہ مقصد حاصل کیا جاتا ہے جہاں وہ ان قوتوں کی حسب منشا کام نہ کریں وہاں انھیں مروانے سے بھی گریز نہیں کیا جاتا۔ یہاں ڈاکٹر سورج بھی ایک ایسی صورتحال کی بات کر رہے ہیں کہ اقتدار پر ان سرمایہ داروں کے دلال جب قابض ہوتے ہیں تو اس کے نتائج عام آدمی کے لیے کس قدر اذیت ناک ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر ممتاز احمد اردو ناول کے بدلتے تناظر میں خوشیوں کے باغ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"خوشیوں کا باغ کا ہیرو چیف اکاؤنٹینٹ ہے جس کے ذریعے پڑھنے والا اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ یہاں نہ انصاف ہے نہ آزادی۔ کسی کو نہیں معلوم کہ اس کے ساتھ آئندہ لمحے کیا واقعہ پیش آجائے۔ جنگ کے سائے اس پر ہر وقت منڈلاتے رہتے ہیں اور مجموعی تناظر میں دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ پورے معاشرے کی تقدیر کی ڈور بڑی طاقتوں کے ہاتھ میں ہے جو چھوٹے چھوٹے ملکوں کو معاشرتی اور اقتصادی طور پر کچل دینے کے عزائم کے ساتھ کام کر رہی ہیں۔ یعنی یہ تیسری دنیا اپنے کرم خوردہ اور استحصالی نظام کو بدلنے پر قادر نہیں..." [۲]

موضوع کے ساتھ اس ناول میں ہیئت کے تجربات بھی ملتے ہیں۔ ناول نگار نے اپنی تکنیک کے اعتبار سے کہانی کو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خان کے مطابق ناول نگار نے اس میں مونتاژ کی تکنیک استعمال کی ہے۔ ناول میں چیف اکاؤنٹینٹ کی ذاتی زندگی کی کہانی کے ٹکڑے علیحدہ اور معاشرے میں پائی جانے والی خرابیوں... جبر و استحصال، بے انصافی، فسق و فجور، ظالمانہ قوانین، افراد کے درمیان احترام و محبت کے خاتمے، بُعد نسل، سیاسی و مذہبی تنگ نظری اور گھٹن کے حصے علیحدہ پائے جاتے ہیں لیکن جابجا مختلف افکار و خیالات کو گڈمڈ بھی کر دیا گیا ہے ایک بات کا تاثر جمنے نہیں پاتا کہ دوسری بات اس پر سپر امپوز (superimpose) ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ ناول اپنے تجربات کی وجہ سے عام قاری کی ذہنی سطح سے بلند ہے اور اس لیے اس کی تفہیم آسان نہیں ہے۔

---

(۱) سورج دیو سنگھ، ڈاکٹر، *اردو اور ہندی کے سیاسی ناول*، (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۶ء) ص ۱۹۹۔۲۰۰

(۲) ممتاز احمد خان، ڈاکٹر، *اردو ناول کے بدلتے تناظر تنقید*، (لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۲۰۰۷ء) ص ۲۱۳

# آگے سمندر ہے

انتظار حسین بیسویں صدی کے اردو افسانہ نگاروں اور ناول نگاروں میں ایک اہم مقام کے حامل ہیں۔ چاند گہن (۱۹۵۳)، بستی (۱۹۸۰)، تذکرہ/ نیا گھر (۱۹۸۷) کے بعد ان کا اگلا ناول آگے سمندر ہے کے نام سے ۱۹۹۵ میں شائع ہوا۔ ہجرت کا موضوع اگرچہ نیا نہیں ہے کیونکہ پاکستان کو بنے تقریباً پون صدی ہو چکی ہے لیکن یہ بات بھی اپنی جگہ اہم ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس موضوع کی نئی نئی جہات سامنے آتی رہی ہیں۔ انتظار حسین کے تیسرے ناول آگے سمندر ہے میں مصنف نے بستی اور تذکرہ کے معاشرتی و تہذیبی مسائل کو نئی جہت عطا کی ہے۔ بہر حال اس ناول کا موضوع بھی ہجرت اور اس سے جڑے مسائل ہیں۔ شاہد نواز اس حوالے سے لکھتے ہیں:

انتظار حسین نے اپنے ناولوں میں کراچی کو موضوع بنایا ہے۔ ان کے ناولوں میں تقسیم کے بعد کراچی میں بسنے والے مہاجرین کی روداد ملتی ہے۔ انہیں یہ موضوع اس قدر پسند تھا کہ انہوں نے اپنے ناول آگے سمندر ہے کی بنیاد ہی اسی پر رکھی... انتظار حسین کا مذکورہ ناول دراصل کراچی کا نثری نوحہ ہے۔ اس ناول میں ۱۹۴۷ سے لے کر بیسویں صدی کی نویں دہائی تک کراچی کا ارتقا دکھایا گیا ہے... ناول کا موضوع کراچی کے روز بروز بگڑتے حالات ہیں..."(۱)

ناول میں شعور کی رو کی تکنیک استعمال کی گئی ہے۔ ہجرت کر کے آنے والوں کے احساسات، مسلمانوں کا عرب خطے سے تعلق اور وہاں سے ہجرت در ہجرت کر کے کراچی کو مسکن بنانے کے حوالے سے واقعات اور ان سے منسلک ناسٹلجیا کے احساسات ناول میں اول تا آخر قاری کے ذہن کو گرفت میں لیے رکھتے ہیں۔ ناول لوکیل کراچی ہے۔ جو کبھی امن کا گہوارہ تھا لیکن اب معاشرتی اقتصادی اور تہذیبی اتھل پتھل نے ایک ہولناک بحران کو جنم دیا ہے۔ دہشت گردی کی فضا ہے یہاں کئی قسم کے تفرقات موجود ہیں۔ اس لیے مجو بھائی اسے ست خصمی شہر کہتے ہیں۔ یہاں ہندوستان کے مختلف علاقوں سے آنے والے لوگ جو اب مہاجر کہلاتے ہیں آباد ہوئے ہیں۔ مختلف زبانیں اور مختلف لہجے بولتے ہیں۔ اسی حوالے سے مجو بھائی کہتے ہیں کہ سارے ہندوستان سے ندیاں بہتی شور کرتی آئیں اور سمندر میں رل مل گئیں مگر رلیں ملیں کہاں، ہر ندی کہتی ہے میں سمندر ہوں، مجو بھائی جو ناول کا بظاہر مجہول اور غیر ذمہ دار سا کردار میں کراچی کے حالات کا بالکل درست تجزیہ کرتے ہیں۔

ناول کا مرکزی کردار جواد ہے جو ویاس پور سے ہجرت کر کے کراچی آتا ہے تو اس کے پاس سر چھپانے کو کوئی ٹھکانہ نہیں۔ پہلے پہل وہ اپنے کالج کے دوست مصباح کے ساتھ اس کی جھونپڑی میں رہتا ہے بعد ازاں مجو بھائی کے کہنے پر ان کے ساتھ ان کے گھر منتقل ہو جاتا ہے اور آخر وقت تک اسی میں رہتا ہے۔ جواد کے ساتھ ناول کا دوسرا اہم کردار مجید الحسینی المعرف مجو بھائی کا ہے۔ مجو بھائی

---

(۱) شاہد نواز، *پاکستانی اردو ناول میں عصری تاریخ* [۱۹۴۷تا ۲۰۰۷]، (سرگودھا: شعبہ اردو سرگودھا یونیورسٹی، ۲۰۱۸ء)، ص ۳۱۲

کے کردار کے توسط سے قارئین کو کراچی کے حالات سے نہ صرف آگاہی ملتی ہے بلکہ ان حالات کا تجزیہ بھی وہ اپنے مخصوص لاپرواہ اور غیر شخصی میں کرتے رہتے ہیں۔ کراچی میں ہجرت کرکے آنے والوں اور شہر کی معاشرت کے متعلق اسرار کی عقدہ کشائی بھی اسی کردار کے ذریعے مصنف کرتا ہے۔

پورے ناول میں مجو بھائی کو کوئی کام کرتا نہیں دکھایا گیا اور اس حوالے سے ناول کے مختلف کردار چہ میگوئیاں کرتے نظر آتے ہیں۔ بہر حال مجو بھائی کی زندگی بقول ناول نگار

"کبھی دھنا سیٹھ اور کبھی پھانک ہاں پھانک ہوناتو سمجھ میں آتا تھا مگر وہ دھنا سیٹھ کیسے بن جاتے تھے کسی پر یہ راز نہ کھلا۔"(۱)

مجو بھائی کا شہر کے بڑے بڑے گھرانوں میں آنا جانا تھا۔ افسران کے ساتھ تعلقات تھے ریڈیو پر ان کی پرچی چلتی تھی، دہلی، لکھنؤ، یوپی یا ہندوستان کے کسی علاقے سے کوئی خاندان کراچی آتا تو اس کا شجرہ نسب معلوم کرکے اس سے تعلق نکال لیتے تھے۔ مجو بھائی کے حوالے سے بعض حاسدین کا خیال تھا کہ وہ حکومتی اداروں کے لیے معلومات فراہم کرتے ہیں لیکن کافی ہاؤس بند ہوجانے سے یہ تاثر بھی ختم ہوگیا۔ اب وہ لوگوں کے گھروں تک جا پہنچے اور ان کی ذاتی زندگیوں میں اہم کردار ادا کرتے نظر آنے لگے۔ جواد کی نوکری کا بندوبست بھی مجو بھائی نے کیا۔ مرزا دلاور کے ہاں اس نوکری کے دوران جواد کی ملاقات عشرت سے ہوئی جہاں ایک بچے کی ولادت کے دوران عشرت دنیا سے رخصت ہوگئی۔ اس بچہ کے حوالے سے کوئی معلومات کوئی تذکرہ نہیں ملتا ماسوائے اس کے کہ وہ امریکا میں رہائش پذیر ہوچکا ہے۔ بیوی کی وفات کے بعد جواد وہ نوکری چھوڑ کر بینک میں ملازمت اختیار کرلیتا ہے اور یوں زندگی گزرتی چلی جاتی ہے جبکہ مجو کی زندگی خانگی جھمیلوں سے آزاد ہے۔ جواد اور مجو بھائی کے بعد خیرل کا کردار اہم ہے وہ ہندوستان میں قیام پذیر ہے۔ جواد ہندوستان جاتا ہے تو خیرل بھائی سے بھی ملاقات ہوتی ہے۔ خیرل بھائی کے بھائی بہن پاکستان میں اعلیٰ عہدوں پر خوش و خرم زندگی گزار رہے ہیں مگر خیرل بھائی بیوہ بہن کے ساتھ ہندوستان میں ہی رہے۔ اگرچہ پاکستان بننے سے قبل وہ سیاسی طور پر بڑے متحرک تھے مگر پاکستان بننے کے بعد وہ پاکستان جانے سے انکار کردیتے ہیں اور نہ جانے کی جو وجہ انہوں نے بیان کی وہ بہت خوبصورت ہے۔

"مگر اس وقت وہ کوئی ملک نہیں تھا ایک خواب تھا... خواب جب تک خواب ہے اس میں بہت سحر ہوتا ہے..."(۲)

(۱) انتظار حسین، آگے سمندر ہے، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء) ص ۲۲

(۲) ایضاً، ص ۱۵۳

اس کے علاوہ میمونہ کا کردار اہم ہے جو جواد کی پھوپھی زاد اور بچپن کی دوست ہے۔ جواد کے پاکستان چلے جانے کے بعد اس کا خاندان ہندوستان میں رہا اور اس تقسیم نے میمونہ کی زندگی کے المیے کو جنم دیا اور وہ تمام عمر غیر شادی شدہ زندگی بسر کرتی ہے اور ایک سکول میں بچوں کو پڑھاتی ہے۔

ناول کے آخری حصے میں ایک مذہبی کردار عطااللہ غازی کا ہے جو اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا متمنی ہے۔ جو یہ سمجھتا ہے کہ موجودہ دور میں سائنس اور فلسفے کی کتب کے ذریعے مسلمان نوجوانوں کو کفر والحاد کی راہ پر لگا دیا گیا ہے۔

ناول کے آخری حصے میں جواد جاڑوں کے موسم میں پیدل چلتا ہوا چائے خانوں کے پاس پہنچتا ہے وہاں قریب ہی عطااللہ غازی کا جلسہ ہو رہا ہے جواد چائے پینے بیٹھ جاتا ہے تو کچھ ٹیکسی سوار لوگ فائرنگ کرتے گزرتے ہیں۔ جواد کو بھی گولی لگ جاتی ہے جواد ابھی پوری طرح صحت یاب نہیں ہوتا کہ غازی صاحب کے جلسے میں بم پھٹنے سے مجو بھائی لاپتہ ہو چکے ہیں۔ غالباً وہ بھی دیگر لوگوں کے ساتھ انتقال کر چکے ہیں۔ یہی ناول کا اختتام ہے۔ لیکن پورے ناول کے دوران جگہ جگہ مصنف نے کراچی میں پھیلی افراتفری، بدامنی، دہشت گردی اور کرفیو اور قتل و غارت کی منظر کشی کی ہے اور اب آخر میں ناول کے دونوں مرکزی کردار جو کسی بھی قسم کی عصبیت نہیں رکھتے جو پر امن شہری ہیں وہ بھی اسی دہشت گردی کی لپیٹ میں آکر جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔

اس مرکزی کہانی کے ساتھ ساتھ مصنف تاریخ اندلس کے اہم کردار عبدالرحمن (اول) کا بھی تذکرہ کرتے ہیں جس نے اندلس میں اموی حکومت کی بنیاد رکھی۔ ناول کے آغاز ہی وہ اس طرح کے کرتے ہیں۔

> ”یہ اصل میں اس زمانے کا ذکر ہے جب عبدالرحمن (اول) کے بوئے ہوئے کھجور کے
> درخت پر سوا دو سو برس گزر چکے تھے اور اس کے آس پاس کتنے درخت اگ چکے تھے۔
> صحرائے عرب کی حور اندلس میں رچ بس چکی تھی...“[1]

عبدالرحمن اول کو الدخل بھی کہا جاتا ہے جس کا مطلب ہے مہاجر۔ عبدالرحمن نے عباسیوں سے بھاگ کر اپنی جان بچائی اور اندلس میں اموی حکومت قائم کی جو تقریباً تین سو سال قائم رہی۔

انتظار حسین ہند اسلامی تہذیب کو موضوع بناتے ہیں لیکن ان کی انفرادیت یہ ہے کہ ان کی فکر کے سرچشمے صرف اسلامی تاریخ سے نہیں پھوٹتے بلکہ بدھ مت اور ہندو تہذیب اور ہندو اساطیر سے بھی استفادے کا رجحان ان کے ہاں ملتا ہے۔ وہ مہابھارت بھگوت گیتا اور جاتک کہانیوں سے بھی دانش و بینش کے موتی چن کر اور کردار مستعار لے کر اپنے منفرد اسلوب کی نقش گری کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ اہل تشیع میں سے ہیں لہٰذا اس مسلک سے جڑی رسومات اور تقریبات کا تذکرہ ان کے ہاں بکثرت ملتا ہے اور ان کا سب سے بڑا موضوع ہجرت اور اس سے جڑی یاد ماضی ہے جو ان کے ہاں منفی نہیں بلکہ مثبت طور پر سامنے آتی ہے۔ زیر تبصرہ ناول میں

---

(۱) انتظار حسین، آگے سمندر ہے، ص ۵

بھی ہجرت کے بعد کراچی کی صورت حال اور اس کے نتیجے میں سامنے آنے والے مسائل کو پیش کیا گیا ہے۔ کراچی کی جس عصری صورتحال کو انتظار حسین نے اپنے ناول میں پیش کیا تاریخ میں اس کی جڑیں بہت پیچھے پیوست ہیں۔ نوآبادیاتی دور سے قبل ہندوستان مغلوں کے زیر اثر ایک سیاسی وحدت تھا۔ لیکن حکمران طبقے کے سیاسی مفادات کا تقاضا یہ تھا کہ تقسیم کرو اور حکومت کرو کی پالیسی کو فروغ دیا جائے۔ چنانچہ انگریزوں کی آمد سے قبل یہاں لسانی اختلاف، مذہبی اختلافات کی بجائے رواداری پر مبنی ایک کثیر السانی، کثیر المذہبی اور کثیر الثقافتی معاشرہ قائم رکھا تھا۔ لیکن انگریزوں نے یہاں نفاق کا بیج بویا۔ اردو ہندی تنازع انگریزوں کی اسی پالیسی کا شاخسانہ تھا۔ جس نے صدیوں سے آباد ہندوؤں مسلمانوں کے درمیان ہمسائیگی کے خوبصورت تعلقات کو قطع کر کے انہیں آمنے سامنے لا کھڑا کیا۔ اس کے علاوہ مذہبی تعصب کو ہوا دے کر پہلے دونوں قوموں کے مابین اختلافات کی خلیج کو گہرا کیا گیا پھر خود مسلمانوں کے اندر شیعہ سنی جیسے اختلافات کو پیدا کر کے انہیں ہوا دی گئی۔ ان اختلافات کا حتمی نتیجہ تقسیم ہندوستان کی صورت میں نکلا جس نے صدیوں کی جمی جمائی تہذیب کو بکھیر کر رکھ دیا۔ اردو تہذیبی مراکز لکھنو اور دلی اور اسی طرح دیگر ہندوستانی علاقوں سے آنے والے مہاجرین جہاں اپنے ساتھ اپنی زبان اور اپنی مخصوص تہذیب لے کر آئے وہیں علاقائی اور تہذیبی تفاخر بھی تھا جس نے انہیں مل جل کر رہنے بسنے کی بجائے ایک دوسرے سے فاصلے پر بلکہ متحارب لا کھڑا کیا اور اس نے کراچی کے امن وسکون کو غارت کر کے عام آدمی کی زندگی کو خطرات سے دوچار کر دیا۔ یہ عالم گیریت کے بالواسطہ اثرات کا نتیجہ قرار دیا جاسکتا ہے جس نے کراچی جیسے عروس البلاد کو دہشت گردی، کرفیو اور لسانی تفرقات کا شکار کر دیا۔

اس کے علاوہ موجودہ دور میں بڑی اقوام اور ترقی یافتہ ممالک بھی اپنے مخصوص معاشی مفادات کے حصول وتحفظ کے لیے اس قسم کی سرگرمیوں کا سہارا لیتی ہیں۔ حال ہی میں بلوچستان میں ہونے والی دہشت گردی کے ڈانڈے ہندوستان سے جاملے ہیں کلبھوشن یادیو کے ذریعے اس نیٹ ورک کا پتہ چلا ہے جسے بھارتی خفیہ ایجنسی را پاکستان کو معاشی عدم استحکام کا شکار کرنے کے لیے -پاکستان میں دہشت گردی کی کاروائیوں میں استعمال کر رہی تھی۔ مقصد پاکستان کے غیر محفوظ ہونے کا تاثر دے کر بین الاقوامی سرمایہ کاری کی راہ روکنا ہے۔ کراچی میں بھی ایک مخصوص جماعت کو ہندوستان سے امداد اور تربیت فراہم کر کے پاکستان کے اولین دارالحکومت اور صوبائی دارالحکومت کے امن کو خطرے سے دوچار کر دیا گیا۔ اس کے علاوہ سیاسی طور پر پاکستان میں جمہوریت کو بار بار ڈی ریل کر کے آمریت کا رستہ ہموار کرنے میں بھی بعض بڑی عالمی طاقتوں کا اہم کردار رہا ہے۔ اس آمریت نے بھی ملک میں عدم برداشت کے کلچر کو فروغ دیا جس کا خمیازہ ملک کو بھگتنا پڑا۔

انہی حالات کو موضوع بناتا ہوا انتظار حسین کا یہ ناول کراچی کے حالات کی ایک سچی تصویر قارئین کے سامنے پیش کرتا ہے۔ اس ناول کے حوالے سے ڈاکٹر شہزاد لکھتے ہیں:

"ناول میں بنیادی طور پر انتظار حسین نے کراچی کی صورت حال کو پیش کیا ہے کہ جب ہندوستان کے صوبہ اترپردیش سے ہجرت کر کے آنے والے مہاجرین اپنے اپنے کلچر، تہذیب و تمدن اور طرز زندگی کو ساتھ لیے کراچی میں آباد ہوئے، ایک جانب ان کو اپنے تشخص کا مسئلہ درپیش کیا تھا، دوسرے جانب ایک علاقے سے تعلق ہونے کی بنا پر باہمی اخوت اور بھائی چارہ کی فضا پیدا ہوئی اور باہم رشتوں کی بات چلی اور تیسری جانب کراچی میں ہونے والی دہشت گردی کی فضا میں انھوں نے کس طرح خود کو زندہ رکھنے کے سلسلے پیدا کیے..." (۱)

اس کے ساتھ ساتھ وہ مزید لکھتے ہیں:

"نو آبادیاتی نظام اور پاکستان کی تشکیل کے بعد جس طرح کا سماج وجود میں آیا وہ انتظار حسین کے لیے قابل قبول نہیں..." (۲)

الغرض آگے سمندر پاکستان میں امن عامہ کی صورتحال اور اس کے پیچھے کارفرما محرکات کو پیش کرتا ہے اور تقسیم کے بعد وجود میں اانے والے پاکستانی معاشرے کے مسائل کو پیش کرتا ہے۔

---

(۱) غافر احمد شہزاد، ڈاکٹر، آگے سمندر ہے، مشمولہ *انتظار حسین تنقیدی جائزہ، مکالمہ اور زندگی نامہ* مرتبہ محمد عاصم بٹ، (لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۱۸ء)، ص ۳۱۰

(۲) ایضاً، ص ۳۱۱

# دائرہ

دائرہ کی پہلی اشاعت ۲۰۰۱ میں عمل میں آئی تو اس نے سنجیدہ ادبی حلقوں کو چونکا دیا۔ ناول نگار محمد عاصم بٹ نے کہانی کو بہت منفرد انداز میں پیش کیا ہے۔ ناول کا عنوان دائرہ گہری معنویت کا حامل ہے۔

"دائرے کا کوئی آغاز، کوئی اختتام نہیں ہوتا۔ یہ لا مختتم ہے اور اس لئے دنیا کا سب سے بڑا بھید بھی۔"(۱)

ان الفاظ سے شروع ہونے والا یہ ناول دور جدید کی پیچیدہ زندگی کو پیش کرتا ہے۔ مادی اعتبار سے انسان نے بہت ترقی کر لی ہے اور بہت سے مسائل کے حل اور سوالات کے جوابات تلاش کر لئے ہیں لیکن بہت سے سوالات ہنوز جواب طلب ہیں۔

جدید دور میں دنیا سمٹ گئی لیکن انسان تنہائی کے کرب میں مبتلا ہو گیا ہے۔ مادی ترقی اور اس سے لپٹی خواہشات کے حصول کی دوڑ نے انسان سے فراغت اور اس کے ساتھ ساتھ شناخت بھی چھین لی ہے۔ اب وہ خود سے سوال کرنے لگا ہے کہ وہ کون ہے۔ دائرہ اسی سوال کے المیے کو پیش کرتا ہے۔ انسان کی داخلی و خارجی شناخت ہی ناول کے بنیادی موضوعات ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ناسٹلجیا کا مسئلہ ہے۔ اس ناول کی کہانی فلمی اداکار راشد کی کہانی ہے۔ اس ناول کا مرکزی کردار آصف مراد ہے جو ایک ایڈوٹائزنگ کمپنی میں ملازم ہے۔ در حقیقت آصف مراد ایک کردار ہے جسے راشد ادا کر رہا ہے۔ لیکن یہ کردار اس کے حواسوں پر اس قدر سوار ہو جاتا ہے کہ اب وہ اپنی شناخت میں ابہام کا شکار ہے۔ دوہری زندگی کا عذاب ایک دائرے کی طرح لا مختتم ہے۔ دائرے کا ہر کردار اپنے حصے کی گولائی میں اضافہ کرتا جاتا ہے۔ اسے اپنی انتہا کی خبر ہے نہ ابتدا کی۔

ناول کے دو کردار اہم ہیں اصل میں یہ دونوں کردار ایک ہی شخصیت کی دو پرتیں ہیں۔ راشد ایک فلمی اداکار ہے جو اپنا کردار اتنا ڈوب کر کرتا ہے کہ قاری وقتی طور پر بھول جاتا ہے کہ اصل کردار کون ہے؟ آصف مراد یا راشد۔

مصنف نے دونوں کرداروں کو اس طرح باہم جذب کر دیا ہے کہ قاری تشکیک کا شکار ہو جاتا ہے۔ مصنف نے دو الگ کرداروں کے ذریعے جہاں دور جدید کے انسان کا مسئلہ اٹھایا ہے وہیں اس کی زندگی کے واقعات کو ایک نئے تناظر میں پیش کیا ہے۔ کئی چہروں کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے کرب کو الفاظ میں یوں سمو دیا ہے کہ دائروں میں گزرتی اور سسکتی زندگی ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ جس کی کوئی ابتدا ہے نہ انتہا۔ اس حوالے سے ڈاکٹر ممتاز احمد کہتے ہیں:

---

(۱) محمد عاصم بٹ، دائرہ (لاہور: سنگ میل پبلیکیشنز، ۲۰۱۴ء)

"اس (ناول) کے سروکاروں میں انسانی کی خارجی و داخلی شناخت اور ناسٹلجیا کا مسئلہ ہے۔ کس طرح انسان ایک خاص اہم منصب حاصل کرنے کے بعد ماضی کے دھندلکوں میں کھو جاتا ہے۔ اپنی عسرت و مفلسی کی زندگی سے جڑے ہوئے افراد اور کرداروں کو یاد کرتا ہے اور یہ سوچتا ہے کہ 'میں اداکاری کرتا ہوں اور دوسروں کی زندگی کی اداکاری کرتا ہوں، میں خود کیا ہوں؟ یعنی یہ کہ اس دوہری زندگی کا عذاب اس کے حواس پر غالب آ جاتا ہے۔"(۱)

اس ناول کا مرکزی کردار آصف مراد پانچ جماعتیں پاس کرنے کے بعد اندرون شہر کے ایک سکول میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس سکول سے میٹرک پاس کرنے کے بعد بھی اسے شہر کے اچھے کالجز میں داخلہ نہیں کہ داخلے کا وقت گزر چکا ہے۔ وہ ایک کامرس کالج میں داخلہ لے لیتا ہے اور سکینڈ کلاس میں بی کام پاس کر کے ملک کے بیروزگاروں میں شامل ہو جاتا ہے۔ گھر والوں کی طرف سے نوکری تلاش کرنے کا دباؤ کا سامنا ہوتا ہے تو سگریٹ نوشی، شراب اور چرس جیسے نشے میں پناہ لے لیتا ہے۔ آخر کار اسے ایک اشتہاری ادارے میں کاپی رائٹر کی نوکری مل جاتی ہے۔ اس پیشے سے فطری مناسبت کی بنا پر وہ جلد ترقی کر کے ہیڈ کاپی رائٹر بن جاتا ہے۔ اسی دفتر میں کام کرتے ہوئے ایک رات جب وہ آفس سے نکلا تو راستے میں ایک مجذوب فقیر کو دیکھا جس نے آگ جلائی ہوتی۔ آصف مراد یہ محسوس کرتے ہوئے کہ یہ آگ خطرے کا باعث بن سکتی ہے فقیر کو آگ جلانے سے منع کرتا ہے۔ لیکن وہ مجذوب اس قدر مشتعل ہوتا ہے کہ اس پر حملہ کرنے کے لئے اس کے پیچھے دوڑتا ہے۔ اپنے بچاؤ کے لئے بھاگتے ہوئے آصف مراد کی نظر اپنے چوکیدار پر پڑتی ہے تو اسے حوصلہ محسوس ہوا۔ لیکن چوکیدار نہ صرف اسے پہچاننے سے انکار کر دیتا ہے بلکہ فقیر کے ساتھ مل کر اس کی ٹھکائی بھی کر دیتا ہے۔ مزید حیرت اسے تب ہوتی ہے جب نورین بھی اسے آصف کی بجائے راشد سمجھتی ہے۔ یہ التباس اور ادغام اس قدر حقیقی ہے کہ قاری کے لئے فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ آصف کون ہے اور راشد کون۔ لیکن حیرت کا اصل مقام یہ ہے آصف کے وجود سے برآمد ہونے راشد بھی ایک مستقل وجود کا مالک نظر آتا ہے۔ بہر حال یہ ایک فلم کا سین ہے۔ یہیں نورین کا کردار سامنے آتا ہے جو آصف مراد کی بیوی ہے۔ اس کے ماضی پر بھی ناول نگار روشنی ڈالتا ہے۔ نوید نامی اوباش شخص اسے اپنے چنگل میں پھنسا کر اپنی ہوس کا نشانہ بناتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مصنف نے اندرون لاہور کی ثقافت، طرز زندگی، انسانی رستوں کی نزاکت اور انسانی نفسیات کے بعض پہلوؤں پر عمدگی سے روشنی ڈالی ہے۔

ناول کا ایک اہم کردار راشد بھی ہے۔ یہ کردار ناول میں تین حوالوں سے نمایاں ہوا ہے آصف مراد کی جگہ لینے اور نورین کے ساتھ اپنی گذشتہ زندگی کی تلاش میں اور فلیش بیک کی تکنیک کے ذریعے ہم راشد کے بچپن اور جوانی کی کہانی کو مربوط انداز میں دیکھتے ہیں۔ راشد کا بچپن ایک عام سے بچے کا بچپن ہے لیکن اس کی زندگی کے کچھ تلخ واقعات اس کی زندگی کا دھارا بدل دیتے ہیں۔ نشہ کرنے والے سائیں

(۱) ممتاز احمد، ڈاکٹر، *اردو ناول کے ہمہ گیر سرکار* (لاہور: فکشن ہاوس، ۲۰۱۲ء) ۱۱۴

جیرو کا بیٹا اپنی والدہ کی وفات کے بعد اپنے ماموں کے گھر منتقل ہو جاتا ہے۔جہان وہ میٹرک کر کے ایک دن چپکے سے لاہور آجاتا ہے۔اس کے گھر چھوڑنے کی دو وجوہات تھیں: نمبر ایک اس کا ماموں راشد کی شادی اپنی بیٹی نسرین سے کرنا چاہتا ہے، لہٰذا اس شادی سے بچنے کے لئے وہ گھر چھوڑ کر لاہور کا رخ کرتا ہے۔دوسرا اس کے قصبے میں ہر سال نوٹنکی والے آتے تھے۔ان کو دیکھ کر اسے شوق ہوا:

"اس نوٹنکی نے اسے ایک خواب دیا۔۔۔یہاں سے دور نوٹنکیوں کے دیس کا خواب۔شہر کا خواب، جہاں اس کے خیال میں بڑی بڑی نوٹنکیاں تھیں۔۔۔بجلی کی مشینوں سے لیس نوٹنکیاں جہاں جادو چلتا تھا، جادو کے زور پر مردوں میں جان پڑتی اور زندہ لوگ دیکھتے ہی دیکھتے نظروں کے سامنے سے غائب ہو جاتے۔"([1])

بہر حال مصنف نے دو الگ الگ کرداروں کے ذریعے دور جدید کے انسان کی زندگی کو پیش کیا ہے ۔اپنی شخصیت پہ کئی چہروں کا نقاب چڑھا کر جینے والوں کے کرب کو مصنف نے ایک نئے انداز سے پیش کیا ہے۔

روبینہ سلطان اس کردار کے حوالے سے کہتی ہیں:

"آصف مراد اصل میں اس فلم "دائرہ" کا ایک کردار ہے، جس کا اصل نام راشد ہے۔یہ ناول کی ایک پرت ہے جس کو راوی قوت ترغیب سے لیس ہو کر قاری کے سامنے پیش کرتا ہے۔ لیکن یہ قوت ترغیب یہیں ختم نہیں ہوتی اس کے بعد کہانی کی اگلی پرت شروع ہوتی ہے جہاں آصف مراد خود کو راشد ماننے سے انکار کر دیتا ہے۔اور مسلسل یہ کہتا ہے کہ وہ آصف مراد ہے راشد نہیں ہے۔یہاں پر راوی ایک اور نقطہ بیان کرتا ہے جو بڑا الجھا ہوا ہے اور ساتھ ساتھ قاری کو بھی الجھاتا ہے۔یعنی اگر آصف مراد راشد ہے تو راشد کون ہے۔۔۔پھر اسی شخصی پہچان کا المیہ پوری کہانی میں چلتا ہے۔"[۲]

یہ محض کہانی کا المیہ نہیں یہ دور جدید کے ہر انسان کا المیہ ہے۔عالم گیریت کے تناظر میں دیکھا جائے تو پہچان اور تشخص کو برقرار رکھنا نہ صرف فرد بلکہ اقوام کا سب سے بڑا مسئلہ بن چکا ہے۔عالم گریت نے فرد کی انفرادیت پر ضرب لگائی ہے اور آج اسے پہچان کے بحران کا سامنا ہے۔فرد بیک قوت دوہری ثقافتی پہچان رکھتا ہے۔ایک اس کے مقامی کلچر کی دین ہے جو اس کے لئے فطری ہے

---

(1) محمد عاصم بٹ، دائرہ ۱۳۹

(2) روبینہ بٹ، تین نئے ناول نگار (لاہور: دستاویز، ۲۰۱۲) ۲۱۵

جبکہ دوسری پہچان اسے عالمگیر ثقافت نے عطا ہے جو اس پر میڈیا کے ذریعے مسلط کی جارہی ہے۔ یہ ایک مصنوعی شخصیت ہے جو اس کی اصل شخصیت پر پینٹ کی گئی ہے۔ اور اس ناول کے کبیری کردار کی طرح وہ بھی اپنی اصل شخصیت کے متعلق مخمصے کا شکار ہے۔

اس عالمی گاوں میں فرد جس قسم کی داخلی تنہائی کا شکار ہے۔ ناول کے کبیری کردار کے مطالعے سے اسے سمجھا جا سکتا ہے۔

اس عالمی گاوں میں فرد کا رابطہ دور دراز خطوں کے لوگوں سے تو قائم ہو گیا ہے لیکن اس کے اطراف میں کیا ہو رہا ہے وہ اس سے لاعلم ہے۔ معلومات تک آسان رسائی نے اسے absent person میں تبدیل کر دیا ہے۔ پاکستانی سماج کی خوبصورت روایات بھی عالمگیریت کی اس لہر سے متاثر ہوئی ہیں۔

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں

موج ہے دریا میں، بیرون دریا کچھ نہیں

یہی ربط ملت عالمگیریت کا ہدف ہے۔ اور فرد کا رابطہ اپنے دوستوں، ہمسائیوں اور رشتہ داروں سے کمزور پڑنے کا اثر خود اس کی نفسیات کے لحاظ سے منفی ثابت ہوا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ فرد کا رابطہ خود اپنی ذات سے بھی کٹ گیا ہے۔ مسابقت کی دوڑ نے اس کے اندر بے سکونی اور عدم اطمینان کو جنم دیا ہے۔ اسے اشیا کا غلام بنا دیا ہے۔ اور اس کی زندگی کو خواہشات کے حصول میں ایک دائرے میں بدل دیا ہے جس کی کوئی ابتدا ہے نہ انتہا ہے۔ ایک چکر ہے جس میں وہ مسلسل گھوم رہا ہے۔

# کاغذی گھاٹ

خالدہ حسین کا ۴۷۷ صفحات پر مشتمل یہ ناول ۲۰۰۲ میں اشاعت پذیر ہوا۔ کاغذی گھاٹ تقسیم سے قبل سے لے کر تقریباً ۲۰۰۰ تک کے پاکستانی سیاست اور معاشرت کے نشیب و فراز کا احاطہ کرتا ہے۔ بدلتی ہوئی تہذیبی اقدار اور استحصال کو موضوع بناتے ہوئے مصنفہ نے اس عہد کی تاریخ کو محفوظ کر دیا ہے جو ان کا اپنا عہد بھی ہے۔ اس حوالے سے اس ناول کو ایک سوانحی ناول بھی کہا جا سکتا ہے۔ ناول کے حوالے سے ڈاکٹر ممتاز احمد خاں کہتے ہیں کہ

> "مصنفہ اپنے حوالے سے اپنے معاشرے کو بتوسط ناسٹلجیا پیش کر رہی ہیں اور جن تاریخی واقعات کو فکر کا حوالہ بنا رہی ہے اس سے ناول کا خودنوشتانہ پیرایہ ابھر کر سامنے آتا ہے۔"(۱)

پاکستان بننے کے بعد جو نیا معاشرہ یہاں تشکیل پایا اس کی اقدار اس رچی بسی تہذیب کی اقدار و روایات سے یکسر مختلف تھیں۔ جس نے صدیوں کے عمل کے بعد یہاں جنم لیا تھا نمو پائی اور پھر تقسیم کے بعد اس کے تار و پود بکھر گئے اور ایک ایسا مرکب معاشرہ وجود میں آیا جس میں مقامی لوگوں کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے علاقوں سے ہجرت کر کے آنے والے بھی شامل تھے جو اپنی اقدار و روایات اور ان سے منسلک تفاخر ساتھ لے کر آئے تھے۔ اس کے علاوہ تقسیم کے بعد جائیدادوں کی الاٹمنٹ کی بہتی گنگا میں ہاتھ دھو کر بہت سے لوگوں نے اپنی سماجی حیثیت کو تبدیل کیا اور ایک نودولتیا طبقہ وجود میں آیا۔ معاشرے میں تبدیلی کے اس عمل کو ناول میں مونا اور اس کی دوستوں عائشہ اور افروز کے کرداروں کے ذریعے پیش کیا گیا۔ کاغذی گھاٹ کے حوالے سے منشایاد ستارہ ادب میں لکھتے ہیں:

> "کاغذی گھاٹ میں پاکستان کے سارے معاملات تضادات کامیابیاں، ناکامیاں، عروج اور زوال، اس قوم کو درپیش مسائل زیر بحث آتے ہیں۔ تقسیم سے پہلے تعلیمی اداروں میں پڑھائے جانے والے ہندو اور مسلم نصاب اور ان میں پیش کیے جانے والے تاریخی واقعات کے تضادات اور تعصبات دونوں کلچرز اور طلبہ کے رویوں کا فرق اور پاکستان... ایک خاص علاقے سے آنے والے مہاجر کنبوں کا تہذیبی تفاخر اور مقامی تہذیب، زبان اور رہن سہن پر ان کے اثرات، دہلی، لکھنؤ علی گڑھ اور آگرہ کے قصبے، مسلم تہذیب کی پرشکوہ عمارات اور تاج محل، لال قلعہ، قطب مینار جیسی تاریخی نشانیاں چھوٹنے کا غم......(۲)

ناول کی کہانی ان تین تعلیم یافتہ اور انقلابی سوچ کی حامل لڑکیوں کی زندگی کے خاص دور تک محیط ہے۔ یہ دوران کا اعلیٰ تعلیم کا دور ہے جس میں بلند و بالا آدرشوں کے ساتھ وہ سماج کو بدلنے کا عزم رکھتی ہیں۔ طبقاتی تقسیم کو ختم کر کے معاشرے میں مساوات کی

---

(۱) ممتاز احمد خاں، ڈاکٹر، اردو ناول کے ہمہ گیر سروکار، (لاہور: فکشن ہاؤس ۲۰۱۲ء) ص ۱۱۵

(۲) غفور احمد، نئی صدی نئے ناول، ص ۲۴۱

خواہاں ہیں۔ یہ تینوں لڑکیاں مونا، افروز اور عائشہ مختلف سماجی پس منظر کی حامل ہیں لیکن انجام تینوں کا یکساں ہے کہ شادی کر کے عملاً اپنے آدرشوں کو طاق نسیاں پر رکھ کر ایک عام گرہستن کی زندگی بسر کرنے لگتی ہیں۔ اس میں کبیری کردار مونا کا ہے جو دورِ جدید کی تعلیم یافتہ لڑکی ہے اور دنیا میں موجود استحصال کو ختم کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ لیکن عملی طور پر اس استحصالی نظام سے ٹکرانے کا حوصلہ نہیں رکھتی۔ یہ کردار اس ناول کا راوی بھی ہے۔ ناول کی کہانی اس کی ذہنی رو کے ساتھ ساتھ چلتی ہے اور ناول کے دیگر کرداروں میں سے ہم اسی کردار کے توسط سے متعارف ہوتے ہیں۔

مونا کی دوست افروز بہت متحرک کردار ہے۔ وہ نہ صرف آزادی اظہار کی جرأت رکھتی ہے بلکہ عملاً استحصالی قوتوں سے ٹکرانے کا حوصلہ بھی رکھتی ہے۔ وہ ایک مزدور سے شادی کرنا ایک چیلنج سمجھ کر قبول کرتی ہے۔ ناول میں ایک اور اہم کردار عائشہ کا ہے جو ایک بیوروکریٹ سے بیاہ کر کے محض حیاتیاتی سطح پر زندہ ہے۔ نہ صرف عائشہ بلکہ ناول کے دیگر تین اہم کردار جن میں نور آپا کا کردار بھی شامل ہے۔ شادی کے بعد ذہنی طور پر عدم فعالیت کی زندگی بسر کرنے لگتے ہیں۔ شادی ان کی ذہنی صلاحیتوں کے لیے پیغام اجل ثابت ہوتی ہے۔

> ”افروز کی شادی کے بعد مونا سوچتی ہے مگر اس کے بعد کیا ہوا؟ عائشہ بھی۔ وہ بھی بس ایک پرچھائیں میں ڈھل گئی اور اب افروز، سب اپنے اپنے انداز میں تمت بالخیر کی طرف رواں ہیں۔“ (۱)

"قصہ مختصر یہ کہ عائشہ اب وہ سب کچھ حاصل کرنے کے قریب پہنچ چکی تھی جس کے لیے اس نے اتنی تگ و دو کی۔ اس طرح لڑکیوں کی زندگی کا ڈراپ سین آتا ہے اور سب مطمئن ہو کر بیٹھ جاتے ہیں..."(۲)

لڑکیوں کی انفرادی زندگی اور شخصی مسائل سے ہٹ کر ناول نگار نے اس معاشرے کا ناقدانہ جائزہ بھی پیش کیا جہاں Haves and Have not کی خلیج روز بروز گہری ہو رہی تھی۔ اس حوالے سے ناول میں جابجا مصنفہ کا سماجی معاشی شعور اپنی جھلک دکھاتا ہے۔

”آہستہ آہستہ سب کچھ معدوم ہوتا جا رہا تھا اور دنیا دو حصوں میں بٹ رہی تھی۔ میرا تمہارا، بڑا چھوٹا، طاقتور کمزور، ہونا نہ ہونا، عمل سوچ...... تقسیم نے افراد کی زندگی پر کیا اثر ڈالا تھا۔“ (۳)

> ”اب لاہور نے بھی زندگی کا ایک ورق الٹا تھا۔ مال روڈ پر بہت سے نئے نئے ریستوران اور ہوٹل جگمگانے لگے تھے۔ گاڑیوں کا ہجوم بڑھ گیا... نیا دولت مند طبقہ ابھر رہا تھا۔ دولت کی ریل پیل اور اعلیٰ سوسائٹی کے آداب و اطوار اور سوشل لائف کے ساتھ سول سروس کلچر

---

(۱) خالدہ حسین، *کاغذی گھاٹ*، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء) ص ۱۵۵

(۲) ایضاً، ص ۱۴۲

(۳) خالدہ حسین، *کاغذی گھاٹ*، ص ۶۴

کے ساتھ ساتھ کاروباری طبقہ جو خوب پیسہ کماتا تھا اور انتہائی آسائش اور گلیمر کی زندگی بسر کرتا تھا۔"[۱]

بیسویں صدی میں سائنسی پیشرفتوں نے زندگی کے ہر شعبہ بشمول فلسفہ، سائنس، ٹیکنالوجی، طب، تعلیم، کو متاثر کیا تو انداز فکر اور طرز زندگی میں تبدیلی برق رفتاری سے رونما ہوئی۔ ذرائع ابلاغ و مواصلات کی ترقی نے فاصلوں کو سمیٹا اور گلوبل ویلیج کا تصور سامنے آیا۔ لیکن ان ترقیوں کا اثر انسانی سماج کے تمام طبقات کے لیے یکساں نہیں تھا۔ سرمائے کے غیر مساوی بہاؤ نے معاشرے کے مختلف طبقات کے درمیان خلیج کو گہرا کیا تو ایک طرف وہ متمول طبقہ پیدا ہوا جو بقول مصنفہ

"یہ گویا اعلیٰ طبقہ تھا جو چیونگ گم چبا چبا کر انگریزی سلینگ بولتا تھا اور دوسروں پر حقارت کی نظر ڈالتا تھا... عام طور پر یہ لڑکیاں کالج اور پبلک بسوں کی بجائے اپنی لمبی لمبی لش لش کرتی گاڑیوں میں آتی جاتیں، اکثر کا تعلق زمیندار گھرانوں سے تھا... یہ یہاں کے قدیم لوگ تھے جو پنجاب کے مختلف گاؤں سے تعلق رکھتے تھے اور اپنے بیٹوں کو یورپ، برطانیہ اور بیٹیوں کو انگریزی اداروں میں تعلیم دلواتے تھے۔ جو باہر نہ جاتے وہ اکثر لاہور کے چیفس کالج اور کلیات میں داخلہ لیتے جہاں ان کی رگ رگ میں تحکم اور دولت پرستی بھر دی جاتی..." [۲]

زمینداری معاشرہ اب رفتہ رفتہ سرمایہ دار معاشرے میں تبدیل ہو رہا ہے اور اپنی قدیم روایات کو ترک کرتے ہوئے جدید دنیا سے ہم قدم ہونے کے شوق میں خود کو بدلتے ہوئے حالات کے مطابق ڈھال رہا تھا۔ عالمگیریت کا یہ درمیانی دور تھا جب کشور کشائی کا دور گزر چکا تھا اور اب رفتہ رفتہ اس کی نئی صورت میڈیا کے ذریعے اور تعلیم کے ذریعے اذہان کو تبدیل کر رہی تھی۔ نو آبادیاتی نظام نے جس طبقاتی تقسیم کو جنم دیا موروثی جاگیرداری نظام کے ذریعے تقسیم کے بعد وہ نظام جوں کا توں موجود رہا لیکن اس تقسیم کے عمل سے ایک تیسرا طبقہ سامنے آیا جو نودولتیوں پر مشتمل اور ہندوستان کی روایتی وضع داری اور تہذیبی روایات سے نا آشنا تھا۔

بہرحال کاغذی گھاٹ کی دنیا عورتوں کی دنیا ہے اور معاشرتی دباؤ کے تحت پاکستانی عورت کی دنیا عملاً ایک محدود دنیا ہے۔ وہ ایک بہتر دنیا کا خواب ضرور دیکھ سکتی ہے اسے اپنے اردگرد مسائل کا ادراک ضرور ہے لیکن ان مسائل کے حل میں عملاً اس کا کردار نہ ہونے کے برابر ہے۔ مختصر سے اس ناول نے مصنفہ نے ایک عورت کے نقطہ نظر سے بدلتے ہوئے پاکستانی سماج پر نظر ڈالی ہے غریبوں کسانوں اور مزدوروں کے استحصال کو محسوس کیا ہے اور خود اس کے اپنے استحصال یعنی ذہنی استحصال کو بھی محسوس کیا ہے اور پیش کیا ہے لیکن اس جبر کو بھی محسوس کیا ہے کہ صدیوں پر مشتمل اس استحصالی نظام کو بدلنا ان لڑکیوں کے بس کا روگ نہیں اور یہی المیہ اس ناول کا موضوع ہے۔

---

(۱) خالدہ حسین، *کاغذی گھاٹ*، ص ۶۷

(۲) ایضاً، ص ۷۹

# حاصل گھاٹ

اردو ادب کی دنیا میں بانو قدسیہ بطور افسانہ نگار، ڈراما نگار، خاکہ نگار، سوانح نگار اور ناول نگار معتبر اور قابل قدر شناخت رکھتی ہیں۔ ان کا ناول راجہ گدھ اردو ناول کی تاریخ میں اپنے مخصوص اسلوب اور موضوع کی ندرت کی بنا پر اہم ناول سمجھا جاتا ہے۔ بانو قدسیہ کا ناول حاصل گھاٹ ۲۰۰۳ میں پہلی بار سنگ میل سے شائع ہوا۔ ناول کا انتساب ناول نگار نے ہجرت کرنے والوں کے نام کیا ہے۔ ناول ایک ایسے بوڑھے شخص کی داستان ہے جو ریٹائرمنٹ کے بعد اپنی بیٹی کے پاس امریکا منتقل ہو چکا ہے اور فراغت میں فلیٹ کی بالکونی میں بیٹھ کر ماضی کو دہراتا رہتا ہے۔ یہ ناول ناسٹلجیا کے احساس کو نمایاں کرتے ہوئے فلیش بیک کی تکنیک میں لکھا گیا ہے۔

کہانی کا آغاز بھی اسی طرح ہوتا ہے کہ ایک بوڑھا شخص گھر کی بالکونی میں تنہا بیٹھا اپنے ماضی کے جھروکوں میں جھانک کر یادوں کو دہرا رہا ہے۔ ناول کا کبیری کردار ہمایوں فرید ہے جو جوانی میں اقبال نامی لڑکی سے محبت کرتا تھا لیکن یہ خاموش محبت یکطرفہ ہی ہے۔ اقبال کی منگنی اس کا ڈی پی آئی باپ نثار سے کر دیتا ہے۔ جس کے باپ کی آئس فیکٹری تھی اور وہ خود بھی سول سروس میں تھا۔ دوسری طرف ہمایوں فرید تھا جس کی ہال روڈ پر چھوٹے چھوٹے ریڈیو، پرانی استریوں، ہیڈ ٹائپ رائٹر اور اسی نوع کی دیگر ساز و سامان کی چھوٹی سی دکان ہے اور تعلیم بھی نامکمل ہے لیکن اگر تعلیم مکمل بھی ہو جاتی ہے تو وہ بھی زیادہ سے زیادہ کسی قصباتی کالج میں لیکچرار لگ جاتا۔ چنانچہ اقبال کی شادی نثار احمد صدیقی سے ہو گئی اور ہمایوں فرید نے اپنی چچازاد اصغری سے شادی کر لی جس سے اس کی بیٹی ارجمند اور بیٹا جہانگیر پیدا ہوئے۔ اس کی بیوی اصغری کچھ عرصہ ہوا اسے داغ مفارقت دے کر جا چکی ہے۔ بیٹا جہانگیر شادی کے بعد پہلے اپنے سسرال اور اب کئی سالوں سے امریکا منتقل ہو چکا ہے۔ بیٹی ارجمند بھی شادی کے بعد اپنے میاں کے ساتھ امریکا منتقل ہو چکی ہے۔ ہمایوں فرید زندگی میں بھرپور محنت کے بعد ایک آسودہ بڑھاپا گزار رہا ہے لیکن اب اس کا بڑا مسئلہ تنہائی ہے۔ اپنی بیوی کے ساتھ ایک خوشگوار ازدواجی زندگی گزارنے کے باوجود اس کے دل سے پہلی محبت کی کسک اور یاد کسی صورت نہیں جاتی۔ یہ بات باعث حیرت ہے کہ دل میں اقبال کی محبت کو زندہ رکھتے ہوئے اس نے اصغری کے ساتھ ایک خوشگوار ازدواجی زندگی کیونکر بسر کی۔ اس کا جواب ناول نگار نے یوں دیا ہے:

> "جس طرح عورت ماں اور طوائف کا ملغوبہ ہوتی ہے۔ ہر مرد میں ایک کارندہ کفالت کرنے والا اور ایک زناکار موجود ہوتا ہے... جونہی ماں اور کفیل سنجوگ میں بندھ جاتے ہیں کامیاب شادی شدہ زندگی جنم لیتی ہے۔"(۱)

(۱) بانو قدسیہ، *حاصل گھاٹ*، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء) ص ۹۴

بہر حال اقبال کی محبت کی قندیل ہمایوں کے دل میں روشن رہی اور اس کے امریکا جانے کا ایک اہم محرک بھی یہی اقبال کی محبت تھی۔ اپنی بیٹی ارجمند کے پاس امریکا جا کر اقبال کا نام سن کر یہ محبت انگڑائی لے کر پوری طرح بیدار ہو جاتی ہے۔ لیکن جلد ہی اسے پتہ چلتا ہے کہ یہ اقبال کوئی اور خاتون ہے جس کے شوہر کا نام بھی اتفاق سے نثار ہے۔ لیکن پھر اتفاق یوں ہوا کہ امریکا میں مقیم ایک صاحب نثار صاحب نے ہمایوں فرید کو ان کی شاعرانہ حیثیت کے مطابق ایک مشاعرے میں مدعو کیا تو وہاں ان کی ملاقات اس کی جوانی کی محبت اقبال سے ہو جاتی ہے جو ایک ابنارمل بیٹی کی ماں ہے اور اس کی زندگی بچانے کے لیے امریکا میں قیام پذیر ہے۔ لیکن اب وہ مایوسیوں کے گرداب میں یوں پھنس چکی ہے کہ امید کی کوئی نئی کرن جگانا نہیں چاہتی۔ وہ ہمایوں فرید کو ایک دفعہ پھر اپنی زندگی سے خارج کر کے اسے پاکستان واپس جانے کا کہتی ہے اور بتاتی ہے کہ میرا اپنی بیٹی کے علاج کے لیے امریکا ٹھہرنا اشد ضروری ہے۔ ہمایوں فرید نے اقبال کا کہا مان لیا اور امریکا کو خدا حافظ کہہ دیا۔ یہ ناول کا فطری انجام ہے۔

ہمایوں اور اقبال کی ادھوری محبت پورے ناول پر چھائی ہے۔ اس محبت سے وابستہ اوائل جوانی کی دیگر یادیں بھی ہمایوں کے دماغ پر دستک دیتی رہتی ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس ادھوری محبت کے پس منظر میں بانو قدسیہ نے دو تہذیبوں اور مشرق و مغرب کے فرق کو اجاگر کیا ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

> "ہمایوں اور اقبال کی ناتمام محبت کی یہ کہانی پورے ناول پر پھیلی ہوئی ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس کہانی کے وسیلے سے ہی بانو قدسیہ نے دو تہذیبوں کی کشمکش کو ہمارے سامنے بے نقاب کیا ہے۔" (۱)

ڈاکٹر انور سدید کی اس رائے کی تصدیق میں اس ناول میں جابجا ایسے اقتباسات موجود ہیں جو اس تہذیبی آویزش کو نمایاں کرتے ہیں مثلاً:

> "مشرق میں ابھی تبدیلی سے اتنی محبت پیدا نہیں ہوئی، تبدیلی ہمیں خوفزدہ کرتی ہے... ہم صابرین اور شاکرین میں سے ہونا چاہتے ہیں۔ ہم مابعد آخرت میں اپنا حصہ لینا چاہتے ہیں۔ یہی وہ بنیادی فرق ہے جس کے باعث کہنا پڑتا ہے کہ مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب اور یہ دونوں کبھی مل نہیں سکتے۔ امریکن خواہش کو تازہ دم رکھتے ہیں تبدیلی سے اپنے آپ کو انگیخت کرتے ہیں۔ خرابی اور خوبی کو بدلتے رہتے ہیں یہ تبدیلی انھیں مسابقت کی طرف کھینچتی ہے۔ وہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہتے ہیں۔" (۲)

---

(۱) انور سدید، ڈاکٹر، *بانو قدسیہ: شخصیت اور فن*، (اسلام آباد: اکادمی ادبیات، ۲۰۰۸ء) ص ۱۳۰

(۲) بانو قدسیہ، *حاصل گھاٹ*، ص ۱۳۱

مشرق اور مغرب کے درمیان فرق واضح کرتے ہوئے وہ اس مذہبی فلسفی کو اس وجہ قرار دیتی ہیں جو مشرقی بالخصوص پاکستانی معاشرے میں افراد کی ذہن سازی کرتی ہے۔

"مشرقی انسان کو اپنی تمام بد نصیبی کے باوجود یہ یقین ہو جاتا ہے کہ یہ دنیا دارالمحن ہے۔ یہاں انسان کا امتحان مقصود ہے اور اصلی حیات مابعد سے شروع ہوتی ہے...... کسی قسم کی ترقی انسان کو مکمل طور پر پر سکون، قناعت پسند، مسرت آشنا نہیں کر سکتی۔ جب تک اوپر والے کا فضل نہ ہو، کچھ بھی مثبت نہیں ہوتا ہے۔"

"سورج مشرق سے طلوع ہوتا ہے اور مغرب میں غروب ہو جاتا ہے۔ دونوں الگ الگ وقت کے تابع ہیں۔ مشرق تبدیلی کا خواہاں نہیں۔ استواری کا دل دادہ ہے۔"

"مشرق میں خواہش کو دبانے کا عمل ہے مغرب میں ابھارنے کا... یہاں عقیدہ اہم ہے اور وہاں قاعدہ..."(۱)

مشرق و موازنہ کرتے ہوئے مصنفہ دراصل اس تہذیبی تصادم کی طرف اشارہ کرتی ہیں جو عالمگیریت کی تحریک اپنے دامن میں لیے ہوئے پوری دنیا پر سایہ فگن ہو رہی ہے۔ اس تحریک کے مضمرات و نتائج کیا ہوں گے۔ اس کو سمجھنے کے لیے یہ تہذیبی موازنہ رہنمائی کر سکتا ہے کہ کسی خاص خطے کے رہنے والے اپنی تہذیب کے اندر زندگی کچھ خاص عقائد کی رہنمائی میں بسر کرتے ہیں یہی عقائد ان کے ذہنی رویوں کی صورت گری کرتے ہیں۔ ان کے عادات و خصائل کو ڈھالتے ہیں۔ اس حوالے سے مشرق اگر روحانیت کی سرزمین ہے تو مغرب مادیت کو ترجیح دیتا ہے۔ مشرقی لوگ صرف آج پر یقین نہیں رکھتے ان کے سامنے ان کا "کل" بھی ہے جو آج کے تصور سے زیادہ توانا اور اثر انگیز ہے جب کہ مغرب کے لیے آج ہی سب کچھ ہے تو ایسی صورت میں کسی ایک تہذیب کو ساری دنیا پر مسلط کرنا کیونکر جائز قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس سے مسائل حل ہونے کے بجائے نئی الجھنیں پریشانیاں مسائل جنم لیں گے فرد کی ذات کے اندر بھی اور معاشرے میں بھی۔ اس تہذیبی فرق کے حوالے سے ناول نگار نے امریکی معاشرے کی ایسی تصویر کشی کی ہے کہ اس کے عیوب و محاسن نمایاں ہو کر قارئین کے سامنے آ گئے ہیں۔

ہمایوں فرید جو پاکستانی معاشرے کا پروردہ ہے۔ اب بڑھاپے میں جب اس کی تجزیہ کرنے کی قوت وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھ جاتی ہے اپنے سامنے ایک بالکل مختلف روایات کے حامل معاشرت کو دیکھ کر اس کا ذہن مشرق و مغرب کے موازنے میں مصروف رہتا ہے۔ یہ کردار دراصل ناول نگار کے ذہن کی عکاسی کرتا ہے اور مغربی معاشرے کے حوالے سے اس کے مشاہدات اور ان مشاہدات کے نتائج کو قارئین کے سامنے پیش کرتا ہے۔

"چالیس پچاس سال پہلے مشرق کا Extended فیملی ایک بہت بڑا Support سسٹم تھا۔ اب یہ سسٹم کمزور پڑ رہا ہے۔ مشرق میں زندگی خاندان کے تابع چلتی رہتی ہے... فرد معاشرے کے تابع، خاندان سے وابستہ، روایت کا پابند، اپنی شخصی آزادی کو بھینٹ چڑھا کر

---

(1) بانو قدسیہ، حاصل گھاٹ، ص ۲۷٦

عافیت کی زندگی بسر کرتا رہا ہے۔ سفید فام لوگ اور خاص کر امریکی معاشرہ خاندان کی زنجیریں توڑ چکا۔ فرد نظام کا تابع ہے۔ ہر شہری پابند ہے۔ حکومت چاہے ڈیموکریٹ کی ہو چاہے Republican کی ہر شہری نظام کا پابند رہے گا۔ وہ حکومتی Infrastructure کو توڑ کر اپنی آزادی کا اعلان نہیں کر سکتا۔" [۱]

خاندانی نظام کی شکست وریخت نے فرد کو تنہائی کا تحفہ دیا ہے اور یہ تنہائی فرد کی پرائیویسی کی خواہش کا نتیجہ ہے۔

"اسے خیال آتا ہے کہ کیا تنہائی سفید فام کلچر کا حصہ ہے کہ اس کی ضرورت؟ کیا تنہائی آزادی کی آرزو سے پیدا ہوتی ہے کہ privacy کی خواہش نے فیملی یونٹ کو مالٹے کی پھانکوں سمان علیحدہ پیک کر کے ایک پھل کا حصہ بنا دیا ہے۔" [۲]

امریکی معاشرہ سرمایہ دارانہ معاشرہ ہے اس معاشرے کی اپنی اخلاقیات اپنے رسوم اپنی اقدار ہیں اور اس سرمایہ دارانہ معاشرے میں جہاں دیگر تبدیلیاں آئی ہیں وہیں معاشرے میں عورت کا مقام بھی تبدیل ہو گیا ہے۔

"...اب اشتہار کے لیے عموماً عورت کی جنسی کشش سے سہارا لیا جاتا ہے۔ بکاؤ مال بندوق ہو یا برگر، عوت کا ماڈل عام طور پر استعمال میں آتا ہے جس قدر عورت جنسی کشش کی مالک ہو گی اسی قدر اشتہار بھی سریع الاثر ہو گا... ماڈرن، ترقی یافتہ معاشرے میں عورت چھپانے، سر دھڑ کی بازی لگانے، حیران کرنے کے کام نہیں آتی۔ وہ رجھانے، لبھانے اور ستانے کا سمبل بن گئی ہے... لیکن خود عورت کو معلوم نہیں کہ وہ برف کی چٹان پر کھڑی ہے یا گرم پانی کے نیچے ڈبکیاں لگا رہی ہے۔ ترقی کی دوڑ میں حاصل آزادی اور ذاتی شناخت کی تلاش اس کی شخصیت کو سیر اب بھی کر رہی ہے اور ساتھ ساتھ بنجر بھی کیے دیتی ہے......" [۳]

مختلف وجوہات کی بنیاد پر ہجرت کر کے ان ممالک میں پناہ لینے والے افراد پر نئی معاشرتی اقدار کا اثر مختلف انداز کا ہوتا ہے۔

ان ترقی یافتہ ملکوں میں ہجرت کر کے آنے والوں کی حیثیت سیکنڈ کلاس سٹیزن کی ہوتی ہے لیکن ان معاشروں کے اپنے افراد کی صورتحال کا تجزیہ بھی ناول نگار نے کیا ہے۔

"نظاموں کے پابند معاشرے میں ذاتی زندگی آزاد ہو گی اور معاشرہ اسی شخصی آزادی کے باعث مشکلات سے دوچار ہو گا۔ طمانیت، سکون، شانتی کی کمی ہو گی۔ ذہنی نفسیاتی بیماریاں بڑھیں گی۔ طلاق کی شرح میں اضافہ ہو گا۔ شلٹر ہومز بڑھیں گے۔ فرد کا support سسٹم نہ ہونے کی وجہ سے تنہائی کا روگ عام ہو گا... مشرق کا حساب اس سے برعکس ہے ہمارے معاشرے میں فرد پابند اور شہری آزاد ہے... ہمارے رسم ورواج، لین دین، محبت اور نفرت کے سارے سرچشمے خاندان سے نکل کر بہتے ہیں... جب معاشرے

---

(۱) بانو قدسیہ، حاصل گھاٹ، ص ۲۷۶

(۲) ایضاً، ص ۲۷۴

(۳) ایضاً، ص ۲۶۹

میں محبت، مروت اور یگانگت کے رشتے ہوں تو پھر سپورٹ سسٹم کے باعث نفسیاتی مسائل کم، ایسی سپورٹ کے باعث تنہائی کم تر اور سکون طمانیت قلب وافر انداز میں ملتی ہے لیکن نظام نہیں چلتے اور نظام نہ چلنے کی صورت میں خاطر خواہ ترقی نہیں ہوتی۔" (۱)

مشرق و مغرب کا یہ تقابل پورے ناول میں موجود ہے لیکن اس میں ناول نگار کا غیر جذباتی انداز اس تقابل کو منطقی انداز میں نمایاں کرتا چلا جاتا ہے۔ اور عمومی طور پر وہ یہ تقابل معروضی انداز میں کرتی ہیں اور دونوں طرز زندگی اور معاشروں کی خوبیوں خامیوں کو بیان کرتے ہوئے قارئین کو دعوت فکر دے رہی ہیں کہ عالمگیریت جس تہذیب کا غلبہ چاہتی ہے اپنی اصل میں وہ مشرقی تہذیب سے کتنی مختلف ہے۔ لیکن وہ نتیجہ نکالنے میں فی الحال حق بجانب ہیں۔

"مغرب اور مشرق اسی لیے کبھی مل نہیں سکتے کہ مشرق میں ابھی فلاح کی تلاش جاری ہے۔ فلاح کا سفر فرد سے شروع ہو کر بالآخر معاشرے میں ضم ہوتا ہے۔ ترقی کی منزل معاشرے کی فراوانی، آرائش و زیبائش کے بغیر ممکن نہیں اور تنہائی پر منتج ہوتی ہے... ایک شمال سے جنوب کا سفر ہے دوسرا مشرق سے مغرب کی جانب بڑھنے کی مسافت ہے کیا جانے نقطۂ اتصال کہاں ہے کیا فلاح اور ترقی بیک وقت ممکن بھی ہے اور کس قدر کہاں تک اور کیونکر؟" (۲)

حاصل گھاٹ کے حوالے سے خواجہ محمد زکریا لکھتے ہیں:

"حاصل گھاٹ کا موضوع نیا نہیں یہ ناول فلیش بیک کی تکنیک میں لکھا گیا ہے اور دو تہذیبوں کا تصادم اس کا بنیادی موضوع ہے۔ جو لوگ پاکستان سے نکل کر امریکا یا کسی دوسرے یورپین ملک میں آباد ہو جاتے ہیں وہ نہ تو وہاں کی تہذیب کو پوری طرح اپنا سکتے ہیں اور نہ ہی اپنی تہذیب کو چھوڑ سکتے ہیں۔ نتیجے کے طور پر ذہنی کشمکش کا شکار رہتے ہیں۔" (۳)

بانو قدسیہ کا ناول اس وقت شائع ہوا جب سوویت یونین کا شیرازہ بکھر چکا تھا اور امریکا واحد سپر پاور کے طور پر ایک نیا عالمی نظام متعارف یا واضح لفظوں میں دنیا پر مسلط کر رہا تھا۔ سیموئل ہنگٹن نے تہذیبی تصادم کا نظریہ پیش کر کے مشرق کے روحانی اور مغرب کے مادیت پسندانہ مزاج کے درمیان واضح خط تقسیم کھینچ دیا۔ روس کے آدرشی نظام کو شکست دے کر امریکا نے اپنا نیا ہدف اسلام اور مسلمانوں کو بنایا۔ لیکن مسلمان حکومتوں کو زیر کرنے کے لیے الگ الگ منصوبے بنائے گئے کہیں مسلمان ممالک کو آپس میں لڑا کر ان کی قوت کو ضعف پہنچایا گیا۔ مثلاً عراق کو پہلے ایران اور پھر کویت پر حملے کے لیے اکسایا اور بعد ازاں صدام کی حکومت کا تختہ الٹ کر وہاں خانہ جنگی مسلط کر دی گئی جس کی آڑ میں اس ملک کے تیل کے کنوؤں تک رسائی حاصل کر کے عراق کے وسائل کو اپنے تصرف میں لایا گیا۔ بوسنیا کو سربیا اور کروشوں کے سامنے نہتا کر کے پھینک دیا گیا۔ الجزائر میں فوجی راج قائم کر کے اپنے مقاصد کا

---

(۱) بانو قدسیہ، *حاصل گھاٹ*، ص ۲۷۶۔۲۷۸

(۲) حوالا بالا، ص ۲۷۹

(۳) خواجہ محمد زکریا، *مختصر تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند*، ص ۸۳۱

حصول ممکن بنایا پاکستان میں سیاسی عدم استحکام اور دہشت گردی کے ذریعے غیر یقینی صورتحال پیدا کی گئی اور یوں معیشت کو سنبھلنے کا موقع نہ مل سکا۔ ترکی کی تمام ترکاوشوں کے باوجود اسے یورپی یونین کا ممبر نہ بننے دیا گیا۔

افغانستان میں روسی مداخلت کے دوران افغان جنگجوؤں کو اسلحے سے مسلح کر کے روس کے خلاف استعمال کیا گیا اور بعد ازاں انہیں یونہی چھوڑ دیا گیا۔ پاکستان میں کلاشنکوف کلچر کا فروغ اسی افغان وار کی دین ہے۔ ناول میں بانو قدسیہ نے اس صورتحال کا تجزیہ کیا ہے وہ لکھتی ہیں:

> "پھر اسی اسلحے کی برکت سے شہروں میں وارداتیں ہونے لگیں۔ گروہی اجتماعی جھگڑے فروغ پاتے ہیں۔ ڈاکو اٹھائی گیرے اسی اسلحہ کی بنیاد پر زیادہ جی داری کا مظاہرہ کرتے ہیں ٹرینوں میں بم پھٹتے ہیں... ان تمام وارداتوں کی تفاصیل سپرپاور کے کارندے فتح مندی کے ساتھ اپنے مالکان تک پہنچاتے ہیں... مسلمان ملکوں کو کسی وقت بھی کوئی میر جعفر اپنی حرص کے باعث اسلحے کی فراہمی کے ہاتھوں خانہ جنگی میں ڈبو سکتا ہے۔" (۱)

حاصل گھاٹ مشرق اور مغرب کا موازنہ نہایت خوبصورتی سے پیش کرتے ہوئے دعوت فکر دیتا ہے۔

---

(۱) بانو قدسیہ، حاصل گھاٹ، ص ۱۵

# کئی چاند تھے سر آسماں

''کئی چاند تھے سر آسماں'' ایک تاریخی ناول ہے جس میں تخیل اور تاریخ یکجا ملتے ہیں۔ اس میں تاریخ کے حوالے سے تخیل کی کارفرمائی اس طرح ملتی ہے کہ اس زمانے کی تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے۔

کئی چاند تھے سر آسماں شمس الرحمن فاروقی کا پہلا ناول ہے اس سے قبل وہ بطور نقاد، محقق اور افسانہ نگار اپنی شناخت مستحکم کر چکے تھے۔ یہ ناول ہند اسلامی تہذیب کے پس منظر میں ایک خوبصورت اسلوب، بہترین ادبی زبان اور منفرد تکنیک کو پیش کرتا ہے اس ناول کا اہم موضوع وزیر خانم کی زندگی کے حالات ہیں۔ ناول کے تمام کردار وواقعات اور کہانی کے تانے بانے اسی ایک کردار کے گرد گھومتے ہیں یوں ناول کا کبیری کردار وزیر خانم ہے جو ایک خوبصورت، خوش سلیقہ، خوش ذوق اور متحرک خاتون ہے۔

اس ناول کا بیانیہ کردار خلیل اصغر فاروقی ہے جو ایک ماہر امراض چشم ہے لیکن وہ اپنے پیشے کو خیر باد کہہ کر ہندوستان میں فاروقی خاندان کی تاریخ اور نسبی کڑیوں کی تلاش میں انڈیا آفس لائبریری لندن پہنچ جاتا ہے۔ وہاں اس کی ملاقات وسیم جعفر سے ہوتی ہے۔ خلیل اصغر کو پتہ چلتا ہے کہ وسیم جعفر نواب مرزا داغ دہلوی کی والدہ وزیر خانم عرف چھوٹی بیگم کے اخلاف میں سے ہیں اور وسیم جعفر کا نسب کچھ یوں ہے۔

۱۔ وزیر بیگم مارسٹن بلیک

۲۔ سوفیہ عرف مسیح جان

۳۔ حسیب اللہ قریشی (قلمی نام سلیم جعفر)

۴۔ اعجاز احمد قریشی (قلمی نام شمیم جعفر)

۵۔ وسیم جعفر

وسیم جعفر بیسویں صدی کے وسط میں اسی خاندان کا چشم و چراغ ہے جو اپنے آبا کے حالات زندگی اور ان کی زندگی کی گمشدہ کڑیوں کی تلاش میں انڈیا آفس لائبریری میں انہی خطوط پر کام کر رہا ہے کیونکہ اس کے خیال میں ۵۷ کے بعد قلعہ معلیٰ کا سارا علمی و ادبی خزانہ یہاں منتقل ہوا تھا لہٰذا اسے وزیر خانم کی تصویر بھی یہاں مل جاتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ محمد حسین آزاد کا مدون کردہ دیوان ذوق بھی ملتا ہے جس میں اس تصویر کا تذکرہ ہے لیکن اس نسخے میں جس انداز میں وزیر خانم کا ذکر کیا گیا ہے وہ نہایت تکلیف دہ ہے۔ تصویر کا اندراج لائبریری کی کسی فہرست میں نہیں ہے اس لیے وہ با آسانی تصویر باہر لے آتا ہے۔ خلیل اصغر فاروقی کچھ عرصے بعد وطن واپس لوٹ آتے ہیں۔ چند ماہ بعد انہیں وسیم جعفر کے وکیل کی طرف سے ایک پارسل اس اطلاع کے ساتھ ملتا ہے کہ پھیپھڑوں کے سرطان کے باعث وسیم جعفر کا انتقال ہو چکا ہے اور اس کی طرف سے وزیر خانم کی تصویر اور کچھ کاغذات خلیل اصغر

فاروقی کو ملتی ہے اور مزید یہ اطلاع بھی اگر وہ ان کاغذات کی روشنی میں کوئی تحقیق کرنا چاہیں تو تحقیق اور دیگر اخراجات کے لیے ان کے ترکے میں سے ایک ہزار کی رقم پیش کر دی جائے۔

ناول کا آغاز وزیر خانم کے تعارف سے ہوتا ہے۔ اس تعارف کے بعد مصنف انہی معلومات کے ماخذ کے بارے میں اطلاعات فراہم کرتا ہے۔ یہیں ہمارا تعارف وسیم جعفر سے ہوتا ہے جس کا تذکرہ سطورِ بالا میں ہو چکا ہے اور وسیم جعفر کے اس کردار سے کہانی کا رخ ماضی کی جانب ہو جاتا ہے اور قارئین کو وسیم جعفر بلکہ وزیر خانم عرف چھوٹی بیگم کے آباؤاجداد کے متعلق جانکاری ملتی ہے جس کے مطابق مخصوص اللہ کشن گڑھ نامی گاؤں کا باسی ہے گاؤں کی کل آبادی دو سو افراد پر مشتمل ہے اور ان تمام نفوس کا تعلق کسی نہ کسی طور مصوری سے ہے۔ شبیہ سازی میں ان لوگوں کو کمال حاصل ہے۔ مخصوص اپنے خونِ جگر سے ایک ایسی خیالی شبیہ کے خدوخال تراشتے ہیں کہ اس پر جیتی جاگتی مورت کا گمان گزرتا ہے اور اس میں ان کا فن ایسی بلندیوں پر نظر آتا ہے کہ دیکھنے والے انگشت بدنداں رہ جائے۔ اس تصویر کی شہرت دور دور تک پھیل جاتی ہے لیکن یہ بھی اتفاق ہے کہ اس شبیہ میں کشن گڑھ کے نواب کی چھوٹی بیٹی من موہنی سے غیر معمولی مشابہت موجود ہے۔ من موہنی کے بے پناہ حسن کے قصے تو ہر خاص وعام کی زبان پر موجود تھے لیکن اسے دیکھا کسی نے نہیں۔ اس تصویر کی شہرت نواب کشن گڑھ تک پہنچی تو وہ تصویر دیکھنے آتا ہے۔ بیٹی کی شباہت تصویر میں پاکر آگ بگولہ ہو جاتا ہے اور بیٹی کو کشن گڑھ لا کر اس کا سر قلم کرنے کے بعد تصویر کو بھی نیزے کی انی سے چھید دیتا ہے۔ ان حالات میں مخصوص اللہ کی خوش نصیبی اس کے کام آتی ہے کہ وہ اس وقت گاؤں میں موجود نہیں۔ نواب کا عتاب پورے گاؤں پر نازل ہوتا ہے اور وہ انھیں علاقہ بدر کرنے کا حکم سناتا ہے۔

مخصوص اللہ کی ملاقات گاؤں کے باسیوں سے رستے میں ہوتی ہے صورتحال کا علم ہونے پر وہ بھی ان کے قافلے میں شامل ہو جاتا ہے اور آخر کار کشمیر پہنچ جاتا ہے۔ وہاں وہ ایک کشمیری لڑکی سے شادی کر لیتا ہے لیکن اس کے اندر کا فنکار مضطرب رہتا ہے۔ کشمیر میں مصوری کے لیے ماحول ساز گار نہیں۔ ایک رات وہ چپکے سے گھر سے نکل جاتا ہے اور قالین بافوں کی صحبت میں رہ کر آٹھ سال کی محنت شاقہ سے وہ قالین کی نقشہ سازی کا فن سیکھ لیتا ہے۔ اس میں وہ اپنی طرف سے بھی اضافے کرتا ہے۔ اس فن میں وہ ایسا طاق ہو جاتا ہے کہ جلد اس کی شہرت کشمیر میں پھیل جاتی ہے۔ مخصوص اللہ کی موت اور اس کے بیٹے کی پیدائش ایک ہی وقت میں ہوتی ہے۔

> "صورت ایسی کہ بالکل ہو بہو باپ کی تصویر، لیکن مخصوص اللہ کے چہرے پر ایک استغراق رہا کرتا تھا اور محمد یحییٰ کے منھ پر قلبی سکون کی ہلکی سی ارتعاش آمیز روشنی کی چھوٹ تھی جیسے صبح کاذب کے وقت لولاب کا پانی۔" (۱)

---

(۱) فاروقی، شمس الرحمن، *کئی چاند تھے سرِ آسماں*، (کراچی: شہرزاد، ۲۰۱۱ء) ص ۹۲

محمد یحییٰ بھی اپنے باپ کی طرح تعلیم نویسی میں نام پیدا کرتا ہے۔ یحییٰ کے ہاں دو جڑواں بچے تولد ہوئے جن کے نام داؤد اور یعقوب رکھا گیا۔ خاندانی روایت کے برعکس وہ دونوں تجارت کا پیشہ اپناتے ہیں اور اچھی آواز کے مالک ہیں اس لیے عارفانہ کلام کی گائیکی میں نام پیدا کرتے ہیں۔ محمد یحییٰ اور اس کی بیوی کے انتقال کے بعد وہ کشمیر کو چھوڑ کر جے پور سے کشن گڑھ کی طرف روانہ ہوتے ہیں۔ رستے میں ریت کا طوفان انھیں آلیتا ہے اور وہ اپنے اصل رستے سے بھٹک جاتے ہیں۔ رستے کی صعوبتیں اور موسم کی شدت انھیں نیم جاں کر دیتی ہیں۔ آخر کار طوفان تھم جاتا ہے تو کچھ مسافت کے بعد وہ ایک چھوٹی سی بستی کے قریب ایک کنویں پر پہنچ جاتے ہیں۔ یہاں ان کی ملاقات دو لڑکیوں سے ہوتی ہے جو ایک ڈرامائی حادثے کے بعد ان کی شریک زندگی بن جاتی ہیں۔ یہ دونوں بھائی فرخ آباد میں قیام کرتے ہیں۔ یعقوب کے ہاں ایک بیٹے محمد یوسف کی ولادت ہوتی ہے جبکہ دوسرا بھائی لاولد رہتا ہے۔ یعقوب اور داؤد مرہٹوں کے خلاف جنگ میں مارے جاتے ہیں۔ ان کے خاندان سے واحد محمد یوسف زندہ رہتا ہے جسے اکبری طوائف دہلی لے آتی ہے۔ یوسف کو پال پوس کر وہ اپنی بیٹی اصغری سے اس کا نکاح کر دیتی ہے۔ اس جوڑے کے ہاں تین بیٹیوں کی پیدائش ہوتی ہے۔ انوری، عمدہ خانم اور وزیر خانم۔ بڑی کی شادی مولوی نذیر سے ہو جاتی ہے، منجھلی عمدہ خانم سید یوسف علی خان بہادر کے حرم میں داخل ہو جاتی ہے جبکہ چھوٹی اپنی ماں کی وفات کے بعد نانی کے زیر تربیت موسیقی کے بنیادی اسرار و رموز سیکھتی ہے شاعری میں وہ شاہ نصیر کی شاگردی اختیار کرتی ہے اپنے زمانے کے اعتبار سے وہ بہت ترقی پسند اور باغیانہ خیالات رکھتی ہے۔

"سنیے میں شادی وادی نہیں کروں گی" وزیر نے مربیانہ لہجے میں کہا۔

کیوں؟ کیوں نہیں کرے گی شادی؟ اور نہ کرے گی تو کیا کرے گی؟ لڑکیاں اسی لیے تو ہوتی ہیں کہ شادی بیاہ ہو گھر بسے...

'...بچے پیدا کریں شوہر اور ساس کی جوتیاں کھائیں چولھے چکی میں پس کر وقت سے پہلے بوڑھی ہو جائیں' وزیر نے مضحکہ اڑانے کے انداز میں کہا۔ شاہزادہ تقدیر میں لکھا ہو گا تو آئے گا ہی۔ نہیں تو نہ سہی۔ مجھے جو مرد چاہے گا اسے چکھوں گی پسند آئے گا تو رکھوں گی نہیں تو نکال باہر کروں گی۔" (۱)

ایسے خیالات کی حامل وزیر بیگم کی مڈبھیڑ مارسٹن بلیک سے اتفاقیہ طور پر ہوتی ہے۔ ولی خواجہ قطب صاحب کی درگاہ سے واپس آتے ہوئے وزیر بیگم اور اس کے والد کی بہلی حادثے کا شکار ہو جاتی ہے۔ ان حالات میں مارسٹن بلیک اسسٹنٹ پولیٹیکل ایجنٹ ان کی مدد کرتا ہے اور بحفاظت منزل تک پہنچا دیتا ہے۔ یہی اوّلین تعارف مزید ملاقاتوں کا پیش خیمہ بن جاتا ہے اور نتیجتاً چھوٹی بیگم مارسٹن بلیک کے ہمراہ دلہن بن کر چلی جاتی ہیں۔ لیکن قانونی طور پر وہ ان سے نکاح نہیں کرتا۔ اس رشتے سے ان کے ہاں دو بچے بیٹا مارٹن بلیک (امیر مرزا) اور بیٹی سوفیہ (بادشاہ بیگم) پیدا ہوتی ہے مارسٹن بلیک اردو اور فارسی کا عمدہ ذوق رکھتا ہے دونوں کے درمیان چھوٹے چھوٹے اختلافات موجود ہیں لیکن محبت کا رشتہ بھی مضبوط ہے مگر مارسٹن کے بھائی بہن اس رشتے کو قبول نہیں کرتے۔

---

(۱) فاروقی، شمس الرحمن، *کئی چاند تھے سر آسماں*، ص ۱٦۹

۱۸۷۹ میں جب وہ دونوں باقاعدہ شادی کا فیصلہ کرچکتے ہیں لیکن تقدیر غالب آجاتی ہے اور مارسٹن بلیک ایک بلوے میں مارا جاتا ہے۔ مارسٹن بلیک کی اس ناگہانی موت سے وزیر خانم کی زندگی میں المیوں کا آغاز ہو جاتا ہے۔ وزیر خانم کی زندگی اور خوشیوں کا چراغ آندھیوں کی زد میں آجاتا ہے۔ مارسٹن بلیک کی قانونی بیوی نہ ہونے کی وجہ سے وہ اس کی کسی قسم کی جائیداد کی حقدار نہیں ٹھہرتی۔ وہ ان سے ایک معاہدہ کرنے پر مجبور کر دی جاتی ہے جس کے تحت وہ اپنے تمام حقوق سے دستبردار ہونے کے عوض بچوں کی جزوی کفالت کا حق حاصل کرتی ہیں۔ لیکن جس وقار، تدبر اور حوصلے سے وہ یہ معاہدہ کرتی ہے وہ اس کی بصیرت اور معاملہ فہمی کا ثبوت ہے۔ اس معاہدے کے بعد چھوٹی بیگم دلی واپس لوٹ آئی لیکن اپنے باپ کے پاس جانے کی بجائے کرائے پر مناسب گھر لے کر رہائش اختیار کرتی ہے۔

> ''اس وقت خانم کی عمر انیس سال اور چند دن تھی۔ وہ دو بچے پیدا کرنے، پھر صاحب کا غم اٹھانے اور پھر بچوں کی جدائی کے صدمے کے باوجود اس وقت اس کا حسن ایسا تھا کہ قسم کھایئے اور دیکھتے رہیے۔'' (۱)

وزیر خانم کو اپنے اس بے پناہ حسن کا احساس ہے۔ لیکن آئندہ زندگی کے متعلق اندیشوں اور تفکرات کی شکار ہے۔ لیکن یہ فیصلہ وہ بہر حال کر چکی ہے کہ اب وہ جلد بازی میں کوئی فیصلہ نہیں کرے گی۔ اب وہ نجی محفلوں میں جانا شروع کرتی ہے۔ ایسی ہی محفل میں شرکت کے لیے اسے نواب یوسف خاں کی طرف سے دعوت نامہ ملتا ہے یہ ادبی محفل دہلی کے ریذیڈنٹ آفیسر ولیم فریزر کے گھر منعقد ہو رہی ہے۔ ناول میں اس عہد کے ہندوستان کے مسلم گھرانوں کی زندگیوں اوران کے حرم کے متعلق معلومات ملتی ہیں اور یہ بھی کہ اس دور میں انگریزوں کے ہاں بھی کئی کئی بیبیاں تھیں۔ اور وہ بھی ہندوستانی رؤسا اور امرا جیسی زندگی بسر کر رہے تھے۔ بہر حال اس محفل میں اس کا سامنا نواب شمس الدین احمد اور ولیم فریزر سے ہوتا ہے وہ دونوں کی مرکز نگاہ بن جاتی ہے۔ لیکن ولیم فریزر کی عمومی شہرت وسیع حرم اور امرد پرستی اسے ولیم فریزر سے متنفر کر دیتی ہے۔ نواب شمس الدین عشق کی یہ بازی جیت لیتا ہے۔ ولیم فریزر جو دہلی کا ریذیڈنٹ آفیسر ہے رقابت کا شکار ہو کر نواب شمس الدین کے خلاف سازشوں کا جال بچھاتا ہے جس کے نتیجے میں وہ لوہارو کی ریاست جو انہیں والد سے ترکے میں ملی تھی محروم ہو جاتا ہے۔ اس کا انتقام وہ نواب ولیم فریزر کو اپنے ایک کارندے کے ذریعے قتل کروا کے لیتا ہے، قتل کی اس واردات میں نواب شمس الدین خود ملوث نہیں لیکن انصاف کے تمام تر تقاضوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے نواب شمس الدین کو قتل کے الزام میں پھانسی کی سزا دے دی جاتی ہے۔ وزیر خانم اور نواب شمس الدین کی محبت کا سورج غروب ہو جاتا ہے۔ اس محبت کی یادگار نواب مرزا (داغ دہلوی) کی صورت میں رہ جاتی ہے۔ اس کے بعد نواب یوسف علی خاں کی کاوشوں سے چھوٹی بیگم کی شادی آغا مرزا مولوی تراب علی سے ہو جاتی ہے۔ یہ وزیر خانم کی پہلی باقاعدہ شادی ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وزیر خانم کو اپنے شوہر سے محبت

(۱) فاروقی، شمس الرحمن، *کئی چاند تھے سر آسماں*، ص ۲۱۸

ہو جاتی ہے اور اس کے ہاں تیسرا بیٹا شاہ محمد آغا مرزا پیدا ہوتا ہے۔ لیکن وزیر خانم کی خوشیوں کی عمر بہت مختصر ثابت ہوتی ہے اور مرزا تراب علی ایک سفر کے دوران ٹھگوں کے ہاتھوں قتل ہو جاتا ہے۔ وزیر خانم کی زندگی المیوں کی داستان بن کر رہ جاتی ہے۔ اس کی زندگی میں پھر خلا پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کی زندگی پھر وہیں پہنچ جاتی ہے جہاں سے اس نے سفر کا آغاز کیا تھا۔

نواب مرزا داغ اور شاہ محمد آغا کے ساتھ وزیر خانم پھر دہلی واپس آجاتی ہے۔ نواب مرزا دہلی کی ادبی مجالس اور صحبتوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں ذوق و غالب سے تعلق ہوتا ہے نواب ضیاء الدین احمد برادر خورد نواب شمس الدین احمد وزیر خانم میں دلچسپی ظاہر کرتے ہیں جسے وہ ٹھکرا دیتی ہے۔

ادھیڑ عمری اور کئی بچوں کی ماں ہونے کے باوجود وزیر خانم کا شباب اور خوبصورتی قائم ہے۔ اس کے حسن کے چرچے دلی کے لال قلعے میں رہنے والوں کو متاثر کرتے ہیں اور ولی عہد سوم مرزا فخرو (بہادر شاہ ظفر کے بیٹے) اس پر فریفتہ ہو جاتے ہیں۔ پھر امام بخش صہبائی اور حکیم احسن اللہ خاں کی مداخلت سے چھوٹی بیگم قلعہ معلیٰ کی آبرو بن جاتی ہے۔ نواب مرزا بھی قلعہ چلے جاتے ہیں جہاں ان کی تربیت شاہی خاندان کے فرد کی طرح ہوتی ہے لیکن وزیر خانم کی زندگی کی ناؤ بہت مختصر وقت کے لیے پر سکون چلنے کے بعد پھر طوفان کی زد میں آجاتی ہے۔ اب کی بار مرزا فخرو ۱۸۵۶ میں ہیضہ سے وفات پا جاتے ہیں۔ وزیر خانم پھر بے آسرا رہ جاتی ہے۔ زینت محل وزیر خانم کو محل سے نکال باہر کرتی ہیں۔ وزیر خانم کی بربادی کے پس منظر میں ناول نگار نے آخری باب کا عنوان ''شاخوں پہ جلے ہوئے بسیرے'' رکھا ہے اور وزیر خانم کی رخصتی کا منظر اس طرح پیش کیا ہے:

> ''اگلے دن مغرب کے بعد قلعہ مبارک کے لاہوری دروازے سے ایک چھوٹا سا قافلہ باہر نکلا۔ ان کے چہرے ہر طرح کے تاثرات سے عاری تھے لیکن پالکی کے بھاری پردوں کے پیچھے چادر میں لپٹی اور سر کو جھکائے بیٹھی ہوئی وزیر خانم کو کچھ نظر نہ آتا تھا۔'' (۱)

یہ ناول وزیر خانم کی سرگزشت ہے اور اول و آخر اس کی زندگی کا المیہ ہے۔ وزیر خانم کی زندگی میں آسودگی اور خوشی کے لمحات بہت مختصر اور محدود تھے لیکن اس میں وزیر خانم کی داستان حیات کے پس منظر میں اٹھارویں اور انیسویں صدی کی ہند اسلامی تہذیب کی تفصیلات، جزئیات اور جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں اور اس خطے میں صدیوں میں پروان چڑھنے والی اس رواداری مشترک تہذیب کے مظاہر نظر آتے ہیں اور ایسی رسموں، رواجوں اور اجتماعات کا ذکر ملتا ہے جہاں لوگ مذہب و ملت کی حدبندیوں سے بلند ہو کر شرکت کرتے تھے۔ اس عہد کے شرفا کا رہن سہن، خوش سلیقگی ناول میں جا بجا نظر آتی ہے۔ شعر و سخن کا ذوق اور رغبت لطیف لفظوں اور جملوں سے چھیڑ چھاڑ اس دور کے عوام و خواص میں رچی بسی نظر آتی ہے۔ ایک طرف یہ تہذیب تھی جو ہندوستان کے مقامی رنگوں مختلف مذاہب اور اقوام کے اشتراک عمل سے وجود میں آئی تھی تو دوسری طرف یہ عہد سیاسی اعتبار سے بہت اہم تھا کیونکہ اس دور میں

---

(۱) شمس الرحمن فاروقی، کئی چاند تھے سرِ آسماں، ص ۸۱۳

انگریزی اقتدار تیزی سے ہندوستان میں اپنی جڑیں پھیلا رہا تھا اور یہ غلبہ محض سیاسی اعتبار سے ہی نہ تھا بلکہ یہ بدیسی حکمران اپنے ساتھ اپنی زبان اپنی تہذیب اپنی رسومات لے کر اور طرز زندگی لے کر آئے تھے۔ اگرچہ اس دور تک وہ دلی جو مغل دارالحکومت تھا تک قبضہ کر چکے تھے لیکن علامتی طور پر ابھی مغل بادشاہ حکمران تھا۔ جس کی سلطنت کی حدود قلعہ معلیٰ کے اندرون تک محدود تھیں۔ اگرچہ ان غیر ملکی حکمرانوں نے مقامی تہذیب و ثقافت کا اثر بھی قبول کیا تھا اور ناول نگار اس کا تذکرہ بھی کرتا ہے۔ ان انگریزوں کے ہاں کئی کئی مقامی بیبیاں تھیں لیکن چونکہ وہ فاتح تھے۔ ان کی ثقافت غالب ثقافت تھی لیکن ابھی کمپنی کا اقتدار پوری طرح قائم نہ ہوا تھا اس لیے اس عالمگیریت جو آج کی دنیا میں موجود ہے کے اثرات ناول میں موجود نہیں تاہم نوآبادیات جو قدیم عالمگیریت کی صورت تھی اور عالمگیریت کا قدیم تصور ہے وہ اس ناول میں پورے طور پر موجود ہے اور اس عالمگیریت کا اطلاق اس دور کی ضروریات اور تقاضوں کے مطابق فوج کشی کے ذریعے ہوتا تھا۔ لیکن اس عالمگیریت نے عام ہندوستانیوں کی زندگیوں کو کس طرح کس حد تک متاثر کیا اس حوالے سے ناول میں زیادہ وضاحت موجود نہیں۔ ناول چونکہ انیسویں صدی کے ربع ثانی کے ہندوستان کے امراؤسا اور ریاستوں کے نوابین مثلاً یوسف علی خاں اور نواب شمس الدین والی ریاست فیروز پور جھرکہ اور لوہارو کی زندگیوں، ان کے روزوشب، ضیافتوں، کھیل تماشوں اور شکاری مہمات کو پیش کرتا ہے وہ کس طرح کا زرق برق لباس زیب تن کرتے تھے کس طرح کے کھانے ان کے ہاں دستر خوانوں کی زینت بنتے۔ ان کے زنان خانے، ان کے حرم سرا اور اس نوعیت کی دیگر تفصیلات اور نہایت باریک جزئیات کو بھی مصنف نے محدب عدسے سے دکھایا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی نظر آتا ہے کہ اس عہد میں انگریز بھی ان نوابین اور امرا کے فیشن کی پیروی کرتے تھے۔ فارسی بولتے نان کھاتے اور مرزا غالب کے کلام پر سر دھنتے۔ لیکن اس عہد میں عوام کی زندگی کیسی تھی؟ وہ کن مسائل کا شکار تھے ان کے متعلق سرسری تذکرہ ایک دو جگہوں پر ملتا ہے اور بالخصوص ہندوستان کا کسان کسمپرسی کی زندگی گزار رہا تھا اس کے حوالے سے مثلاً ص نمبر ۲۳۳ پر

> "بات یہ ہے کہ... کمپنی راج میں شہر والے تو آرام سے ہیں لیکن گاؤں کے لوگوں کو بہت پریشانیاں ہیں کمپنی نے لگان بڑھا دیئے ہیں۔ کسان اور زمیندار آپس میں خوش نہیں ہیں... مقامی صناعوں کو کام نہیں مل رہا ہے..." (۱)

یہ گفتگو ولیم فریزر صاحب ریزیڈنٹ دولت کمپنی بہادر کی ہاں منعقد ایک شعر و سخن کی محفل میں نینی پارکس اور وزیر خانم کے درمیان ہوتی ہے یہ دونوں خواتین معاشرے کے اس طبقے سے تعلق رکھتی ہیں جہاں زندگی عیش و آرام کا دوسرا نام ہے لہٰذا یہاں بھی وہ کسان کے دکھ اور اس کی تکلیفوں کا سرسری تذکرہ کرکے گفتگو کا رخ موڑ دیتی ہیں۔ حالانکہ ولیم فریزر ایک ظالم و جابر شخص تھا جو زمینداروں اور کاشتکاروں سے ان کے حالات کا خیال کیے بغیر سختی سے لگان وصول کرتا ہے۔ اسے اس بات سے کوئی سروکار نہیں تھا کہ

---

(۱) فاروقی، شمس الرحمن، *کئی چاند تھے سرِ آسماں*، ص ۲۳۳

جس شرح اور سختی سے وہ لگان وصول کر رہا ہے اس کے بعد زمین پر اپنا خون پسینے بہا کر فصل پیدا کرنے والے کسان کے پاس اپنے بچوں کے روٹی بچتی بھی ہے یا نہیں۔ اس حوالے سے ناول میں درج ہے:

> ”فریزر کے بارے میں طرح طرح کی باتیں مشہور تھیں۔ ایک افواہ یہ تھی کہ وہ مسلمان ہو گیا ہے لیکن اتنا تو یقینی تھا کہ اپنے سابق حاکم اعلیٰ اختر لونی صاحب کی طرح اس نے بھی ہندوستانی طور طریقے اپنا لیے تھے۔ وہ سور اور گائے نہ کھاتا تھا۔ حقہ، پان اور عطریات کا شوق اسے کثرت سے تھا... فارسی بے تکان بولتا تھا اور شعر ریختہ سے بھی شغف رکھتا تھا۔ ان سب کے باوجود فریزر صاحب نہایت ظالم و جابر مشہور تھا۔ کاشتکاروں اور زمینداروں سے لگان کی وصولی اور شرح میں وہ اس قدر سختی کرتا تھا کہ دہلی اور مضافات دہلی میں گاؤں کے گاؤں ویران ہو گئے تھے۔“ (۱)

کمپنی کے نمائندوں کے ہاتھوں کسانوں زمینداروں کے اس معاشی قتل عام نے انہیں آبائی علاقوں سے نقل مکانی کرنے پر مجبور کر دیا اور یہ صرف ولیم فریزر کے ہاتھوں دہلی اور اس کے مضافات کے کسانوں کا ہی مسئلہ نہ تھا پورے ہندوستان میں جہاں جہاں کمپنی کی عملداری قائم ہو چکی تھی وہاں یہی صورتحال تھی۔ کمپنی کے کارندوں کے ہاتھوں ہندوستان کے معاشی استحصال کی داستانیں تاریخ کی کتب کے ساتھ ساتھ کئی ناولوں کا بھی موضوع رہا۔ یہی معاشی استحصال تھا جس کی وجہ سے بنگال جیسے زرخیز صوبے میں کمپنی کے دور میں کئی قحط پڑے اور لاکھوں انسان موت کے منہ میں چلے گئے۔ موت بھی ایسی اذیت ناک موت کہ جب وہ لوگ بھوک کے ہاتھوں نڈھال ایڑھیاں رگڑ رگڑ موت کے منہ میں اترتے چلے گئے۔ دراصل تجارت کی اجازت حاصل کر کے انگریز نے سازشوں کی ایسی بساط بچھائی جس نے صدیوں تک ہندوستان کو غلامی غربت کے اندھیروں میں دھکیل کر ہر طرح سے اس کا استحصال کیا گیا۔ فرنگیوں کی یہ قوم بزعم خود مہذب اور ترقی یافتہ تھے جبکہ ہندوستان کے لوگ عموماً غیر ترقی یافتہ اور غیر مہذب تھے۔ وزیر خانم کو مارسٹن بلیک کے ساتھ رہ کر اہل ہندوستان کے بارے میں ان فرنگیوں کے خیالات معلوم ہوئے تو وہ نہایت دل گرفتہ ہوئی۔

"اہل ہند کے بارے میں فرنگیوں اور خاص کر مارسٹن بلیک کے رویئے میں کئی باتیں اسے بری معلوم ہوتی تھیں... مارسٹن بلیک کے خیال میں ہندوستان کے لوگ عموماً غیر ترقی یافتہ اور غیر مہذب تھے۔ وہ یہاں کی ریت اور رسم کی کثرت پر ہنستا تھا اور کہتا تھا کہ دولت اور عزت دونوں گنوانے کا اچھا طریقہ تم لوگوں نے نکالا ہے۔۔۔مارسٹن بلیک کے ہم خیالوں کے دل میں ہند اور اہل ہند کی باتوں، ان کی معیشت و معاشرت، ان کے خیالات و عقائد، ان کے مذہب، کسی چیز کی کچھ قدر نہ تھی اور سب سے بدتر یہ کہ مارسٹن بلیک لفظوں سے نہیں اشاروں سے بھی نہیں لیکن ہندوستان میں اس کے رہن سہن کے انداز اور یہاں کی دولت سے متمتع ہونے کے طور

---

(۱) فاروقی، شمس الرحمن، *کئی چاند تھے سر آسماں*، ص ۲۲۴

طریقوں سے دو باتیں بالکل صاف نظر آتی تھیں۔ ایک تو یہ کہ صاحبان فرنگیان یہاں کی دولت بٹورنے آئے تھے اور دوسری بات یہ کہ اگر دولت بٹورنے کے لیے یہاں حکمرانی بھی کرنی پڑے تو وہ اس کے لیے سارے جوڑ توڑ، ساری جنگ، ساری سازش، ہر طرح کی راہیں اختیار کرنے پر آمادہ اور مستعد تھے۔" [۱]

تو قدیم عالمگیریت یا نو آبادیت کا مقصد بھی دولت کا حصول تھا۔ جہاں سے بن پڑے اور جیسے بھی ممکن ہو۔ اس کے لیے فوج کشی کی جاتی۔ سازش جوڑ توڑ سے غدار خریدے جاتے اور یوں مطلب بر آری کے ہر قاعدہ قانون کو چٹکیوں میں اڑا دیا جاتا۔

آج بھی عالمگیریت کے علمبر دار تہذیب و ثقافت اور جمہوریت کے نئے درس لے کر دنیا کے وسائل آخری حد تک نچوڑ کر اپنی تجوریاں بھرنے پر یقین رکھتے ہیں۔ یہی طرز عمل اس وقت بھی اپنایا گیا اور ہندوستان کی دولت کو لوٹ لوٹ کر برطانیہ منتقل کرتے رہے۔ یہاں کی صنعتوں کو تباہ کر کے اپنی مصنوعات کی منڈی کے طور پر ناتواں ہندوستان کے جسم سے خون کی آخری بوند تک نچوڑنے تک یہ عمل جاری رہا۔ برطانیہ میں لوگوں کا معیار زندگی بلند سے بلند تر اور ہندوستان میں لوگ نان شبینہ کے محتاج ہو گئے۔ اس بھوک اور فاقے کے ہاتھوں اخلاقی اقدار اور انسانیت کا دیوالیہ نکل گیا۔ لوگ صدیوں کے لیے غربت کے اس نہ ختم ہونے والے چکر میں پھنس کر رہ گئے۔

کئی چاند تھے سر آسماں اس صدی کا ایک بڑا ناول ہے۔ جو مصنف کی ان تھک محنت اور تحقیق کا نتیجہ ہے۔ اور ناول کے کبیری کردار وزیر خانم کے ذریعے دو صدیوں کی تہذیب و معاشرت کو زندہ کر کے ہمارے سامنے لا کھڑا کیا ہے۔ وزیر خانم کا کردار وقت کی گرد تلے دبا ہوا ایک گمنام کردار ہے جسے مصنف نے تاریخ کے اوراق سے تلاش کر کے اس کے نقوش سے وقت کی گرد جھاڑ کر قارئین کے سامنے یوں پیش کیا کہ وہ اس کی ایک ایک ادا کی دلکشی اس کی دھڑکنوں کے زیر و بم اس کی پوشاک کی نفاست و خوبصورتی اس کے عمدہ شعری ذوق اس کی زہانت کو محسوس کر سکتے ہیں۔ ناول کے دیگر کردار بھی ناول نگار کی فنی مہارت اور پختگی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ سراپا نگاری میں مصنف کو ایسا کمال حاصل ہے کہ وہ کردار کی ایک پوری تصویر کھینچ کر قاری کے سامنے رکھ دیتے ہیں۔

ناول نگار کا ڈکشن اور اسلوب اس ناول کی ایک نمایاں خصوصیت ہے۔ اس حوالے سے غفور احمد نئی صدی نئے ناول میں لکھتے ہیں:

"...اگر اس ناول کے ڈکشن اور اسلوب پر غور کریں تو یہاں بھی ایک جہاں آباد ہے۔ اٹھارھویں اور انیسویں صدی کی اردو زبان اپنے تمام تر جوبن کے ساتھ زندہ ہو گئی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ کہیں کہیں الفاظ ثقیل اور بوجھل ہو گئے ہیں مگر یہ محض اس لیے ہے کہ درمیان میں دو صدیوں کی خلیج حائل ہے۔... اپنی اس ثقافت اور قدیم اردو زبان کے استعمال کے باوجود یہ ایسا شاہکار ہے جو ایک لمبے عرصے تک یاد رکھا جائے گا۔" [۲]

---

(۱) فاروقی، شمس الرحمن، *کئی چاند تھے سر آسماں*، ص ۱۸۵

(۲) غفور احمد، *نئی صدی نئے ناول*، (لاہور: دارالنوادر، ۲۰۱۴ء) ص ۸۷

# غلام باغ

غلام باغ ۲۰۰۶ میں اردو فکشن کے افق پر طلوع ہوا۔ اس کے ناول نگار اس ناول سے قبل افسانے اور ڈرامے کی اصناف میں منفرد پہچان بنا چکے تھے۔ غلام باغ ان کا پہلا ناول ہے لیکن ان کا یہ پہلا ناول ان کی پہچان بطور ناول نگار ان کو معتبر شناخت اور پہچان دی ہے۔ یہ ناول ۸۷۸ صفحات اور ۳۰ ابواب پر مشتمل ہے۔ ناول کا انتساب ارزل نسلوں کے نام ہے۔ زیر نظر ناول کی اشاعت دوم میں بھی یہی انتساب ہے جبکہ اشاعت سوم میں انتساب کے بعد ایک اور اضافہ کیا گیا ہے

ارذل نسلوں کی اساطیر کھودنے میں سرگرداں نوجوانوں کے غلام باغ گروپ کے لیے

عدنان، وقاص، عثمان، گوہر

یہ گورنمنٹ کالج یونیورسٹی کے طالب علموں کا وہ گروپ ہے جو اس ناول کی اشاعت کے بعد غلام باغ گروپ کہلایا۔" [۱]

"غلام باغ" یہ عنوان ایک خاص معنویت کا حامل ہے اور اس کی یہ معنویت دو سطحوں پر ہے۔ اول غلام باغ آثار قدیمہ سے متعلق ایک جگہ ہے جس میں یہ کیفے غلام باغ واقع ہے۔ اس کے کیفے میں ناول کے کچھ اہم کردار اکٹھے ہوتے ہیں گپ شپ کرتے ہیں اور یہ مقام یعنی کیفے اس حوالے سے بھی اہمیت کا حامل ہے کہ ناول کی کہانی کے سارے تانے بانے کسی نہ کسی طور پر اسی کیفے سے جڑے ہوتے ہیں۔ اس عنوان کی دوسری معنویت استعاراتی حوالے سے ہے۔ انسانی تاریخ میں آزادی اور غلامی کی کشمکش ازل سے جاری ہے اور شاید تا ابد رہے۔ اس عنوان کے حوالے سے ناول نگار نے اپنے ایک انٹرویو میں بتایا:

"'غلام باغ اس میں ایک تو جگہ کا بھی نام ہے۔ آثار قدیمہ کے حوالے سے ایک تخیلاتی جگہ ہے۔ جس میں کھنڈرات ہیں۔ اسی میں ایک کیفے ہے۔ اس میں سارے Characters ہیں جو بیٹھتے ہیں۔ ایک تو Place ہے غلام باغ لیکن اس کا ایک Wider theme اگر دیکھا جائے تو وہ ہی ہے کہ غلام باغ، آزادی اور غلامی کو بنیادی طور پر موضوع بنایا گیا ہے کہ انسان جو ہے وہ کس حد تک آزاد ہے اور اگر وہ آزاد ہے تو کیا اس کا Relation قائم رہ سکتا ہے دوسروں کے ساتھ؟ کیا دوسرے کو Dominate کرنا، کیا وہ Inevitable ہے یہ ساری بات ایک سطح پر باتی چلتی ہے۔

Wider sense میں Dominance (غلبہ) دوسرے پر حاصل کرنا وہ اس کا ایک استعارہ ہے جو کہ نام سے بھی ظاہر ہو رہا ہے۔ (۲)

---

(۱) غفور احمد، *نئی صدی نئے ناول*، ص ۸۱

(۲) ایضاً، ص ۸۲

مندرجہ بالا انٹرویو سے یہ ظاہر ہوتا ہے بلکہ مصنف نے خود واضح لفظوں میں ناول کے موضوع کے متعلق بتا دیا ہے کہ وہ غلبہ یعنی فرد کا افراد پر یا کسی قوم کا دیگر قوموں پر غلبہ اس ناول کا موضوع ہے اور مصنف کا پیش کردہ یہ سوال کہ کیا یہ غلبہ ناگزیر ہے؟ اور کیا انسان، افراد یا اقوام آزاد رہ سکتے ہیں یعنی غلبے کی یہ خواہش نہ ہو تو پھر انسان آزاد ہو گا۔ بہر حال ناول کا موضوع یعنی بڑا موضوع انسان کی انسان پر قوموں کی قوموں پر اور نسلوں کی نسلوں پر غلبہ پانے کی خواہش کو پیش کرتا ہے اور اس کے لیے مصنف نے بہت منفرد تکنیک اپنائی ہے جسے روبینہ سلطان چینی ڈبوں کی تکنیک کا نام دیتی ہیں۔ اس حوالے سے وہ لکھتی ہیں کہ:

"غلام باغ میں شروع سے آخر تک چینی ڈبوں کی تکنیک سے بہت زیادہ کام لیا ہے یہ وہی تکنیک ہے جو ہمارے کلاسیکی ادب یعنی باغ و بہار اور الف لیلیٰ میں استعمال ہوئی یعنی کہانی در کہانی بیان کرنا۔ اس تکنیک سے راوی کا مقصد اسرار وابہام اور پیچیدگی پیدا کرنا ہے۔"(۱)

غلام باغ ایک ضخیم ناول ہے اور ناول کا زیادہ تر حصہ کسی کہانی کو بیان کرنے کی بجائے کرداروں کے باہمی مکالمات پر مبنی ہے۔ اس ناول کے اہم کرداروں میں یاور عطائی، کبیر، ڈاکٹر ناصر، زہرہ اور جرمن آر کیالوجسٹ شامل ہیں۔ اس ناول کی کہانی کا ایک بڑا حصہ یاور عطائی کے گرد گھومتا ہے۔ عطائی مانگر جاتی سے تعلق رکھتا تھا مانگر جاتی کو ارذل نسل تصور کیا جاتا تھا۔ جس علاقے میں عطائی کی پیدائش ہوئی وہاں اس نسل کو حقیر ذلیل اور کمتر خیال کیا جاتا تھا۔ اتنا ارذل کہ وہاں کے بااثر لوگ اس مانگر جاتی کی عورتوں کو اپنی ہوس کا نشانہ بناتے تھے۔ اس نسل نے جب کبھی تھوڑی بھی بغاوت کی، وہاں کے بااثر لوگ جو کاچھر اور پگل خاندان سے تعلق رکھتے تو ان باغیوں کو موت کے منہ میں دھکیل دیتے تھے۔ یعنی اس ارذل نسل سے تعلق رکھنے والوں کی نہ جان محفوظ تھی نہ عزت۔ لیکن عطائی کے باپ خادم حسین نے اپنے خاندان کو اس مانگر جو سے نکال کر انعام گڑھ منتقل کر دیا اور اسے تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنے کی کوشش کی۔ ناول نگار نے اس خاندان کی کچھ نسلوں کے حالات ناول میں بیان کیے ہیں اور عطائی کی کہانی کو اس کے ماضی کے ساتھ پیش کیا کہ سب سے پہلے حا کو کانٹے والے نے اپنی خاندانی روایات سے بغاوت کرتے ہوئے تعلیم حاصل کی جو کہ اگرچہ چند جماعتوں پر مشتمل تھی لیکن انھی چند جماعتوں کی بنیاد پر اسے انگریز دور میں کانٹے بدلنے والے کی نوکری مل گئی۔ لیکن یہ چند جماعتیں پڑھنا اور بااثر خاندانوں کو چھوڑ کر انگریز سرکار کی نوکری کرنا اس کا ایسا جرم تھے جن کی سزا میں اسے باندھ کر ریلوے لائن پر لٹا دیا گیا لیکن اس کا بیٹا خادم حسین بھی باپ کے نقش قدم پر چل کر تعلیم حاصل کر کے ڈاکیے کی نوکری کر لیتا ہے۔ اس حوالے سے ناول نگار نے لکھا ہے:

"خادم حسین کا تعلق سوکڑ نہر کے کنارے آباد مانگر جاتی سے تھا۔ اسے وہیں آباد رہنا چاہیے
تھا مگر وہ کسی نہ کسی طرح انعام گڑھ کے کاچھر اور پگل چوہدریوں کے درمیان ڈاکیا بن کر
آبسا۔ قصبے کی سردار نسلیں مانگر جاتی کو ارذل کاموں اور اسفل دھندوں کے لیے بہت

---

(۱) روبینہ سلطان، *تین نئے ناول نگار*، لاہور، دستاویز، ۲۰۱۲، ص ۱۷۴

موزوں سمجھتی تھیں۔اس کے باوجود کہ خادم حسین اپنے آپ کو ایک دیانت دار فرض شناس جرأت مند حتیٰ کہ خود دار ڈاکیا بنائے پھرتا تھا۔ اس کا یہ رویہ بعض اوقات خاندانی لوگوں میں ایک جھنجھلاہٹ آمیز تنفر کا باعث بن جاتا تھا اور عجیب معمہ نظر آتا تھا۔ لیکن کا چھر اور پگل بزرگوں کو اس اچنبھے کی وجہ صاف نظر آتی تھی۔'عطر گندی نالی میں بھی بہہ جائے تو تھوڑی بہت خوشبو پھر بھی دے جاتی ہے'سب اس رمز کی اصل کو سمجھتے تھے اور خوب ہنستے تھے۔ سب جانتے تھے کہ مانگر عورتیں ان کے گھروں میں خدمت گزاری کرتی ہیں ایسے ہی رواداری میں کبھی کبھار وہ اپنے مانگر خاوندوں کی ولدیت کے شبے میں کوئی نسلی بچہ جننے پر بھی مجبور ہو جاتی ہیں۔" (۱)

خادم حسین کی ساری زندگی ایمانداری سے نوکری کرتے گزر جاتی ہے اسی نوکری کے دوران اسے ایک پارسل ملتا ہے جو کسی حکیم صاحب کے نام ہے۔ خادم حسین جب وہ پارسل لے کر حکیم صاحب کے پاس پہنچتا ہے تو اس سے پہلے حکیم صاحب کا اسی رات انتقال ہو چکا تھا۔ یہ پارسل دراصل گنجینہ نشاط، محربات برائے درازی عمر پادساہاں وشباب دائمی ایشان نامی ایک قلمی نسخہ ہے۔ اپنے انتقال سے پہلے وہ یہ کتاب اپنے بیٹے یاور حسین کے سپرد کر دیتا ہے۔ یاور عطائی اپنا علاقہ چھوڑ کر شہر منتقل ہو جاتا ہے اور اپنی اصلیت کو مخفی رکھتے ہوئے ایک امیر اور معزز خاندان میں شادی کر کے خود بھی اس طبقے کا ممبر بن جاتا ہے لیکن اس سارے کے دوران وہ اپنا مقصد یعنی کا چھر اور پگل خاندان سے اپنی ہتک کا بدلہ لینا نہیں بھولا۔ ان کو جنسی طاقت بڑھانے والی ادویات کا جھانسا دیتا ہے۔ ان ادویات کا کوئی اثر تھا یا نہ تھا اس کا اندازہ اس کی موت کے بعد ہوتا ہے لیکن دوران حیات وہ ان لوگوں کو نفسیاتی طور پر اپنا غلام بنائے رکھتا۔ شہر کے ادھیڑ عمر کے امیر اور عمائدین اس کے در کے غلام بن جاتے ہیں۔ اپنی اس ترقی کے عمل کے دوران وہ اپنی اصلیت تمام لوگوں بشمول اپنی اولاد سے بھی پوشیدہ رکھتا ہے۔ اس کے دو بیٹے ایک کامیاب زندگی گزارتے ہیں اور بڑی کاروباری شخصیات میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ لیکن اپنے بھائیوں کے برعکس اس کی بیٹی ایک حساس اور فہیم لڑکی ہے وہ اپنے بھائیوں کی زندگیوں کے متعلق پوچھتی ہے۔

"پاپا آپ بھائیوں کو ایسا ہی بنانا چاہتے تھے... زہرہ نے پوچھا۔

میں چاہتا تھا کہ انھیں اس قابل بنادوں کہ وہ اس دنیا میں جو چاہیں خرید سکیں...

مگر کیوں...

اس لیے کہ جو خرید نہیں سکتا وہ خود بک جاتا ہے۔ ظالم، کمینے، خود غرض، حریص مگر عزت دار صاحب حیثیت معزز... [۲]

---

(۱) اطہر بیگ، مرزا، *غلام باغ* (لاہور: سانجھ پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء) ص ۶۶

(2) حوالہ بالا، ص ۱۱۲

اسی طرح وہ اپنی اصلیت جاننے کے لیے بھی بے چین ہے اور باپ سے پوچھتی ہے۔

"ہم کون لوگ ہیں پاپا؟ زہرہ نے کہا اور عطائی دہل کر رہ گیا اور ایک ہی زقند میں ایک زمانہ پہلے کے انعام گڑھ میں اپنے باپ کی آخری رات میں پہنچ گیا۔ جب باپ بیٹے سے یہی سوال کر رہا تھا مگر بیٹا جواب جانتا تھا اور اب بیٹی جواب نہیں جانتی تھی۔ "(۱)

ناول کا یہ حصہ سارا یاور عطائی اس کی بنائی دنیا کے گرد گھومتا ہے وہ یاور عطائی جس کا تعلق اس ارذل نسل سے تھا جو شاید کیڑے مکوڑوں کی سطح سے بھی نیچے زندگی بسر کرتی تھی لیکن اپنی ماہیت قلب کے بعد وہ اپنا راز اپنے سینے میں دفن رکھتا ہے اور اپنا انتقام اس طرح لیتا ہے کہ امیر ورئیس لوگوں کو مقوی ادویات کی فراہمی کا جھانسا دے کر انہیں اپنی چوکھٹ کا طواف کرنے پر مجبور کر دیتا لیکن دوسری طرف وہ اپنی اولاد کو ان محرومیوں اور ذلتوں سے بچانا چاہتا ہے جس کا سامنا اس کے آباؤاجداد نے کیا تھا۔ لیکن اس کی بیٹی زہرہ جدید دور کی وہ بے چین اور غیر مطمئن روح ہے جو اپنی جڑوں اور اپنی اصل کی تلاش میں ہے۔ یاور عطائی نے اپنے بیٹوں اور بیٹی کو بڑے شہر میں جدید سہولیات والی زندگی دی ہے۔ یہ نسل بڑے شہر کی نئی تہذیب و ثقافت کی پروردہ ہے اور اپنی اصل سے نا آشنا ہے۔

اس ناول کا ایک اور اہم کردار کبیر مہدی ہے جو اپنی باتوں سے لوگوں کو چونکا تا رہتا ہے۔ وہ خود کے متعلق یہ سوچتا ہے کہ وہ کوئی شہکار ادب تخلیق کرے گا۔ نیلے رجسٹر کے مندرجات اس کی اسی خواہش کا شاخسانہ ہیں لیکن وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے بغیر موت سے ہم آغوش ہو جاتا ہے۔ کبیر دراصل دوسرے لوگوں کو نفسیاتی دباؤ میں رکھنا چاہتا تھا۔ جدید دور میں ہر انسان دوسرے کو مغلوب کرنے کی دوڑ میں لگا ہوا ہے اور اس کے لئے جائز ناجائز کام کرتا ہے۔ کبیر کا یہ کردار جدید دور کی زندگی کی بے معنویت کی علامت ہے۔ زندگی کبیر کے لئے اتنی ہی بے معنی ہے جتنی ننگے افلاطون چٹاسائیں کے لیے ہے حقیر اور بے معنی۔ خود اپنے بارے میں وہ کہتا ہے:

> "میں دراصل ایک Mercenary writer ہوں جیسے کرائے کے قاتل ہوتے ہیں ویسے ہی میں ایک کرائے کا رائٹر ہوں مجھ سے کچھ بھی لکھوایا جا سکتا ہے۔" (۲)

بہر حال کبیر مہدی اس ناول کا سب سے زیادہ جاندار کردار ہے۔ یہ ایک فلسفیانہ قسم کا کردار ہے جس کے نظریات متغیر ہیں لیکن اس میں بات بات میں چونکا دینے کا فن ہے زندہ دلی ہے اس کی فلسفیانہ گفتگو یہ سب مل کر اسے ناول کا ایک دلچسپ کردار بناتے ہیں، وہ ایک ایسا پڑھا لکھا انسان ہے جو بڑے بڑے آدرش لے کر شہر آیا لیکن ایک اجرتی لکھاری بن گیا۔ لیکن وہ اپنے اس پیشے سے مطمئن ہے۔ کیونکہ اس کا کوئی ضمیر نہیں اور نہ ہی کوئی کمٹمنٹ ہے وہ ایک دکان میں کتابوں کی چھانٹی کا کام بطور اپنے مکان کے کرائے کرتا ہے لیکن اس سے علم و ادب کے بارے میں اس کی معلومات میں حیرت انگیز اضافہ ہو چکا ہے لیکن اس کی ذات میں تعمیری و تخریبی

---

(۱) اطہر بیگ، *غلام باغ*، ص ۱۳۹

(۲) حوالہ بالا، ص ۲۴۶

قوت یوں یکجا ہو گئی ہیں کہ اسے اپنی تباہی یقینی نظر آتی ہے۔ کبیر کا یہ کردار اس ناول میں اول تا آخر موجود رہتا ہے۔ یہ اس ناول کا مرکزی کردار بھی ہے لیکن اپنی ذہانت اور علم کے اعتبار سے وہ اپنے وقت سے بہت آگے ہے۔ لیکن اس کی ذات بعض استحصالی قوتوں کے لیے خطرے کا باعث بن جاتی ہے کیوں کہ اس کا زندہ رہنا ان کے لیے رسوائی کا باعث بن سکتا ہے لہٰذا رستے سے ہٹانے کے لیے اس بار بار قاتلانہ حملہ کیا گیا اور آخر کار جل پتھری کے نیچے پانی کا قطرہ حلق میں اتارنے سے پیشتر امبر جان کی گولی کا نشانہ بن جاتا ہے۔ ناول میں مرکزی کردار کی موت سے ایک خلا پیدا ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر ناصر اس ناول کا ایک اور نمایاں کردار ہے جو متوسط اور پسے ہوئے طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔ زہرہ اسی کے توسط سے غلام باغ گروپ میں شامل ہوئی۔ وہ زہرہ سے محبت کرتا ہے۔ غیر معمولی ذہانت کا حامل یہ کردار اس معاشرے کے مروجہ اصولوں اور اقدار کے مطابق خود کو ڈھالنے میں ناکام ہے۔

ہاف مین جرمن آرکیالوجسٹ ڈاکٹر ناصر کا دوست ہے جو غلام باغ آثار قدیمہ پر تحقیق کر رہا ہے۔ ناول میں اس کا کردار نو آبادیاتی دور کی یاد دلاتا ہے۔ غیر ملکی ہونے کے باوجود وہ مشرقی معاشرے اور اس کی روایات کے متعلق قابل قدر شنائی رکھتا ہے۔ ناول کے دیگر کرداروں کی مانند شوخ اور فلسفیانہ ذہن رکھتا ہے اور اسی کے مطابق گفتگو کرتا ہے۔ غلام باغ کے مالک نواب ثریا جاہ نادر جنگ کے ہمراہ غلام باغ کے تہہ خانے میں زندہ دفن ہو جاتا ہے۔

غلام باغ کا بنیادی موضوع تو استحصال اور تسلط ہے اور تسلط کی خواہش ہے۔ اس کے ضمنی موضوعات میں ایک اہم موضوع مابعد نو آبادیاتی مطالعہ بھی ہے۔ انگریز حکمرانوں نے اس دور میں اپنا تسلط قائم اور برقرار رکھنے کے لیے جس طرح مقامی لوگوں کا استحصال کیا اس نے مقامی لوگوں کی نفسیات میں الجھنوں اور کجی کو جنم دیا۔ مقامی لوگ گوری رنگت سے مرعوب اور متاثر بھی تھے اور اس سے نفرت بھی رکھتے تھے۔

اسی گوری رنگت کی بنا پر ہاف مین سے امتیازی سلوک روا رکھا جاتا ہے اور اعزازی سلوک بھی کیا جاتا ہے لیکن اس سلوک کے پیچھے کہیں نفرت بھی موجود ہے۔

> "میں نے ہاف مین کی ہمت بندھائی کہ نواب آخر نواب ہے اپنے سابقہ گورے آقاؤں کی نسل میں سے کسی کے ساتھ پھڈ اڈالنے کی کوشش نہیں کرے گا خواہ وہ گورا جرمن ہی کیوں نہ ہو۔ ہاف مین نے کہا کہ میں تمہاری مابعد سامراجی منطق کو تسلیم نہیں کرتا ہوں۔ میں نے مابعد کی بجائے نو کا تقاضا کیا جو تسلیم کر لیا گیا۔" (۱)

غلام باغ کے موضوع اور عالمگیریت میں تسلط اور معاشی استحصال مشترک ہیں۔

---

(۱) اطہر بیگ، غلام باغ، ص ۴۰۵

ناول کا کبیری کردار کبیر مہدی بھی ہاف مین کے متعلق اسی قسم کے رویے کا مظاہرہ بعض اوقات کرتا ہے جیسے وہ کسی غلام کا بدلہ لے رہا ہو۔ ایسے ہی ایک موقع پر ہاف مین کہتا ہے:

"تم ۱۸۵۷ میں تو نہیں رہ رہے؟ انگریز کب کا جا چکا ہے یعنی گورا صاحب رخصت ہو چکا ہے۔ پھر تمہارا رویہ ناقابل فہم ہے۔ یہاں کے سب لوگ تو تم جیسے نہیں ہیں۔ تمہارے دانشور بھی نہیں۔ یورپی اقوام سے تمہاری نفرت ایک عجیب و غریب رویہ ہے۔" (۱)

یہ نفرت بے بنیاد نہیں اس کے پیچھے وہ صدیوں کی محرومیاں ہیں جو عالمگیریت کے اس قدیم دور میں ہندوستانیوں کا مقدر بن گئیں یا بنادی گئیں۔

ایک طرف اس استحصال نے جہاں مقامی لوگوں میں نفرت کو جنم دیا، وہیں وہ امرا اور نوابین بھی تھے جو انگریزوں کے تابعدار تھے اور اس تابعداری نے ان پر دولت طاقت جیسی نعمتوں کے دروازے کھول دیئے اور وہ لوگ بھی تھے جنہیں نذیر احمد نے ابن الوقت کا نام دیا۔ جو اپنے طور طریقوں، ادب و آداب اور طرز زندگی میں اپنے انگریز حکمرانوں کی تقلید کو اس وقت کامیابی کی کلید سمجھتے تھے اور آج اس عالمگیریت کے دور میں جب اسلام کو دہشت گردی، بنیاد پرستی، رجعت پسندی اور مسلمانوں کو پسماندہ اور دہشت گرد سمجھا جارہا ہے اور میڈیا کے ذریعے دن رات یہی تصورات لوگوں کے ذہن میں راسخ کیے جارہے ہیں۔ آج بھی مغربی تہذیب کی تقلید ماڈرن اور لبرل ہونے کی علامت ہے۔ اس لیے آج بھی لوگ بہت فخر سے تہذیب مغرب کے مظاہر کو اپنائے ہیں اور پیروی مغرب میں فلاح دنیا پاتے ہیں۔

اسی حوالے سے کبیر ہندوستان کے لوگوں کی غلامانہ ذہنیت اور تقلید مغرب کے بارے میں بات کرتے ہوئے کہتا ہے:

"تم یہاں کے روسا، یہاں کے نودولتیوں یہاں کے بڑے بڑے جاگیرداروں حتیٰ کہ یہاں کی تہذیب و ثقافت کے نام نہاد علم برداروں کی کوٹھیاں دیکھ لو۔ ان کے عالی شان بنگلے دیکھ لو۔ تمہیں وہاں ایک بھی مقامی درخت نہیں ملے گا۔ ان میں سے کوئی بھی کیکر، شیریں اور شیشم کو اپنے لانوں میں اُگانا پسند نہیں کرتا۔ یہ سب تمہیں ملیں گے بس سڑکوں کے کنارے، ادھر ادھر اکادُکا بس اپنے زور پر اُگے ہوئے۔ تم گوروں نے ہم سے ہماری نباتات بھی چھین لی ہیں۔" (۲)

---

(۱) اطہر بیگ، *غلام باغ*، ص ۳۳

(۲) ایضاً، ص ۴۲

کبیر ایک حساس اور محب وطن فرد ہونے کے ناطے ایسی ذہنیت، مرعوبیت کے خلاف ہے اسے ہدف تنقید بناتا ہے اور اسے اپنے یہاں کی حقیر سے حقیر چیز سے بھی لگاؤ ہے۔ اسی لیے وہ ہندوستان میں پڑنے والی سخت گرمی کو برا نہیں کہنے دیتا کہ لے دے کے ہمارے پاس ایک گرمی ہی تو ہے۔

مابعد نو آبادیات اور عالمگیریت اس ناول کے بنیادی موضوعات تو نہیں ہیں لیکن ناول کے موضوع اور عالمگیریت میں قدر مشترک استحصال ہے جسے مصنف ایک خوبصورت اور کسی حد تک فلسفیانہ پیرائے میں پیش کرتا ہے۔ بہر حال یہ ناول اردو کا ایک منفرد اور عمدہ ناول ہے اور فلسفیانہ ہونے کے باوجود اپنے اندر مزاح کی چاشنی لیے ہوئے ہے۔ یہاں فلسفیانہ انداز بیان مزاح کی چاشنی پر غالب آ کر قاری کو بدمزہ نہیں کرتا۔ یہ ناول کی خوبی اور مصنف کا کمال ہے۔

# مٹی آدم کھاتی ہے

محمد حمید شاہد جدید افسانہ نگاری کا ایک معتبر نام ہے۔ بند آنکھوں سے پرے، مرگ زار اور جنم جہنم ان کے افسانوی مجموعے ہیں۔ مٹی آدم کھاتی ہے ان کا پہلا ناول ہے جو ۲۰۰۷ میں شائع ہوا۔ ۱۲۲ صفحات پر مشتمل اس ناول کا انتساب آدمی کے نام ہے جو زمین کی محبت میں دیوانہ ہو گیا ہے۔ ناول کے انتساب سے اس کے موضوع کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ ۱۹۷۱ میں سقوط ڈھاکہ پاکستان کی تاریخ میں ایک ایسا المناک واقعہ ہے جو اغیار کے ساتھ ساتھ اپنوں کی بھی "مہربانیوں" کا نتیجہ تھا۔ اس نے قوم کے ساتھ ساتھ افراد کی نفسیات پر بھی گہرے اثرات مرتب کیے۔ شمس الرحمن فاروقی ناول کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

> ”مٹی آدم کھاتی ہے اس لحاظ سے منفرد ہے کہ اس میں مشرقی پاکستان / بنگلہ دیش کی حقیقت سے آنکھ ملانے کی کوشش رومان اور تشدد کو یکجا کر دیتی ہے۔ اسے محمد حمید شاہد کی بہت بڑی کامیابی سمجھنا چاہیے کہ وہ ایسے موضوع کو بھی اپنے بیانیہ میں بے تکلف لے آتے ہیں جس کے بارے میں زیادہ تر افسانہ نگار گومگو کا شکار ہوں گے کہ فکشن کی سطح پر اس سے کیا معاملہ کیا جائے۔ دکھ شاید سب کچھ سکھا دیتا ہے۔“ [۱]

ناول کے راوی دو ہیں ایک خان صاحب کے گھوڑوں کی دیکھ بھال کرنے والا جس کا باپ بھی اسی کی طرح خاں جی کے گھوڑوں کی دیکھ بھال کرتے اور ان کی لید اٹھاتے ایک دن خاموشی سے مر گیا۔ دوسرا راوی خان جی کا بھتیجا اور داماد کیپٹن سلیم ہے جو اپنے ماں کے خواب کی تعبیر میں تعلیم حاصل کر کے فوج میں شمولیت اختیار کرتا ہے اور اس کا باپ اس کی پاسنگ آؤٹ پریڈ سے ایک دو روز پیشتر سڑک پر کسی نامعلوم گاڑی کی زد میں آ کر جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے اور جس کی موت کے متعلق اس کے بیٹے کو یقین تھا کہ اسے خاں جی نے اس کی زمین سے حصہ دینے کی بجائے موت کا تحفہ دیا۔ پھر اس کے بیٹے سے اپنی بیٹی زرجان کی شادی کروا دی۔ ناول میں سقوط ڈھاکہ کے سانحے کے حوالے سے بھی معلومات ملتی ہیں اور ناول کے ایک راوی کیپٹن سلیم کی پوسٹنگ ڈھاکے میں ہونے کی وجہ سے بنگال کی علیحدگی کی تحریک، پاکستانی فوج کا کردار اور مکتی باہنی کے ذریعے ہندوستان کی دراندازی کا حوالہ بھی ملتا ہے۔ وہیں کیپٹن سلیم کو اپنے دوست کی بیوی نبیہ جو بنگالی حسن کا نمونہ ہے سے محبت ہو جاتی ہے۔ وہ موسیقی اور ادب کا عمدہ ذوق رکھتی ہے۔ پیانو بجاتی ہے اس کی زلفیں گھٹا کی مانند گہری کالی ہیں۔ اس کے ملیح سراپا میں نزاکت اور دلکشی کیپٹن سلیم کو اس کا اسیر کر دیتی ہے لیکن یہ کردار ایک منفعل کردار ہے۔ مشرقی پاکستان سے ایک اسٹیمر کے ذریعے آنے والے کچھ افسروں کے ساتھ مغربی پاکستان واپسی کے لیے نبیہ بھی اس کے ساتھ آتی ہے لیکن اس کے ساتھی افسران حالات کی نزاکت دیکھتے ہوئے اس بنگالی لڑکی کو ساتھ لانے سے انکار کر دیتے ہیں۔ کیپٹن سلیم

(۱) شاید، محمد حمید، مٹی آدم کھاتی ہے، (کراچی: اکادمی بازیافت، ۲۰۰۷ء) ص ۱۵

بھی بزدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے خاموشی سے اسٹیمر میں بیٹھ جاتا ہے بلکہ جب مکتی باہنی والوں کی جانب سے چلائی گئی گولی اس کی ٹانگ میں لگی ہے تونبیہ سب کچھ بھول کر اسے اسٹیمر میں سوار ہونے میں مدد دیتی ہے خود وہ وہیں ساحل پر کھڑی رہتی ہے۔ اگلی گولی اسے لگتی ہے اس کا جسم جھٹکا کھاتا ہے تو وہاں پانی اچھلتا ہے۔ یہ آخری دفعہ تھی جب کیپٹن سلیم نے اسے دیکھا۔ اپنی بزدلی، نبیہ کی موت، پاکستانی فوج کی ہزیمت سب نے مل کر اس کے ذہنی توازن کو تلپٹ کر دیا۔ اب وہ بیٹھا مٹی ناخنوں سے کرید تا رہتا ہے اور دہراتا رہتا ہے۔

آدمی تو مٹی ہے

مٹی تو خاکی ہے بس خاک اڑاتی ہے......

مٹی تو مٹی ہے یہ اپنی کہاں رہتی ہے

مٹی تو مٹی ہے

مٹی میں پانی ہے

مٹی میں مستی ہے

مٹی تو مٹی ہے [۱]

پہلا راوی یادداشتوں پر مبنی یہ ڈائری یا مسودہ لکھتا رہتا ہے لیکن اس کی کوشش ہے کہ خاں جی کو اس تحریر کے متعلق پتہ نہ چلے۔ اس کی ڈیوٹی خاں جی نے اس متروک شخص کے ساتھ لگائی تا کہ وہ سارا دن اس کے ساتھ رہ کر اس کی ذہنی کیفیت کے متعلق رپورٹ خاں جی کو دے۔

''مٹی آدم کھاتی ہے'' ناول کی روایتی تکنیک کی بجائے مختلف حصوں اور ٹکڑوں میں لکھا گیا ہے جنہیں جوڑ کر کہانی کی تفہیم ممکن ہے اس میں دونوں راویوں کی کہانی ساتھ ساتھ چلتی ہے اور اس کے ساتھ پاکستان کی تاریخ کے اہم موڑ کو بھی ناول کے ماجرے کا حصہ بنایا گیا ہے۔ اگر ان سب واقعات کو سامنے رکھیں تو اس سے وہ استحصال سامنے آتا ہے جو زمین کے ٹکڑے کے حصول کے لیے خاں کی طرف سے روا رکھا ہے اور زمین کی حرص نے اسے اس طرح اندھا کر دیا کہ رشتوں کی قدر و قیمت اس کے سامنے ختم ہو گئی۔ ناول میں یہ استحصال انفرادی سطح پر بھی نظر آتا ہے اور قومی سطح پر بھی۔ اسی استحصال نے بنگالیوں کے اندر محرومیوں اور پھر بغاوت کو جنم دیا جس نے پاکستان کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔

مٹی آدم کھاتی ہے جدید تجربات کا حامل اکیسویں صدی میں لکھا جانے والا عمدہ ناول ہے تاہم عالم گیریت کے اثرات سے واحد مشترک نقطہ استحصال ہے جو اس ناول کا موضوع بھی ہے اور عالم گیریت کے نام پر دنیا کے بڑے حصے کو اسی استحصال کا سامنا ہے۔

---

(۱) محمد حمید شاہد، مٹی آدم کھاتی ہے، ص ۱۱۲، ۱۱۳

# دھنی بخش کے بیٹے

حسن منظر کا ناول دھنی بخش کے بیٹے پہلی بار ۲۰۰۸ میں شائع ہوا۔ اس سے پہلے ان کا ناول العاصفہ شائع ہو چکا تھا۔ مصنف ناول نگاری کے علاوہ افسانہ نگاری کی صنف میں اپنی پہچان رکھتے ہیں۔ حالیہ برسوں میں شائع ہونے والے ناولوں میں یہ ناول اپنے موضوع اور اسلوب کے اعتبار سے ایک اہم ناول ہے۔ یہ ناول شہرزاد پبلشرز سے شائع ہوا۔ انتساب آصف فرخی کے نام ہے۔ ۵۷۱ صفحات پر محیط اس ناول کو درج ذیل عنوانات کے تحت چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلی رت آرزو، دوسری رت فرار، تیسری رت کشمکش اور چوتھی رت شکست آرزو۔

سندھ کے ایک دور افتادہ گاؤں دھنی بخش میں ایک متوسط درجے کا زمیندار خاندان آباد ہے۔ گاؤں کا نام بھی اسی خاندان کے مرکزی کردار کے باپ کے نام پر ہے۔ ناول کے پلاٹ کا تانا بانا اسی خاندان کے گرد بنا گیا ہے۔ جو اس گاؤں کا مالک ہے۔ ناول کا موضوع استحصال ہے اور صدیوں سے رائج استحصالی نظام اور اس کے شکنجے میں جکڑے غریب لوگ ہیں جو اس نظام کو اپنی قسمت سمجھتے ہوئے اس کے ساتھ سمجھوتے کیے ہوئے ہیں۔ اس ناول کا راوی ہمہ دان ہے جو بیانیے کی دنیا سے الگ تھلگ ہے۔ واحد غائب ضمیر کے ذریعے ناول نگار کہانی کو بیان کرتا ہے۔ ناول کا لوکیل سرزمین سندھ ہے۔ بااثر جاگیر دار اور حکومتی طبقے کی آمرانہ سوچ کو موضوع بناتا ہوا یہ ناول سماجی حقیقت نگاری کی ایک عمدہ مثال پیش کرتا ہے لیکن ناول کا موضوع دو جہات کو پیش کرتا ہے۔ ایک پاکستانی سماج کی کمزوریوں، خامیوں بالخصوص عوام کی غلامانہ ذہنیت اور بااثر طبقے کی غاصبانہ طرز فکر اس ناول کے موضوع کی ایک جہت کو پیش کرتے ہیں۔ عوام کس طرح استحصال کا شکار ہیں اور ظلم کی چکی میں یوں پس رہے ہیں کہ انھیں یہ احساس ہی نہیں کہ ان کا استحصال کیا جا رہا ہے۔ ناول کی دوسری جہت کا تعلق ملک کی طبقاتی تقسیم، مذہبی منافرت، کرپشن، روزگار کے بہتر مواقع کی عدم دستیابی، غربت بے انصافی سے بچ کر ایک بہتر اور محفوظ زندگی کی طلب میں دیار غیر بسنے والے تارکین وطن کی عدم اطمینانیت اور اذیت ہے جو ایک ایسے معاشرے کا حصہ ہیں جو تہذیبی اور تاریخی حوالے سے بنجر ہے۔ جہاں خاندانی نظام منتشر ہے بزرگ اولڈ پیپل ہوم میں بسیرا کرتے ہیں۔ معاشرہ تنہائی کے خوف میں مبتلا ہے۔ ایسے میں وہاں آباد پاکستانیوں (ایشیائیوں) کو اپنے مذہبی اور قومی تشخص کو برقرار رکھنے کے لیے جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ وہ اپنی نئی نسل پر اس کلچر کے اثرات کو دیکھ کر پریشانی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

ناول کا آغاز احمد بخش کی امریکا سے واپسی سے ہوتا ہے جو سترہ اٹھارہ سال سے امریکا میں قیام پذیر ہوتا ہے اور اب اپنے بھائی علی بخش کی جاپانی کار میں کراچی سے اپنے گاؤں دھنی بخش جا رہا ہے۔ دھنی بخش ایک بڑا زمیندار تھا جس کے نام پر یہ گاؤں بسایا گیا ہے۔ دھنی بخش کے تین بیٹے تھے بڑا خدا بخش، منجھلا علی بخش اور سب سے چھوٹا احمد بخش۔ باپ کے مرنے کے بعد خدا بخش زمینداری سنبھال لیتا ہے۔ خدا بخش سلجھی ہوئی طبیعت کا نیک اطوار انسان ہے لیکن مختصر عمر لے کر پیدا ہوا تھا شاید اس لیے چار سال باپ کی جاگیر

کو کامیابی سے سنبھالنے کے بعد بخار میں مبتلا ہو کر چل بسا اور اپنے پیچھے جائید اد کے وارث دو بھائی علی بخش اور احمد بخش چھوڑ جاتا ہے۔ یہ دونوں طبیعت اور مزاج کے اعتبار سے ایک دوسرے کے بالعکس ہیں۔

علی بخش جاگیر داری معاشرے کی تمام تر قباحتوں کی حامل شخصیت ہے۔ بگڑے رئیس زادوں اور جاگیر داروں کے سبھی شوق رکھتا ہے۔ حویلی کا وہ حصہ جہاں خواتین کا جانا ممنوع ہے اس کی عیاشیانہ سر گرمیوں کا اڈہ ہے۔ حرمت اس کی بیوی ہے جو اس کے تمام منفی مقاصد میں معاون اور اس تمام کمزوریوں کو قبول کرنے والی جاگیر دارانہ سماج میں رہنے والی صابر و شاکر عورت ہے۔

احمد بخش کر دار کے لحاظ سے اپنے بڑے بھائی خدا بخش سے مماثلت رکھتا ہے اور علی بخش کے بالکل الٹ نرم مزاج اور باشعور انسان ہے۔ تعلیم سے محبت رکھتا ہے۔ انسان دوست ہے۔ اس کی دوستی اپنے گاؤں کی مسجد کے پیش امام عبد الرحمن سے ہے۔ ان دونوں کی ایک بہن عائشہ ہے جو نابینا ہے۔ ایک دفعہ سردیوں میں نمونیہ کا شکار ہوتی ہے اور مناسب طبی امداد نہ ملنے کی بنا پر دنیا سے چلی جاتی ہے۔ علی بخش ایک دفعہ اپنی عیاشی کے لیے ایک کمسن لڑکی مردانے میں بلواتا ہے۔ لڑکی کسی طرح بھاگ کر زنانے میں پہنچ کر مدد طلب کرتی ہے۔ جس پر احمد بخش طیش میں آکر بھائی کی زندگی میں مداخلت کرتا ہے اور لڑکی کو بحفاظت واپس بھجوا دیتا ہے۔ علی بخش اس کے غصے سے خائف ہو جاتا ہے لیکن احمد بخش کی دلچسپی جاگیر داری اور اس کے دیگر امور کی بجائے پڑھائی میں ہے اس لیے وہ ایم اے انگریزی ادب کی ڈگری لے کر امریکا چلا جاتا ہے۔ اسی دوران کی اس ماں ستارہ فالج کا شکار ہو کر چل بسی تو علی بخش بلا شرکت جاگیر کا نیا حکمران بن جاتا ہے۔ یہاں ناول کے دوسرے حصے فرار کا آغاز ہوتا ہے۔ اب ناول کا لوکیل امریکا منتقل ہو جاتا ہے۔ نیا ماحول نئے حالات نئی طرز زندگی میں احمد بخش اجنبیت محسوس کرتا ہے۔ امریکا میں وہ اپنے وطن میں روا رکھی جانے والی ناانصافی اور استحصال سے تو نجات حاصل کر لیتا ہے لیکن یہاں نیا طرز زندگی نیا مسائل لے کر آتا ہے۔ اسے اندازہ ہوتا ہے کہ اس ملک میں رہنے والے تنہائی سے خوفزدہ ہیں۔ اس معاشرے کی تہذیبی جڑیں نہیں ہیں۔ اس ملک میں ہر ملک و قوم کے لوگ موجود ہیں جو یہاں روٹی تو کمانا چاہتے ہیں لیکن مرنا وہ اپنے ملک میں چاہتے ہیں اور اپنی مٹی میں دفن ہونے کی خواہش رکھتے ہیں۔ احمد بخش بھی اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکا آیا تھا لیکن تعلیم مکمل کرنے کے بعد اسے یونیورسٹی میں جاب مل جاتی ہے۔ وہ ماضی اور اپنی مٹی کے سحر سے نکل نہیں پاتا اور ناسٹلجیا کا شکار ہو کر طلبا کو اپنے ملک کی روایات اور رہن سہن کے متعلق معلومات فراہم کرتا ہے۔ اس مادیت پرست معاشرے کے باشعور طلبا اسے اور اس کے ملک کو آئیڈیلائز کرتے ہیں۔ کچھ عرصے بعد احمد بخش اولا جو سویڈش لڑکی ہے سے شادی کر لیتا ہے۔ اولا احمد بخش کی ہمدرد انسان ہے۔ اولا کے سامنے وہ اپنے دل کے دکھڑے رو لیتا ہے۔ اپنے وطن کی پسماندگی، جہالت استحصال اور اپنے گھر کے مسائل کے حوالے سے غبار نکالتا ہے۔ احمد بخش کی زندگی میں کشمکش کا آغاز اس وقت ہوتا ہے جب اس کے ہاں بچے کی پیدائش ہوتی ہے۔ ایک طرف اولا ہے جو امریکی معاشرے میں تشدد کے بڑھتے ہوئے رجحان سے تشویش کا شکار ہو رہی ہے تو دوسری طرف احمد بخش کو امریکی معاشرے کی بے راہ روی اور جنسی معلومات کی عام دستیابی پریشان کرتی ہے۔ نہ صرف احمد بخش بلکہ دیگر ایشیائی باشندے بطور خاص پاکستانی اور

ہندوستانی اسی کشمکش کا شکار ہیں کہ ایسے معاشرے کی آزاد فضاؤں میں اپنی نئی نسل کو کیسے ان خرافات سے بچا کر رکھیں یا پھر انہیں واپس اپنے دیس لے جائیں جہاں غربت ہے جہالت ہے اور استحصال بھی ۔ لیکن اپنا کلچر اپنی تہذیب ہے جہاں کی زندگی مشینی انداز کی نہیں ہے یعنی مادیت سے دور ہے۔ یہ تفکرات احمد بخش اور اولا کے مابین سرد مہری کو جنم دیتے ہیں تو وہ اپنے کالج کے دوست جو کہ مصور ہے کہ گھر سکاٹ لینڈ چلا جاتا ہے۔ یہ ایک پاکستانی مذہبی گھرانا ہے جو اپنی تہذیب اور اپنے مذہب سے جڑے ہوئے ہیں۔ یہاں احمد بخش سکون محسوس کرتا ہے اور اب اس میں وطن واپس جانے کا حوصلہ بھی پیدا ہو جاتا ہے۔

دوسری طرف پاکستان میں علی بخش اپنے طرز عمل پر مستقل مزاجی سے عمل پیرا ہے اور حرمت کے بعد لاڈلی سے بیاہ رچاتا ہے۔ پھر حور بائی کی بیٹی زلیخا اس کی تیسری بیوی بن کر اس کی زندگی میں آتی ہے اور ایک بیٹے اور بیٹی کی پیدائش کے بعد تیسرے بچے کے حمل میں جان سے چلی جاتی ہے۔ اس کے بعد روشنی اس کی چوتھی بیوی بن کر آتی ہے اور ایک بیٹی پیدا کر کے گھر سے بھاگ جاتی ہے۔ علی بخش کی زندگی کا مرکز و محور جنس ہے۔اور اب وہ ایک نابالغ بچی مریم سے نکاح کرتا ہے۔ حرمت ہی لاڈلی کے بچوں کو پال رہی ہے اور مریم کو بھی حرمت ہی پال رہی ہے۔

وطن واپسی پر احمد بخش کو ملکی حالات میں کوئی تبدیلی نظر نہیں آتی سوائے آبادی میں اضافے کے۔ گاؤں میں احمد بخش کی ملاقات اس کے بچپن کے دوست مولوی عبد الرحمن سے ہوتی ہے جو امام مسجد اور کئی بچوں کا باپ ہے۔ تھوڑی بہت زمین سے اس کی گزر بسر صبر شکر کے ساتھ ہو رہی ہے۔

احمد بخش علی بخش کے کم سن بیوی کے ساتھ زبردستی ازدواجی تعلق قائم کرنے کو ریپ کا نام دیتا ہے تو علی بخش احساس جرم اور طیش سے مغلوب ہو کر مریم کو طلب کرتا ہے۔ حرمت نیند میں سوئی ہوئی مریم کو علی بخش کے پاس چھوڑ جاتی ہے۔ علی بخش کی زبردستی کے نتیجے میں مریم کی حالت بگڑ گئی احمد بخش اندھا دھند گاڑی چلا کر ڈاکٹر کو لینے چلا جاتا ہے اور ڈاکٹر کو ڈالر دکھا کر اس کے علاج پر آمادہ کر لیتا ہے۔ جبکہ اس جرم میں شریک حرمت اور اصل مجرم علی بخش کو کسی قسم کی ندامت نہیں۔ بلکہ کسی مرد ڈاکٹر سے مریم کے علاج کو بھی ہدف ملامت بنایا جاتا ہے۔ یہ واقعہ اور گھر والوں کا رد عمل دیکھ کر احمد بخش اگلے روز امریکا واپسی کے لیے رخت سفر باندھ لیتا ہے اور اس کے اپنے وطن اور علاقے کو سدھارنے کے عزائم سرد پڑ جاتے ہیں۔ امریکا واپس جا کر احمد بخش کے اندر اداسی جنم لیتی ہے لیکن وہ کشمکش سے چھٹکارا حاصل کر لیتا ہے جو اسے اپنے وطن اور اس غیر وطن کے درمیان معلق رکھتی تھی۔

ناول کا بنیادی موضوع کمزور طبقات بالخصوص عورت کا استحصال ہے۔ عورت شاید کمزور طبقے کا بھی کمزور ترین طبقہ ہے جسے وہ اپنی غرض مفاد کے لیے چند ٹکوں کے عوض کسی کے بھی ہاتھ فروخت کر دیتے ہیں اور اس کی حالت کا اندازہ مریم جیسی کمسن اور نابالغ بچیوں کی حالت زار سے بخوبی ہو جاتا ہے۔ جنہیں ان کا باپ چند ٹکوں کے عوض وڈیروں، جاگیرداروں کے ہاتھوں نکاح کے نام پر فروخت کر دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ عائشہ جیسی بچیاں بھی جن کا علاج نہیں کروایا اور ان کے مر جانے پر شکر ادا کیا جاتا ہے کہ اچھا ہوا

چلی گئی بڑی ہو جاتی تو کون اس سے شادی کرتا۔ بوجھ بن کر زندہ رہتی۔ یا پھر زلیخا جیسی لڑکیاں جو پیدا ہی خاندانی رسوم و رواج کی بھینٹ چڑھنے کے لیے ہوئی ہیں۔ یہاں حرمت کے کردار کا تذکرہ بھی ضروری ہے جو علی بخش کے ہر برے فعل میں حصہ دار ہے۔ جو اپنی سوتیلی اولادوں کو پالتی ہے جو خود علی بخش کے لیے دلہن تیار کر کے حجلۂ عروسی میں پہنچاتی ہے گویا وہ احساسات و جذبات رکھنے والی گوشت پوست کی عورت نہ ہو کوئی پتھر کی مورت ہو۔ لیکن یہ جبر وہ جاگیر داری سماج کے تحت برداشت کر رہی ہے۔ جہاں عورت کی حیثیت مرد کے استعمال کی چیز سے زیادہ نہیں۔ استحصال صرف یہیں دیہی معاشرے میں ہی نہیں ہے اعلیٰ سرکاری حکام اور سیاستدان بھی اپنے طرزِ عمل سے عوام کی زندگی اجیرن کیے رکھتے ہیں۔ وزیر اعظم کی سواری کو سڑک سے گزارنے کے لیے گھنٹوں ٹریفک روک کر لوگوں کو سڑکوں پر مرنے کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے اور ان کی زندگی کی کوئی قیمت نہیں۔ پاکستانی معاشرے کے تناظر میں یہ ناول Have اور Have not کی ترجیحات کی عکاسی کرتا ہے۔

اس حوالے سے مہرونہ لغاری لکھتی ہیں:

> "یہ ناول پاکستانی لوکیل میں haves and haves not کی ترجیحات کی عکاسی کرتا ہے تو امریکا میں معاشرتی طرزِ زندگی کی ایسی تصویر کشی جو انسان کو تنہائی اور اکیلے پن کے ایسے خوف میں مبتلا کر رہی ہے جہاں جا کر انسان کی تمام تر مادی ترقی اسی بنیادی انسانی ضرورت کے تابع ہو جاتی ہے جس کا تعلق احساسِ رفاقت، مروت، لگاؤ اور بے لوث خدمت ہے۔" (۱)

اس موضوع کے ساتھ ساتھ یہ ناول پاکستانی جاگیر داری معاشرے اور جدید امریکی معاشرے کے درمیان تقابل کو بھی پیش کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اسے تہذیبی تصادم کا نام بھی دیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ احمد بخش جو خود ابتدائی طور پر اس معاشرے میں اجنبیت محسوس کرتا ہے لیکن رفتہ رفتہ اسے اپنا لیتا ہے لیکن بچوں کی پیدائش اسے عدم تحفظ کا شکار کر دیتی ہے کہ اس کے بچے وہاں جنسی تعلیم حاصل کریں گے؟ روایتی پاکستانی معاشرے کا پروردہ اپنی اولاد کے حوالے سے ایسے ہی تحفظات کا شکار ہو گا۔ مصنف نے پاکستانی اور امریکی معاشرے کی خوبیوں خامیوں دونوں کو حقیقت پسندانہ انداز میں اجاگر کیا ہے۔ اس حوالے سے روبینہ سلطان لکھتی ہے:

> "دھنی بخش کے بیٹے کی آئیڈیالوجی میں دو تہذیبوں کا تصادم اور اس میں پائی جانے والی برائیوں اور کمزوریوں کو منظرِ عام پر لانے کی کوشش کی گئی ہے ... تہذیبوں کے درمیان تصادم کو کچھ ایسے عمل کے ذریعے سماج کے سامنے رائج کیا کہ لوگ اسے فطری سمجھتے ہیں۔" (۲)

---

(۱) مہرونہ لغاری، *حسن منظر: ادبی خدمات*، (ملتان: شعبہ اردو بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ۲۰۱۴ء)، ص ۱۷۷

(۲) روبینہ سلطان، *تین نئے ناول نگار*، (لاہور: دستاویز، ۲۰۱۶ء) ص ۱۰۶۔۱۰۷

یہی تہذیبی تصادم آج عالمگیریت کی حامل دنیا کی سب سے بڑی علامت ہے۔ عالمگیریت اسی امریکی تہذیب اور اس کے مظاہر اور اداروں کو تمام دنیا پر منطبق کر کے ایسی یک رنگی دنیا معرض وجود میں لانے کی خواہاں ہے جو اس کے معاشی مقاصد سے ہم آہنگ ہو۔ لیکن یہ یک ثقافتی دنیا افراد کے اندر کس طرح کے ذہنی و نفسیاتی بحران کو جنم دے گی اس کا اندازہ احمد بخش کے کردار سے ہوتا ہے جو امریکی معاشرے میں رہتے ہوئے بھی وہاں کے طرز زندگی سے اجنبیت محسوس کرتا ہے اور اپنے بچوں کو اس ثقافت کے ضرر رساں اثرات سے بچانا چاہتا ہے۔ اس تہذیبی تصادم کی کئی مثالیں ناول میں موجود ہیں۔ مثلاً یہ اقتباس دیکھیے:

> "وہ اس قوم کی فرد نہیں ہے جہاں لوگ سوگ منانے کے لیے جیتے رہتے ہیں۔ جیسے کچھ اور کرنے کے لیے نہ ہو، ہو سکتا ہے وہ کسی اور ملک چلی جائے کسی بھی عمر میں دوسری شادی کر لے، اس کے لیے سٹاک ہوم لوٹ جانا کیا برا ہو گا۔ تمہاری تہذیب کی نشانیاں کچھ اور ہیں اس کی تہذیب کی کچھ اور۔ تم محبت کا اندازہ اس سے کرتے ہو کہ سوگوار رکھاؤ بھول جائے اور جتنی عمر ذہنی طور پر مردہ ہو کر جیے۔" (۱)

امریکی معاشرے میں رہ کر اس کو قریب سے دیکھ کر احمد بخش بے سکونی کا شکار ہو چکا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ یہ ایک بے جڑ کا معاشرہ ہے اگرچہ اس معاشرے میں ہر قوم ہر مذہب کے افراد کو بلا تخصیص مذہب، رنگ نسل اپنے اندر سمیٹنے کی گنجائش موجود ہے۔ اس معاشرے میں دو چیزیں قابل قدر ہیں ایک شخصی آزادی اور دوسری محنت۔ اپنے اصل کے اعتبار سے یہ معاشرہ مادیت پرست ہے اور اس سماج میں سب سے نایاب چیز وقت ہے، زندگی بالکل میکانکی انداز سے جاری و ساری رہتی ہے۔ اگرچہ اس معاشرے کی ترقی نگاہوں کو خیرہ کر دیتی ہے لیکن اس کے اندر کئی طرح کی قباحتیں موجود ہیں۔ یہ مادر پدر آزاد معاشرہ ہے یہاں جنس اور جنسی تعلیم کھلے عام دستیاب ہے اور ان سے بڑھ کر تنہائی کا عفریت ہے۔ جس سے اس معاشرے کے لوگ خوفزدہ ہیں۔ اس حوالے سے یہ اقتباس دیکھیے:

> "میں جتنی بار اس سے ملنے گیا میں نے اسے ایک ہی خوف میں مبتلا پایا: میں اگر یہاں مر گئی تو؟ مرنے کے بعد کون رات کو میری روح کا انتظار کرے گا۔ مجھے لے جا کر قبرستان میں دبا آئیں گے اور جلد میری قبر بے نام ہو جائے گی۔ لگتا تھا میری بے چینی مجھے چھوڑ کر اس میں آ گئی تھی..." (۲)

مادیت پرستی نے روحانیت پر غلبہ پا کر اسے تہذیب بدر کر دیا تھا۔ یہاں کا نوجوان طبقہ ان اقدار کا جن کا تعلق انسان کی ہمدردی، لگن، جذبہ محبت اور خدمت سے ہے دلدادہ ہے۔ ان کا معاشرہ چونکہ ان احساسات سے عاری ہے لہٰذا یہ احساسات وہاں

---

(۱) حسن منظر، ڈاکٹر سید، دھنی بخش کے بیٹے، (کراچی: شہرزاد، ۲۰۰۸ء)، ص ۳۹۵

(۲) ایضاً، ص ۱۷۹

گراں قدر جنس کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مغربی معاشرے کی آزادی ایک ایسے موڑ پر پہنچ چکی ہے جہاں تمام رشتے ناطے توڑ پھوڑ کا شکار ہیں۔ معاشرہ تشدد اور جنس کے سیلاب بلاخیز میں بہتا جارہا ہے۔ معاشرے کو درپیش بڑے بڑے سوالات میں یہ ہیں:

> ’’بچوں میں خودکشی اور ان کے والدین میں علاحدگی کے رجحان میں کیا تعلق ہے۔ کیوں ایکاایکی ایک بظاہر بردبار عمر کا آدمی یا ایک سکول کا لڑکا بندوق ہاتھ میں لے کر موت کے خطرے سے ناآگاہ غافل مردوں عورتوں اور بچوں کے ایک گروہ کے خون کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے اور کیوں بہت سے مرد اور عورتیں شادی کے ڈورے کو بودا سمجھ کر بغیر شادی کے ایک دوسرے کے ساتھ رہنے کو ترجیح دیتے ہیں اور کیوں کبھی کبھی بیس تیس سال نکاح میں رہنے کے بعد اچانک علیحدہ ہو جانے پر تیار ہو جاتے ہیں۔‘‘ (۱)

حسن منظر نے اپنے اس ناول کے ذریعے دونوں معاشروں (پاکستانی اور امریکی) کی تہذیب و معاشرت کی وہ جھلکیاں پیش کی ہیں جن کا تعلق افراد کے اخلاق و کردار سے ہے اور ان جھلکیوں کو پیش کرنے میں ان کا ناقدانہ شعور موثر کردار ادا کرتا ہے۔ ایک معاشرہ مذہب کا لبادہ اوڑھ کر ریاکاری کرتا ہے اور اس لبادے کے نیچے وہ ان جرائم کا ارتکاب کرتا ہے جو لادینی معاشروں میں بھی نظر نہیں آتے۔ دوسری طرف وہ معاشرہ جو مادیت پرست ہے لیکن اس کی اپنی خوبیاں ہیں۔ ایشیائی لوگ اس حوالے سے جن الجھنوں کا سامنا کرتے ہیں حسن منظر اس کو موضوع بناتیں ہیں اور احمد بخش ناول کے اختتام پر واپس امریکا جانے کا فیصلہ اپنے ملک و قوم کی تقدیر سے مایوس ہو کر کرتا ہے۔

---

(۱) حسن منظر، دھنی بخش کے بیٹے، ص ۱۰

# صفر سے ایک تک

مرزا اطہر بیگ کا ناول صفر سے ایک تک ۲۰۰۹ میں پہلی بار شائع ہوا۔ اس سے پہلے ان کا ناول غلام باغ شائع ہو کر ادبی حلقوں سے مقبولیت کی سند حاصل کر چکا تھا۔ ۳۹۳ صفحات پر مشتمل یہ ناول دراصل ایک سائبر سپیس منشی کی سرگزشت ہے جس کا نام ذکاءاللہ ہے اور اس کے بزرگ تقریباً گذشتہ ایک صدی سے کوتل سالاراں کے سالار خاندان میں منشی گیری کا فریضہ سرانجام دے رہے ہیں۔ ناول کا انتساب ایلن ٹیورنگ کے نام ہے (جسے Father of Computer Sciences and Artificial Intelligence کہا جاتا ہے) اپنے موضوع کی جدت اور انفرادیت کی بنا پر یہ ناول اکیسویں صدی کا جدید منظر نامہ پیش کرتا ہے۔ ناول اول تا آخر کمپیوٹر پروگرامنگ، انٹرنیٹ اور اس کے استعمال کی نئی نئی دریافتوں کا بیانیہ ہے۔ مرزا اطہر بیگ اس میں سائبر اسپیس کا جو تصور پیش کرتے ہیں وہ مکانیت سے ماورا ہے اور دنیا بھر کے کمپیوٹروں کا ایک مربوط سلسلہ ہے۔ انٹرنیٹ ان کمپیوٹرز کے باہمی انسلاک کا ذریعہ ہے۔ بہر حال مصنف نے اس ناول کے ذریعے کمپیوٹر پروگرامنگ اور نئی نئی ویب سائٹس سے متعلق جو معلومات فراہم کی ہیں ان کی بناء پر یہ ناول جدت کا حامل ایک نیا تجربہ نظر آتا ہے اور ایک نایاب تجربہ بھی۔ اس ناول کا راوی واحد متکلم حاضر یعنی ذکاءاللہ کا ہے جو ناول کے آغاز میں ہی اپنا تعارف کرواتا ہے۔

> ''میرا نام ذکاءاللہ ہے پیار سے بعض لوگ مجھے ذکی اور دھتکار سے ذکو کہتے ہیں۔''(۱)

اپنے تعارف کے بعد وہ اپنے خاندان کا تعارف کرواتا ہے:

> ''میرے والد صاحب منشی عطااللہ موضوع کوتل سالاراں کے جاگیر دار حیات محمد سالار کے منشی تھے۔ دراصل سالار برادری کی ایک شاخ کی منشی گیری ہم آبائی طور پر کرتے رہے ہیں۔''(۲)

ناول کا پلاٹ ان خاندانوں سالار برادری کی اس شاخ جس سے منشی عطا کے باپ دادا بطور منشی منسلک رہے کے درمیان واقعات کے تانے بانے کے گرد گھومتا ہے اور کہانی آغاز اس وقت ہوتا ہے جب ذکاءاللہ اور سالار خاندان کا چشم و چراغ فیض سالار میٹرک کے بعد بغرض تعلیم لاہور کا رخ کرتے ہیں اور اپنی اپنی مالی حیثیت کے مطابق اداروں میں داخلہ لیتے ہیں۔ ذکااللہ اپنے لیے کمپیوٹر سائنس کے مضمون کو منتخب کرتا ہے جبکہ فیضان سالار ہسٹری جیسے سوشل سائنس کے مضمون کو منتخب کرتا ہے لیکن اہم بات یہ ہے کہ کوتل سالاراں سے لاہور کی جانب سفر کے دوران فیضان کا رویہ ذکااللہ کے حوالے سے یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ اسے اپنے ہم

---

(۱) اطہر بیگ مرزا، *صفر سے ایک تک*، (لاہور: سانجھ پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء) ص ۷

(۲) ایضاً

جماعت دوست سے زیادہ منشی سمجھتا ہے جس نے آگے چل کر اس کے لیے وہی فرائض سرانجام دینے ہیں جو منشی عطا اللہ اس کے والد کے لیے سرانجام دیتا رہا ہے۔ ذکا اللہ لاہور کے ایک غیر اہم علاقے میں واقع ایک غیر معروف کمپیوٹر کالج سے کمپیوٹر کی تعلیم حاصل کرتا ہے لیکن یہاں دو چیزیں اس کے لیے بہت معاون ثابت ہوتی ہیں۔ ان میں ایک تو اس کا ذہن ہے اس کے خاندان میں نسل در نسل منشی گیری کی نوکری کرتے ہوئے حساب کتاب اور اعداد و شمار کے حوالے سے غیر معمولی تیزی اور ذہانت پیدا ہو جاتی ہے اور یہ ذہانت اسے کمپیوٹر کی تعلیم میں بھی مددگار ثابت ہوتی ہے اور دوسرا اس کا ایک استاد جو خود بھی مالی طور پر غیر مستحکم ہونے کی بنا پر اس کالج میں نوکری کر کے اپنی تعلیم جاری رکھے ہوئے ہے وہ ذکا اللہ کے جوہر کو پہچان کر اس پر غیر معمولی توجہ اور شفقت سے اس کی رہنمائی کرتا ہے۔ اسی طرح ذکا اللہ کمپیوٹر پروگرامنگ، ہارڈ ویئر اور سوفٹ ویئر کا ماہر بن جاتا ہے دوسری طرف فیضان سالار ہسٹری میں ایم اے کر کے اسی کالج کو بطور لیکچرار جوائن کر لیتا ہے۔ کہانی میں اہم موڑ تب آتا ہے جب سالار فیملی کی ایک تقریب میں زلیخا خلجی جو ایک پاکستانی باپ اور فرانسیسی ماں کی بیٹی ہے تمام کنوارے مردوں اور ان کی ماؤں بہنوں کی توجہ کا مرکز بن جاتی ہے اور ان میں سے ہر ایک سالار اسے رجھانے اور مائل کرنے کی کاوش میں مصروف ہے۔ زلیخا خلجی جس کے والدین کے درمیان طلاق ہو چکی ہے اپنے باپ کا ملک دیکھنے پاکستان آئی ہے لیکن وہ نہیں جانتی کہ اس کا پاکستان آنا صرف اس کی خواہش کا نتیجہ نہیں۔ اس کا باپ اسے لاہور میں مقیم متمول سالار فیملی کے ہاں ٹھہرا کر بزنس مصروفیت کی بنا پر واپس لوٹ جاتا ہے تو وہ یہاں خود کو کسی سازش کے شکنجے میں محسوس کرتی ہے۔ فیضان سالار بھی زلیخا خلجی سے متاثر ہے وہ ذکا کو اس کے متعلق معلومات حاصل کرنے اس کے پاس بھیجتا ہے لیکن ابتدائی تعارف کے بعد وہ ذکا سے ایک سوال پوچھتی ہے کہ یہ سالار کیسے لوگ ہیں۔ ذکا وقتی طور پر اسے ٹال دیتا ہے لیکن زلیخا خلجی کو اس تقریب میں وہ واحد غیر سالار شخص ملتا ہے اس لئے وہ اس سے رابطہ رکھنا چاہتی ہے۔ اس لیے تقریب سے واپسی پر اسے اپنا ای میل ایڈریس دیتی ہے لیکن زلیخا خلجی کے ساتھ اس کا گفتگو کرنا سالاروں کو ناگوار گزرتا ہے۔ بہر حال ایک آدھ دن بعد وہ سالار فیملی سے اٹھ کر ایک ہوٹل میں منتقل ہو جاتی ہے اور اب ذکا اسے سالار نیٹ ورک کا بتاتا ہے۔ زلیخا خلجی تین دن ہوٹل میں ٹھہرتی ہے ذکا ایک گائیڈ کے طور پر اسے لاہور کی سیر کرواتا ہے۔ ان دونوں کے درمیان دوستی کا رشتہ استوار ہو جاتا ہے لیکن زلیخا خلجی کا یوں گھر سے خاموشی سے چلے جانا سالاروں کو مشتعل کر دیتا ہے ان کو شک ہے کہ ذکا اللہ زلیخا کی موجودگی سے باعلم ہے۔ زلیخا خلجی واپس فرانس چلی جاتی ہے تو سالاروں کا مقصد ناکام ہو جاتا ہے۔ اب وہ ذکا اللہ کو اغوا کر کے کسی ایسی جگہ قید کر دیتے ہیں جہاں آرا دن رات لکڑیاں کاٹتا رہتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اسے نفسیاتی طور پر تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ وہ کئی دن لاپتہ رہتا ہے اس کے بعد اسے چھوڑ دیا جاتا ہے لیکن اب وہ فیضان سالار سے الگ رہنے کا فیصلہ کرتا ہے اور اپنے سانده کے تھڑا کانفرنس کے دوستوں سے مشورہ کر کے کمرہ کرائے پر لے لیتا ہے لیکن جانے سے پہلے وہ فیضان سالار کے ذہن میں ایک نیا وائرس یعنی ایک نئی سوچ غیر محسوس طریقے سے داخل کر دیتا ہے۔ دراصل وہ فیضان سالار کو سالار فیملی کے خلاف استعمال کرنا چاہتا ہے اور اس کے علاوہ وہ اپنے باپ منشی عطا اللہ کو کمپیوٹر کا استعمال سکھا کے سالار

فیملی کا سارا ریکارڈ جو بطور منشی ان کے پاس محفوظ تھا اسے کمپیوٹر میں منتقل کر دیتا ہے لیکن اس دوران حیات سالار کو شک ہو چکا ہے کہ ان کا فیملی پراپرٹی ریکارڈ کمپیوٹر میں منتقل کیا گیا ہے۔ اب فیضان سالار رفتہ رفتہ وعدہ معاف گواہ کے طور پر اپنے ہی خاندان کی بداعمالیاں معاشرے کے اور قانون کے سامنے لانے کا فیصلہ کرتا ہے۔ اس سارے وقت کے دوران ذکا اللہ کا بڑا بھائی ثنااللہ کئی شادیاں کرتا ہے اس کے بعد پیری مریدی کا ایک ڈیرہ کھولتا ہے اور خوب پیسہ روپیہ کما کر ایک پر تعیش زندگی گزارتا ہے۔ فیضان سالار کے بدلے ذہنی رویے کا ذمہ دار ذکا کمپیوٹر والے کو سمجھا جاتا ہے جو اب خود کو سائبر سپیس منشی کہتا ہے۔ منشی عطا کی تمام تر وضاحت کے باوجود ذکا اللہ پر فائرنگ کروا کے اسے خوفزدہ کیا جاتا ہے تو اب وہ ذہنی طور پر اتنا منتشر ہو چکا ہے کہ اس کے پاس اب اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں کہ اپنے بھائی ثناءاللہ کے پاس پناہ لے کر کچھ عرصہ اپنے ذہن کو سکون دے۔ ثناء اللہ اس کے سکون کا بندوبست گامو کی صورت میں کرتا ہے۔ لیکن یہ بندوبست ذکاء اللہ کی زندگی کو خطرے سے دوچار کر دیتا ہے۔ ڈیرے پر قیام کے دوران ذکا اللہ اور زلیخا خلجی کے تعلقات نشیب و فراز کا شکار ہو جاتے ہیں۔ سالار خاندان منشی عطا اللہ کا کمپیوٹر سسٹم اور سی ڈی وغیرہ تباہ کر جاتے ہیں تاکہ ان کے اعمال کا کوئی ریکارڈ موجود نہ رہے لیکن نہیں جانتے کہ ذکاءاللہ ڈرافٹ کی صورت میں یہ سارا ریکارڈ اپنے ای میل اکاؤنٹ میں محفوظ کر چکا ہے۔ اس سارے عرصے کے دوران وہ ایک کمپیوٹر گیم کی پروگرامنگ کر رہا ہے۔ ثنااللہ کے ڈیرے پر پولیس کے چھاپے کے بعد اسے پولیس پکڑ کر لے جاتی ہے جبکہ ذکا اللہ کو اس ڈیرے پر جو بھالیکے گاؤں میں واقع ہے جاتے ہوئے سالاروں کے غنڈے زدوکوب کرتے ہیں اور وہ بمشکل جان بچانے میں کامیاب ہوتا ہے۔ آخر کار وہ ثناء اللہ کی بیوی بچوں کے پاس جو ایک محفوظ جگہ پر روپوش ہیں پہنچنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اس کے والدین اور بہنیں بھی وہیں پناہ لیتے ہیں کیونکہ ان کا گھر سالاروں نے تباہ و برباد کر دیا ہے۔ لیکن منشی عطا اللہ میں یہ جرأت نہیں کہ وہ اس توڑ پھوڑ کا ذمہ دار سالار خاندان کو ٹھہرائے۔ وہ اپنے دوست ہیڈ ماسٹر اللہ دتہ کے مشورے سے نامعلوم افراد کے خلاف ڈکیتی کا مقدمہ درج کرواتا ہے۔ اب ذکا اللہ اپنے باپ اور بھتیجے کے ساتھ مل کر کمپیوٹر ٹریننگ سکول کھولتا ہے۔ نئی نسل کا رجحان کمپیوٹر کی جانب ہونے کی وجہ سے ان کا یہ چھوٹا ادارہ چل نکلتا ہے۔ اب ذکا اللہ اور زلیخا خلجی کے معاملات درست ہو چکے ہیں۔ وہ اس سے ملنے کے لیے لاہور آنا چاہتی ہے۔ اتفاق سے اس کو وہیں دیگر صحافیوں کے ہمراہ دنیا کے خطرناک علاقے میں رپورٹنگ کے لیے بھیجا جاتا ہے۔ واپسی پر وہ لاہور قیام کا ارادہ کرتی ہے اور ذکا اللہ کو اپنے لاہور پہنچنے کی تاریخ سے آگاہ کرتی ہے لیکن اس کے پورے گروپ کو اغوا کر لیا جاتا ہے اور وہ کبھی لاہور نہیں پہنچ پاتی۔ اس کے گروپ کے ارکان کو یکے بعد دیگرے اغوا کنندگان کے مطالبے پورے نہ ہونے پر ذبح کر دیا جاتا ہے۔ فیضان سالار کو کانفرنس سے اغوا کر کے اسے گھر میں قید کر دیا جاتا ہے اور اسے ذہن کو ماؤف کرنے والے انجکشن لگائے جاتے ہیں۔ لیکن اس سارے عرصے میں اس کا رابطہ ذکا اللہ کے ساتھ برقرار رہتا ہے اور وہ اپنے پاس محفوظ سالار فیملی کے ریکارڈ میں سے اہم چیزیں فیضان کو میل کرتا رہتا ہے جو آجکل سالار خاندان کی بداعمالیوں کے حوالے سے خفیہ طور پر کتاب لکھنے میں مصروف ہے۔

زلیخا خلجی کے انتظار میں شب و روز گزارتے ذکااللہ کے کمپیوٹر کالج میں ایک صاحب بہت ماڈرن حلیے میں آتے ہیں قریب آنے پر پتہ چلتا ہے وہ بھائی ثنااللہ ہے جو کراچی ایک ایسی خاتون کے پاس پہنچ جاتا ہے جو ابھی تک ان کی منکوحہ ہے اور ثقافتی طائفے عرب ملکوں کو بھجواتی ہے۔ ثنااللہ بھی اس گروپ کا حصہ بن جاتا ہے اور اب وہ ہر مہینے چھپ کر رات میں اپنے بیوی بچوں سے ملنے آتے رہتے ہیں۔ یہی ناول کا اختتام ہے۔ اکیسویں صدی میں لکھے جانے والے ناولوں میں صفر سے ایک تک ایک منفرد انداز اور موضوع کا حامل ناول ہے۔ ناول کا کیبری کردار ذکااللہ چونکہ کمپیوٹر پروگرامنگ سافٹ ویئر ڈیزائننگ ویب ڈیزائننگ کے شعبے سے تعلق رکھتا ہے اس لیے اس میں کمپیوٹر سے متعلق اصطلاحات اور معلومات کی کثرت ہے اور جس انداز اور مقدار میں یہ معلومات ناول کا حصہ بنتی ہیں وہ اس سے قبل اردو ناول کی تاریخ میں اس کی مثال موجود نہیں ہے۔ اس حوالے سے یہ ناول عالمگیریت کی ایک اہم خصوصیت یعنی جدید ٹیکنالوجی کو ناول کے ماجرے کا حصہ بناتا ہے اور کمپیوٹر کی اصلاحات کے پردے میں بعض اہم تصورات کو پیش کرتا ہے مثلاً فیضان سالار کی کایا کلپ کو وائرس کا نام دیا جاتا ہے۔ اسی طرح ذکااللہ کمپیوٹر پروگرامنگ یعنی گیم پروگرامنگ کے پردے میں وہ اپنے خیالات اور بساط زندگی پر اپنی چالوں کو بیان کرتا ہے لیکن عالمگیریت کی اصل روح کو ناول وہاں اپنی گرفت میں لیتا ہے اور بیان کرتا ہے جہاں ص ۱۹۵ پر ذکااللہ زلیخا خلجی کا حوالہ دیتا ہے۔

> "وہی ای میل زلیخا کے باپ کی اور فارماسیوٹیکل ملٹی نیشنل کارپوریشنز اور حکومتوں کا گٹھ جوڑ اور ہاں ان کی میڈیکل ریسرچ کی اصل حقیقت۔ وہ سارے ویب لنک جو تم نے میل کیے تھے۔ یار وہ تو کمال ہے... یہ تو بہت بڑا ایکٹ ہے شہریار خلجی اس میں فٹ ہوتا ہے اور میرا خیال ہے زلیخا خلجی بھی۔ ذرا سوچو۔" (۱)

ذکااللہ کے سامنے انٹرنیٹ کا وسیع و عریض سمندر ہے اور اس میں غواصی کے دوران اسے بہت سی معلومات ملتی ہیں۔ شہریار خلجی ایک منصوبے کے تحت اپنی بیٹی کو اس کی لاعلمی میں اسے اس گٹھ جوڑ، جو حکومتوں اور ملٹی نیشنل کمپنیوں کے درمیان ہے، اور سالار خاندان جو خود بھی ایک نیٹ ورک ہے، کے درمیان لا کر چھوڑ جاتا ہے۔ یہاں ذکااللہ کے طریقہ واردات کا بھی پتہ چلتا ہے جو ایک طرف تو ایسی معلومات فیضان سالار کے ساتھ شیئر کرتا ہے اور اسے اس کے خاندان کے خلاف ثبوت مہیا کرتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اسے اس کی دانشوری، ذہانت کا یقین دلاتا ہے کہ تم جیسے جینیئس ہی انقلاب لاتے ہیں قوموں کی تقدیر بدلنے والے ہوتے ہیں۔ اسے اکساتا ہے۔ لیکن دوسری طرف خود کو بری الذمہ بھی قرار دیتا ہے حالانکہ اندرونی طور پر جانتا ہے کہ سالار کے سسٹم میں یہ وائرس اسی کا داخل کردہ ہے۔ اس کا بار بار یہ کہنا "یہ سالار میرا ہے" اور اس کا یہ کہنا کہ کانے بلے کا چوزے کو نگلنا دراصل اسے اپنا بنانا

(۱) اطہر بیگ مرزا، صفر سے ایک تک، ص ۱۹۵

تھا۔ وہ چوزہ اس کانے بلے کا تھا جسے وہ کتا کہتے تھے۔ بالکل اسی طرح وہ سالار اس کا تھا یعنی فیضان کو اسی کے خاندان کے خلاف ہتھیار بناتا ہے۔

بہر حال فیضان سالار کو انٹرنیٹ سے حاصل کردہ اور ذکا اللہ کی فراہم کردہ معلومات سے پتہ چلتا ہے کہ فارماسیوٹیکل کمپنیاں تیسری دنیا کے ساتھ کیا معاملہ کرتی ہیں اور کس طرح ان کا استحصال کرتی ہیں۔ ایک طرف تو ترقی پذیر ملکوں کی حکومتوں سے اپنے کاروبار کے سلسلے میں ایسی مراعات حاصل کرتی ہیں جو دراصل ان ملکوں کی اپنی معیشت کے لیے نقصان دہ ہیں اور دوسری طرف وہ ان ملکوں کی عوام پر اپنی نئی ادویات کے تجربات کرتے ہیں اور انہیں انسان سمجھنے کی بجائے انہیں چوہے یا گنی پگ کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔

''یہ نقاط اہم ہیں۔ فارماسوٹیکل ملٹی نیشنل کمپنیوں کی ترجیحات۔۔۔ ترقی پذیر ملکوں کی حکومتوں سے یہ کمپنیاں ناجائز مراعات کیسے حاصل کرتی ہیں (زلیخا فیکٹر کو یہاں رکھ کر دیکھو)

میں نہیں سمجھ پارہا۔

ترقی پذیر ملکوں کے غریب عوام پر نئی دوائیوں کے خفیہ میڈیکل تجربات کیسے کیے جاتے ہیں

کیا مطلب؟

منافع، منافع، منافع۔''(۱)

ملٹی نیشنل کمپنیاں عالم گیریت کی آڑ میں جو کھیل کھیل رہی ہیں اس کو ناول نگار نے کھل کر بیان کر دیا ہے اور ان کا سب سے بڑا مقصد یعنی منافع اور منافع اس کے بارے میں فیضان سالار کردار کے ذریعے دراصل اپنے خیالات کو بیان کیا ہے۔

شہریار خلجی جو ایک بڑی ملٹی نیشنل کمپنی کا اعلیٰ عہدیدار ہے وہ اپنے مقصد کے لیے اپنی بیٹی کو استعمال کرنے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ دوسری طرف سالار خاندان ہے جو اس کی بیٹی کے ذریعے اپنا حصہ وصول کرنا چاہتے ہیں اور ایسی کسی کمپنی میں شراکت داری کے خواہاں ہیں اور ان کے رستے میں رکاوٹ بننے والے ذکا اللہ کو ذہنی جسمانی تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے اور اسی طرح فیضان سالار کو بھی اسی سلوک کا سامنا کرنا پڑتا ہے ان بڑی کمپنیوں اور ان کے عہدیداروں کارندوں کے لیے سب سے بڑا رشتہ منافع کا ہے جہاں سے ملے جیسے ملے اور اس مقصد کے لیے جسے قربان کرنا پڑے اور اس کی راہ میں آنے والی ہر رکاوٹ کو ہر قیمت پہ اور ہر حال میں گرانا لازمی ہوتا ہے۔

شہریار خلجی اپنی بیٹی کو، جب وہ سالار چنگل سے نکل کر واپس پہنچ جاتی ہے تو، ایک نئی پیشکش کرتا ہے کہ دنیا کا وہ خطہ جس میں تمہارے باپ کا معاشرہ ہے ایک غیر یقینی مقام ہے لیکن بہر حال انٹر نیشنل ٹریڈ نے تو پھیلنا ہے۔ اس لیے biome کا ایک ریجنل

(۱) اطہر بیگ مرزا، صفر سے ایک تک، ص ۱۹۶

ہیڈ کوارٹر اسلام آباد میں قائم کیا جارہا ہے۔ ایک نئی drug وہاں Introduce کروائی جارہی ہے... میں چاہتا ہوں شدت سے کہ تم وہاں ہمارے پبلک ریلیشنز کے شعبے کی ڈائریکٹر کی پوسٹ قبول کرلو۔[۱]

دراصل یہ شخص اپنی بیٹی کے حسن و جمال اور جوانی کو کیش کرواتے ہوئے اپنی کمپنی کے لیے مراعات حاصل کرنے کا خواہاں ہے۔ سالار خاندان بھی اسی زلیخا خلجی کے ساتھ ساتھ بزنس حاصل کرنے کے لیے سارے پاپڑ بیل رہے تھے زلیخا کے ساتھ بزنس حاصل کرنے کے لیے اسے شیشے میں اتارنا چاہتے تھے لیکن ذکااللہ نے ان کے کھیل کو ناکامی سے دوچار کر کے پاگل بنادیا۔ یہاں فیضان سالار کو کانفرنس سے اٹھانے کے چاروں سالاروں کے درمیان جو مکالمہ ہوتا ہے اس سے ان کے عزائم ظاہر ہوتے ہیں:

"کیا بات ہے ڈاکٹر تم بہت چپ چپ ہو؟

کیا فائدہ یار۔ اب وہ فارماسیٹوٹیکل concern تو ادھر نہیں آرہا۔

اس کی وجہ تو دوسری ہے

ہاں دنیا کے حالات بدل رہے ہین اس وقت کچھ ہو جاتا تو ہو جاتا۔ بڑی گیم فٹ تھی۔ بزنس۔ عورت۔ لیکن۔۔۔" [۲]

اس ناول کا لسانی مطالعہ بھی عالمگیریت کے اثرات کو سامنے لاتا ہے۔ ناول کا کبیری کردار چونکہ کمپیوٹر کی دنیا سے تعلق رکھتا ہے اس لیے کمپیوٹر سے متعلق الفاظ و اصطلاحات عبارت میں عام ملتی ہیں۔ لیکن چونکہ ان اسماء و اصطلاحات کے مترادفات شاید ہی اردو میں دستیاب ہوں اس لیے وہ عبارت میں اجنبیت کا تاثر یا روانی میں اٹکاؤ پیدا نہیں کرتیں۔ عالمگیریت کے معاشی سماجی اور لسانی اثرات غالباً اکیسویں صدی اور اس سے پیشتر لکھے گئے ناول اتنے واضح طور پر پیش نہیں کرتے جتنا کہ یہ ناول پیش کرتا ہے۔ لہٰذا عالمگیریت کے مطالعے میں یہ ناول معاون ہے اور اس کے پس پردہ مقاصد کو واضح کرتا ہے۔

---

(۱) اطہر بیگ مرزا، صفر سے ایک تک، ص۱۷۶

(۲) ایضاً، ص۳۶۰

# خس و خاشاک زمانے

مستنصر حسین تارڑ کا نام اکیسویں صدی کے ناول نگاروں میں ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔ مستنصر حسین تارڑ کا بنیادی حوالہ سفر نامہ ہے لیکن اکیسویں صدی میں ان کے فن کا اگر جائزہ لیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ بطور ناول نگار بھی وہ منفرد پہچان رکھتے ہیں اور اب ان کی ناول نگاری کا پلڑا بھاری ہے۔ خس و خاشاک زمانے سے پیشتر اسی صدی میں ان کا ناول قربت مرگ میں محبت، قلعہ جنگی اور ڈاکیا اور جولاہا شائع ہو چکے ہیں۔ خس و خاشاک زمانے میں ان کا فن عروج پر نظر آتا ہے اور نئی رفعتوں کو چھو رہا ہے۔ یہ ناول ۲۰۱۰ میں شائع ہوا۔ اس ناول کا موضوع وقت ہے اگرچہ اس کو کسی ایک موضوع تک محدود نہیں کیا جاسکتا۔ اس ناول میں ۱۹۳۰ سے ۲۰۰۱ تک تین نسلوں کو پیش کیا گیا ہے۔ جو بچپن جوانی اور بڑھاپے کے مراحل سے گزر کر راہِ عدم روانہ ہو جاتی ہیں۔ لیکن وقت اپنی جگہ موجود رہتا ہے۔ تقریباً ساڑھے سات سو صفحات پر محیط اس ناول میں تقسیم سے قبل مسلمانوں اور سکھوں کے باہمی روابط، ۱۹۴۷ کے خونیں فسادات، صدر ایوب، ضیا الحق اور پرویز مشرف کے ادوار حکومت، ۱۹۷۱ میں سقوط ڈھاکہ کا المیہ، جنرل یحییٰ کا کردار اور پاکستانی سیاست کا اتار چڑھاؤ پلاٹ کا حصہ ہیں۔ کرداروں کے حوالے سے دیکھا جائے تو یہ ناول رنگا رنگ اور متنوع کرداروں کا ایسا جنگل ہے جو قاری کو کہیں بھی عدم دلچسپی کا شکار نہیں ہونے دیتا اور اس کے ذہن کو گرفت میں لیے رکھتا ہے۔

ناول کا آغاز بخت جہاں سے ہوتا ہے جو اپنی بھتیجی سے ایک بیمار مرغ کی بھیک مانگ رہا ہے۔ اس سے پہلے وہ مر جانے والی تمام مرغیاں بھون کر کھا چکا ہے۔ اس ناول میں مصنف نے فلیش بیک کی تکنیک استعمال کی۔ آسانی کی خاطر اس ناول کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلے حصے کا لوکیل پنجاب کے ضلع گجرات کا علاقہ دنیاپور ہے جہاں جاٹ برادری دیگر برادریوں کے ساتھ آباد ہے۔ یہ جاٹ لوگ مالی اعتبار سے قلاش ہونے کے باوجود اپنے نسب کے حوالے سے تفاخر کا شکار ہیں۔ متکبرانہ ذہنیت رکھتے ہیں۔ اسی جاٹ برادری کا فرد بخت جہاں ہے جو اپنے دوسرے دو بھائیوں الف جہاں اور محمد جہاں سے عمر میں چھوٹا اور کردار میں برعکس ہے۔ سب سے بڑا محمد جہاں پھر الف جہاں اور آخری بخت جہاں۔ الف جہاں ایک خاموش طبع انسان تھا جو تیس برس کی عمر میں ہی سانپ کے کاٹنے سے لاولد فوت ہو گیا۔ دوسرا بھائی محمد جہاں ایک شریف النفس اور محنتی انسان ہے جس کا گھرانہ پانچ بیٹیوں اور ایک بیٹے پر مشتمل ہے۔ دو بیٹیاں بچپن میں فوت ہو جاتی ہیں تیسری بیٹی ماہلو غیر معمولی حسن کی مالک ہے۔ گرمیوں کی ایک حبس زدہ دوپہر میں جھولا جھولاتی ماہلو پاس کے گاؤں کے چودھری کو پسند آجاتی ہے اور چوہدری بہت چاؤ کے ساتھ اسے بیاہ کر لے جاتا ہے۔ ماہلو کا کردار ایک خوبصورت رومانوی کردار ہے لیکن چودھری کی پہلی بیوی ماہلو زہر دے کر اس کی جان لے لیتی ہے۔ اس کے بعد محمد جہان بھی جلد ملک عدم سدھار جاتا ہے۔ ملک جہان جو گاؤں کا نمبر دار بھی تھا اور اپنی محنت و شرافت کی بنا پر ہر دلعزیز بھی۔ لیکن بخت جہاں اس کے بالکل برعکس ہے جو بھائی کے

مرنے کے بعد اس کے اہل خانہ کی زندگی اجیرن کر دیتا ہے اور ان کی زمین پر قبضہ کر کے انھیں تنگدستی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔

بخت جہاں خود ایک عیاشانہ زندگی بسر کرتا ہے۔ مجرے سنتا ہے۔ بظاہر وہ ایک دلفریب اور وجیہہ و شکیل انسان ہے لیکن اپنی خوبصورتی کو اپنی ہوس کی تکمیل کے لیے استعمال کرتا ہے۔ اخلاقی اعتبار سے اس قدر بودے اور کمزور کردار کا مالک ہے کہ اپنے جگری دوست سردار لہناں سنگھ کی بیوی امرت کور کو کنیز فاطمہ کا نام دے کر اپنے گھر ڈال لیتا ہے۔ جس دن امرت کور نے اس کی دہلیز عبور کی اس دن بخت جہاں کی پہلی بیوی جو نیک اور صوم و صلوٰۃ کی پابند ہے اپنے بچوں اکبر جہاں اور دونوں بیٹیوں کے ساتھ میکے چلی جاتی ہے اور پھر ساری عمر پلٹ کر نہیں دیکھتی۔ اس کہانی میں کچھ دیگر کردار جو جاٹ برادری سے تعلق رکھتے ہیں ہے لاہور کا رخ کرتے ہیں۔ ان میں سے کوٹ ستارہ کا امیر بخش ہے جس کی ماں رابعہ بی بی کا خواب اپنے بیٹے امیر بخش کو اپنے بھائیوں کی طرح پڑھانا لکھانا ہے اور اس خواب کی تکمیل کے لیے امیر بخش کا محنتی باپ اپنی زمین فروخت کر کے اسے میٹرک تک تعلیم دلواتا ہے۔ امیر بخش اپنے مستقبل کو سنوارنے اپنی برادری کے مڈل پاس خوشی محمد تھانیدار کی چوکھٹ پر حاضری دیتا ہے۔ خوشی محمد اس سے جان چھڑانے کے لیے اس پر اپنے بھوکے بولی کتے چھڑوا دیتا ہے۔ خونخوار کتوں سے بچنے کے لیے اندھا دھند بھاگتے ہوئے زندگی اس پر کچھ سچائیاں آشکار کرتی ہے۔ مثلاً یہ کہ زندگی اور دنیا صرف طاقتوروں کی تھی۔ باقی ذات برادری قبیلہ مذہب عقیدہ سب ڈھکوسلا تھی۔ صرف طاقت سچائی تھی۔ اسی ایک لمحے میں جس میں یہ سچ اس پر آشکار ہوا اس کے سیاہ بال اسی ایک لمحے میں سفید ہو گئے۔ لیکن وہ پلٹ کر گھر جانے کی بجائے سانپوں کی فصل عبور کرتے ہوئے لاہور پہنچ جاتا ہے جہاں کوئی اس کی جائے پناہ نہیں۔ کوئی واقف رشتہ دار نہیں۔ فاقے کرتے چھوٹے موٹے کام کرتے ہوئے اس کے شب و روز بسر ہو رہے تھے کہ اسے اسٹیشن پر عزیز جہاں اور سروسانسی ملے۔ عزیز جہاں کو اس کی والدہ بہشت بی بی اپنے دیور بخت جہاں سے خائف ہو کر لاہور بھیج دیتی ہے کہ کہیں بخت جہاں جائیداد کے لالچ میں بھتیجے کو قتل نہ کروا دے۔ سروسانسی ایک مردار کھانے والا لامذہب انسان ہے جو خود کو انسان نہیں سمجھتا۔ لوگوں کی نظر میں پلید سروسانسی کو عزیز جہاں کی حفاظت کے لیے بہشت بی بی لاہور اس کے ساتھ بھیجتی ہے۔ لیکن امیر بخش اس کی حقیقت سے واقف ہو کر بھی اس سے برابری کا سلوک کرتا ہے اور اسے اپنے ساتھ کھانے میں شریک کرتا ہے۔ سروسانسی سے ایسا سلوک پہلے کبھی نہیں کیا گیا تھا لہٰذا وہ امیر بخش کا گرویدہ ہو گیا۔ اب تینوں مل کر چھوٹے موٹے کام کرتے رام داس کے بھٹے پر مزدوری کرنے لگتے ہیں۔ رام داس ایک دن انہیں اپنے جاننے والے کے پاس اس کے تعمیراتی کام کی نگرانی کی نوکری کے لیے بھیج دیتا ہے۔ وہ تینوں نہایت جانفشانی سے یہ ملازمت کرتے ہیں تو ان پر قسمت کے دروازے کھل جاتے ہیں اور وہ امیر عزیز کنسٹرکشن کمپنی کے مالک بن جاتے ہیں۔ عزیز جہاں امیر بخش کی شادی اپنی بہن نور بیگم سے کر دیتا ہے۔ عزیز جہاں بھٹے پر کام کرنے والی پشپا سے شادی کر لیتا ہے اور سروسانسی اپنی غلطی کے کفارے کے طور پر اپنی چچا کی بیٹی سوہنی سانسن سے شادی کر لیتا ہے۔ لاہور قیام کے دوران سروسانسی کو مسجد کی سیڑھیوں پر ایک لاوارث نومولود بچہ ملتا

ہے جسے لوگ ناجائز خیال کرتے ہوئے سنگسار کرنا چاہتے ہیں لیکن سروسانسی اسے اپنا بچہ قرار دیتے ہوئے اپنے ساتھ گھر لے آتا ہے۔ اس کا نام انعام اللہ، لبھاسنگھ اور جیجیو سانسی رکھ کر چاروں اس سے محبت کرنے لگتے ہیں لیکن سب سے زیادہ محبت اسے امیر بخش سے ملتی ہے۔ امیر بخش کے ہاں بھی ایک بیٹے کی پیدائش ہوتی ہے لیکن انعام اللہ سے اس کی محبت میں کمی واقع نہیں ہوتی۔ امیر بخش کے کہنے پر سروسانسی اپنے بیٹوں راجو اور موتی کو اعلیٰ تعلیم دلواتا ہے۔ موتی کینیڈا چلا جاتا ہے جبکہ راجو اپنا نام بدل کے سلمان شاہ رکھ لیتا ہے اور اب وہ ایک بلند سماجی حیثیت کا مالک اور اپنی آبائی پہچان کو چھپانا چاہتا ہے۔ امیر بخش کا بیٹا روشن اور انعام دونوں صحافت کے میدان میں آتے ہیں۔ انعام اللہ کو ایک فوجی آمر کے خلاف کالم لکھنے کی پاداش میں کوڑے لگائے جاتے ہیں اور جب وہ اپنا ناول آٹو بائیو گرافی آف باسٹرڈ لکھتا ہے تو نام نہاد ملا اس کے خلاف مظاہرے کرنے لگتے ہیں۔ وہ امریکہ منتقل ہو جاتا ہے۔ جہاں وہ محنت و مشقت سے اپنے لیے روزی روٹی کا بندوبست کرتا ہے۔ دوسری طرف پاکستان میں روشن ناموس رسالت کے ایک مظاہرے کو کور کرتے ہوئے ہجوم کے عتاب کا نشانہ بن جاتا ہے کیونکہ اس کا رنگ بہت گورا اور بال بھورے تھے۔ لیکن انعام اللہ کو اس کی خبر نہیں ہوتی۔ نیویارک میں انعام اللہ ٹیکسی چلاتا ہے اور یہیں وہ اپنا دوسرا ناول ٹیکسی ڈرائیور از اے پر اسٹیٹیوٹ لکھتا ہے لیکن اسے شائع نہیں کرواتا۔ ۱۱ ستمبر کے سانحے کو وہ اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے اور اس غم کو ذاتی سطح پر محسوس کرتا ہے۔ امریکی معاشرے میں اس سانحے کے بعد اس سے نفرت کا اظہار اس لیے کیا جاتا ہے کیونکہ وہ پاکستانی تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس دہشت گردی کا ذمہ دار افغانستان کو ٹھہراتے ہوئے اسے تباہ و برباد کر دیا گیا۔ انعام اللہ ایک حساس انسان ہے وہ سوچتا ہے کہ کیا چند افراد کے افعال و اعمال کے ذمہ دار ان لوگوں کو ٹھہرایا جائے گا جو جانتے ہی نہیں کہ ان کا جرم کیا ہے۔ ان حالات میں وہ بالآخر امریکا کو چھوڑنے کا فیصلہ کر لیتا ہے۔

یہاں ایک اہم کردار اکبر جہاں کا عمل دخل ہوتا ہے جو بخت جہاں کی پہلی بیوی سے ہے۔ وہ ان ہی خصوصیات کا حامل ہے جو اس کے باپ کی تھیں۔ غرور و تکبر ٹیڑھا پن اس میں موجود ہے۔ اپنے ماموں زاد بھائیوں کے رویوں سے متنفر ہو کر وہ کینیڈا کا رخ کرتا ہے۔ وہاں وہ ایک غیر آباد علاقہ حاصل کر کے اس پر بہت محنت و مشقت کے بعد اسے گل و گلزار میں تبدیل کرتا ہے اور اس کا نام جہان آباد رکھتا ہے۔ اس کی دو بیویوں سے دو بیٹے اور ایک بیٹی ہے اس کی بیٹی ایک ڈھول بجانے والے سکھ سے شادی کر لیتی ہے۔ اس کا بیٹا سروسانسی کی پوتی موتی کی بیٹی شباہت کو پسند کرتا ہے۔ وہ اس سے شادی کرنا چاہتا ہے یہ دونوں واقعات نفسیاتی طور پر تباہ کر دیتے ہیں۔ اور وہ ڈوب کے مر جاتا ہے۔ بخت جہاں کی قبر کی طرح اس کی قبر بھی ٹیڑھی ہو جاتی ہے۔ یعنی ان کا غرور پس مرگ بھی قائم ہے لیکن شباہت اس کے بیٹے سے شادی سے انکار کر دیتی ہے اور انعام اللہ میں دلچسپی لیتی ہے۔ لیکن انعام اللہ اس کی طرف راغب نہیں ہوتا۔ انعام اللہ استحصالی رویوں سے بیزار ہے بالخصوص امریکا کا استحصالی رویہ اسے پریشان کرتا ہے وہ ناانصافی پر مبنی اس استحصالی نظام سے ٹکرانا اور اسے تباہ کرنا چاہتا ہے۔ ناول کے اختتام پر وہ سوچتا ہے کہ وہ اس نظام سے ٹکرا کر جان دے دے گا۔ اس کا فیصلہ سن کر شباہت

بھی اس کی ہم رکاب ہو جاتی ہے۔ اپنے مقام سے امریکی سرحد تک وہ طویل سفر اپنی گاڑی میں کرتے ہیں اور اس سفر میں وہ زندگی کے حقائق سے آشنا ہوتے ہیں۔ ناول کا اختتام ان الفاظ پر ہوتا ہے:

> ''انعام اللہ کی ہتھیلی شباہت کے فی الحال ہموار پیٹ پر اتری۔ اس کے اندر ایک کونپل کی جو دھک دھک دھڑکن تھی اسے محسوس کیا... اور اس نے کہا چلو اس دنیا کو دوبارہ آباد کرتے ہیں۔'' (۱)

خس و خاشاک کے حوالے سے ڈاکٹر غفور شاہ قاسم لکھتے ہیں:

> "۲۰۱۰ میں شائع ہونے والا تارڑ کا ناول خس و خاشاک زمانے ایک بڑی تخلیقی جست ہے۔ اس ناول کا کینوس راکھ کی نسبت زمانی اور امکانی ہر دو حوالوں سے زیادہ وسیع ہے۔ یہ ناول ۱۹۳۰ سے ۲۰۱۰ تک کے زمانی عرصے کو محیط ہے۔ تقریباً ساڑھے سات سو صفحات پر مشتمل ناول کردار نگاری، مکالمہ نویسی اور پلاٹ پر مضبوط گرفت کے حوالے سے غیر معمولی تخلیق ہے۔"(۲)

بلاشبہ خس و خاشاک زمانے ایک بڑا ناول اور مصنف کے حوالے سے بڑی تخلیقی جست ہے۔ یہ ناول وسیع کینوس کا حامل ہے جو تین نسلوں کی داستان حیات کو موضوع بناتا ہے اور تقریباً پون صدی کا احاطہ کرتا ہے۔ مکانی اعتبار سے قیام پاکستان قبل کے پنجاب کے کچھ دیہات لاہور شہر کی زندگی کے ساتھ ساتھ امریکہ اور کینیڈا تک پھیلا ہوا ہے اور ناول کے کردار انعام اللہ، موتی جب امریکا کینیڈا منتقل ہوتے ہیں تو وہاں کی تہذیب و معاشرت کو قارئین کے سامنے پیش کرتا ہے۔ اس طرح ایک طرف تو ناول نگار نے پنجاب کی دیہی زندگی کے نشیب و فراز کو خوبصورتی سے اجاگر کیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ پاکستان کی شہری زندگی کو پیش کیا ہے اور پس منظر میں پاکستان کی تاریخ کے اہم واقعات کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں۔ ۱۹۴۰ کا مسلم لیگ کا لاہور کا جلسہ، تقسیم ہندوستان، فسادات، ایوب خان، ضیاالحق کا دور آمریت اور اس کے بعد پرویز مشرت کا دور حکومت امریکا کی غیر مشروط تابعداری اور ۲۰۰۱ میں ٹوئن ٹاورز کا انہدام جس نے دنیا کے تاریخ پر دور رس اثرات مرتب کیے۔ اس کے ساتھ ساتھ مصنف کی اپنی مٹی سے محبت کا اظہار بھی ملتا ہے۔ وہ ۱۹۷۱ میں پلٹن گراؤنڈ میں شرمناک شکست کو کسی طور پر قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔

---

(۱) مستنصر حسین تارڑ، *خس و خاشاک زمانے*، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء) ص ۷۴۰

(۲) غفور شاہ قاسم، *مستنصر حسین تارڑ شخصیت اور فن*، (اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۱۸ء) ص ۱۸۸

عالمگیریت کے اہم موضوعات تہذیب و معاشرت اور معیشت ہیں۔ تہذیبی حوالے سے یہ ناول جہاں پنجاب کی قدیم اور خالص معاشرت کو پیش کرتا ہے وہیں امریکا کی معاشرت یعنی وہ تہذیب جو عالمگیریت پوری دنیا پر مسلط کرنا چاہتی ہے اس کا بیان بھی تفصیلاً ملتا ہے اور سرمایہ دارانہ معاشرے کی واحد کاروباری اخلاقیات جو منافع کمانے کے گرد گھومتی ہے۔

"...مارچیلو، اطالوی نہیں سسلی کے مافیا کا ایک معززرکن ہے۔ جس کی اخلاقیات کی داد اس کے دشمن بھی دیتے ہیں... وہ ہمیشہ ایک خاص ضابطہ اخلاق کی حدود میں رہتا ہے۔ وہ صرف جواخانے، نائٹ کلب یا منشیات کے اڈے کنٹرول کرتا ہے..."(۱)

پھر ہزارہ سسلی مافیا کے ساتھ روسی مافیا کا موازنہ کرتا ہے جو مضبوط امریکی شہروں (معاشی طور پر مضبوط) میں قدم جما رہا ہے کہ وہ نہایت سفاک اور بے رحم ہیں۔ ان کا قطعی کوئی ضابطہ اخلاق نہیں۔

"وہ بچوں کو تاوان کے لیے اغوا کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے... عورتوں کا کچھ لحاظ نہیں کرتے... بدن فروش طوائفوں کی کمائی میں حصہ دار ہوتے ہیں۔" (۲)

جدید تہذیب کا وہ تاریک تر اندرون ہے جو بظاہر بہت خوش نما اور دلفریب ہے۔ اور یہاں پاکستانی معاشرے سے بہت پڑھے لکھے اور تعلیم یافتہ طبقے کے نمائندے پروفیسر منظور جیسے کردار بھی وہاں معمولی کام بھی بخوشی کرتے ہیں۔ اس کی وجہ اس معاشرے میں محنت خواہ وہ کسی بھی پیشے میں کی جائے اسے حقیر نہیں سمجھا جاتا ہے اور یہ ان مغربی معاشروں کی ایک ایسی خوبی ہے جو ہمارے پاکستانی معاشرے میں مقصود ہے۔ اس کے علاوہ آمریت کے جبر نے لوگوں کو فرار کی راہ اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔ پروفیسر منظور جو اب امریکا میں گروسری سٹور چلاتا ہے۔ اور مطمئن زندگی گزارتا ہے۔ منظور اور اس جیسے دیگر پاکستانیوں کی پرسکون زندگیاں اس وقت طوفان میں گھر جاتی ہیں جب ستمبر ۲۰۰۱ میں ٹوئن ٹاورز سے دو طیارے ٹکرا کر انھیں زمین بوس کر دیتے ہیں اور بہت سے افراد ان میں دب کر موت کے منہ میں چلے گئے اور گیارہ ستمبر کے بعد جو دنیا وجود میں آئی وہ پہلی دنیا جیسی ہرگز نہ تھی۔

"گیارہ ستمبر کے بعد بقول بش دنیا وہ نہ رہی جو کبھی تھی... جو نئی دنیا وجود میں آئی تھی اس میں متعجب ہونے کے کچھ عجیب سے سامان تھے... جنسی قربت کی اشتہا بڑھ گئی، بدن فروش طوائفوں کا کاروبار چمک اٹھا تھا۔ ان کے نرخ بڑھ گئے اور وہ آسانی سے دستیاب نہ ہوتی تھیں... (۳)

---

(۱) مستنصر حسین تارڑ، *خس و خاشاک زمانے*، ص ۴۵۴

(۲) ایضاً

(۳) ایضاً، ص ۵۰۷

۱۱ ستمبر کے یہ اثرات محض تیسری دنیا تک محدود نہ تھے۔ یورپی ممالک اور خاص طور پر امریکا میں رہنے والے مسلمانوں اور پاکستانیوں کو ایسے رویوں کا سامنا کرنا پڑا جس نے ان کی زندگیوں کو دشوار اور تنگ کر دیا تھا۔ اس کا ذمہ دار وہ میڈیا تھا جو ان بڑے سرمایہ داروں اور بڑے عالمی طاقتوں کا پالتو اور زر خرید ہے۔ اور ان کے اشارے پر اسلاموفوبیا کو ہوا دے رہا تھا۔

"اسے شک ہونے لگا کہ ہر دوچار روز کے بعد جو گورا مسافر آتا ہے وہ دراصل ایک ہی ہے جو بھیس بدل کر اسے بار بار بے عزت کرنے کے لیے، زچ کرنے کے لیے آجاتا ہے... اور یہ مسافر خصوصی طور پر جارج بش اور امریکی میڈیا نے مینوفیکچر کیا تھا... یہ پروپیگنڈہ مشینری کی فخریہ پیش کش تھی جس نے بیشتر امریکیوں کو روبوٹس میں بدل دیا تھا۔ ان کے اندر نفرت کا ڈیٹا بھر دیا گیا تھا... اُن کی آنکھوں میں مسلسل ٹریڈ ٹاورز گرتے چلے جاتے تھے، جمہوریت تہذیب اور آزادی کے دشمنوں کے جو چہرے ٹیلی ویژن پر چسپاں چلے جاتے تھے ان میں ایک قدر مشترک بھی وہ سب کے سب موزلم تھے تمام موزلم ٹیررسٹ نہیں ہیں لیکن تمام ٹیررسٹ موزلم ہیں... "[۱]

میڈیا نے وہی کردار ادا کیا جو ان عالمی طاقتوں کے مفادات کے حصول میں معاون تھا اور نفرت کا ڈیٹا اس طرح ان یورپینز کے ذہنوں میں فیڈ کر دیا گیا تھا کہ اب ٹیررازم اور اسلام دونوں ان کے لئے مترادف بن گئے۔

ایک طرف مدرسوں میں زیر تعلیم طلبا کے ذہنوں میں بوئی گئی بنیاد پرستی نے جہاں ایک طرف پاکستانی معاشرے کو عدم رواداری، عدم استحکام اور تشدد کی راہ پر ڈال دیا تو دوسری طرف میڈیا نے یہی نفرت نے بھی امریکیوں اور یورپی اقوام کے ذہنوں میں راسخ کی۔ عالمگیریت کو اپنے مقاصد کے حصول کی راہ میں کوئی رکاوٹ خواہ وہ مذہبی ہو تہذیبی ہو کلچرل ہو قبول نہیں۔ ٹوئن ٹاور کو جہاز ٹکرانے والے خود کوئی آئیڈیل مسلم نہ تھے بلکہ شراب اور شباب کی رنگینیوں میں غرق اپنے معاصر یورپی نوجوانوں سے کسی طور پر پیچھے نہ تھے۔ ان کے مقاصد میں اسلام کی سربلندی یا اپنے کلچر کو غالب کرنے کا جذبہ تو ہرگز نہ تھا۔ لیکن اس کا خمیازہ پوری دنیا کے مسلمانوں بالخصوص افغانستان کے مسلمانوں کو ادا کرنا پڑا۔ اور اس کے لئے انھیں کیا قیمت ادا کرنا پڑی؟ اس حوالے سے مصنف نے جو لکھا ہے اس کی کاٹ ہر حساس انسان محسوس کر سکتا ہے "البانی کی سرسبز پہاڑیوں اور برف سے ڈھکے جنگلوں کے اندر کچے گھروندے مسمار ہوئے تھے۔ لنگڑاتے ہوئے افغان بچے... گوگو چیختے فوجی تباہ کن ہتھیاروں سے لیس فوجی شکستہ دروازوں پر بنے بھاری بوٹوں کی ٹھوکریں مارتے شوٹ دے باسٹرڈرز پکارتے داخل ہوتے تھے اور دہشت گرد بوڑھوں اور بچوں کو کیفر کردار تک پہنچاتے تھے۔"[۲]

---

(۱) مستنصر حسین تارڑ، خس وخاشاک زمانے، ص ۵۰۶

(۲) ایضاً، ص ۵۷۸

چند سو افراد جو اگرچہ معصوم تھے بے گناہ ٹوئن ٹاورز میں موت کے گھاٹ اتر گئے تو ان کا قصاص افغانستان کے ان معصوم بچوں اور بے گناہ بوڑھوں اور افغان عوام سے لیا گیا کہ جنہیں علم بھی نہ تھا کہ ان کا قصور کیا ہے ؟؟؟

خونِ خاک نشیناں تھا رزق خاک ہوا

ان کو انسان بھی نہ سمجھا گیا۔ صرف اس لیے کہ وہ مسلم تھے اور ایک ایسے عقیدے کے پیروکار تھے جو ان کے عقیدے سے الگ تھا اور ایسا کوئی عقیدہ نظریہ عالمگیریت کے لیے قابل قبول نہیں۔

دوسری طرف عراق کو خاک و خون میں نہلا دیا گیا۔ ان پر ہلاکت خیز ہتھیاروں کی تیاری کا الزام لگا کر یا دہشت گردی کا الزام لگا کر جب کہ حقیقت کیا ہے ناول نگار کے مطابق

> ”وہ سب کچھ ضبط کر گیا... سہار گیا لیکن اس کا ضبط تب ختم ہوا جب افغان حملے کے پورے دو برس بعد اس کے تہہ خانے میں ایک اور جنگ کا آغاز ہو گیا... ایک یک طرفہ جنگ کا... اگرچہ ہر جنگ بے جواز ہوتی ہے لیکن کچھ جنگیں ایسی ہوتی ہیں جو کچھ زیادہ ہی بے جواز اور من گھڑت ہوتی ہیں ... نہ کہیں اجتماعی ہلاکت کے ہتھیار ہوتے ہیں نہ دہشت گردی کی معاونت کے کوئی آثار ہوتے ہیں... صرف دنیا کے سب سے زرخیز تیل کنویں بھڑکتے ہیں یا داؤد کا نیلا ستارہ لہراتا ہے...“ (۱)

امریکی طیاروں کے نوخیز اور پرجوش پائیلٹ مسکراتے ہوئے انگلیوں سے فتح کا نشان بناتے ہوئے ٹیلی ویژن کیمروں کے اندر تک اپنے پرمسرت چہرے لا کر چیختے تھے...... بومب بیگڈاڈ، فک بیگڈاڈ۔ (۲)

جدید تہذیب کے پروردہ نہیں جانتے تھے نہ جاننا چاہتے تھے کہ انہوں نے نینوا کے مرتبان، بابل کے ظروف، اپالو کے مجسمے اور جیتے جاگتے انسانوں کو روند ڈالا۔

> ”صرف دو جدید عمارتوں کے بدلے پوری تہذیب انسانی کو روندنا بھی تو کچھ زیادہ مناسب نہ تھا۔“ (۳)

ناول نگار مسلمانوں کی بے عملی کو بھی ہدف تنقید بناتا ہے۔ عقیدے نے اپنی سینکڑوں برس کی غفلت بے حسی اور نالائقی کا خمیازہ بھگتنا تھا۔ ٹیکنالوجی کے کفر کے آگے سجدہ ریز ہو کر شکست سے دوچار ہونا تھا۔ سینکڑوں بچوں نے اپنی ماؤں کی گود میں ہلاک ہو جانا

---

(۱) مستنصر حسین تارڑ، خس و خاشاک زمانے، ص۵۷۸

(۲) ایضاً، ص۵۸۰

(۳) حوالا بالا، ص۵۸۱

تھا...... اگر ان بچوں کے بس میں ہوتا تو وہ اس عقیدے کے ماں باپ کے گھر میں ہر گز پیدا نہ ہوتے جس نے پچھلے پانچ سو برس سے ایک نیل کٹر بھی ایجاد نہ کیا تھا اور محض آسمانی امداد کے طلبگار رب کے آگے سجدے کرتے گڑگڑاتے...... لیکن ادھر سے...... آسمانوں سے غیب سے فرشتوں نے کہاں اترنا تھا...... ٹیکنالوجی نے ان فرشتوں کے پر جلا دیئے تھے۔ (۱)

ان بڑی طاقتوں کو ٹیکنالوجی کی آزمائش کے لیے ان افغان ماؤں کی گود سوتے بچوں سے بہتر ہدف کیا مل سکتا تھا جنہوں نے ابھی بولنا بھی صحیح طریقے سے نہ سیکھا تھا جو مسلم کافر کا فرق بھی نہ جانتے تھے لیکن ان کے جرم ضعیفی کی سزا یہی مرگِ مفاجات تھی

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

یہی میڈیا جب مغربی تہذیب بالخصوص امریکی تہذیبی کو خوشنما بنا کر پیش کرتا ہے تو دور دراز ملکوں کے رہنے والے ان مغربیوں سے زیادہ مغرب ہو جاتے ہیں۔ اور وہ اس کی آل اولاد کو کیسی حیرت اور کس حد تک ان پر ترس کھاتی تکتی تھی جو اس سے بڑھ کر مغربی اقدار میں ڈھلی ہوئی تھی اور وہ ہمہ وقت یہ ثابت کرنے پر...... اُس کے فرسٹ کزن...... یہ ثابت کرنے پر لگے رہتے کہ وہ اس کی نسبت کہیں کشادہ ذہن اور کھلی سوچ رکھتے تھے...... سچی بات ہے وہ ان ڈیزائنرز اور ڈسک جولیز سے آگاہ ہی نہ تھی جو اس کے کزنز کے دل پسند اور مرغوب تھے...... نہ تو وہ بظاہر شراب کو ہاتھ لگاتی تھی...... نہ ہی چرس کی شوقین تھی اور نہ ہی اس کا کوئی بوائے فرینڈ تھا۔ باب موسیقی کے سلسلے میں تو شاید وہ بہری تھی خاصی تنگ نظر بیک ورڈ لڑکی تھی۔ (۲)

اور اس کے کزنز اس سے مل کر خاصے مایوس ہوئے تھے کہ کینیڈا میں رہتے ہوئے بھی وہ ان کی طرح مغربی تہذیب کی اتنی اچھی نقال نہ تھی جتنی کہ وہ خود تھے۔

مصنف نے ایک ایسی تقریب کا حال بھی لکھا جس کے تمام تر لوازمات تہذیب مغرب کی نقالی کی چغلی کھاتے تھے۔

پلاسٹر آف پیرس میں ڈھلے یونانی ستون دیواروں پر رائے کی شبیہیں اور لکڑی کا ایک گھوڑا اور آس پاس کوئی افلاطون تھا کوئی سقراط کہیں ایتھنا دیوی اور اپالو، پاپ موسیقی، فرانسیسی اور بقائی خادمائیں اور پرس ندھا بازر کا ڈسک جاکی جو خاصی خطیر رقم کے عوض یہاں آیا تھا۔

لاہور کی ایک تقریب کا یہ حال مصنف نے بیان کیا ہے۔

خس و خاشاک زمانے ایک خوبصورت ناول ہے جس میں مصنف نے پاکستانی دیہی تہذیب کی رنگوں کو خوبصورتی سے صفحۂ قرطاس پر بکھیرا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ تہذیب مغرب کی چکاچوند سے متاثر بڑے شہروں کی تہذیب و معاشرت کو پیش کیا ہے۔

---

(۱) مستنصر حسین تارڑ، خس و خاشاک زمانے، ص ۵۰۴

(۲) ایضاً، ص ۵۵۸

جو عالمگیریت کے سیلاب میں بہہ کر اپنے اصل نقوش کو دھندلا چکی ہے اور جہاں کے رہنے والے ان مغربی اطوار کی نقالی بہت فخر سے کرتے ہیں۔ یہ جانے بنا کہ یہ عالمگیریت اپنے سرمایہ دارانہ مفادات کے حصول کے لیے کس قدر بے رحم اور سفاک ہے۔ اور عالم گیریت جس ثقافت کا غلبہ چاہتی ہے وہ مقامی ثقافتوں کی قیمتوں پر ہو گا۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک ثقافت کے اندر زندگی بسر کرنے والے جن عقائد جن رسومات کے حامل ہوتے ہیں انھیں یہ عالمگیر ثقافت کبھی سمجھ ہی نہیں سکتی۔ امریکہ آزادئ اظہار کا بہت بڑا داعی اور مبلغ ہے لیکن آزادئ اظہار کن حدود و قیود کی پابند ہو گی اس کے کوئی اصول و ضوابط وضع نہیں کیے گئے۔ ایک مغربی ملک پیغمبر آخر الزماں کے مضحکہ خیز خاکے شائع کر کے کروڑوں مسلمانوں کی دل آزادی آزادی اظہار کی آڑ میں کرتا ہے تو جائز ہے۔ اس کی ایک توجیہہ یوں بھی کی جاسکتی ہے کہ خود مغربی ممالک اور ان کے عوام مذہب کو ایک قید تصور کرتے ہیں اور انبیا کرام پر ایسی فلمیں بناتے ہیں جن کو سراسر توہین کے زمرے میں آتی ہیں۔

وہ اس امر سے بخوبی آگاہ تھا کہ یورپ میں بیشتر لوگ مذہب کو زیادہ سنجیدگی سے نہیں لیتے۔ بلکہ اس کا ٹھٹھا اڑانے میں کبھی قباحت نہیں سمجھتے... عیسائیت کی بھی دھجیاں بکھیرتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ "کرائسٹ اے ہوموسیکسوئل" نام کا ڈرامہ سٹیج پر پیش کر دیتے ہیں۔ لاسٹ جج منٹ آف کرائسٹ میں اولیا کو برہنہ حالت میں دکھایا گیا ہے... آزادی اظہار کی ان کے نزدیک کوئی سرحدیں نہیں۔ لیکن دوسروں کے جذبات و احساسات کی بھی ان ترقی یافتہ اقوام کے ہاں زیادہ پرواہ نہیں کی جاتی۔ اس لیے دیگر اقوام کی کلچرل رسومات کو قربان کرتے ہوئے اگر ایک ثقافت کا غلبہ ان کے سرمایہ دارانہ مقاصد کے حصول میں ضروری ہے تو بلا دریغ وہ میڈیا کے ذریعے اس خاص کلچر کی برتری کے ترانے ایک تواتر کے ساتھ نشر کرتے رہیں گے اقوام کے اذہان کو بدلنے میں اس وقت تک اپنا سرمایہ لگاتے رہیں گے جب تک کہ وہ مقصد حاصل نہیں ہو جاتا ہے اور جہاں انہیں فوری طور پر تیل کے کنوؤں تک پہنچنا ہو گا وہاں وہ لاکھوں بے گناہ معصوم لوگوں پر بموں کی بارش برسا کر جدید ٹیکنالوجی کے بل بوتے پر وسائل کو اپنے قبضے میں لے لیتے ہیں۔ یہی آج کی جدید عالمگیر دنیا کا دستور ہے اور یہی چلن ہے۔

۱۱ ستمبر کو ناول نگار تہذیبی تصادم کا نام دیتا ہے جو بالادست امریکی تہذیب اور باقی دنیا بالخصوص تیسری دنیا کی تہذیبوں کے درمیان برپا ہوا۔ اور جس کا نتیجہ غالباً نہیں بلکہ یقیناً اس عالمگیر تہذیب کی بلاشرکت غیرے برتری کی صورت میں نکلے گا جو ٹیکنالوجی کے جدید ہتھیاروں سے لیس ہو کر ان کمزور ملکوں اور اقوام کی تہذیب پر پل پڑی ہے۔

امیر بخش نے بھونکتے اور کاٹتے کی طلب میں لپکتے کتوں کے آگے بھاگتے ہوئے جو نتیجہ نکالا تھا وہ ہی نتیجہ قوموں کی زندگی پر بھی منطبق ہوتا ہے۔ "یہ حیات زور آوروں کی تھی جن کے پاس سلطنت اور جبر تھا ان کی تھی۔" [۱]

---

(۱) مستنصر حسین تارڑ، خس و خاشاک زمانے، ص ۱۱۳

# جندر

اختر رضا سلیمی کا ناول جندر پہلی بار ۲۰۱۷ میں شائع ہوا۔ ۲۰۱۸ میں اس کی دوسری اشاعت ہوئی۔ انتساب وصی حیدر کے نام ہے انتساب ہی میں یہ شعر بھی درج ہے

ٹک دیکھ نہیں تو بہت افسوس رہے گا
ہم لوگ گزرتے ہوئے منظر کی طرح ہیں

رمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز راولپنڈی سے شائع ہونے والا مختصر ضخامت کا یہ ناول کل ۱۲۱ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ ناول بنیادی طور پر ایک سوانحی ناول ہے جس کا کیبری کردار ولی خان ہے جو ناول کا راوی بھی ہے۔ ناول کی زبان سلیس اور رواں ہے لیکن جہاں راوی دیہاتی رہتل اور اس سے منسوب بعض الفاظ و اصطلاحات کا استعمال کرتا ہے وہ بعض اوقات قاری کے لیے تفہیم میں مسئلے کا باعث بنتی ہیں اگرچہ راوی نے بعض جگہوں پر عبارت میں ساتھ ساتھ ان کی وضاحت بھی کر دی۔ دیہاتی پس منظر میں لکھا گیا یہ خوبصورت ناول ہماری تہذیبی تبدیلی کے اس دور کو بیان کرتا ہے جب عالمگیریت کی آمد سے قبل خالص دیہاتی تہذیب جو اتحاد و تعاون کے خوبصورت اصولوں پر مبنی تھی موجود تھی۔ اور ابھی عالمگیریت کے ساتھ آنے والی ٹیکنالوجی کی آلائشوں سے پاک فطری حالت میں تھی۔ دیہاتوں کی زندگی زرعی معیشت سے منسلک تھی۔ ٹریکٹر، تھریشر، ہارویسٹر اور اس نوع کی دیگر مشینوں کی آمد سے قبل پورے گاؤں کے کسان زمین کی تیاری، فصلوں کی بوائی اور کٹائی ہر مرحلے میں مل کر حصہ لیتے اور کوئی بھی اس میں پیچھے نہ رہتا۔ جو اس مشترکہ مشق کا حصہ نہ بنتا اسے سماجی بائیکاٹ کا سامنا کرنا پڑتا۔ اس کے علاوہ بھی قبیلوں اور خاندانوں میں انس و محبت کے باہمی رشتے بہت مضبوط تھے اور چچا جمال دین جیسے کردار بھی تھے جو محبت کے گاڑھے آمیزے سے گوندھے ہوئے تھے۔ ولی محمد کی ماں اور پھر باپ کی وفات کے بعد چچا جمال دین نے جس طرح اس کی خبر گیری کی وہ آج کی اس نفسانفسی کی دنیا میں جسے گلوبل ویلیج کہتے ہیں میں ممکن ہی نہیں ہے۔ جندرہ وہ پن چکی ہے جو ولی محمد کو خاندانی ترکے میں ملی ہے اور جس میں اس کے علاوہ اس کے باپ کے دیگر بھائیوں کا بھی حصہ ہے۔ پیدا ہوتے ہی ولی محمد کے کانوں نے اس چکی کی مدھر کوک سنی ہے اور یہی اداس کوک سنتے سنتے وہ جوان ہوا۔ اس کی چچازاد ہاجرہ جو اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے سے اُس کی شادی ہوئی۔ لیکن ہاجرہ اس ماحول کی عادی نہ ہو سکی جبکہ ولی محمد اس ماحول سے الگ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اس لیے ایک بیٹے کی پیدائش کے باوجود دونوں کا ساتھ رہنا ممکن ہی نہیں۔ لہٰذا تنہائی ولی محمد کا مقدر بن جاتی ہے لیکن اس تنہائی کے باوجود گاؤں والے اس جندر پر گندم مکئی پسوانے آتے رہتے ہیں تو اس کی زندگی پر سکون انداز میں بسر ہوتی رہی لیکن جب اس کا بیٹا پڑھ لکھ کر آفیسر بن گیا تو اسے اپنے باپ کا جندروئی ہونا کھٹکنے لگا۔ پہلے اس نے اپنے باپ کو اس کام چھوڑنے کا کہا جب وہ نہیں مانا تو گاؤں کے امام مسجد کو بجلی سے چلنے والی چکی گاؤں کے مرکز میں لگانے کے لیے مالی معاونت فراہم کر کے اپنے باپ کو خود موت

کے گھاٹ میں اتار دیتا ہے وہ اپنے باپ کی جندر اور اس کی آواز کے ساتھ لگاؤ کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ نئی تہذیب کا پروردہ اور جدید تعلیم سے آراستہ یہ نسل ایثار و محبت کی اقدار پر مبنی اس قدیم تہذیب کو سمجھنے سے قاصر ہے جو مشینوں کی آمد سے قبل یہاں موجود تھی۔

مصنف نے بہت وضاحت کے ساتھ جندر اس کے کام کرنے کا انداز اور طریقہ اور دیہاتی معاشرت کو خوبصورتی سے ناول کا حصہ بنایا ہے دوسرے لفظوں میں یہ ناول المیہ ہے ان مٹتی ہوئی تہذیبی اقدار و روایات کا جنہیں ٹیکنالوجی کے دوش پر سوار نئی اور عالمگیر تہذیب تیزی سے نگلتی جا رہی ہے اور ان اقدار سے وابستہ افراد بھی نہایت خاموشی اور کسمپرسی سے معدوم ہوتے جا رہے ہیں۔

یہ ناول فلیش بیک کی تکنیک میں لکھا ہے اور راوی کے ان آخری دنوں کی داستان بیان کرتا ہے جب اسے اپنی موت کا یقین ہو چکا ہے۔ ۴۵ دن پہلے کوئی آخری گاہک اس کے پاس آیا تھا۔ اب وہ تنہائی اور شاید بھوک کے ہاتھوں رفتہ رفتہ موت کے منہ میں جا رہا ہے لیکن زندگی اور موت کی دہلیز پر کھڑے راوی کو یہ الجھن درپیش تھی کہ اس کی موت کے بعد وہ پہلا شخص کون ہوگا جو اس کی موت سے آگاہ ہوگا۔ پھر اسے خیال آتا ہے کہ اگر چچا جمال دین زندہ ہوتا ہے تو غالباً نہیں یقیناً وہی شخص پہلا شخص ہوتا جسے اس کی موت کا پتہ چلتا۔ کیونکہ جیتے جی چچا جمال دین نے محبت و رواداری کے ناطے کو خوبصورتی سے نبھایا بلکہ راوی اور چچا کے درمیان ایسا قلبی تعلق تھا کہ اگرچہ بالکل غیر حقیقی طور پر ہی سہی لیکن اپنی موت کی اطلاع وہ خود دینے ولی محمد کے پاس آیا۔ لیکن موبائل فون کی آمد کے بعد یہ رابطے بہتر ہو گئے لیکن راوی پھر بھی تنہائی کا شکار ہے۔ اس حوالے سے وہ کہتا ہے:

> "اگرچہ اب ہمارے گاؤں میں بھی موبائل فون کی سہولت موجود ہے لیکن میں کبھی اسے اپنے زیر استعمال نہیں لایا کہ ایک تو مجھے کبھی ان چیزوں سے دلچسپی نہیں رہی اور دوسرا جندر والے مقام پر کسی کمپنی کے سگنل ہی نہیں آتے کہ اس کے چاروں طرف پہاڑیاں ہیں۔ البتہ اگر بابا جمال دین زندہ ہوتا تو میں بغیر کسی مرئی رابطے کے اسے مطلع کر سکتا تھا..." (۱)

ان مشینوں کی آمد سے قبل لوگ کس طرح مل جل کر رہتے ایک دوسرے کا ہاتھ بٹاتے۔ اس کی خوبصورت مثالیں ناول میں جابجا موجود ہیں۔ ان دنوں گھروں کی تعمیر میں بھی لوگ رضاکارانہ طور پر بھی حصہ لیتے۔ جب کوئی نیا مکان بنانے کا منصوبہ بناتا گاؤں کے بیشتر لوگ اس میں بلا مبالغہ ہاتھ بٹانے آتے تھے۔ دیواروں کی چنائی کرنے والے مستری کے علاوہ کسی کو معاوضہ دینے کا رواج نہ تھا۔ (۲)

لیکن رفتہ رفتہ مشینوں کی آمد نے کسانوں اور دیہاتی معاشرت میں مل جل کر زندگی بسر کرنے والوں کے باہمی رشتوں کو کمزور کرنا شروع کیا اور رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ جندر کا مالک ولی محمد اب اس پریشانی کا شکار ہے کہ اس کی موت کے بعد نہ جانے کب

(۱) سلیمی، اختر رضا، جندر، (راولپنڈی: رمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، ۲۰۱۸ء) ص ۷۴

(۲) ایضاً، ص ۱۰۰

تک اس کی لاش پڑی گھلتی سڑتی رہے گی؟؟؟ حالانکہ ان مشینوں کی آمد سے قبل اس طرح کی تنہائی کسی انسان کا مقدر نہ تھی خود ولی محمد کی ماں کی موت کے بعد اس کا باپ گاؤں والوں سے فصلوں کی بوائی کٹائی کی انہی رسموں سے جڑا ہوا تھا۔ چنانچہ ناول نگار لکھتا ہے:

"ٹریکٹر اور اس سے وابستہ مشینوں نے آدمی کو پہلے زمین کی اور بالآخر آپس کی جڑت سے آزاد کر دیا۔ اب ہر آدمی آزاد اور خود مختار تھا، یہ خود مختاری غیر محسوس طریقے سے لوگوں کی رگوں میں دوڑنے لگی اور لوگ ایک دوسرے سے کٹتے چلے گئے۔ اگلے چند سالوں میں شادی بیاہ اور ماتم وغیرہ کے لیے برتن بھی، جو پہلے تمام گاؤں کے گھروں سے اکٹھے کیے جاتے تھے ٹینٹ سروس کی دکانوں سے آنے لگے اور قبریں مزدوری پر کھودی جانے لگیں..."[۱]

مصنف کو بھی یہ احساس ہے کہ محض ٹیکنالوجی کی آمد نہیں ہے کہ جس سے کسانوں اور عام آدمی کی زندگی آسان ہو گئی ہے بلکہ "یہ ایک تہذیب کا انہدام ہے۔"[۲]

اور اس تہذیبی کایا کلپ میں قدیم تہذیب سے وابستہ لوگوں کی کوئی جگہ نہیں۔ نئی تہذیب سنگدلی کی حد تک خود مختار ہے کہ ایک بیٹا اپنے باپ کی تنہائی اور کسمپرسی سے لاعلم اپنی زندگی میں مگن ہے۔

ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت
احساسِ مروّت کو کچل دیتے ہیں آلات

---

(۱) سلیمی، اختر رضا، جندر، ص ۱۰۳

(۲) ایضاً، ص ۱۰۷

محاکمہ

# محاکمہ

عالمگیریت کی اصطلاح گذشتہ صدی کی آخری دو تین دہائیوں سے علمی و ادبی حلقوں میں رائج ہو کر دعوتِ فکر و نظر دے رہی ہے۔ سقوطِ ماسکو گذشتہ صدی کے آخر میں رونما ہونے والا ایک ایسا واقعہ تھا جس کے اثرات نہایت دور رس تھے۔ سوویت یونین کے انہدام نے مغرب بالخصوص برطانیہ اور امریکہ کو یہ موقع فراہم کیا کہ وہ دنیا بھر کی اقوام کو فکری طور پر اپاہج بنانے اور اپنے دام تزویر میں جکڑنے کے لیے کمربستہ ہو گئے۔ اپنے ان مقاصد کو انہوں نے عالمگیریت کے خوشنما لبادے میں چھپانے کی ضرورت اس لیے محسوس کی کہ عالمی ضمیر کو مطمئن کیا جا سکے اور اس کی آڑ میں انہیں دیگر اقوام کے استحصال کا ایک لائسنس بھی حاصل ہو سکے۔

عالمگیریت بظاہر ایک ایسے نظام کی داعی ہے جس میں ہر فرد، قوم اور ملک کو تجارت و ترقی کے یکساں مواقع حاصل ہوں۔ سرمائے کی عالمگیر آزادانہ نقل و حرکت سے سارا عالم یکساں طور پر مستفید ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ ثقافتی عالمگیریت کے تحت ایک عالمی کلچر کا تصور دیا گیا جہاں دنیا بھر کے افراد عالمی شہری ہیں۔ عالمی کلچر سے منسلک ایک عالمی زبان بولتے ہوئے عالمی لباس اور عالمی خوراک کو اپنائے ہوئے ہیں۔ اس طرح عالمگیریت کو تاریخ کا فطری موڑ، وقت کی ضرورت اور فلاحِ انسانیت کا مؤثر ذریعہ قرار دے کر اس کی خوب تشہیر کی گئی۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ عالمگیریت کی آڑ میں بڑی طاقتیں ترقی پذیر ممالک کے سرمائے اور وسائل کو ہڑپ کر کے انھیں معاشی طور پر قلاش کرنے میں مصروف ہیں۔ عالمگیریت کی آڑ میں کھیلے جانے والے اس کھیل کو ناقدین اسی لیے ویسٹرنائزیشن (Westernization) اور امریکنائزیشن (Americanization) کا نام دے رہے ہیں۔

دنیا تیزی سے بدل رہی ہے۔ ماضی کی طرح اب استعماری ممالک کے لیے یہ ممکن نہ رہا کہ لشکر کشی کر کے دوسرے ممالک پر قبضہ کریں اور پورے عالم میں جا بجا تجارتی منڈیاں تلاش کرتے پھریں۔ اس لئے استعماری ذہنوں نے نئی شاطرانہ چالیں چلنے کی منصوبہ بندی کی۔ نئے کھلاڑی اب ملٹی نیشنل کمپنیاں تھیں جنہیں الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے دنیا میں متعارف کرایا گیا۔ عالم گیریت کے اس عہد کو مابعد صنعتی عہد کہا گیا کیونکہ صنعتی عہد میں اشیا کی پیداوار پر زور تھا جبکہ مابعد صنعتی عہد میں پیداوار کی کثرت نے کھپت کے مسئلے کو جنم دیا۔ لہٰذا اب خود انسانی ضرورتیں تخلیق کی جانے لگیں۔ یعنی اب صرف اشیاء ہی پیدا نہیں کی جاتی تھیں بلکہ انسانوں کے اندر ان اشیاء کی طلب کو پیدا کرنے کے تصور نے جنم لیا۔ اب معاشی عالمگیریت نے اپنا رشتہ ثقافت سے استوار کیا کیونکہ عالم گیریت کے لیے ہر شے بکنے والی ہے۔ خواہ زبان ہو، مذہب ہو یا ثقافت۔ اسی طرح ثقافتی عالمگیریت معاشی عالمگیریت کا ایک ضمیمہ ہے۔ بقول ڈاکٹر ناصر عباس نیر معاشی عالمگیریت کا اجارہ پسندانہ رخ انتہائی سنگدلانہ ہے جو اپنے مقصد کے لیے تباہ کن جنگیں شروع کرنے سے بھی نہیں ہچکچاتا۔ پہلے جنگوں سے شہر مسمار کیے جاتے ہیں، انسانی آبادی کا صفایا کیا جاتا ہے پھر تعمیر نو کے نام پر سرمایہ کاری کی جاتی ہے۔ اس تعمیر نو میں عمارتوں، سکولوں، ہسپتالوں، سڑکوں اور گھروں کی تعمیر سے لے کر نئی حکومتوں، نئے طبقات اور نئے کلچر کی تعمیر بھی شامل ہوتی ہے۔ اور اس تعمیر کے نام پر عالمگیریت کے داعین نہایت ہوشیاری سے اقوام و افراد کی شناختوں اور ان کی امتیازی شناخت کو معدوم کرنے کی کاوشوں میں مصروف ہیں کیونکہ عالمگیریت دنیا بھر کے لسانی اور لسانی تنوعات کے خاتمے اور دنیا بھر میں یکساں

کلچر اور یکساں زبان کے فروغ کی خواہاں اور اس مقصد کے لیے مصروف کار ہے۔ امریکی میکڈ انلڈ، کے ایف سی، پیپسی، کوکا کولا، جیلٹ، ایبٹ، سنگر، نیسلے، یونی لیور کی مصنوعات، گلوریا جینز اور ان جیسے برانڈز عالم گیریت کی چھتری کے زیر سایہ دنیا بھر میں اپنی شاخیں کھول کر منافع سمیٹنے میں مصروف ہیں۔

خوراک کے حوالے سے دیکھا جائے تو فاسٹ فوڈ اس ثقافتی عالم گیریت کا سب سے بڑا مظہر ہے۔ لباس میں جینز، شارٹس، برمودا شرٹس آج خاص و عام بالخصوص نوجوان نسل کا پسندیدہ لباس بن چکے ہیں۔ اس کے علاوہ ہالی وڈ کی فلمیں دنیا بھر میں دیکھی جاتی ہیں۔ انگریزی زبان بالخصوص امریکی انگریزی دیگر زبانوں خواہ قومی ہوں یا مقامی، حاشیے پر دھکیل کر دکانوں کے سائن بورڈ سے لے کر موبائل ایپلی کیشنز تک اپنی جگہ بنا چکی ہے۔ خوراک اور لباس کے ذریعے کیے جانے والا اظہار تو ثقافت کا سطحی اظہار ہے لیکن زبان صرف ذریعہ اظہار نہیں خیالات، تصورات اور بیانیوں کی تشکیل کا پلیٹ فارم بھی ہے۔ اقبال اسے بجا طور پر تہذیب حاضر کی سوداگری کہتے ہیں جس نے افراد کو اشیاء کا غلام بنا دیا ہے۔ یہ برانڈز دور حاضر کے لات و منات ہیں جن کی پوجا کی جارہی ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ سرمایہ دنیا کے چند افراد، خاندانوں اور ملکوں کی ملکیت بنتا جارہا ہے۔ اور وہ علم جو کل تک طاقت تھا عالمگیریت نے اسے سرمایہ بنا دیا اور اس سرمائے کے زور پر ہر چیز جنس بازار بن گئی یہاں تک کہ خود انسان بھی کموڈٹی بن گیا۔

دنیا کے اکثر ترقی پذیر ممالک جو پہلے نو آبادیات کی سیاہ طویل رات میں اپنی زمین کے وسائل سے محروم ہوئے سو ہوئے لیکن آزادی کے بعد بھی انھیں صارفی عہد کا سامنا کرنا پڑا تو ان میں اتنی سکت نہیں کہ وہ استعماری معیشت کی ریشہ دوانیوں اور حیلہ سازیوں کا سامنا کر سکیں۔

بہر حال اس تحقیق کی ابتدا میں کچھ مفروضات قائم کیے تھے۔

☆ عالمگیریت ایک قدیم تصور ہے اگرچہ یہ اصطلاح نئی ہے

☆ اردو میں ناول کا آغاز عالمگیریت کے زیر اثر ہوا

☆ ابتدائی اردو ناول سے ہی عالمگیریت کے اثرات دیکھے جاسکتے ہیں

☆ ابتدائی اردو ناول میں عالم یریت کے بیانیے کے اثرات موجود تھے

برصغیر میں انگریزی اقتدار کے استحکام کو مد نظر رکھتے ہوئے فارسی زبان کو سرکاری زبان کے درجے سے فارغ کر کے اس کی جگہ علاقائی دیسی زبانوں کی ترویج پر توجہ دی گئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ نئے حکمران جانتے تھے کہ فارسی دربار کی زبان ہونے کے ساتھ ساتھ ہر خاص و عام کی زبان تھی۔ ہندو مسلم بلا تفریق مذہب اس زبان کو بولتے تھے۔ یہ زبان مضبوط تہذیبی روایات کی حامل تھی اور اس میں قواعد کا باقاعدہ نظام موجود تھا۔ شعر و ادب کی ایک طویل روایت اس میں موجود تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ زبان مسلم ثقافت اور مسلم تشخص کی علامت تھی۔ یہ انگریز حکمران اس زبان کی اہمیت اور مقام و مرتبے سے بخوبی واقف تھے اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ وہ جس بیانیے کو فروغ دینا چاہتے ہیں اس کے

لیے یہ زبان ہرگز ان کی معاون نہیں ہو سکتی۔ اس لیے ان کی نظر انتخاب آج کی اردو اس وقت کی ہندوستانی زبان پر پڑی۔ یہ زبان کسی خاص مذہب سے مخصوص نہ تھی اور عوام کی زبان تھی۔ جو ہندوستان کے طول و عرض میں بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ اس زبان میں قواعد، لغات اور علمی وادبی تصانیف کی کوئی خاص روایت بھی موجود نہیں تھی لہٰذا حکمران اپنے بیانیوں کی اشاعت کے لیے اس کو استعمال کر سکتے تھے۔ لیکن اس کے لیے انہوں نے اردو زبان کو تقسیم کر کے اسے اردو اور ہندی کا نام دے کر اس کا تعلق ہندوستان کے دو بڑے مذاہب سے جوڑ کر لسانی تفریق کی بنیاد رکھ دی۔ اس طرح ایک طرف انہوں نے دیسی زبانوں کے محسن کے طور پر اپنا تصور قائم کیا تو دوسری طرف انہوں نے مخصوص خیالات اور تصورات کی نشر و اشاعت کے لیے اردو کو ذریعہ بنایا۔

انگریزی حکومت نے نہ صرف (مخصوص) علم کی اشاعت کے لیے نوزائیدہ دیسی زبانوں کو ذریعہ بنایا بلکہ ہندوستان میں صدیوں سے مروج اور مقبول اصناف کو ازکار رفتہ اور دفتر بے معنی قرار دیتے ہوئے نئی اصناف متعارف کروائیں۔ اس حوالے سے دیکھیں تو سرسید تحریک کے زیر اثر شائع ہونے والے ادب میں عالمگیریت کے اثرات سامنے آنا شروع ہو گئے۔ کیونکہ جس وقت حالی، سرسید، محمد حسین آزاد، شبلی، امام اثر ادب و تنقید کے میدان میں اترے تو ان کے سامنے مغربی کلامیے اپنی تمام تر چکا چوند کے ساتھ موجود تھے کیونکہ فاتحین نے اپنے سیاسی و معاشی استحکام کو یقینی بنانے کے لیے جبر واستبداد کے ساتھ مخصوص سیاسی، سماجی اور علمی آئیڈیالوجی کا نصاب پڑھانا شروع کیا جو حکمرانوں کی حمایت میں تھا۔ اس کے علاوہ ان دیسی زبانوں میں نئی اصناف ادب متعارف کروائی گئیں جو مغربی ادب سے مستعار لی گئی تھیں۔ انہیں اصناف میں ناول کی صنف بھی شامل تھی۔ اس کے ساتھ برصغیر میں مروج اصناف مثلاً داستان، غزل جیسی اصناف کی مذمت کا رویہ بھی ملتا ہے۔ داستان کو جھوٹ کا پلندہ کہا گیا۔ ناول کی شعریات داستان کی شعریات سے بالکل مختلف ہونے کی بنا پر اس کا تعلق داستان سے جوڑنا درست معلوم نہیں ہوتا اور نہ ہی ناول کے آغاز کو فطری کہا جا سکتا ہے۔ بلکہ اس کی بنا انگریزی ناول پر رکھی گئی تھی۔ لہٰذا اردو میں ناول کا آغاز عالمگیریت کے اثرات کے زیر اثر ہوا ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر عبدالستار نیازی اپنے مضمون "بدیسی ادب کے اردو تراجم" میں لکھتے ہیں کہ اردو ادب میں ڈپٹی نذیر احمد وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے اپنے طور پر انگریزی سیکھی۔ ان کے ہاتھ کہیں سے ڈے سمتھ (Day Smith) کی کتاب سینڈ فورڈ اور مرٹن (Sand Ford and Morton) لگی جس میں بچوں کے تعلیمی، اخلاقی اور سائنسی مسائل بیان کیے گئے تھے۔ نذیر احمد نے مغربی ادب سے متاثر ہو کر اردو میں ناول کی داغ بیل ڈالی۔ نذیر احمد کی تصانیف پر انھیں انعامات بھی ملے۔ اور یہ بھی دلچسپ امر ہے کہ اردو ناول کے بنیاد گذار نذیر احمد، سرشار، رسوا سرکاری ملازم تھے۔ نذیر احمد کے ناول میتھیو کیمپسن اور ولیم میور کی نظر سے گزرے تو ان کی حوصلہ افزائی بھی کی گئی اور دیسی ادب کے مقابلے میں پیش کیے گئے۔ بہر حال حکمرانوں کی یہ حکمت عملی خاصی کامیاب رہی اور اس دور میں ان ناولوں میں پیش کردہ خیالات وکٹوریائی اخلاقیات سے متاثر تھے۔ ان ناولوں کے ذریعے مغربی خیالات کا نفوذ اس نئی زبان میں با آسانی ہو گیا جو فارسی جیسی مضبوط ادبی روایت کی حامل زبان میں ممکن نہ تھا۔

ابتدائی اردو ناولوں میں عالمگیریت کا بیانیہ اور کلامیہ موجود تھا۔ اس سلسلے میں ابن الوقت میں اگرچہ ڈپٹی نذیر احمد نے توازن قائم رکھنے کی کوشش کی اور مسٹر نوبل جیسے شریف النفس انگریز کے مقابلے میں مسٹر شارپ جیسا منتقم مزاج اور تنگ نظر انگریز کو پیش کیا لیکن مسٹر نوبل کی ابن

الوقت کو یہ نصیحت کرنا معنی خیز ہے کہ اگر وہ اپنی قوم کی اصلاح کا خواہشمند ہے تو اسے انگریزی طور طریقے اور آداب و رسوم اختیار کرنے چاہییں۔ دوسرے لفظوں میں مقامی آداب اور طرز زندگی جہالت پر مبنی، دقیانوسی اور پیش پا ہیں۔

سرشار کے ناولوں پر نظر ڈالیں تو ان کے ناول سیر کہسار میں مقامی لوگوں کو اخلاقیات سے عاری جبکہ مغربی تہذیب کو قابل تقلید نمونہ قرار دیا گیا ہے۔ اسی طرح شرر جو اسلامی تاریخ کے حوالے سے ناول نگاری میں منفرد مقام رکھتے ہیں ان کے معاشرتی ناول طاہرہ میں انگریزوں کو باکردار، مجسمہ شرافت، پیکر خلوص و ایثار بنا کر پیش کیا گیا جبکہ ان کے مقابلے میں مسلمان تنگ نظر اور دقیانوسی ہیں۔

بہر حال انگریزی زبان اور مغربی تعلیم و تہذیب نے یہاں کے لوگوں بالخصوص پڑھے لکھے طبقے کو اس طرح متاثر کیا کہ ابن الوقت جس طرح کی زندگی کو اختیار کرنے پر کرسٹان کہلوائے وہی طرز زندگی بعد کے ناول نگاروں عزیز احمد، قرۃ العین حیدر وغیرہ کے ہاں مقامی ارسٹوکریسی کی وہ تہذیب ہے جسے وہ فخریہ اپناتے ہیں اور اس کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں۔

عالمگیریت کے ساتھ منسلک استحصال کا شعور بہر حال اردو ناول نگاروں کے ہاں موجود ہے۔ اور یہ پریم چند سے لے کر بعد کے ناول نگاروں کے ہاں کسی نہ کسی طور پر موجود ہے۔

۱۹۸۰ کی دہائی کے بعد لکھنے والے ناول نگار کا ذہنی افق الیکٹرانک میڈیا کی بدولت بہت وسیع ہو چکا ہے۔ اب جدید موضوعات بھی ناول میں جگہ پا رہے ہیں جس کی بہترین مثال مرزا اطہر بیگ کا ناول صفر سے ایک تک ہے۔ اس کے ساتھ مشرق و مغرب کا موازنہ اپنی خوبیوں خامیوں سمیت بھی ناول میں نظر آ رہا ہے۔ بانو قدسیہ نے حاصل گھاٹ میں یہ موازنہ خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ اپنی روایات سے محبت اور اپنی مٹی کی مہک مستنصر حسین تارڑ کے ناولوں میں جگہ پاتی ہے تو ۲۰۱۸ میں لکھے گئے جندر میں عالم گیریت کے زیر اثر دم توڑتی مقامی تہذیبی روایات کا نوحہ ملتا ہے۔

عالمگیریت کے سلسلے میں میرا مفروضہ تھا کہ تصور اگرچہ قدیم ہے لیکن اصطلاح نئی ہے۔ تو اس سلسلے میں تاریخ کے مختلف ادوار میں نمودار ہونے والی بڑی بڑی سلطنتوں مثلاً سمیری سلطنت، یونانی سلطنت، مسلم ریاست وغیرہ کا مختصر تذکرہ کر کے یہ تجزیہ کیا گیا کہ یہ ریاستیں اپنی حدود میں توسیع معاشی مفادات کے پیش نظر کیا کرتی تھیں۔ اور پھر مفتوح اقوام کے وسائل لوٹ کر اپنے خزانے معمور کیے جاتے لیکن اس کے ساتھ ساتھ بعض اوقات ان کی زبان کی جگہ اپنی زبان رائج کی جاتی ہے۔ پھر نو آبادیات کے دور میں بھی ترقی یافتہ اقوام دور دراز کا سفر کر کے لشکر کشی کرتیں۔ اس دور کی سب سے بڑی برطانوی سلطنت تھی جس کی حدود اس قدر وسیع تھیں کہ وہاں کبھی سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔ برطانیہ نے اپنے صنعتی انقلاب میں ہندوستان کے وسائل سے بھرپور استفادہ کیا اور ہندوستان جیسا خوشحال ملک انگریزوں کی جدید ٹیکنالوجی کا مقابلہ نہ کر سکا۔ لہٰذا اس کے وسائل کو لوٹ کھسوٹ کر برطانیہ منتقل کیا گیا۔ اس کے بعد تاریخ نے نئی کروٹ لی تو اب بزور قوت ملکوں پر قبضہ کرنا اور اسے برقرار مہنگا محسوس ہوا تو یہی کام ملٹی نیشنل کمپنیوں سے لیا جانے لگا۔

بہر حال عالمگیریت یا گلوبلائزیشن دراصل طرز زیست، پسند و ناپسند کے حصول کی خواہش یا رد کے وہ اصول ہیں جن کی بنیاد اپنی اصل میں بظاہر جمہوری لیکن دراصل صارفی ہے۔ اس نظام میں ہر وہ چیز جو بک سکتی ہے سود مند ہے اور وہی سچائی کے منصب پر فائز ہے۔ یہاں تک کہ اگر جھوٹ

اچھے دام دے سکے تو بیچ کے مقابلے میں زیادہ قابل قدر اور بڑا بیچ مانا جائے گا۔ عالمگیریت کا حاصل سرمایہ ہے خواہ وہ سرمایہ کسی بھی وسیلے سے پیدا ہو۔ لیکن عالمگیریت کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اس میں زندہ رہنے کا حق اسی کو ہے جو سرمائے کو پیدا کر سکے۔ صنعتی دور میں فیکٹریاں سرمایہ پیدا کرتی تھی اب علم اور میڈیا کے ذریعے سرمایہ پیدا کیا جا رہا ہے۔ صارفیت کے اس کلچر نے تیسری دنیا کا معاشی، نفسیاتی اور جذباتی طور پر استحصال کیا ہے۔ یہ سب کچھ سچ ہے لیکن سوال یہ ہے کہ محض اتنا جان لینا اور اس کی مذمت کر دینا کافی ہے؟ دنیا اگر پیش کار اور صارف میں بٹ چکی ہے تو ضروری نہیں ہم صارف ہی رہیں۔ یہاں یہ سوال اہم ہے کہ عالمگیریت کی زد پر اگر ہماری تہذیب و ثقافت ہیں تو ان کی حفاظت کیونکر ممکن ہے۔ تو اس سلسلے میں یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ کلچر کوئی جامد چیز نہیں ہے اس میں تغیر فطری امر ہے۔ لیکن یہاں یہ ضروری ہے کہ اس کا اصل جوہر جس کی بنا مذہب پر ہے وہ ہاتھ سے نہیں جانا چاہیے۔

عالمگیریت کے ردو قبول میں ہمارے عمومی رویے کو بھی دخل ہے جس کے حوالے سے شمس الرحمٰن فاروقی نے کہا تھا کہ مشرق تجربے سے متنفر جبکہ مغرب تجربہ پسند ہے تو اس سلسلے میں اس مزاج میں بھی تبدیلی کی ضرورت ہے اور شدت پسندی سے عالمگیریت کو رد کرنے کی بجائے ٹھوس حقائق کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ فیصلہ کرنا لازم ہے کہ ان میں سے کون سی چیزیں ہمارے لیے فائدہ مند ہیں۔ انھیں اختیار کرنے میں حرج نہیں ہونا چاہیئے اور جن مظاہر سے ہماری ثقافت، تشخص اور زبان کو خطرات لاحق ہوں ان سے اجتناب کرنا لازم ہے۔ بہر حال عالمگیریت ایک جاری و ساری عمل ہے جس کا مکمل بائیکاٹ / مقاطعہ ممکن نہیں۔ لیکن اس سلسلے میں مزید تحقیق کی ضرورت ہے تا کہ اس کو سمجھ کر اپنے حالات کے مطابق ڈھالا جائے اور پھر اس سے استفادہ ممکن ہو۔

عالمگیریت کا یہ موضوع اردو ناول نگاروں کے لئے دعوت مبارزت ہے کہ وہ ان مظاہر کی نشاندہی اپنی تخلیقات میں کریں جو عالمگیریت کے فلسفے کی عکاسی کرتے ہوں اور اس کے ساتھ ساتھ یہ ناقدین کے لئے بھی لازم ہے کہ وہ ان تخلیقات کی گتھیوں کو اپنے قارئین کی تفہیم کے لئے کھول کر پیش کریں۔

# کتابیات


- ابراہیم جلیس، *کالا چور*، لاہور: مکتبہ جدید، س۔ن
- احزاز نقوی، ڈاکٹر، *پنڈت ناتھ سرشار بحیثیت ناول نگار*، لاہور، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۲۰۰۶ء
- احسن فاروقی، *اردو ناول کی تنقیدی تاریخ*، لکھنو: ادارہ فروغ اردو، ۱۹۶۲ء
- احسن فاروقی، *آئینہ دل کا*، کراچی: اردو اکیڈمی سندھ ۱۹۵۵ء
- احسن فاروقی، *شام اودھ*، کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۸۵ء
- احسن فاروقی، *ناول کیا ہے*، لکھنو: دانش محل ۱951ء
- احمد داوءد، *رہائی*، راولپنڈی: حرمت پبلی کیشنز، ۱۹۷۹ء
- احمد سلیم (مرتب) *عبداللہ حسین تخلیقی سفر کی نصف صدی*، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۶ء
- احمد عباس، *انقلاب*، لاہور: مکتبہ اردو ادب ۱۹۷۵ء
- اخلاق احمد قادری (مترجم) *تاریخ انحطاط وزوال روما*، لاہور: بک فورٹ، ۲۰۱۷ء
- اخلاق احمد قادری (مترجم) *تاریخ قیصران روم*، لاہور: بک فورٹ، ۲۰۱۴ء
- اسلم آزاد، *اردو ناول آزادی کے بعد*، نئی دہلی: لکشمی پریس، ۱۹۹۰ء
- اسلوب احمد انصاری، *اردو کے پندرہ ناول*، علی گڑھ: یونیورسل بک ہاؤس، ۲۰۰۳ء
- اشرف، اے۔ بی، *ادب اور سماجی عمل*، ملتان: کاروانِ ادب،، ۱۹۸۰ء
- اشک، اوپندر ناتھ، *ستاروں کے کھیل*، لاہور: آئینہ ادب، ۱۹۶۳ء
- اطہر بیگ، مرزا، *حسن کی صورتحال*، لاہور: سانجھ پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء
- اطہر بیگ مرزا، *صفر سے ایک تک*، لاہور: سانجھ پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء
- اطہر بیگ، مرزا، *غلام باغ*، لاہور: سانجھ پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء
- الطاف فاطمہ، *چلتا مسافر*، لاہور: فیروز سنز،، ۱۹۸۰ء
- الطاف فاطمہ، *دستک نہ دو*، لاہور: آئینہ ادب، س۔ن
- الطاف فاطمہ، *نشانِ محفل*، لاہور: آئینہ ادب، ۱۹۷۵ء
- انتظار حسین، *آگے سمندر ہے*، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء
- انتظار حسین، *بستی*، لاہور: کتاب گھر،، ۱۹۸۰ء

- انتظار حسین، *تذکرہ*، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۷ء
- انتظار حسین، *چاند گہن*، لاہور: مکتبہ میری لائبریری، ۱۹۵۲ء
- انوار احمد، ڈاکٹر، *شوکت صدیقی، شخصیت اور فن* پاکستانی ادب کے معمار، اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۰۶ء
- انور پاشا، ڈاکٹر *ہندو پاک میں اردو ناول کا تقابلی مطالعہ*، نئی دہلی: انیس پبلی کیشنز، ۱۹۹۲ء
- انور سجاد، *جنم روپ*، لاہور: قوسین، ۱۹۸۵ء
- انور سجاد، *خوشیوں کا باغ*، لاہور: قوسین، ۱۹۸۱ء
- انور سدید، ڈاکٹر، *بانو قدسیہ: شخصیت اور فن*، اسلام آباد: اکادمی ادبیات، ۲۰۰۸ء
- انیس اشفاق، *دکھیارے*، کراچی: شہر زاد: ۲۰۱۵ء
- انیس ناگی، *دیوار کے پیچھے*، لاہور: ایور گرین بکس، ، ۱۹۸۰ء
- انیس ناگی، *ایک موسم کی کہانی*، لاہور: روہتاس بکس، ۱۹۹۰ء
- انیس ناگی، *قلعہ*، لاہور: جمالیات، ۱۹۹۴ء
- انیس ناگی، *نذیر احمد کی ناول نگاری*، لاہور: جمالیات، ۱۹۸۱ء
- اے۔بی اشرف، ڈاکٹر، *مسائل ادب، تنقید و تجزیہ*، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء
- بانو قدسیہ، *حاصل گھاٹ*، لاہور: سنگ میل، ۲۰۰۳ء
- بانو قدسیہ، *راجہ گدھ*، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۱ء
- بانو قدسیہ، *موم کی گلیاں*، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء
- بلونت سنگ، *چار ناولوں کا مجموعہ (رات چور اور چاند، ایک معمولی لڑکی، عورت اور آبشار اور عہد میں ملازمت کے ۳۰ دن)*، لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۱۶ ء
- پریم چند، منشی، *بازارِ حسن*، لاہور: دارالاشاعت، ۱۹۳۸ء
- پریم چند، منشی، *گئودان*، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۴
- پریم چند، منشی، *مجموعہ پریم چند (جلوہ ایثار، منورما، چوگان ہستی، بیوہ، روٹھی رانی)* (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء)
- پریم چند، منشی، *میدان عمل*، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء
- تحسین فراقی، ڈاکٹر، *اقبال دیدہ بینا قوم*، اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۱۵،
- جاوید اختر سیّد، ڈاکٹر، *اردو کی ناول نگار خواتین*، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۷ء

- جگدیش چندر رودھاون، *عصمت چغتائی شخصیت وفن*، دہلی: کتابی دنیا، ۲۰۰۳ء
- جمیل یوسف، *مسلمانوں کی تاریخ ایک جائزہ* ،اسلام آباد: کتاب گھر، ۲۰۰۵ء
- جمیلہ ہاشمی، *آتش رفتہ*، کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۶۴ء
- جمیلہ ہاشمی، *تلاش بہاراں*، لاہور: شعیب پبلشر، ۱۹۸۳ء
- جمیلہ ہاشمی، *دست سوس*، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء
- جیلانی بانو، *ایوان غزل* ،لاہور: الوقار پبلی کیشنز ۲۰۱۶ء
- جیلانی بانو، *بارش سنگ*، کراچی: مکتبہ دانیال، ۱۹۸۵ء
- حجاب امتیاز علی، *پاگل خانہ* ،لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء
- حجاب امتیاز علی، *ظالم محبت*، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء
- حسن منظر، *انسان اے انسان*، کراچی: شہر زاد، ۲۰۱۶ء
- حسن منظر، *دھنی بخش کے بیٹے*، کراچی: شہرزاد، ۲۰۰۸ء
- حسین الحق، *فرات*، دہلی: ترقی اردو بیورو، ۱۹۹۲ء
- حیات اللہ انصاری، *گھروندا*، راولپنڈی: حرمت پبلی کیشنز، ۱۹۹۶ء
- حیات اللہ انصاری، *لہو کے پھول*، راولپنڈی: حرمت پبلی کیشنز، ۱۹۸۱ء
- حیات اللہ انصاری، *مدار*، راولپنڈی: حرمت پبلی کیشنز،، ۱۹۸۲ء
- خالد اشرف، ڈاکٹر، *برصغیر میں اردو ناول*، لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۰۵ء
- خالد سہیل، *ٹوٹا ہوا آدمی* ، دہلی: ترقی اردو بیورو، ۱۹۹۰ء
- خالدہ حسین، *کاغذی گھاٹ*، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء
- خدیجہ مستور، *آنگن* ،لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء
- خدیجہ مستور، زمین، لاہور: ادارہ فروغ اردو ۱۹۸۳ء
- راجندر سنگھ بیدی، *ایک چادر میلی سی*، لاہور: نیا ادارہ، ۱۹۷۹ء
- راشد الخیری، علامہ۔ *شب زندگی حصہ دوم*، دہلی: حمیدہ پریس، س۔ن
- راشد الخیری، علامہ، *محراب مغرب*، دہلی: عصمت بک ایجنسی، ۱۹۴۰ء
- راشد الخیری، علامہ *نوحہ زندگی*، دہلی: محبوب المطابع، ۱۹۲۰ء
- رامانند ساگر، *اور انسان مر گیا*، لاہور: مکتبہ شعر وادب، س۔ن

- رسوا، مرزاہادی، *امراؤ جان ادا*، دہلی: مکتبہ جامعہ، ۱۹۷۷ء
- رسوا، مرزاہادی، *شریف زادہ*، دہلی: مکتبہ جامعہ، ۱۹۷۰ء
- رشید احمد گوریجہ، ڈاکٹر، *اردو میں تاریخی ناول*، لاہور: ابلاغ، ۱۹۹۶ء
- رشید اختر ندوی، *گوشہ ادب*، پندرہ اگست، لاہور: ۱۹۴۷ء
- رضی عابدی، *تین ناول نگار*، لاہور: پولیمر پبلی کیشنز، ۱۹۹۴ء
- رضیہ فصیح احمد، *آبلہ پا*، لاہور: ادارہ نقوش، ۱۹۶۴ء
- رضیہ فصیح احمد، *انتظار موسم گل*، لاہور: دین محمد پریس، س۔ن
- رضیہ فصیح احمد، *زخم تنہائی*، کراچی: شہرزاد، ۲۰۰۸ء
- رضیہ فصیح احمد، *صدیوں کی زنجیر*، لاہور: ادارہ نقوش، س۔ن
- روبینہ سلطان، *تین نئے ناول نگار*، لاہور: دستاویز، ۲۰۱۶ء
- ریاض ہمدانی، ڈاکٹر، *اردو ناول کا نوآبادیاتی مطالعہ*، لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۱۸ء
- رئیس احمد جعفری، *ایک مہاجر*، لاہور: ظفر برادرز، س۔ن
- رئیس احمد جعفری، *آن*، کراچی: کتاب منزل، س۔ن
- رئیس احمد جعفری، *باغی*، بمبئی: آفتاب اکادمی، ۱۹۴۴ء
- ساؤتھ ایشیا پارٹنرشپ پاکستان، *عالمگیریت اور پاکستانی سماج*، لاہور: ساؤتھ ایشیا پارٹنرشپ، پاکستان، ۲۰۰۵ء
- سائرہ ہاشمی، *سیاہ برف*، لاہور: نقوش، ۱۹۸۶ء
- سائرہ ہاشمی، *درد کی رُت*، لاہور: ادارہ فروغ اردو، ۱۹۸۳ء
- سجاد حسین انجم، *نشتر*، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۳ء
- سجاد ظہیر، *لندن کی ایک رات*، اسلام آباد: الحمد پبلشنگ، ۲۰۰۱ء
- سرشار، رتن ناتھ، پنڈت، *فسانہ آزاد جلد اول ودوم*، لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۰۸ء
- سرشار، رتن ناتھ، *سیر کہسار*، لکھنؤ: نول کشور مطبع، ۱۹۳۴ء
- سرشار، رتن ناتھ، *فسانہ آزاد، جلد اول*، لکھنو: نول کشور مطبع، ۱۹۴۹ء
- سرشار، رتن ناتھ پنڈت، *فسانہ آزاد، جلد چہارم*، لکھنو: مطبع نول کشور، ۱۹۱۴ء
- سلمیٰ اعوان، *تنہا*، لاہور: ماورا پبلشرز، ۱۹۹۲ء
- سلیمی، اختر رضا، جاگے ہیں خواب میں، راولپنڈی، رمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، ۲۰۱۷ء

- سلیمی، اختر رضا، جندر، راولپنڈی: رمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، ۲۰۱۸ء
- سہیل بخاری، ڈاکٹر، اردو ناول نگاری، لاہور: مکتبہ جدید، ۱۹۶۶ء
- سورج دیو سنگھ، ڈاکٹر، اردو اور ہندی کے سیاسی ناول، دہلی: ایجو کیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۶ء
- سید جاوید اختر، ڈاکٹر، اردو کی ناول نگار خواتین: ترقی پسند تحریک سے دورِ حاضر تک، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۷ء
- سید عظیم، تجارتی لوٹ مار کی تاریخ اور نام نہاد آزاد منڈی کی تجارت، لاہور: دار الشعور، ۲۰۰۶ء
- سید عظیم، ڈبلیو ٹی او اور گلوبلائزیشن، لاہور: دار الشعور، ۲۰۰۶ء
- سید عظیم، ملٹی نیشنل کمپنیاں، لاہور: دار الشعور: ۲۰۰۴ طبع چہارم
- شاد، رحمت علی، ڈاکٹر، (مرتب) قرۃ العین کا تصور تاریخ و تہذیب، لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۱۷ء
- شاہد نواز، پاکستانی اردو ناول میں عصری تاریخ (۱۹۴۷ تا ۲۰۰۷)، سرگودھا: شعبہ اردو یونیورسٹی آف سرگودھا، ۲۰۱۸ء
- شاہد، محمد حمید، مٹی آدم کھاتی ہے، کراچی: اکادمی بازیافت، ۲۰۰۷ء
- شبیر حسین، جھوک سیال، لاہور: مکتبہ آئینہ ادب، ۱۹۷۲ء
- شرر۔ عبد الحلیم، آغا صادق کی شادی، لکھنو، منیجر دلگداز، س۔ن
- شرر، عبد الحلیم، غیب دان دلہن، لاہور: مکتبہ القریش، ۲۰۱۱ء
- شرر، عبد الحلیم، طاہرہ، لکھنؤ: دلگداز پریس، ۱۹۲۳ء
- شرر۔ عبد الحلیم، فردوس بریں، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۲۰۱۴ء
- شرر، عبد الحلیم، ملک العزیز ورجینا، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۵ء
- شوکت تھانوی، بیگم صاحبہ، نئی دہلی: شمع بک ڈپو، ۱۹۶۳ء
- شوکت تھانوی خدانخواستہ، لاہور: ادارہ فروغ اردو، س۔ن
- شوکت صدیقی، جانگلوس، جلد اول، کراچی: کتب پبلشرز، ۲۰۱۰ء
- شوکت صدیقی، جانگلوس، جلد دوم، کراچی: کتاب پبلشرز، ۲۰۱۰ء
- شوکت صدیقی، جانگلوس، جلد سوم، کراچی: کتاب پبلشرز، ۲۰۱۰ء
- شوکت صدیقی، خدا کی بستی، کراچی: کتب پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء
- صدیق سالک، ایمرجنسی، لاہور: غالب پبلی کیشنز، ۱۹۸۵ء
- صدیق سالک، پریشر ککر، لاہور: غالب پبلی کیشنز، ۱۹۸۳ء
- صدیق سالک، میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا، لاہور: غالب پبلی کیشنز، ۱۹۷۰ء

- صفدر زیدی، بھاگ بھری، لاہور، عکس پبلی کیشنز، ۲۰۱۸ ء
- طارق محمود، *اللہ میگھ دے* ، اتر پردیش: ساہتیہ اکادمی، ۱۹۸۶ء
- طارق وحید بٹ، *نیورلڈ آرڈر، اسلام اور پاکستان*، لاہور: ۱۹۹۸ ء
- طاہر القادری، ڈاکٹر۔ *نیو ورلڈ آرڈر اور عالم اسلام*، لاہور: منہاج القرآن پبلی کیشنز: ۲۰۰۸ء
- طاہرہ اقبال، گراں، اسلام آباد، دوست پبلی کیشنز، ۲۰۱۹ ء
- ظفر پیامی، *فرار*، نئی دہلی: ایجوکیشنل پبلی کیشنز، ۱۹۸۶ء
- ظفر زیدی، ہمایوں، *قرۃ العین حیدر شخصیت و فن* (لاہور: دارالشعور، ۲۰۱۵ء
- عابد قیوم سلہری، *عالمگیریت، ڈبلیو ٹی او اور پاکستان*، اسلام آباد: آکسفیم پاکستان، ۲۰۰۴ء
- عبدالستار صدیقی، *پہلا اور آخری خط*، لکھنو: ادارہ فروغ اردو، ۱۹۶۷ء
- عبدالستار صدیقی، *شب گزیدہ*، لکھنو: ادارہ فروغ اردو، ۱۹۶۷ء
- عبدالستار صدیقی۔ *شکست کی آواز*، لکھنو: ادارہ فروغ اردو، ۱۹۶۷ء
- عبدالستار صدیقی، *غالب*، لاہور: روہتاس، ۱۹۸۶ء
- عبدالسلام، ڈاکٹر، *اردو ناول بیسویں صدی میں*، کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۷۳ء
- عبدالصمد، *دو گز زمین*، لاہور، مکتبہ القریش، ۱۹۸۸ء
- عبدالصمد، *مہاتما*، لاہور: مکتبہ القریش، ۱۹۲۲ء
- عبدالغفار قاضی، *لیلیٰ کے خطوط*، لاہور: غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۸۳ء
- عبدالغنی، ڈاکٹر، *قرۃ العین حیدر کا فن* ، نئی دہلی: ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۸۵ء
- عبداللہ حسین، *اداس نسلیں* ، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۵ء
- عبداللہ حسین، *باگھ*، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء
- عبداللہ حسین، *قید*، لاہور: قوسین، ۱۹۸۹ء
- عبداللہ حسین، *نادار لوگ*، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء
- عبداللہ یوسف علی، علامہ، *انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ*، لاہور، دوست ایسوسی ایشن، ۲۰۰۴ء
- عزیز احمد، *آگ* ، لاہور: مکتبہ میری لائبریری، ۱۹۷۳ء
- عزیز احمد، *ایسی بلندی ایسی پستی*، لکھنو: دانش محل، ۱۹۴۷ء
- عزیز احمد، *تیری دلبری کا بھرم*، لکھنو: دانش محل، ۱۹۶۴ء

- عزیز احمد، جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں، لاہور: مکتبہ میری لائبریری، ۱۹۸۸ء
- عزیز احمد، خدنگ جستہ، لاہور: مکتبہ لائبریری، ۱۹۸۸ء
- عزیز احمد، شبنم، لکھنو: دانش محل، ۱۹۶۱ء
- عزیز احمد، گریز، لاہور: مکتبہ جدید، ۱۹۵۶ء
- عصمت چغتائی، ایک قطرہ خون، لاہور: مکتبہ اردو ادب، ۱۹۷۶ء
- عصمت چغتائی، ٹیڑھی لکیر، لاہور: مکتبہ اردو ادب ۱۹۷۸ء
- عصمت چغتائی، دل کی دنیا، لاہور: روہتاس بکس، ، ۱۹۹۲ء
- عصمت چغتائی، سودائی، لاہور: نیا ادارہ، ۱۹۶۶
- عصمت چغتائی، ضدی، لاہور: اردو مرکز، ۱۹۶۵ء
- عصمت چغتائی، معصومہ، لاہور: نیا ادارہ، ۱۹۶۲ء
- علی عباس حسینی، اردو ناول کی تاریخ و تنقید، لاہور: لاہور اکیڈمی، ۱۹۶۴ء
- علی عباس حسینی۔ ناول اور ناول نگار، ملتان: کاروانِ ادب ۱۹۹۰ء
- غفور احمد، نئی صدی نئے ناول، لاہور: دالنوادر، ۲۰۱۴ء
- غفور شاہ قاسم، مستنصر حسین تارڑ شخصیت اور فن، اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۱۸ء
- غلام الثقلین نقوی، میرا گاؤں، سرگودھا: مکتبہ اردو زبان، ۱۹۸۱ء
- غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر، اردو شاعری کا سیاسی، سماجی پس منظر، لاہور: مطبع جامعہ پنجاب، ۱۹۶۶ ء
- فاتوماتا جوارا، فراز احمد (مترجم)، ڈبلیو ٹی او پس پردہ حقائق: بین الاقوامی تجارتی مذاکرات کی حقیقی کہانی، لاہور: سانجھ پبلی کیشنز، ۲۰۰۶
- فاروقی، شمس الرحمن، کئی چاند تھے سر آسماں، کراچی: شہر زاد، ۲۰۱۱ء
- فاروقی، طاہر منصور (مرتب) عزیز احمد کے چار ناول، لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۱۶ء
- فخر زمان، ایک مرے ہوئے شخص کی کہانی، لاہور: کلاسیک، ۱۹۸۷ء
- فخر زمان، سات گمشدہ لوگ، لاہور: کلاسیک، ۱۹۸۷ء
- فراز احمد (مترجم) ڈبلیو ٹی او پس پردہ حقائق، لاہور: سانجھ پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء
- فرزانہ اسلم، ڈاکٹر عصمت چغتائی بحیثیت ناول نگار، نئی دہلی، سیمانت پرکاش، ۱۹۹۶ء
- فضلی، فضل کریم، خونِ جگر ہونے تک، لاہور: دبستان، ۱۹۶۰ء

- فیاض محمود (مرتب) *تاریخ ادبیات پاکستان وہند، جلد نہم*، لاہور: پنجاب یونیورسٹی، س۔ن
- قاسم یعقوب، *گلوبلائزیشن مابعد جدید فکر مشمولہ تناظر* جنوری تا دسمبر، گ ۲۰۱۳ء گجرات: سوشیور لٹریری فارم ۲۰۱۳ء
- قدرت اللہ شہاب، *یاخدا*، کراچی: مکتبہ دانیال، ۱۹۸۸ء
- قدرت اللہ شہاب، ماں، کراچی، مکتبہ دانیال، ۱۹۸۷ء
- قرۃالعین حیدر، *آخرِ شب کے ہم سفر*، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء
- قرۃالعین حیدر، *آگ کا دریا*، لاہور: سنگِ میل پبلیکیشنز، ۲۰۱۲ء
- قرۃالعین حیدر، *چاندنی بیگم*، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۰ء
- قرۃالعین حیدر، *سفینہ غمِ دل*، لاہور: سنگِ میل، ۱۹۹۹ء
- قرۃالعین حیدر، *گردشِ رنگِ چمن*، کراچی: مکتبہ دانیال، ۱۹۸۸ء
- قرۃالعین حیدر، *میرے بھی صنم خانے*، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء
- قمر رئیس، ڈاکٹر، *پریم چند کا تنقیدی مطالعہ بہ حیثیت ناول نگار*، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، ۲۰۰۴
- کرشن چندر، *آسمان روشن ہے*، دہلی: ایشیا پبلشرز، ۱۹۵۷ء
- کرشن چندر، *ایک عورت ہزار دیوانے*، دہلی: ایشیا پبلشرز، ۲۰۰۰ء
- کرشن چندر، *ایک گدھا نیفے میں*، لاہور: نیا ادارہ، ۱۹۶۴ء
- کرشن چندر، *برف کے پھول*، لاہور: تخلیقات، ۱۹۶۳ء
- کرشن چندر، *پانچ لوفر ایک ہیروئن*، لاہور: نیا ادارہ، ۱۹۶۶ء
- کرشن چندر، *جب کھیت جاگے*، بمبئی: بمبئی بک ہاؤس، ۱۹۵۲ء
- کرشن چندر، *شکست*، امرتسر: آزاد بک ڈپو، ۱۹۵۳ء
- کرشن چندر، *طوفان کی کلیاں*، دہلی: مکتبہ شاہراہ دہلی، ۱۹۵۴ء
- کرشن چندر، *غدار*، لاہور: نیا ادارہ، ۱۹۷۹ء
- کرشن چندر، *میری یادوں کے چنار*، لاہور: مکتبہ اردو، ۱۹۶۲ء
- گل صبا، *قرۃالعین حیدر کے ابتدائی تین ناول ایک مطالعاتی تجزیہ*، دہلی: شاہد پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء
- لوئیس ایل سنائیڈر، *جنگِ عظیم دوم*، صفدر رشید (مترجم)، لاہور: دارالشعور، ۲۰۰۵ء
- محمد زکریا، خواجہ، *مختصر تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان وہند، اردو ادب (آغاز تا بیسویں صدی)*، لاہور: پنجاب یونیورسٹی ۲۰۱۶ء

- محمد سعید مرزا،خواب ہستی، کراچی: دارالاشاعت،۱۹۵۹ء
- محمد عارف، پروفیسر ڈاکٹر،اردو ناول اور آزادی کے تصورات ،لاہور: پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی۲۰۰۶ء
- محمد عاصم بٹ،(مرتب) آگے سمندر رہے،مکالمہ اور زندگی نامہ،لاہور: الحمد پبلی کیشنز،۲۰۱۸ء
- محمد عاصم بٹ،دائرہ، لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۱۴ء
- محمد عاصم بٹ،مختصر تاریخ عالم (مترجم)،لاہور:تخلیقات،۲۰۱۰ء
- محمد عاصم بٹ، ناتمام،لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۱۴ء
- محمد عظیم اللہ،ڈاکٹر،اردو ناول پر انگریزی ناول کے اثرات ،لاہور: دارالشعور،۲۰۱۵،
- محمد اشرف کمال،ڈاکٹر،اردو ناول، تاریخ وارتقا آغاز سے اکیسویں صدی تک ، کراچی: رنگ ادب پبلیکیشنز،۲۰۱۷ء
- محی الدین بمبئی والا، پروفیسر،قرۃالعین ایک مطالعہ ، گجرات:ساتینہ اکادمی،۱۹۹۹ء
- مستنصر حسین تارڑ، اے غزال شب ,لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۲۱۰۲ء
- مستنصر حسین تارڑ ، بہاؤ ،لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۲ء
- مستنصر حسین تارڑ، پیار کا پہلا شہر ,لاہور: دھنک پبلی کیشنز،۱۹۹۷ء
- مستنصر حسین تارڑ،پکھیرو،لاہور: التحریر،۱۹۸۳ء
- مستنصر حسین تارڑ،خس وخاشاک زمانے،لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۱۰ء
- مستنصر حسین تارڑ ، راکھ,لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۳ء
- مستنصر حسین تارڑ،فاختہ ,لاہور: التحریر،،۱۹۸۰ء
- مستنصر حسین تارڑ، قلعہ جنگی ,لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۷ء
- مشرف علی،جیلانی بانو کی ناول نگاری کا تنقیدی مطالعہ , دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہائوس،۲۰۰۳ء
- مقصود خالق (مترجم) W.T.O کیا ہے,لاہور: دارلشعور۲۰۰۶ء
- ممتاز احمد خان،ڈاکٹر،آزادی کے بعد اردو ناول ہیئت، اسالیب اور رجحانات ، کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان۱۹۹۷ء
- ممتاز احمد خاں،ڈاکٹر،اردو ناول کے بدلتے تناظر ، کراچی: ویلکم بک پوائنٹ،۱۹۹۳ء
- ممتاز احمد خاں،ڈاکٹر، اردو ناول کے چند اہم زاویے,اسلام آباد: انجمن ترقی اردو،۲۰۰۳ء
- ممتاز شیریں،معیارِ تنقید،لاہور: نیا ادارہ سرکلر روڈ،ء۱۹۶۳ ء
- ممتاز مفتی، الکھ نگری،لاہور: الفیصل ناشران و تاجران،۲۰۱۴ء
- ممتاز مفتی، علی پور کا ایلی ،لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۱۹۸۸ء

- ممتاز احمد خان، ڈاکٹر، *اردو ناول کے بدلتے تناظر تنقید*، لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۲۰۰۷ء
- ممتاز احمد خاں، ڈاکٹر، *اردو ناول کے ہمہ گیر سروکار*، لاہور: فکشن ہاؤس ۲۰۱۲ء
- منشی پریم چند، *مجموعہ منشی پریم چند*، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء
- منصور آفاق، *نیند کی نوٹ بک*، لاہور: اساطیر، ۲۰۰۴ء
- منو بھائی، *مردانہ ڈبے کی زنانہ سواریاں*، نقوش ستمبر، اکتوبر ۱۹۶۲ء
- مہدی جعفر، *اردو افسانے کے نئے افق*، لاہور: نصرت پبلشرز، ۱۹۸۳ء
- مہدی جعفر، *نئے افسانے: سلسلہ عمل*، لاہور: کلچرل اکادمی، ۱۹۸۱ء
- مولوی سید ہاشمی فرید آباد (مترجم)، *تاریخ یونان ترجمہ ہسٹری آف گریس پروفیسر بیوری*، حیدر آباد دکن: دار لطبع سرکار عالیہ، ۱۹۱۹ء
- میلان کنڈیرا، *ناول کا فن (مکالمے اور دیگر نگارشات)* محمد عمیر میمن (مترجم)، کراچی: شہر زاد، ۲۰۱۳
- نارنگ، گوپی چند، (مرتب) *سجاد ظہیر ادبی خدمات اور ترقی پسند تحریک*، نئی دہلی، ساہتیہ اکادمی، ۲۰۰۷ء
- ناطق، علی اکبر، *نولکھی کوٹھی*، لاہور: سانجھ پبلی کیشنز، ۲۰۱۵ء
- نثار حسین، (مرتب) *شوکت صدیقی افکار و شخصیت* کراچی: کتاب پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء
- نثار عزیز بٹ، *کاروان وجود*، راولپنڈی: احمد رشید پبلشرز، ۱۹۸۰ء
- نثار عزیز بٹ، *نگری نگری پھرا مسافر*، راولپنڈی: احمد رشید پبلشرز، ۱۹۵۴ء
- نثار عزیز بٹ، *نے گلے نے چرانے*، راولپنڈی: احمد رشید پبلشرز، ۱۹۷۳ء
- ندوی، نذز الحفیظ، *مغربی میڈیا اور اس کے اثرات*، کراچی؛ مجلس نشریات اسلام، س-ن
- ندوی، ابو الحسن، *مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش*، کراچی: مجلس نشریات اسلام، س۔ن
- نذیر احمد، ڈپٹی، *ابن الوقت*، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۲۰۱۴ء
- نذیر احمد، ڈپٹی، *ایامی*، لاہور: فیروز سنز، ۱۹۹۰ء
- نذیر احمد، ڈپٹی، *بنات النعش*، لاہور: فیروز سنز، ۱۹۹۰ء
- نذیر احمد، ڈپٹی، *توبتہ النصوح*، لاہو: فیروز سنز، ۱۹۹۰ء
- نذیر احمد، ڈپٹی، *رویاے صادقہ*، لاہور: مطبع احمدی، س۔ن
- نذیر احمد، ڈپٹی، *مراۃ العروس*، لاہور: فیروز سنز، ۱۹۹۰ء
- نسیم عباس احمد، *اردو افسانے کے نظری مباحث: تنقید تجزیہ*، فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۰۵ء

- نیئر، ناصر عباس، ڈاکٹر، *عالمگیریت، اردو اور دیگر مضامین*، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۵ء
- نیئر، ناصر عباس، ڈاکٹر، *لسانیات اور تنقید*، اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۱۴ء
- واجدہ تبسم، *پھول کھلنے دو*، لاہور: مکتبہ میری لائبریری، ۱۹۹۷ء
- وقار عظیم سید، *داستان سے افسانے تک*، علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۹۲ء
- وقار عظیم سید، *فن افسانہ نگاری*، لاہور: اردو مرکز، ۱۹۶۱ء
- وقار عظیم سید، *نیا افسانہ*، دہلی: مطبوعہ جناح پریس، س۔ن
- وہاب اشرفی، پروفیسر، *اردو فکشن اور تیسری آنکھ*، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوءس، ۱۹۹۸ء
- یاسر جواد (مترجم)، *تاریخ عرب*، لاہور: الفیصل ناشران، ۲۰۱۵ء
- یاسر، خالد اقبال ڈاکٹر، *ادب اور زمانہ*، لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۲۰۱۴ء
- یوسف سرمست، ڈاکٹر، *بیسویں صدی میں اردو ناول*، حیدرآباد: نیشنل بک، ۱۹۷۳ء
- یوسف علی، علامہ، *انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ*، لاہور، دوست ایسوسی ایشن، ۲۰۰۳ء


## ادبی رسائل


- *آج* (سہ ماہی)، کراچی: شمارہ: ۵، ستمبر، ۱۹۹۰ء
- *آج*، (سہ ماہی)، کراچی: شمارہ: ۷، مارچ، اپریل، ۱۹۹۱ء
- *المعارف*، جنوری۔ مارچ ۱۹۹۸ء
- *اخبار اردو*، اگست ۲۰۱۰ء
- *ادبیات* (سہ ماہی)، اسلام آباد: بین الاقوامی نمبر ا، شمارہ: ۵۳، ۶۳
- *ادبیات*، اسلام آباد: بین الاقوامی نمبر ا، شمارہ: ۵۳، ۶۳
- *ادبیات*، اسلام آباد: بین الاقوامی نمبر ۲، شمارہ: ۷۳، ۸۳
- *ادبیات*، اسلام آباد: بین الاقوامی نمبر ۳، شمارہ: ۹۳، ۰۴
- *ادبیات*، اسلام آباد: بین الاقوامی نمبر ۵، شمارہ: ۴۴، ۳۴
- *اوراق*، لاہور: جون، ۱۹۹۱ء

- *تسطیر*،لاہور:اکتوبر تا دسمبر،۱۹۹۷ء
- *دنیازاد* (سہ ماہی)، کراچی: کتاب، ۱۴، اکتوبر، ۲۰۱۴ء
- *شرق* (مجلہ)، لاہور: اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی، ۲۰۰۹ء تا ۲۰۱۵ء،
- *صریر*، ستمبر، ۱۹۹۷ء
- *محراب* (سہ ماہی)، لاہور: ۱۹۸۳ء
- *محراب*، لاہور: ۱۹۸۵ء
- *محراب*، لاہور: ۱۹۸۲ء
- *خیابان*، پشاور: شعبہ اردو جامعہ پشاور ۲۰۰۶ء
- *تناظر جنوری تا دسمبر ۲۰۱۳ء* گجرات: سوشیور لٹریری فارم ۲۰۱۳ء
- سطور، *قرۃالعین حیدر کا خصوصی نمبر* ،لاہور: بیکن بکس، ۲۰۰۳ء
- *نصرت*، (ماہنامہ) لاہور: گورنمنٹ کالج شعبہ اردو، ۱۹۸۹
- تحقیقات *اردو جرنل*، راولپنڈی: ادارہ تحقیقات اردو، ۲۰۱۵،


## مقالات


- ثوبیہ مقبول، *اردو ناول میں انگریز کردار*، لاہور: اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی۔
- صدف سلطان، گلوبلائزیشن، *مسلم دنیا پر ثقافتی اثرات*، لاہور: ادارہ علوم اسلامیہ جامعہ پنجاب، ۲۰۰۳ء
- عائشہ مقصود، *اردو میں انگریزی کی آمیزش: لسانیاتی مطالعہ*، لاہور: اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی۔
- محمد عرفان پاشا، *اردو ادب پر عالم گیریت کے اثرات*، لاہور: یونیورسٹی آف ایجوکیشن لوئر مال کیمپس۔
- حمیرا عثمان، *نوآبادیاتی عہد کے اردو ناول کا مطالعہ، مابعد نوآبادیاتی تنقید کی روشنی میں*، لاہور: شعبہ اردو اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی، ۲۰۱۶ء
- محمد فاروق، *شوکت صدیقی کے ناولوں میں پاکستانی سماج کی عکاسی*، غیر مطبوعہ مقالہ، لاہور: شعبہ اردو اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی ۲۰۱۴ء
- مہرونہ لغاری، *حسن منظر: ادبی خدمات*، ملتان: شعبہ اردو بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ۲۰۱۴ء
- نیر سلطانہ بٹ، *خدیجہ مستور کی ناول نگاری*، *تحقیقی مقالہ ایم۔اے اردو* ،لاہور: اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی ۱۹۸۹ء

## ENGLISH BOOKS


- *A Fair Globalization creating opportunities for all*, New Delhi: World commission on the social dimensions of globalization:2006
- Anthony Giddens, *The third way: the renewal of social democracy*, UK: Cambridge Polity Press, 1998
- Bhatia, B.M., *Famine in India*, 1943, New Delhi: Asia Publishing House,1963
- Chamsyel Ojeili and Hayden, Patrick, *Critical Theories of Globalization*, Basingstoke: Palgrave Macmillon,2007
- Noam Chomskay and Herman Edward, *Manufacturing Consent, The Political Economy of the Mass Media*, New York: Pantheon Books, 2002
- Croucher, Sheila L. *Globalization and belonging the politics of identity in a changing world*, Maryland: Roman and Littlefield, 2004
- Dani Roderick, *Has globalization gone too far?* Washington: Institute for international economics 1997
- Daniel, Cohen. *Globalization and its Enemie*, Cambridge, The Mit Press, 2006
- David Held, *A Globalizing World? Culture, Economics and Politics*, New York: Routledge,2000
- David, Hasmondalgh, *The Culture Industries*, London: Sage Publications,2002
- Kaufman,Debra Renee ,*Rachel's Daughters, newly orthodox Jewish women*, New Jersey: Rutgers University Press 1993
- Ejaz Ahmad, Rana. *Globalization and its impacts on Pakistan*, Lahore: Areas Publications, 2004.
- Fukuyama ,Franics, *The End of History and the Last Man*, New York: Avon Books inc،1998
- Freidman, Thomas L, *The Lexus and olive tree* ,New York: Farrar Straus Guiros, 1999
- Friedman, Thomas L. *The World is Flat*, London: Pengiun Books. 2006
- Fyzee, Asaf A. *Islamic Culture* Bombay: International Book House,1944
- G Reg Buckman, *Globalization Tame it or Scrap it*, Dhaka, the University press 2004
- George Ritzer, *The Mcdonaldization of Society*, Los Angles :Sage,2015
- Gerg Buckman, *Globalization* Tames *it or Scrap it*?
- Gergen, K.J.*The Challenge of Absent Person*, New York: Cambridge University Press,2002
- Anthony, Giddens*Modernity and Self-identity Self and Society in the Late Modern age* Cambridge: polity press, 1991.
- Anthony,Giddens, *Socology*, Cambridge: Polity Press,2006
- Hassan M.Kabir, *Globalization and Sustainable Development in the POIC Countries in Globalization and Muslim world* ,Dhaka : Bangladesh Institute of Islamic Thought (BIIT) 2003.
- Huntington,Samual Phillip, *The Clash of Civilizations and Remaking of World Order*, London: Touchstone Books,1998.

- Scholte,Jan Art, *the Globalization of World Politics*, Oxford University Press, 2001
- Joe Krieger Ed, *The Oxford Companion to Politics of the World*, New York: Oxford University Press 2001
- John Gray, *False Dann*, New York: The New press TVA
- Joseph Stiglitz, *Making Globalization Work, New* York: Norton and Company,2006
- Josph Stiglitz. *Globalization and its Discontent*, New York: Norton and Company 2002
- Keylely, Charles wand and Blanton Shannon L, World Politics, Australia Wads work: 2012
- Khalid Rehman, *The Role of MNCs and TNCs and Their Socio-Economic Impact on Socities Included in Globalization: Economic, Social and Political Dimensions*, Karachi: University of Karachi,2007
- Linderf Peter F, Does *Globalization Make the World More Unequal in Globalization and Income inequality*, Hyderabad: Infancy University press: 2010
- Lui Hebron, *Globalization: Debunking the Myth*, Noida: Dorling Kindersley India Pvt. Ltd:2013
- Malcom Walters, *Globalization*, New York: Routledge,2001
- Nikolas Coupland, *Language, the handbook of language and globalization*, Malden, Mass, Wiley-Blackwell,2013
- Noami Klien, *No Logo*, New York: Martin Press ,2002
- Noreena Hertz, T*he Silent Take Over*, New York: the free press 2001
- Rachael Singh(trans), *Globalization, Law and the State*, Oxford: Hart Publishing,2017
- Robertson, Roland, *Globalization: social theory and global culture* London: Sage, 1992
- Samir Dasgupta, *The Changing Face of Globalization*, London: Sage Publications ND

.

- Scholte, Jan Art, *Globalization*: *A Critical Introduction*,2nd ed, New York: Palgrave Macmillan,2005.
- Steger, Manfred B. *Globalization: A very short introduction*, Oxford: Oxford University Press,2013.
- Stieglitz, Joseph E, *Globalization and its Discontent*, New York: Norton and company 2006
- Javed Masood, Syed, *International Political Economy and Globalization*, Singapore: World Scientific Publishing, 2008.
- Tahir, Naveed Ahmad, *Globalization Economics, Social and Political Dimensions, Focus on South Asia*, Karachi: Area Study Center of Europe University of Karachi,2007
- Terhi Rentane. *The Media and Globalization*, London: Sage Publications, ND
- Thompson, J.B, *The Media and Modernity*, Cambridge: Polity Press, 1995
- Tomlinson. *Cultural Imperialism*, London: Continum, 2002
- Tomlison J.B, *Globalization and culture*, Chicago: University of Chicago Press, 1999
- Toynbee, Arnold J. *Civilization on Trial*, London: Oxford University Press, 1948
- Uzma Shujat, *Globalization: a political social and economics dilemma for India in globalization economic, social and polit6ical dimensions*, Karachi: Area study center, 2007

- Vandana Shajan, *Globalization and Income inequality*. Hyderabad: Icfaci University press,2010
- Viviane Forrester, *The Economic Horror (Transited by Policy press from French* )_,Oxford: Blackwell, 1999.
- Walker, C*, Depression and Globalization: the politics of mental health in twenty first century,* New York: Springer, 2008
- Malcolm, Walter, *Globalization,* New York: Routledge, 2001


## Website Name


- www.piie.com
- www.investopedia.com>terms
- www.forbes.com
- www.imf.org
- slideplayers.com
- eNotes.com


### Online Articles


- Arnould, Aric J. "Consumer Culture Theory (cct): twenty years of research" Journal of Consumer Research Vol 31, Issue 4, 868-888 (March 1,2005): http://doi.org/10.1086/426626 (Accessed Feb 05, 2017).
- Galliers, Robert D. "A Discipline Divided: Globalization and Parochialism in Information System Research" Communications of the association of the information system: vol.1, Article 5 (January 11, 2013): http://aisel.aisnet.org/cais/vol11/issl/5 (Accessed Feb 5, 2017).
- Muhammad Akram Ch. "Globalization and its impact on the world Economic Development". International Journal of Business and social science.2 No.23 Sp. issue (December, 2011): http://pdfs.semanticsschororg/ea77/f41eca8d21of od9bfcaa4c1338c8f4t4f.pdf. (Accessed January 10, 2017).
- Ndesauliva, Audrey Paul. "The Impact of Technology and Innovation (Technovation) in Developing Countries: A review of impirical evidence" Sciepub 4, No.1 (Sep 1, 2016): http://pubs.sciepubcom/jbms/4/1/2 (Accessed April 10, 2017).
- Steinbock, Dan. "The Great Shift of Globalization": China Quarterly of International Strategic Studies (2017): http://doi.org/10.1142/s2377740017500129 (Accessed June 10, 2017).

## Dictionaries/ Encyclopedias


- *Dictionary of Political Scienc*e, New Delhi SARUP and Sons, 2007
- *Encyclopedia Britannica*, Chicago: The University of Chichago,1986. Vol 1,
- *Jami English Urdu Dictionary*, New Delhi: National Council for promotion of urdu, 1996
- *Kitabistan new millennium Practical Dictionary*, Lahore: Kitabistan Publishing Company, 2004
- *New Collegiate Dictionary* USA spring field, Massachusetts: G & C Merrian Company ,1980.
- *Oxford Dictionary of English* 2nd Ed, Oxford University Press, 2006
- *Britannica Concise Encyclopedia*, London: Encyclopedia Britannica, Inc.  2005
- *The New Encyclopedia Britannica*, Vol 20, Chicago: The New Encyclopedia Britannica, Inc,2005
- *The New Fontana Dictionary of Modern Thought*, London: Harper Collins,1999
- *The Penguin Dictionary of Economics*, New York: Penguin Books,1985

# Abstract

Globalization is about the interconnectedness of people and businesses across the world that eventually leads to global cultural, political and economic integration. It is the ability to move and communicate easily with others all over the world in order to conduct business internationally. Globalization in short, points to the whole effort towards making the world global community as a one village. Goods that were only found in western countries can now be found across the globe. Now under developed areas can enjoy the benefits of scientific advances and industrial progress available in developed countries for the improvement and growth of their areas.

Because of globalization the economies of the world are being increasingly integrated, example mobile phones and internet have brought people closer. The world is becoming a smaller place. Work can be outsourced to any part of the world that has an internet connection because of improvements in traffic infrastructure one is able to reach one's destination in a short time.

Globalization can also be defined as an ongoing process by which regional economies, societies and cultures have become integrated through a globe-spanning network of communication and trade. The process of globalization includes a number of factors which are rapid technology developments that make global communications possible, political developments such as the fall of communism, and transportation developments that make traveling faster and more frequent. These produce greater development opportunities for companies with the opening up of additional markets, allow greater customer harmonization as a result of the increase in shared cultural values, and provide a superior competitive position with lower operating costs in other countries and access to new raw materials, resources, and investment opportunities.

Globalization through global communications, global markets and global production have promoted and facilitated by a fourth area of global activity in relation to money. For example, the American dollar, the Japanese yen, Euro and other major national currencies circulate globally. They are being used anywhere on earth and moving electronically and via air transport anywhere in effectively no time. Most bankcards can extract cash in local currency from the thousands of automated teller machines (ATMs) across the world. Also credit cards like Visa, MasterCard and American Express can be used for payments in almost every country in the globe .

People can move from one country to another, trade restrictions are reducing, domestic markets are opening up for foreign investments, telecommunications are better established and the countries that are leading the innovations are passing on their technologies to other countries in need

Globalization has brought benefits in developed countries as well as negative effects. The positive effects include a number of factors which are education, trade, technology, competition, investments and capital flows, employment, culture and organization structure.

On the other hand it is being criticized for its negative effects on developing countries.and it is said that it has deepened the disparity between the haves and have nots.Globalization has affected almost all spheres of life including language and literature. In this thesis, I have tried to

see the effects of globalization including financial,political,social,cultural,lingual and psychological in Urdu novel.

# GLOBALIZATION AND URDU NOVEL

**THESIS FOR THE DEGREE OF**

**DOCTOR OF PHILOSOPHY IN URDU**

**Session 2015-2020**

By

**RIFFATRAFIQUE**

**Roll No:07-2015**

**SUPERVISOR**

**PROF.DR. MUHAMMAD KAMRAN**

**Department of Urdu**

**Oriental college, Lahore**

**DEPARTMENT OF URDU, ORIENTAL COLLEGE**

**UNIVERSITY OF THE PUNJAB, LAHORE**